

Jasoosi Digest July 2018

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد48 • شمارہ 07 • جولائی 2018 • زرِسالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ
چینی بہ چینی

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

جولائی کا سکون آفریں شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ گرمی کے سخت موسم میں رمضان المبارک کا مقدس مہینہ آیا اَور عبادت گزاروں کے لیے رحمتوں کے نزول کے ساتھ گزر گیا۔ عید الفطر کے بعد یہ محفل بجی ہے مگر دیر آید، درست آید کے مصداق آپ سب کو عید کی دلی مبارک باد۔ اس بار عید سعید کے ساتھ ہی انتخابی گہما گہمی چل پڑی ہے۔ اپنے حلقوں کو برسوں سے بھولے ہوئے نامانوس چہرے کمیں گاہوں سے نکال کر اجتماعات میں اپنا تعارف کراتے اور ووٹ کی طلب بلکہ ہوس کا اظہار کرتے پھر رہے ہیں۔ آنے والے دن ان پیشہ ور لوگوں سے زیادہ ہمارے امتحان کے ہوں گے۔ ہم رشتے داری، برادری اور ذاتی مراسم کی رو میں بہتے ہیں یا اپنے ضمیر کے مطابق اہل بلکہ اہل ترین امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، اسی پر ہمارے یعنی عوام کے خوش حال مستقبل کا دارومدار ہوگا۔ رہے خواص تو ان کی ہمیشہ پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہوتا ہے۔ وہ جس کا پلڑا بھاری دیکھتے ہیں، لڑھک کر اسی طرف ہو لیتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان بے پیندے کے لوٹوں کو اپنے نئے سیاسی حلیف سے انتخابی پروانہ بھی مل جاتا ہے۔ ہم نے رو پیٹ کر جمہوریت کے دو مسلسل دورانیے یعنی پورے دس برس گزار لیے۔ اگر ہم نے اب بھی ماضی قریب سے سبق نہ سیکھا اور پرانی روش پر چلتے رہے تو...... بس آگے سوچتے ہوئے خوف آتا ہے۔ بجلی کا بحران ختم نہیں ہوا کہ پانی کی ہاہا کار شروع ہو گئی ہے۔ کاغذی دعوے اور سیاسی تقریریں اپنی جگہ لیکن اے رہنمایانِ قوم! ذرا تاریک بستیوں اور پیاسی آبادیوں پر بھی ایک نظر ڈال لیا کرو۔ تمہارے دعووں اور تقریروں سے نہ اجالے پھیل سکتے ہیں نہ پانی کی نہریں بہہ سکتی ہیں۔ بہتر مستقبل اور درد مند سیاسی قیادت کے ابھرنے کی امید لیے چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں توصیف و تنقیص نامے ہم سب کے منتظر ہیں۔

یو، اے، ای سے طلعت مسعود کی یادِ رفتگاں ''جون کا جاسوسی جیسے ہی سامنے آیا تو ہمارا ذہن آج سے کوئی پندرہ سولہ سال پہلے اس وقت تک چلا گیا جب ہم نے جاسوسی نیا نیا پڑھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت جاسوسی کے تین سو بیس صفحات اور سرورق کے رنگ بھی تین ہوتے تھے۔ ابتدائی صفحات اور رنگوں میں علیم الحق حقی، نواب صاحب، احمد اقبال، ایچ اقبال، کاشف زبیر، عبدالقیوم شاد صاحب جیسے قلمکاروں کے شاہکار موجود ہوتے تھے۔ وقت گزرتا گیا اور ان میں سے کئی اس دنیا سے منہ موڑ گئے اور باقی اب لکھنا چھوڑ چکے۔ اور اس کے ساتھ ڈائجسٹ بھی بدلتا گیا پہلے دو سو اسّی صفحات ہوئے اور اب دو سو ساٹھ صفحات رہ گئے ہیں اور رنگ تین سے دو ہو چکے۔ یقیناً وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزوں میں تبدیلیاں آتی ہیں اور ادارے نے مجبوری میں ہی صفحات کم کیے ہوں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ادارے کو جدید دور سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اب ڈیجیٹل دور میں کئی لوگ کتابوں کی خرید و فروخت سے کسی حد تک دور ہو چکے ہیں جس سے ڈائجسٹ اور رسائل پر فرق پڑتا ہے۔ اس لیے ہم نے پہلے بھی ایک تجویز دی تھی اور اب پھر دہرا رہے ہیں کہ ادارے کو اپنی ویب سائٹ لانچ کرنے کے بارے سوچنا چاہیے۔ سرورق پر موجود خواتین کے اسپئیر پارٹس آج کل کافی ٹیڑھے میڑھے نظر آ رہے ہیں جیسے اس خاتون کی گردن بھی اس کے چہرے سے متفق نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے ہم نے بھی ایک ہی نظر ڈال کر آگے کا رخ کیا جہاں اداریے میں وہی ملکی حالات کا رونا تھا جن کے بدلنے کی امید بنتی ٹوٹتی رہتی ہے۔ نکتوں والی چینی میں عاصم شہزاد صاحب کہانیوں پر تجزیے و تبصرے کرتے پہلے نمبر پر نظر آئے۔ اچھا تبصرہ رہا۔ ایم اقبال صاحب بھی عمدگی سے رائے دے رہے تھے۔ تفسیر عباس بابر کا نام دیکھ کر تبصرہ پڑھا لیکن یہ تبصرہ ان کے انداز سے ہٹ کر تھا جس کی وجہ سے مشکوک ہو گیا۔ ایمانے زارا شاہ ٹائٹل پر اگر کسی خوبصورت حسینہ کے نام پر ٹیڑھی میڑھی مخلوق نظر آئے تو ڈر تو بنتا ہے۔ ماہ رخ صاحبہ ہمارے تبصروں میں سے بُردباری کی دریافت نے آپ کا تبصرہ بھی بُردبارانہ بنا دیا۔ عائشہ صاحبہ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ سید ذیشان کاظمی کا نوک جھونک والا تبصرہ زبردست رہا۔ اس کے علاوہ سعدیہ قادری، شفقت محمود، اشفاق شاہین، عبدالجبار رومی کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ کہانیوں میں پہلے انگارے کی طرف رخ کیا جہاں ایک شاک ہمارا منتظر تھا۔ مغل صاحب نے ایک بار پھر ایک ہردلعزیز کردار کو ہم سے دور کر دیا۔ مغل صاحب اسے کسی چنگی نہیں کھتی۔ ویسے آپ کو ہیرو کے دوستوں سے ایسی کیا دشمنی ہے۔ اس سے تو بہتر تھا سجاول کی قربانی ہی دے دیتے۔ خیر اب آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ شدت سے اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ابتدائی صفحات پر ہمارے پسندیدہ امجد رئیس صاحب آئینِ وفا کی صورت میں ایک اور تھرلنگ اور ایکشن سے بھرپور ناول کے ساتھ موجود تھے۔ ایکشن اور سسپنس کے ساتھ رومانوی مکالمے بہت جاندار رہے اور جورڈن کا کردار دلچسپ اور زبردست رہا۔ پہلا رنگ دوسری شرط معمول سے بہت مختصر رہا۔ بہرحال اچھی کاوش رہی۔ انتقام اور نفرت و محبت کی انتہا کا شکار ہو کر پچھتانے والا روشان دوسروں کے لیے مسیحا بنا لیکن اپنے درد کا علاج نہ کر سکا۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ نفرت اور غصے کے زیرِ اثر کیے گئے فیصلوں پر اکثر پچھتانا پڑتا ہے۔ کہانی بیان کرنے کا انداز سلیس اور دلچسپ رہا۔ رقیبِ محبت ہنستی مسکراتی تحریر میں منظر امام صاحب نے محبت کے بارے بہت دلچسپ مشورے دیے۔ باقی کہانیاں ابھی مطالعے کی منتظر ہیں اس لیے ابھی اسی

کے ساتھ اجازت۔ بشرطِ زندگی پھر حاضری دیں گے۔ ہماری طرف سے سب کو بہت عید مبارک۔"

بورے والا سے عبدالجبار رومی انصاری کی خبر گیری" جاسوسی سرورق تو ٹھیک ہی تھا لیکن ایسے لگ رہا تھا جیسے مصور کا بس اسی دوشیزہ پر ہاتھ لگا ہوا ہے۔ اس کی ہم شکل پہلے بھی آچکی ہے۔ کبھی کبھار اتفاقیہ مماثلت تو ہو جاتی ہے لیکن مسلسل تو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ خیر ٹائٹل کی صورت میں ٹھیک ہی تھا جنھوں نے جاسوسی فرسٹ ٹائم لیا ہوان کے لیے، اس دفعہ اداریے کی سچائی سے بھرپور باتیں بہت اچھی لگیں۔ خاص کر ووٹ کے حوالے سے کہ سوچ سمجھ کر ووٹ دیں گے تو بگڑا نظام درست ہو جائے گا ورنہ پانچ سال کے لیے ہر دفعہ کی طرح بس عوام کا رونا ہوگا اور حکمرانوں کی عیاشیاں...... واہ جی عاصم شہزاد! اعتراضات کے ساتھ بھی محفلِ صدارت پر، مبارک ہو بھئی۔ مثبت اعتراضات بھی سر آنکھوں پر ہوتے ہیں۔ ایم اقبال کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا خدا کرے اسے رہائی کی نوید سنادے۔ بہت عمدہ تبصرہ۔ عائشہ مرزا کی تنبیہ تو مجھے برجستہ لگی، بہت اچھا تبصرہ لکھتی ہیں۔ محمد صفدر معاویہ کی سرشاری کے کیا کہنے، عمدہ تبصرہ بھائی۔ طویل مدت بعد حاضری دیتے تفسیر عباس بابر کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اب آتے رہنا جناب اور بھرپور تبصرے کے ساتھ جیسے طویل مدت پہلے آتے تھے۔ منشی محمد عزیز مئے نے بھی اپنے مختصر تبصرے میں جاسوسی سے اپنی محبت کا سرور بکھیر دیا۔ رانا بشیر احمد ایاز بیزار تو تھے لیکن اتنے بھی نہیں آخر بھرپور تبصرہ بھی تو کیا ہے، عمدہ۔ شعیب الرؤف، سیف الرؤف بھی قینچی سے ڈرتے ڈرتے عمدہ تبصرہ کر گئے۔ دھیمی باتیں کرتے شفقت محمود کا دلچسپ تبصرہ اچھا لگا۔ سید ذیشان حیدر کاظمی بھی بلیک لسٹ سے بچتے محفل میں جگہ بنا گئے اور چینی کے ساتھ مرچوں کے تکتے بھی لگا گئے، عمدہ۔ ایمانے زارا شاہ کا خواب میں انگاروں پر پاؤں پڑ گیا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ شکر ہے بارش کی ٹھنڈک سے جان میں جان آئی۔ تبصرہ اچھا لکھا۔ باقی سعدیہ قادری کی روانی، عاصم جٹ کی چہکاریں، ماہ رخ ارباب کی پسند ناپسند بھی عمدہ رہی۔ اشفاق نے بھی عمدہ تبصرہ کیا اور بھرپور تبصرے کے ساتھ عبدالودود عامر کے مشورے بھی زبردست رہے۔ آئینِ وفا میں بلا کی پھرتیلی تھی۔ کیلی موت کے منہ سے بچتی بھاگتی رہی وہ چھوٹی سی چور تھی اس کے لیے دل ہارنے والے جورڈن نے بھی چور ہونے کے ساتھ کیلی سے محبت کا حق ادا کر دیا۔ آخر کیلی بھی بھاگ دوڑ چھوڑ کر اس کی بانہوں میں سما گئی۔ امجد رئیس کی ابتدائی صفحات کی کہانی زبردست رہی۔ اوہو، ہاناوانی کے جادو سے ہپناٹائز اپنوں کی جان کا دشمن بنا انیق غلط فہمی سے ہی موت کے منہ میں چلا گیا۔ سجاول کو تو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن داؤد بھاؤ کے دل میں ابھی تک کسک باقی ہے، امید ہے ایسٹرن وہ بھی دور کر دے گا اور سب ہی خانہ جنگی سے نکل کر اپنی مشترکہ دشمن ہاناوانی کے گرد گھیرا تنگ کریں گے۔ مغل انکل کی کہانی ہر دفعہ کی طرح زبردست رہی بس نگو شہزادے کی موت کا افسوس ہوا۔ ایسے ہی آوارہ گرد کا بڑی دوست روڈلف بھی موت کے منہ میں چلا گیا افسوس ہوا۔ بہرحال ... جہاز میں یاسمین خانم۔ بھٹی صاحب کی کہانی بھی ایکشن سے بھرپور عمدہ جارہی ہے۔ کبیر عباسی کی مسیحا اچھی رہی۔ لباس کی چوری بھی عمدہ رہی۔ رقیب محبت میں تایا ہی رقیب بن کے آگیا اور بھتیجا بھی اتنا بھولا بھالا کہ تائے کی باتوں میں آگیا۔ منظر امام کی کہانی بھی اچھی رہی۔ سرور اکرام کی کہانی زندگی کے رنگ حساس موضوع پر دکھی کر دینے والی تحریر، بہت اچھی لگی۔ اتفاق نے بچے کے حقیقی باپ کو ملا دیا اور ماہرہ کو اچھا شوہر مل گیا۔ عکس فاطمہ کی گواہی کی قیمت اچھی کہانی تھی۔"

کراچی سے ادریس احمد خان کی نکتہ رس باتیں" ہمیشہ کی طرح جاسوسی ڈائجسٹ بروقت موصول ہوا۔ صفحات کی کمی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ دوبارہ سے ناچیز تجویز پیش کر رہے ہیں کہ بے شک اجرت میں اضافہ کر لیں 32 صفحات کی کمی قارئین میں ازحد محسوس کی جائے گی۔ ویسے ادارہ زیادہ بااختیار ہے۔ ایک اور بات کہ جو معیار آٹھ دس سال پہلے تھا اب وہ مفقود ہے آپ بذاتِ خود موازنہ کر سکتے ہیں، یہ خوش آئند بات ہے کہ آپ کے ادارے کے باذوق قارئین نے اچھے اور معیاری ادب کا اثر قبول کیا نتیجتاً بہت سے لکھاری میدان میں آگئے ہیں۔ ادارے نے ان کی ہمت افزائی بھی کی مگر ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی کے مصداق یہ حقیقت ہے کہ بیشتر لوگ ادارے کے لیے تحریر کے معیار پر پورا نہیں اترتے۔ معذرت انتہائی معذرت کے ساتھ۔ ڈائجسٹ کا سرورق محنت سے بنایا گیا اور دیدہ زیب تھا۔ چینی نکتہ چینی میں تمام دوست آراء کا اظہار کر رہے تھے۔ سب سے پہلے آئینِ وفا جس میں ہمت و قسمت سے منزل پر پہنچنے کا پیغام ملا۔ آستین کا سانپ اور گواہی کی قیمت نے بھی متاثر کیا۔ انگارے اور آوارہ گرد بھی کامیابی کے ساتھ اختتام کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ دوڑ بھی سبق آموز کہانی تھی۔ منزل کی تلاش میں نکلنے والوں کے لیے دنیار کاوٹیں ضرور کھڑی کرتی ہے۔ منظر امام صاحب کی رقیبِ محبت اور زندگی کے رنگ اچھے انداز میں لکھی ہوئی کہانیاں تھیں۔ لباس کی چوری بھی اچھی لگی۔ آخری صفحات کی آخری کہانی نے مایوس کیا۔ سب دوستوں کو عید الفطر کی بہت بہت مبارک باد۔"

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کا غمگین انکشاف" جون 18ء کا جاسوسی 29 کو صدر بازار پشاور میں مل گیا۔ سرورق کی خوب صورت سی دوشیزہ کے خوب صورت سے ہونٹ، دلنشیں آنکھیں، مہکتی سی زلفیں، بے داغ چاند سا چہرہ کیا کہنے، ساتھ میں ایک سوئی سی لڑکی ایک پولیس آفیسر ایک ہاتھ بدست پسٹل بھی جاسوسی کا اچھا تاثر تھا۔ آپ کے اداریے پر آئے۔ جو چھاپے مارنے والے ہیں ان کو ان کا حصہ گھر میں پہنچا دیا جاتا ہے انہیں کیا ضرورت کہ جا کر چیک کریں کہ عوام پر کیا ظلم ہو رہے ہیں۔ ان کی تو پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ اپنی محفل میں آئے راولپنڈی سے عاصم شہزاد محفل کو لیڈ کر رہے ہیں۔ ایم اقبال کی میانوالی جیل سے آمد اچھی رہی۔ آپ لوگوں کی ہمت کی داد دینی پڑے گی کہ مشکل حالات میں بھی جاسوسی سے رابطہ رکھنا ویری ویلڈن برادر جی۔ رانا بشیر احمد ایاز کی بھی بہترین تبصرہ نگاری۔ سرورق کی دوشیزہ کو محفل کے معزز اراکین اس طرح پسند و ناپسند کرتے ہیں جیسے لڑکی نہ ہو بریانی یا حلوے کی پلیٹ ہو۔ شعیب الرؤف، سیف الرؤف دونوں کی بہترین انٹری دوستوں اور رقیبوں سب کو دھو ڈالا۔ شفقت محمود رومی بھائی، ایمانے کے تبصرے عمدہ رہے باقی تمام لوگوں کے تبصرے بھی محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ امجد رئیس کی آئینِ وفا پہلے لفظ سے آخری لفظ تک بہترین تحریر تھی۔ ایسا لگا جیسے کہانی پڑھ نہ رہے ہوں بلکہ دیکھ رہے ہوں۔ کہانی کے نشیب و فراز کے ساتھ ہمارا دل ڈوبتا ابھرتا رہا۔ جورڈن نے

کیلی سے محبت کی تو اس کو پانے کی خاطر ہر مشکل سے ٹکرا گیا اور کیلی نے جو بیڑا اٹھایا تھا وہ پورا کیا وکٹر وان ویلڈن کو انجام رسید کر کے۔ مزہ آ گیا کہانی پڑھ کے۔ تنویر ریاض کی آستین کا سانپ بہترین تحریر تھی۔ خصوصاً اختتام چونکا دینے والا تھا۔ عکس فاطمہ کی گواہی کی قیمت بھی اچھی رہی، مارک نے گواہی کا فائدہ اٹھایا اور خود کی جان بچالی۔ انگارے میں پہنچے تو وہاں انگارے نہیں خون کے شرارے ابل پڑے۔ آہ انیق چلا گیا دل ماننے کو تیار نہیں کہ وہ ہنس مکھ سو بر تھوڑا بے وقوف سالٹر کا زیرِ زمین چلا گیا۔ وہ اپنوں کے ہاتھوں مرا پر استعمال اسے دشمن کر گیا۔ ہاناوانی نے بہت بڑا زخم لگایا ہے داؤد بھاؤ، شاہی اور سجاول کو۔ انجام وانی کا بھی برا ہونا ہے۔ 15 روزے کو میرا ایک پڑوسی سحری کرنے گھر آ رہا تھا شاپ سے کہ راستے میں ڈکیتی کے دوران مزاحمت پر جسم میں تین گولیاں اتار کر 25 سالہ نوجوان کو تہِ خاک پہنچا دیا۔ آہ کیسا ظلم ہے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے، لاقانونیت نظر آئی، خیبر پختونخواہ میں بھی۔ تمکین رضا کی دوڑ نے دکھی کر دیا۔ ہوس کی دنیا نے مستقبل کا ایک ہیرا ضائع کر دیا۔ منظر امام کی رقیبِ محبت کیا عمدہ تحریر تھی۔ تایا نے چونا لگا دیا۔ سرور اکرام کی زندگی کے رنگ بہت پیاری تحریر تھی۔ ماہرہ نے بہادری کا مظاہرہ کیا اور اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ آوارہ گرد بھی سنسنی خیز رہی جہاں روڈلف زندگی کی بازی ہار گیا۔ ساتھ میں ڈاکٹر حماد بھی، اس مہینے تو بس موت ہی موت چھائی نظر آتی ہے۔ شہزی کافی مشکلات میں پھنس چکا ہے۔ جمال دستی کی لباس کی چوری بھی نسبتاً اچھی رہی جہاں جی بھر کے خون خرابا ہوا، ایک لباس کے لیے۔ اعتراز سلیم وسلی کی دوسری شرط بھی اچھی رہی پر اپنا رنگ صحیح طور پر نہ جما سکی۔ کبیر عباسی کی مسیحا کچھ بہتر رہی کہ روشان کا کردار کچھ اچھا نہیں رہا مگر اب وہ اچھا کام کر رہا ہے۔ تمام عالم کے مسلمانوں کو روزے اور عید بہت بہت مبارک ہو۔''

نارووال سے سید ذیشان حیدر کاظمی کی التجا ''گرما گرم آگ برساتے جون کا ٹائٹل ٹھنڈے ٹھنڈے رنگوں سے سجا کر آپ نے آنکھوں کو بہت سکون بخشا۔ آئندہ بھی ایسی غضب ناک گرمی سے وقتی ریلیف کے لیے ایسے ہی ٹائٹل دیتے رہا کریں۔ خون آلود لاش پولیس افسر کے اپنے کسی رشتے دار ہی کی محسوس ہوئی۔ فائنل اندازہ بعد میں لگانے کا فیصلہ کر کے چٹپٹی نکتہ چینی میں چھلانگ لگا دی جہاں ڈائجسٹ کے صفحات میں کمی کا بم گرایا تھا۔ آپ ڈائجسٹ کی قیمت سو روپیہ کر دیں لیکن صفحات کم نہ کریں۔ راولپنڈی سے عاصم شہزاد کے اعتراضات نے خدشات کا تاثر زیادہ دیا۔ ایم اقبال کے لیے دل سے دعا ہے کہ انہیں قید سے رہائی نصیب ہو۔ عائشہ مرزا کے تبصرے میں نکتہ چینیوں کے لیے مکھن کا تناسب زیادہ تھا۔ محمد صفدر معاویہ کو پاپا بننے کی بدھائی۔ منشی محمد عزیز میئے کا سُرور محسوس کر کے اگلے تبصرے نے تاسف میں مبتلا کر دیا۔ فیصل آبادی آل راؤنڈرز کی جوڑی نے بھی بڑے عرصہ بعد انٹری دی۔ آتے جاتے رہا کرو بھائیو! آپ سمیت ایک دو افراد ہی تو اور ایسے ہیں جن سے پرانی اور خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی اور اگلے کئی دن تک اس کے ٹرانس سے باہر ہی نہ نکل سکا۔ کوئی اور کہانی پڑھنے کے لیے ڈائجسٹ اٹھاتے ہی انگلیاں بے اختیار صفحہ چورانوے کھول لیتیں۔ بارش، طوفان، امراجوں کی ریاست سے نکلتے وقت لڑائی، انیق کا زخمی وجود لے کر اسپتال کی طرف بھاگ دوڑ، ڈرافٹس پڑھنے کے بعد اس کی موت، تدفین کے مناظر اور پھر سجاول سیالکوٹی کے ردِعمل نے تو جیسے کوئی تھری ڈی فلم چلا دی تھی۔ سب کچھ آنکھوں کے سامنے حقیقت میں ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ مغل صاحب! آپ کا کوئی جوڑ نہیں۔ دوسری کہانی اعتراز سلیم وسلی کی پڑھی۔ دوسری شرط نے آغاز میں بہت دلچسپی کا سامان پیدا کیا پھر دھیرے دھیرے کہانی کی گتھیاں خود بخود ذہن میں سلجھتی چلی گئیں۔ دوسرا رنگ جمانے کے لیے کبیر عباسی کافی عرصہ بعد نظر آئے۔ کبیر عباسی ہر موڑ پر کسی نہ کسی انداز میں قارئین کو چونکا دیا کرتے ہیں۔ اختتام پہ کہانی ذرا جلد سمیٹ دی گئی اس لیے ہلکی سی تشنگی محسوس ہوئی۔ مختصر کہانیوں میں رقیبِ محبت، زندگی کے رنگ اور دوڑ پڑھ لی ہیں۔ اپنی اپنی جگہ تینوں بہترین تھیں۔ آئینِ وفا امجد رئیس کے قلم سے برآمد ہوئی۔ ایک اور شاہکار تخلیق ثابت ہوئی۔ اس بار کہانی میں رومان کا عنصر کافی بے احتیاط نظر آیا۔ اس کے علاوہ اندازِ پیشکش بہترین رہا۔ آخر میں ایک بار پھر یہی التجا کروں گا کہ ڈائجسٹ کے صفحات کم نہ کریں۔''

کراچی سے محمد اقبال کی آمد ''موسمِ گرما کی گرمی ایک طرف، جاسوسی سے ہماری محبت ایک طرف۔ چلچلاتی گرمی کی پروا کیے بغیر بک اسٹال کے چکر لگاتے رہے اور بالآخر تیسرے چکر میں جاسوسی ہمارے ہاتھ میں تھا اور بے اختیار ٹائٹل، فہرست، اداریہ، چٹپٹی نکتہ چینی سب کو کراس کرتے ہوئے پہنچے سیدھے طاہر جاوید مغل کے بچھائے انگارے پڑھنے کہ آیا اب کیا ہو رہا ہے اس میں۔ جیسا کہ میں نے اپنے پچھلے خط میں اظہار کیا تھا کہ انیق کو ٹرانس میں لیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ یہ سب کر رہا تھا۔ گزشتہ قسط میں یہ بات کنفرم ہو گئی اور ٹرانس میں لیے جانے کی وجہ سے انیق اپنی زندگی کی بازی ہار گیا اور اپنے بہترین دوستوں کو رنجیدہ کر گیا۔ اس کی معصوم اور بے ساختہ شرارتیں تادیر یاد رہیں گی۔ اب مجھے لگتا ہے کہ شاہ زیب سے زیادہ سجاول اور داؤد بھاؤ اس جادوگرنی ہاناوانی کی درگت بنائیں گے۔ داؤد بھاؤ کا کردار ابھی تک کم کم ہی ایکشن میں نظر آیا ہے۔ اس کے بعد امجد رئیس کی آئینِ وفا پڑھی۔ حسبِ روایت بہترین کہانی تھی جس میں سب کچھ تھا، سسپنس، رومانس، ایکشن غرض یہ کہ عمدہ کہانی تھی۔ عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد پڑھی۔ بھٹی صاحب اب شہزی کو جلد امریکا پہنچا کر ایکشن میں آنے دیں، تاکہ کہانی آگے بڑھے۔ فی الحال اتنا ہی ڈائجسٹ پڑھا ہے۔ دیگر دوستوں سے معذرت کہ اپنی محفل میں گھسے ہی نہیں۔ آخر میں التماس ہے کہ ڈائجسٹ کے صفحات کم نہ کریں بہت مہربانی ہوگی بے شک قیمت میں اضافہ کر دیں۔''

چشمہ بیراج سے ساگر نلوکر کی سیرابی ''جاسوسی بروقت مل گیا۔ بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ مگر ٹائٹل دیکھ کر حیرت اور اذیت ہوئی۔ عام سے کاغذ پر عام سا سرورق ایسی تبدیلی نہ لائیں۔ اداریے میں مسائل کی نشاندہی کی گئی مگر کیا کریں حکمران طبقے کے کان پر مچھر تک نہیں کاٹتا اور ہمارا رونا بے کار جاتا ہے۔ جاسوسی کے صفحات کی کمی برداشت کر لیں گے مگر معیار کی کمی برداشت نہیں ہوگی۔ محفل میں عاصم شہزاد کو کرسی صدارت

مبارک۔ ایم اقبال سے متفق ہوں کہ ابتدائی صفحات پر انگلش کہانی نہ لگے تو بہتر ہے۔ صفدر معاویہ کو خصوصی مبارکباد۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ آئین وفا کیلی اور جورڈن کی کہانی۔ ابتدائی صفحات پر انگلش ترجمہ کہانی اتنی طویل۔ کچھ ہمارا دھیان رکھیں۔ آستین کے سانپ نے خاص متاثر نہیں کیا۔ گواہی کی قیمت گراہم سالومن نے اپنے کیے کی سزا پائی۔ ہنری کو منزل ملی خوشگوار اختتام ہوا۔ اچھا لگا۔ انگارے، طاہر جاوید مغل آپ تو سدا کے ظالم ٹھہرے ہیں۔ آپ ہماری کوئی خوشی برداشت کر ہی نہیں سکتے۔ پہلے سیف کو شرابی شاہ زیب کے ہاتھوں مروا دیا۔ اب ہمارے پیارے انیق کو سجاول جیسے گندے ڈکیت اور بدمعاش سے قتل کروا کر ہم پر ظلم عظیم کیا ہے۔ ہمیں تو شدت سے انتظار تھا کہ کب انیق سجاول کو پھڑکائے گا۔ رقیب محبت ہنستی مسکراتی اور سبق سکھاتی کہانی اچھی لگی۔ زندگی کے رنگ زبردست سبق آموز کہانی۔ ماہرہ کی ہمت اور محبت کو سلام۔ خدا ہر انسان کو ایسا دل اور جذبہ دے۔ آوارہ گرد بس رینگ رہی ہے۔ کب ختم ہوگی۔ شہزی نے کاسپاکو تو قتل کر ڈالا مگر پھر بھی مشکلات میں پھنسا ہوا ہے۔ آوارہ گرد میں اب جان نہیں رہی۔ جلد انجام بخیر کریں۔ سرورق کی پہلی کہانی دوسری شرط میں غیر ضروری رومانس اور غیر ضروری ایکشن کی بھرمار نے مایوس کیا۔ یہ کہانی سرورق کی کہانی کے قابل نہیں تھی۔ کبیر عباسی میرے پسندیدہ لکھاری ہیں۔ بہت عرصہ بعد آئے۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔ دیر سے آئے مگر حق ادا کر دیا۔ مسیحا کیا زبردست کہانی۔ روشان کی والدہ نے اس کے دل میں نفرت اور بدگمانی پالی۔ جو روشان اور دوسروں کی زندگی تباہ کر گئی۔ نیہا جیسی معصوم لڑکی کی محبت اور موت نے رُلا دیا۔ انسان بھی عجیب ہے۔ کہیں درندوں اور شیطان کو شرما دیتا ہے۔ کبھی اپنے منصب حقیقی کو پاکر فرشتوں سے افضل ٹھہرتا ہے۔ کیا خوبصورت سبق دیا۔ بہت عرصے بعد سرورق پر سپرہٹ اور بامقصد کہانی لگی۔ لکھاری اور ادارے کا شکریہ اور مبارکباد۔ اس بار کترنیں بہت پسند آئیں۔''

اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ کی حاضری ''اس بار سرورق پر خاتون کے بجائے کوئی پلاسٹک کی گڑیا تھی۔ چلیں کچھ تو تبدیلی آئی۔ باقی پولیس والے سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اس کا کام ہی تماشا دیکھنا ہوتا ہے! نکتہ چینی میں سب کی نکتہ چینی عروج پر رہی لیکن حیرت ہوتی ہے خواتین آٹے میں نمک کے برابر نمائندگی کرتی ہیں۔ عاصم شہزاد کو تبصرۂ صدارت کی مبارک باد۔ عائشہ مرزا اشفاق شاہین کو بچہ ثابت کرنے پر تلی نظر آئیں۔ منشی صاحب نے اس دفعہ شکر ہے ڈائجسٹ مکمل نہیں پڑھا۔ رانا بشیر صاحب کے تبصرے سے قلبی طور پر متفق ہوں۔ ذیشان حیدر آپ کی باتیں پڑھ کر بے تحاشا ہنسی آئی خاص کر بابر عباس کے بارے میں اور اچھا ہے ہم بچوں کو بھی پتا چل گیا کہ وہ کتنے پرانے زمانے کے ہیں۔ آئندہ ہم ادب کریں گے..... نو مذاق۔ عبد الجبار رومی، سرورق کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے آپ ہی ملا سکتے ہیں نا۔ ہمیں تو پوسٹ مارٹم کرنا ہوتا ہے! سعدیہ آپ یہ کوئٹہ کی ہواؤں پر تکیہ کرنا چھوڑ دیجیے کیونکہ سیف خوامخواہ خوشی سے کُپا بن جائیں گے! محفل میں سب سے دو دو ہاتھ کرنے کے بعد بھاگم بھاگ انگارے کی طرف دوڑے۔ مغل صاحب، آپ اتنے ظالم کیوں بن جاتے ہیں؟ اس مرتبہ تو انگاروں پر ہمیں ننگے پاؤں چلا دیا آپ نے۔ جس کردار کو دو سال سے سینت کر پروان چڑھایا اسے پلک جھپکتے مار دیا اور مروایا بھی اس جابر سجاول کے ہاتھوں!!! میں نے کبھی کسی چیز کو دو مرتبہ نہیں پڑھا لیکن یہ قسط یکے بعد دیگرے تین مرتبہ پڑھی لیکن انیق تو پھر بھی نہیں زندہ ہوا۔ داؤد بھائی اور سجاول میں سے بھی اب ایک ہی بچے گا۔ بانادانی کیا بَلی ہے؟ جا ماجی سے انیق کے گاؤں تک کیسے رسائی حاصل کی؟ منظر امام کی کہانی تو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر گئی۔ کیا عظیم تایا تھے، سبحان اللہ.....! آخری شرط نہ بتادیتے تو بھی کیا کر لیتا بیچارا احمق سے پیدل بھتیجا! دوڑ ہمارے ہاں موجود سیٹ اپ کی نشاندہی کرتی کہانی تھی۔ یہی وجوہات ہمارے ملک سے ٹیلنٹڈ کھلاڑیوں کو آگے بڑھنے سے پہلے ہی ختم کر دیتی ہیں.....! اب بات کروں رنگوں کی تو رنگوں کے نام پر مذاق ہی تھا لیکن ہم نے یہ بھی صبر کا گھونٹ پی کر پڑھ لیے.....! اعتراز سلیم وصلی کی دوسری شرط ٹھیک لگی۔ نو آموز ہونے کی وجہ سے مارجن دینا چاہیے لیکن پھر بھی یہ ضرور کہوں گی مطالعہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ کہانی کے تانے بانے اچھے بُنے اس کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی لیکن ایک بات کی تکرار سے کہانی کا حسن خراب ہو جاتا ہے۔ آفتاب کا انجام بھی نہیں دکھایا گیا۔ شیر علی کو تو سزا دے دی غنڈہ گردی سے لیکن اپنی بیوی کے ساتھ کیا کیا جو اس کی جڑ تھی؟ یا ڈھیٹ بن کر برداشت کر گیا اسے۔ امید ہے ان باتوں کا آئندہ خیال رکھا جائے گا.....! دوسرے رنگ میں مسیحا تو خود اَن گنت زخم کھائے ہوئے تھا۔ کہانی اچھی تھی لیکن کبیر عباسی سے زیادہ ایکسپکٹ کرتے ہیں ہم۔ مجموعی لحاظ سے شمارہ اچھا لگا۔''

کراچی سے ماہ رخ ارباب کی دلچسپی ''سرورق پر بنی حسینہ اپنی ایک آنکھ سے دنیا اور دوسری آنکھ سے خلا کے رموز و اسرار پر غور کرتی نظر آئی اور ذرا سی بھی قابلِ غور نہ لگی لہٰذا اسے جوں کا توں چھوڑا اور محفلِ نکتہ چیں کی جانب رخ کیا۔ جہاں گرانی کی تباہ کاریوں کے ساتھ صفحات کے کم ہونے کا مژدہ جانکاہ پڑھنے کو ملا اور افسوس کی سرد آہیں بھرتے خطوط کی جانب نگاہ کی۔ مسندِ اقتدار پر عاصم شہزاد صاحب براجمان تھے مبارکاں، بقیہ مسافران چینی نکتہ چینی کچھ اس طرح بجھے بجھے سے تھے جیسے عین افطاری سے کچھ پہلے خط لکھنا شروع کیا ہو یعنی کہ بالکل ٹن ٹن۔ شفقت محمود کی ایک سال بعد خوبصورت حاضری پسند آئی۔ سید ذیشان حیدر کاظمی، عبدالجبار رومی ساگر تکوکر اور ایمانے کے چلبلے تبصروں نے محفل میں رنگ جمائے رکھا۔ بارشوں کا ذکر کر کر کے کراچی والوں کا دل جلانے کی قسم کھائی ہوئی ایمانے زارا شاہ نے، ظالمو اللہ پوچھے گا تو اتوں۔ عبدالودود عامر بھائی کا اعتراضات اور سوالات سے بھرپور خط پڑھ کر کافی دیر سوچ میں گم رہی پھر یاد آیا آگے شمارہ بھی پڑھنا ہے۔ اپنے خط کا تین چوتھائی حصہ دیکھ کر دل خون کے آنسو رو دیا۔ امجد رئیس بہت عرصے بعد اثر نعمانی کی کمی کچھ کچھ پوری کرتے نظر آ رہے ہیں بہترین تراجم اور ہر مرتبہ زبردست قسم کے ناول کا انتخاب، مغربی تحریر میں مشرقی جذبات کی چاشنی امجد رئیس کے تراجم کا خاصہ ہے۔ تنویر ریاض کی آستین کا سانپ ہمیشہ کی طرح خوبصورت تخلیق ثابت ہوئی کہانی کی ابتدا میں لگا کہ قاتل کارلوس ہے مگر بالکل مختلف انجام کے ساتھ دلچسپ تحریر رہی۔ گواہی کی قیمت ایک عام سی کہانی دراصل اس کا نام گواہی کی نہیں بلکہ جرم کی قیمت ہونا چاہیے تھا۔ سب کے سب گواہ شریکِ جرم تھے۔ انگارے، اف یہ کیا کیا مغل صاحب نے پھر سے اپنے مداحوں کے دلوں پر اتنا بڑا چرکا۔ کاش انیق مزید

زندہ رہتا اور کہانی میں ہیرو کے قریبی عزیز کے مرنے کا کوٹا تاجور پورا کرتی تو کتنا بڑا اَپ سیٹ ہوتا، لوگ خوشی سے بھنگڑے ڈالتے مگر یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ بہرحال بہت ہی ہنگامہ خیز قسط رہی۔ دوڑ، کرپٹ سسٹم پر طنز کرتی ہوئی تحریر اب تو اس سسٹم پر اتنا طنز ہو چکا کہ یہ ڈھیٹ ہو گیا ہے۔ دوڑ پڑھ کر طبیعت پر جو بوجھل پن طاری ہوا وہ رقیبِ محبت نے کچھ کچھ زائل تو کیا مگر تایا کی حرکات کچھ ایسی زہریلی سی تھیں کہ غصے کے مارے فوراً صفحات پلٹ دیے۔ لباس کی چوری، نام پڑھ کر ایک پل کو لگا آہا نک ویلوٹ۔ مگر نک ویلوٹ نہ ہوتے ہوئے بھی اچھا خاصا انٹرٹین کر گئیں عمدہ تخلیں۔ آوارہ گرد کی جگہ اب کوئی نیا منفرد سلسلہ شروع ہونے کے شدت سے منتظر ہیں۔ دوسری شرط میں اعتزاز سلیم وصلی اپنے مخصوص تیز رفتار انداز میں ہیرو کے ہاتھوں بے ایمانوں کی لاشیں گراتے نظر آئے مگر وہی بات کے خون سے خون کے دھبے دھوئے نہیں جاتے۔ مجموعی طور پر شمارہ دلچسپ رہا۔“

اوچ شریف سے محبوب سعیدی کی دل گرفتگی ”آٹھویں کلاس سے لے کر یونیورسٹی لائف تک جاسوسی پڑھتے ہوئے یہ میرا پہلا تبصرہ ہے۔ سب سے پہلے تو انیق کی موت نے دلِ مضطر کو مزید رنجیدہ کیا۔ مغل صاحب کی کہانی پڑھتے ہوئے یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ایسی انہونی ہونی ہے جیسے ایک مشہور شعر کا مصرع ہے۔

”میں نے امکان سبھی پیشِ نظر رکھے تھے“

بہرحال ایک یادگار کریکٹر کی موت سے تاسف ہوا۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی۔ بھٹی صاحب خدا کے واسطے اب تو شہزی کو امریکا دکھا دیں بیچارہ ابھی مصر کی سیر بھی کرے گا۔ سرورق کی پہلی کہانی وصلی برادران کی تھی۔ ٹھیک ہے انہوں نے لکھنا شروع کیا ہے اچھا اسٹارٹ لیا ہے مگر افسوس ہے کہ دوسری شرط سرورق کی پہلی کہانی کی حقدار نہیں تھی۔ ایک تو انتہائی چھوٹی اور پھر مالک موری سے متاثر لگ رہی تھی امید ہے نیکسٹ ٹائم ایسی کہانی سرورق کی زینت نہیں بنے گی۔ وصلی برادران کے لیے نیک تمنائیں۔ کبیر عباسی بھائی کی کہانی ہمیشہ کی طرح سسپنس سے بھرپور تھی اور اینڈ تک اپنے سحر میں مبتلا رکھا ویل ڈن بھائی۔ امید ہے ان کی اگلی کہانیاں مری اور بالائی پاکستان کے علاقوں سے نکل کر جنوبی پنجاب اور سندھ کے پس منظر پر بھی ہمیں ملیں گی ان شاء اللہ۔ ترجمہ شدہ کہانیاں ہمیشہ کی طرح بہترین تھیں صفحات کی کمی نے دلِ امید توڑا مگر ادارے کی بھی مجبوریاں ہیں وقت کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی بہتری نکل آئے گی ان شاء اللہ۔“

داؤد خیل سے محمد سجاول خان کی آمد ”پہلے تو اتنے دنوں محفل سے غیر حاضری پر معذرت! اصل میں میرے امتحانات شروع ہو گئے تھے اور جاسوسی پڑھنے کا وقت نہیں مل پاتا اور پڑھے بغیر تبصرہ کرنا میری طبیعت کو گوارا نہیں تھا۔ تپتی گرمی میں جاسوسی ایک خوشگوار ہوا کے جھونکے کی طرح ملا۔ ذاکر انکل کی طبیعت کی خرابی کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ پاک انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ اسی لیے اس بار ٹائٹل پر کوئی تبصرہ نہیں۔ رسالہ کھولتے ہی ہم سیدھے محفلِ خطوط کی جانب بڑھے جہاں بہت سے دوست اپنے جاندار تبصروں سے محفل کو چار چاند لگا رہے تھے۔ کرسیِ صدارت عاصم شہزاد نے سنبھال رکھی تھی۔ اچھا تبصرہ تھا۔ عائشہ مرزا کا تیز طرار تبصرہ اور نشی عزیز کا خوبصورت تبصرہ پڑھا۔ محمد صفدر کو بیٹے کی پیدائش کی ڈھیروں مبارکباد۔ تفسیر عباس صاحب کا تبصرہ اس بار بہت مختصر تھا۔ شعیب اور سیف کا مجموعی تبصرہ بڑا مفصل اور خوبصورت تھا۔ شفقت صاحب بھی سال بعد محفل میں حاضری لگاتے نظر آئے۔ ذیشان حیدر اور عبدالجبار بھی کہانیوں کا آپریشن کرتے نظر آئے۔ ایمانے شاہ بھی سب کی ٹانگیں کھینچنے میں مصروف تھیں۔ ساگر تلوکر، سعدیہ قادری، عبدالودود اور عاصم جٹ بھی لڈیاں ڈالتے نظر آئے اور آخر میں ماہ رخ ارباب اپنی پسند ناپسند سے ادارے کو آگاہی دیتی رہیں جو کہ ایک حد تک درست بھی تھیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے منظر امام کی مختصر کہانی رقیبِ محبت کی جانب بڑھے۔ مزاحیہ کرداروں سے بھی ایک ہلکی پھلکی کہانی۔ آگے بڑھے تو عکس فاطمہ گواہی کی قیمت ادا کرتے ہوئے پائی گئیں۔ اگلے موڑ پر تمکین رضا دوڑ لگا رہے تھے۔ دیسی کرداروں سے بھی ایک خوبصورت کہانی۔ اعتزاز وصلی کو سرورق کے رنگوں میں انٹری مارنے پر مبارکباد۔ کہانی نے شروع سے ہی اپنی گرفت میں لے لیا۔ رواں انداز اور بہترین اسٹوری لائن کے ساتھ وصلی کی یہ اب تک کی سب سے بہترین پیشکش تھی۔ کبیر عباسی نے بھی کافی عرصہ بعد مسیحا بن کر انٹری ماری۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو آشکار کرتی ایک منفرد کہانی۔ جس میں ایک نوجوان زندگی کے تلاطم میں اپنے آپ کو بچا رہا ہے۔ محبت اور نفرت کے تجربات سے گندھی ایک بہترین کاوش۔ کترنیں اور اقتباسات بھی بہترین تھے۔“

راولپنڈی سے عاصم شہزاد کی مصروفیت ”اس ماہ کا جاسوسی 7 جون کو ہاتھ لگا۔ باعث مصروفیت صرف چند کہانیوں پر ہی تبصرہ کر سکوں گا۔ محفل میں خود کو صدارت کی کرسی پر براجمان پایا تو شادیِ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ادارے کے لیے دل سے دعا نکلی، اسی کیفیت کے زیرِ اثر سفرِ جاسوسی شروع کیا۔ آئینِ وفا، واقعات، اتفاق، جذبات، احساسات، بے قراری کی ڈگر پر چلتی تحریر میں ایکشن کم اور جذبہ زیادہ۔ جورڈن اور کیلی کی کیمسٹری دلچسپ و رنگین تھی۔ اور ان کے انتہائی لمحوں کی منظر نگاری کے لیے مصنف نے دلچسپ ترین الفاظ کا انتخاب کیا۔ وکٹر ویلڈن نے حیرت زدہ کیا۔ بے اختیار منہ سے نکلا یہ عمر اور یہ جذبے۔ خواہشات کا بوجھ اٹھائے دولت کے پیچھے دوڑتے سائمن کا انجام متوقع تھا اور ہم جذبات میں بہتے دو انسانوں کو ان کے حال پہ چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ آستین کا سانپ، جرم کی دنیا کے پس منظر میں سیدھے سادے طریقے سے آگے بڑھتی تحریر کا انجام بالکل غیر متوقع تھا۔ انگارے، اس بار تو مغل صاحب نے واقعی انگارے برسا دیے۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود گلو شہزادہ لقمہ اجل بن ہی گیا۔ ہر اختیار کے باوجود کبھی کبھی انسان کتنا بے اختیار ہو جاتا ہے۔ یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ خیر ہم نے بھی آنسو پونچھے اور شاہ زیب کو متوقع ہنگاموں کی سوچ میں غلطاں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا لاڈلا ایک بار پھر ایکشن میں نظر آیا گزشتہ قسط کی نسبت یہ قسط تیز ترین تھی۔ روڈلف کی موت نے غمزدہ کیا۔ ہزاروں فٹ کی بلندی پر شہزی کا کوہارا سے سامنا حیرت کا باعث بنا۔ مصر یا کیلیفورنیا یا پھر کریش...... آئندہ کی قسط میں مزید دلچسپی کی امید لیے آگے بڑھ گئے۔ لباس کی

چوری زیادہ متاثر کن نہ رہی۔ اعتزاز کو رنگوں میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ دوسری شرط جرم، بے چارگی اور تھوڑے بہت سسپنس کے دوش پہ آگے بڑھتی تحریر ہے سرورق کا بالکل تیکھا رنگ تھی۔''

ہری پور سے شاہد ذوالفقار کی بددلی ''رمضان میں ہوٹل بند ہوتا ہے اس لیے فل ٹائم فرصت تھی۔ ایسے میں جاسوسی کا انتظار بھی حد سے زیادہ تھا۔ آخر اللہ اللہ کر کے انتیس تاریخ کو جاسوسی نے اپنے درشن کرا ہی دیے۔ ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی سرورق کا پوسٹ مارٹم کرنے میں مشغول ہو گیا۔ سرورق کی حسینہ جس کا نام دوسرے رنگ سے نیہا معلوم ہوا پورے طمطراق سے سرورق پر براجمان تھی۔ اس کے ڈائی کیے ہوئے بال اس کی سب سے خاص بات تھی۔ اس کی بلوری آنکھوں میں انوکھی کشش تھی۔ دل تو کر رہا تھا ادھر ہی ڈبکیاں لگا کہ اس کی آنکھوں میں غوطہ زن ہو جاؤں مگر رمضان کا احترام غالب آ گیا اور بمشکل میں نے اس سے نظریں ہٹائیں۔ اوپر روشان کا پستول والا ہاتھ نظر آ رہا تھا جس سے نکلی گولی نیہا کے سر میں پیوست ہوئی اور نیچے نیہا خطرناک سے پوز میں لیٹ گئی۔ اس کے نیچے خون نہ نظر آتا تو میں اس کے پوز کی حشر سامانیوں میں گم ہو جاتا مگر خون دیکھ کر نظریں ہٹا لینے میں ہی عافیت جانی۔ ساتھ ایک پولیس والے صاحب شرافت سے شاید نیہا کا ہی معائنہ کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور سیدھا فہرست میں پہنچا۔ فہرست میں کافی عرصے بعد کبیر بھائی کا رنگ دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اعتزاز بھائی کا پہلا رنگ بھی خوشی دے گیا مگر ابتدائی صفحات پر انگلش کہانی دیکھ کر منہ بن گیا۔ خیر سب ہی میری مرضی کا تو نہیں ہو سکتا ناں۔ یہی سوچ کر دل کو تسلی دی اور تبصروں کی محفل میں چھلانگ لگا دی۔ اداریے میں صفحات کم ہونے کی خبر موجود تھی۔ مجھے تو خیر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ صفحات کم ہونے سے انگلش کہانیاں کم ہوں گی جو میں ویسے بھی پڑھتا ہی نہیں۔ عاصم شہزاد نے شاید پہلی بار تبصرہ لکھا اور پہلی بار ہی پہلے نمبر پر آ گیا۔ اچھا تبصرہ تھا۔ ڈھیر ساری مبارکباد۔ ایم اقبال، شعیب رؤف اور سیف رؤف نے میری تجویز کے حق میں ووٹ دیا کہ ابتدائی صفحات پر انگلش کہانی نہیں ہونی چاہیے۔ امید ہے آپ لوگ اب میری درخواست پر ضرور غور کریں گے۔ باقی جن لوگوں کو میرا تبصرہ پسند آیا ان کا بہت بہت شکریہ اور جنہوں نے میرا ذکر نہیں کیا انہیں اللہ پوچھے گا۔ تفسیر بھائی کا تبصرہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی مگر وہ تو کہتے ہیں انہوں نے تبصرہ لکھا ہی نہیں تھا۔ کیا یہ کوئی اور تفسیر عباس ہیں؟ عبدالودود عامر کا تبصرہ سب سے اچھا لگا۔ ان کے علاوہ ایمانے زارا، صفدر معاویہ، شفقت محمود، ذیشان حیدر، عبدالجبار اور ماہ رخ ارباب کے تبصرے زیادہ پسند آئے۔ کہانیوں کی باری آئی تو سب سے پہلے انگارے ہاتھ میں لیے کہ فیس بک پر بھی ہر کوئی انگارے انگارے کر رہا تھا۔ انگارے میں انیق کی موت نے دل اداس کر دیا۔ بہت شاندار قسط رہی بس ایک چیز بری لگی کہ داؤد بھاؤ جیسے گینگسٹر کو کیا کوئی اور کام نہیں کہ وہ تاجور کے متعلق معلومات جمع کرتا رہتا ہے۔ آوارہ گرد کے ساتھ بنا اسکیچ بہت خوبصورت ہے میں اکثر فارغ وقت میں اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ آوارہ گرد کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں نت نئے الفاظ پڑھنے کو ملتے ہیں۔ جیسے اس کی باتیں مجھے کدیڑنے لگیں۔ کھٹر پٹر کی آوازیں اور گولی چھاؤ کر کے گزر گئی وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس کہانی میں جملے ایسے ہوتے ہیں جیسے میں ششم کلاس میں کہانی لکھتے ہوئے بنایا کرتا تھا۔ کہانی تو میں پوری ٹھیک لکھتا تھا مگر ایسے جملوں کی وجہ سے مجھے ٹیچر دو تین نمبر ہی دیا کرتے تھے۔ خیر آوارہ گرد میں ایک بات بہت اچھی لگی کہ اس کے صفحے بس پچیس چھبیس ہی تھے۔ اعتزاز بھائی کے پہلے رنگ میں صفحے پندرہ تھے مگر یہ بات مجھے بہت بری لگی ایک تو سرورق کی کہانی اتنی چھوٹی ہوتی نہیں اور دوسرا کہانی مزے کی ہو تو کم صفحے برے لگتے ہیں۔ اعتزاز بھائی کو پہلی بار رنگ کی اشاعت پر مبارک ہو۔ کہانی ایکشن اور تجسس سے بھرپور تھی، مزہ آیا پڑھ کے۔ آخری صفحے پر دو جھٹکے لگے ایک تو ایک دم ختم ہونے والا اور دوسرا پولیس والے کا حمنہ کا باپ ہونا۔ رانا اشفاق اور داراب جیسے لوگوں کی حرکتیں دیکھ کر بے پناہ نفرت محسوس ہوئی۔ ایسے لوگوں نے ہی ہمارا معاشرہ تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کا انجام پڑھ کے دل کو سکون ملا۔ کاش حقیقت میں بھی ان کو کوئی ایسے انجام سے دوچار کرے۔ دوسرا رنگ کبیر بھائی نے لکھا اور کیا خوب لکھا۔ محبت نفرت اور جرم سے گندھی یہ سبق آموز تحریر مدتوں یاد رہے گی۔ نیہا کی موت نے بہت دکھی کیا۔ آخری پیراگراف بہت سبق آموز تھا۔ واقعی جرم تب پھیلتا ہے جب معاشرے میں محبت کی جگہ نفرت عام ہو جائے۔ کبیر بھائی کی کہانیوں کی سب سے خاص بات یہی لگتی ہے کہ ایک تو ان میں کوئی نہ کوئی سبق ضرور ہوتا ہے اور دوسرا تجسس بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بندہ سوچ رہا کچھ اور ہوتا ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔ کبیر بھائی سے گزارش ہے کہ جلد کیس سیریز کا اگلا کیس لکھیں۔ کافی عرصہ ہو گیا وہ پڑھے۔ منظر امام کی رقیب محبت بس ٹھیک ہی تھی البتہ سرور اکرام کی زندگی کے رنگ بہت اچھی کہانی تھی۔ اس بار فرصت تھی اس لیے انگلش کہانیوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے کا سوچا۔ سب سے پہلے لباس کی چوری پڑھنا شروع کی۔ شروع میں تو مزے کی لگی مگر آگے جا کے اتنی بور ہو گئی کہ بمشکل تین چار صفحے ہی پڑھ سکا۔ اس کہانی نے اتنا دل کھٹا کیا کہ باقی انگلش کہانیاں پڑھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔''

کوئٹہ سے سیف خان کے تبصرے ''اس بار فہرست میں امجد رئیس کا نام ابتدائی صفحات پہ نظر آیا تو کچے پکے سرورق اور کم صفحات پہ کیے جانے والے سارے شکوے ذہن سے اڑنے لگے۔ محفل کے نکڑ پہ بیٹھے عاصم شہزاد ہماری طرح تاجور سے نالاں نظر آئے۔ انہیں اول آنے پہ مبارکباد تھمائی اور ساتھ ہی ٹن پڑے ایم اقبال کی ٹانگ کھینچی جو تاجور کی جدائی میں کچھ زیادہ ہی دبلے پتلے ہو رہے تھے۔ اقبال میاں ڈریں اس وقت سے جب مغل صاحب اس منحوس ہیروئن کا پتا ہی صاف کر دیں گے۔ عائشہ مرزا، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی آپ ابھی تک شاعر اور شاعری کے گرداب میں پھنسی ڈبکیاں کھا رہی ہیں۔ صفدر معاویہ کو بیٹے کی ولادت بہت بہت مبارک ہو اور سرورق اب ذاکر انکل نے بنانے چھوڑ دیے ہیں۔ انیق کے بارے میں آپ کا اندازہ کتنا درست نکلا۔ تفسیر عباس بابر صاحب کا نام دیکھا تو حیرت سے اچھل پڑے۔ شفقت بیٹا، شاہی نے

سکھ چین امن امان کی زندگی بسر کرنی شروع کی تو انگارے کا کریا کرم ہو جائے گا۔ سید ذیشان حیدر کاظمی کا ناپا تلا تبصرہ گردے کو چھو گیا۔ بے ایمانے کا تبصرہ ان کی ناک کی طرح چھوٹا موٹا گول مٹول ہی رہا اور پلیز یہ بچ بچی نظروں سے مجھے تاں دیکھا کریں، بقول شاعر مری چیخیں نکل جاتی ہیں۔ پچھلی مرتبہ اول آنے پہ سعدیہ قادری کے تو اس بار بھی گھی...... دانت ہی دانت نکل رہے تھے۔ عبدالودود، ناک کو ناک سے راہ ہوتی ہے اس لیے مومنہ کشف میری ناک کا احوال ٹنڈو الا یار میں بھی بیٹھ کر بتا سکتی ہیں۔ محفل کی آخری پنچ پہ ماہ رخ ارباب بیٹھی سب کو تاڑ رہی تھیں۔ انہیں جوابی طور تاڑا اور کہانیوں کی اور ہو لیے۔ انگارے کی حالیہ قسط نے کم و بیش ہر قاری کو افسردہ کر دیا ہے۔ گزشتہ دو تین اقساط سے انیق پہ جو غصہ چلا آ رہا تھا وہ ایکدم سے حیرت، افسوس اور پھر ماتم میں بدل گیا۔ اگرچہ کہانی میں فخر زمان اور رضوان نی کی انٹری ہو چکی ہے لیکن انیق کی جگہ شاید ہی کوئی لے پائے گا۔ مغل صاحب ہمیشہ ہیرو سے زیادہ سائڈ ہیرو کی شخصیت کہانی میں ابھارتے ہیں لیکن پھر اسے ہی تکپٹ کر دیتے ہیں۔ یوں قارئین ایک لمبے عرصے تک اس کردار کے ٹرانس سے نکل نہیں پاتے۔ انیق کے سین نے عمران کا غم کتنا تازہ کر دیا ہے۔ اس قسط میں داؤد بھاؤ کا ایک چھوٹا سا انکشاف بھی شامل ہے جسے پڑھ کر زیرک قارئین نے ضرور منہ بنایا ہوگا کہ نکے وارا ب کا نچلا دھڑا ایکسیڈنٹ کی پاداش میں کام ہی نہیں کر رہا، مطلب ایک بار پھر تاجور کے لیے شاہ زیب کی راہ ہموار کی جا رہی ہے۔ ٹیکساری گینگ کی قاتل مشینوں کے ساتھ شاہ زیب کا ٹاکرا کہانی کا کلائمیکس ثابت ہوا۔ ایکشن کے اس سیکشن کو مزید پھیلایا جا سکتا تھا، عجیب اور خونخوار ولنز کے بارے میں پڑھ کر سنسنی انتہا کو چھونے لگتی لیکن مغل صاحب گھما پھرا کر قارئین کو واپس میسنی تاجور کے پاس لے آتے اور ہمارے پاس منہ بنانے کے سوا کچھ بچتا ہی نہیں۔ (آپ کو ایسی کیا تکلیف پہنچی ہے تاجور سے؟) مئی کی قسط پڑھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ کہانی سمیٹی جا رہی ہے۔ لیکن جون کی قسط نے انگارے مزید دہکا دیے۔ نئے ولنز سامنے آ گئے اور کہانی نے ایک نہیں کئی موڑ لیے۔ اب اس کا حجم مجھے مزید پھیلتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ (یہ بتائیں کہ آپ خوش ہیں یا ناخوش؟) ان تمام باتوں سے قطع نظر، مغل صاحب کی تحریر ان کا اسلوب لفظوں کی چاشنی قاری کو جکڑے رکھتی ہے۔ آوارہ گرد میں بھی بھٹی صاحب نے روڈلف کی صورت قارئین کو جھٹکا دے دیا دیسے روڈلف کے مرنے کے بعد کے سین عاشقی معشوقی کی نذر ہو گئے ورنہ شہزی کے جذبات و کیفیات بیان کر کے اچھا خاصا سماں باندھا جا سکتا تھا۔ گزشتہ کئی اقساط پڑھتے سے یہی خیال رہتا ہے کہ ایک اچھے موضوع کے ساتھ زیادتی برتی جا رہی ہے۔ اب شہزی کو یقیناً زبردستی مصر پہنچانا ہے اور اس لیے طیارہ پوری دنیا کا چکر کاٹ کر جا رہا ہے ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ منیلا سے کیلیفورنیا کے لیے فلائٹس بحرالکاہل کے اوپر سے جاتی ہیں۔ پچاس اقساط کی عمر تک پہنچنے کے باوجود بھی کہانی اس مقام تک نہیں پہنچ پائی جس پہ سرکش...... شکاری، مداری، آتش فشاں یا حتیٰ کہ بھٹی صاحب کا اپنا سلسلہ وار خارزار ہوا کرتا تھا۔ آئینِ وفا...... پورا ناول سانس روکے پڑھتا رہا۔ خطرناک حالات کے مدوجزر میں کیلی اور جورڈن کی پختہ محبت نے خوف و سرور کا عجیب امتزاج بنائے رکھا۔ کشمیر آئی سے نکلی بات زمیں سے فضا میں مار گرانے والے میزائل کرافٹس پہ ختم ہوئی...... امجد صاحب نے ہمیشہ کی طرح توقعات سے بڑھ کر خوبصورت ناول پیش کیا۔ ویلڈن! اعتزاز سلیم کی ننھی منھی دوسری شرط نے علی شیر کی جان ہی لے لی۔ بطور رنگ پہلی کہانی کی اشاعت پہ مبارکباد۔ تحریر میں جزئیات پہ لازمی توجہ دیا کریں، چھوٹے نکات کی صراحت کہانی کو بہت زیادہ حسن دیتا ہے۔ کبیر عباسی کا نام طویل عرصہ بعد مسیحا کے روپ میں نظر آیا۔ ان کی کہانی شمارے کی تیسری بہترین کہانی قرار دی جا سکتی ہے۔ روشان کا دلفدار ماضی پڑھتے ہوئے کتنے ہی حقیقی کردار نظروں کے سامنے گھوم گئے جنہوں نے غصے، جذبات اور اندھے انتقام میں ایسے اقدام اٹھا لیے جن کی خلش ساری زندگی انہیں پچھتاوے کی آگ میں جھلساتی رہی۔ کلائمیکس اگرچہ کچھ زیادہ ہی اتفاقات کا شکار رہا تاہم مجموعی طور پر کہانی اچھا تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہی۔ تنویر ریاض کی، کافی کلر کی گہری آنکھیں آستین کا سانپ ثابت ہوئیں۔ کہانی کے عنوان نے نینا کو پہلی نظر میں ہی مشکوک بنا دیا۔ منظر امام کے رقیب محبت ان کے تایا زاد ہی نکلے۔ ہلکی پھلکی تحریر رہی لیکن مختصر کہانیوں میں تمکین رضا کی دوڑ نے دل کو چھو لیا۔ جوئے کی آگ کس طرح کھیل کے میدان میں حقیقی ٹیلنٹ کو خاکستر کر رہی ہے، اس کا اندازہ سلیم کے انجام کو پڑھ کر بخوبی ہو جاتا ہے۔ آخر میں فرزانہ کا ذکر اگرچہ تشنہ رہا۔ لباس کی چوری تیز رفتار کہانی ثابت ہوئی، ڈیشا کی دلیری نے اختتام میں رنگ بھر دیے۔ مجموعی طور پر پورا شمارہ بہترین رہا۔"

قبولہ شریف سے فیصل مشتاق کا اشتیاق "جاسوسی ڈائجسٹ کا عرصہ دراز سے فین ہوں۔ جاسوسی کی کہانیاں ہمیشہ نمبر ون ہوتی ہیں اور کہانی مختلف پہلو اور مطلب سمیٹے ہوتی ہے۔ سنسنی خیز اور دلچسپ کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں جاسوسی کا تعارف کچھ یوں ہوا کہ میں بک اسٹال سے کچھ رسالے خریدتا تھا ایک مرتبہ مطلوبہ رسالہ نہ ملا۔ میں نے خوبصورت سرورق والے جاسوسی پر نگاہ دوڑائی اور پھر کیا تھا جاسوسی خرید لیا، وہ دن اور آج کا دن جاسوسی سے بے پناہ محبت ہے۔ اب خط لکھنے کی جسارت بھی پہلی بار کر رہا ہوں۔ امید ہو شائع ہوگا۔ جون کا ڈائجسٹ جلد موصول ہو گیا۔ سرورق اچھا تھا ایک طرف لڑکی کی تصویر تھی تو دوسری طرف نیچے اس کی خون میں لت پت لاش تھی۔ پولیس والا بھی شاید تفتیشی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا تمام کہانیاں سنسنی خیز اور دلچسپ تھی خاص کر دوڑ اور رقیب محبت مجھے بہت پسند آئیں۔ دوڑ میں بے چارے سلیم کے ساتھ بہت ہی برا ہوا۔ آخر کار بدلے کی آگ جیت گئی اور سلیم بھی معذور ہو گیا اپنے باپ کی طرح اب اسے بھی ساری عمر معذوری میں گزارنا تھی۔ اب وہ کبھی نہیں دوڑ سکتا تھا اس کے علاوہ زندگی کے رنگ، لباس کی چوری، مسیحا، انگارے اور دیگر تمام کہانیاں اپنی عمدگی کی مثال آپ تھیں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

حسنین عباس، کمیل عباس، کھاریاں۔ آصفہ شکیل، سکھر۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ حنا کاشف، کوٹری۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔ وقار احمد، میرپور خاص۔ ایاز خان، پشاور۔ جاذب جاوید، کراچی۔

کاغذی پیرہن

ایچ اقبال

ہر ملک ہر قوم کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے ملک کے فیصلے کرنے والے حکمرانوں کا انتخاب کریں... ایسے حکمران جو ملک و عوام دونوں کے لیے مفاد پرست ثابت ہوں... الیکشن آتے ہیں اور ہو بھی جاتے ہیں... ووٹرز بھی اسی فرسودہ تناظر میں سوچتے ہیں اور دیکھتے ہیں... نہ پیمانے بدلتے ہیں... نہ سوچ اور نہ ہی فکر... کاش کہ دیکھنے اور پرکھنے کے زاویے یکسر تبدیل ہو جائیں... مثبت سوچیں... دیانت دار... ایماندار منصف اس ملک کے لیے ناگزیر ہو جائیں... الیکشن کی اسی گھما گھمی سے تعلق رکھتی کہانی کے نشیب و فراز... جہاں اُمیدوار ہر صورت الیکشن میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑنا چاہتے ہیں... چاہے اس کے لیے کتنی ہی رکاوٹوں کو ہٹانا پڑ جائے... سیاست کے میدانِ کارزار سے محبت کے مرغزاروں میں داخل ہوتی خوب صورت کہانی...

کاغذی پیرہن میں چھپی ناکام فتوحات کا سنسنی خیز احوال

صوفیہ نے آکسفرڈ سے پولیٹیکل سائنس پڑھنے کے بعد جب اپنے وطن کا رخ کرنے کے لیے جہاز کی سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھا، اس وقت بھی پورا ماضی اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ جب تک آکسفرڈ میں زیرِ تعلیم رہی، واٹس ایپ پر روزانہ ہی طالش سے بات چیت کیے بغیر اسے چین نہیں آتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو شدت سے چاہتے تھے۔ اپنے وطن میں دونوں ایک ہی کالج میں تھے۔ انہوں نے تعلیم کے اختتام پر شادی کرنے کا فیصلہ بھی کرلیا تھا لیکن جب صوفیہ کے والد آصف خاں نے اسے آکسفرڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا تو وہ انکار نہیں کر سکی۔ انکار نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ خود اسے بھی سیاست سے دلچسپی تھی اور اس کے والد تو ایک پرانے سیاست داں تھے۔ دو مرتبہ قومی اسمبلی کا انتخاب بھی جیت چکے تھے اور تیسری بار بھی جیت جاتے اگر انہیں ایک ایسی بیماری نے نہ گھیر لیا ہوتا جس کے لیے انہیں خاصے طویل عرصے کے لیے 'بیڈ ریسٹ' کرنا پڑا۔ بہرحال اس بار بھی ان کی 'لبرل ڈیموکریٹک پارٹی' کے انیس افراد انتخاب لڑ کر قومی اسمبلی میں پہنچ گئے تھے۔

لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ آصف خاں ہی تھے جنہوں نے کچھ لوگوں کے ساتھ یہ پارٹی دو انتخابات سے پہلے بنائی تھی۔ پہلے انتخابات میں وہ اور



پارٹی کے چار افراد کامیاب ہو سکے تھے۔ دوسرے انتخابات میں تعداد گیارہ ہوگئی۔ آصف خاں اپنی جدوجہد کو تیز سے تیز تر کرتے رہے۔ تیسرے انتخابات میں وہ بیماری کی وجہ سے حصہ نہیں لے سکے لیکن ان کی پارٹی کے انیس افراد منتخب ہو گئے تھے۔ آصف خاں کا خیال تھا کہ اگر وہ بیماری کی وجہ سے غیر فعال نہ ہو گئے ہوتے تو کامیابی زیادہ ہوتی۔ اب تیسرے اور چوتھے انتخابات کے درمیانی عرصے میں آصف خاں نے پارٹی کو یکا یک بہت زیادہ مقبول بنا دیا۔ اب عمومی خیال یہ تھا کہ حکومت لبرل ڈیموکریٹک پارٹی ہی بنا سکے گی۔ اس کے مقابلے پر دوسری پارٹی پیپلز اسٹیٹ تھی جس کا سربراہ واجد امیر تھا۔ اس کے بارے میں بھی یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ حکومت وہ بنائے گی۔ گویا دیگر پارٹیوں کو چھوڑ کر صرف یہ دو پارٹیاں تھیں جن کا مقابلہ بہت زوردار ہوتا۔

آکسفرڈ میں تعلیم کے دوران میں صوفیہ ان خبروں سے خوش ہوتی رہتی تھی کہ اس کے والد کی پارٹی ملک کی دو بڑی پارٹیوں میں سے ایک بن چکی ہے۔

اب اپنے والد کی پارٹی کے لیے اسے بھی کام کرنا ہو گا، صوفیہ کے دماغ میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ چکی تھی۔

جب وہ طیارے سے اپنے وطن کے ائرپورٹ پر اتری تو اس کے استقبال کے لیے نہ صرف آصف خاں بلکہ طالش بھی موجود تھا۔ آصف خاں سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی کہ اس کی بیٹی اور طالش ایک دوسرے سے شادی کے عہد و پیماں کر چکے ہیں۔ زندگی کے اس قسم کے معاملات میں آصف خاں بہت وسیع النظر تھے۔ انہوں نے اس معاملے میں بس اتنا کیا تھا کہ طالش کے کردار کی چھان بین کر لی تھی اور مطمئن ہو گئے تھے۔

صوفیہ اپنے والد کی کار میں ائرپورٹ سے روانہ ہوئی۔ طالش سے اس نے کہا تھا کہ وہ دو ڈھائی گھنٹے بعد اسے فون کرے گی۔ ائرپورٹ پر وہ دونوں آصف خاں کی موجودگی کے باعث زیادہ گفتگو نہیں کر سکے تھے۔

کار شوفر ڈرائیو کر رہا تھا۔ آصف خاں اور صوفیہ پچھلی نشست پر تھے۔

''ہماری کار کے ساتھ کوئی سیکیورٹی اسکواڈ نہیں ہے ڈیڈی؟'' صوفیہ نے تعجب کا اظہار کیا۔

''میں اس کا قائل نہیں ہوں۔''

''ہونا چاہیے ڈیڈی! اب آپ ایک بڑی پارٹی کے سربراہ ہیں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''فرق پڑتا ہے ڈیڈی...... اکثریت کا خیال ہے کہ اس مرتبہ انتخابات آپ ہی جیتیں گے اور وزیراعظم بنیں گے۔'' صوفیہ نے پُرجوش اور جذباتی انداز میں کہا۔ ''صحیح معنوں میں آپ کے مدِمقابل صرف پیپلز اسٹیٹ پارٹی ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی اس پارٹی کے سربراہ واجد امیر کو وزیراعظم دیکھنا چاہتا ہو۔ وہ ادارہ آپ کا دشمن ہوسکتا ہے۔''

''ایک ادارہ دنیا کے تمام اداروں سے زیادہ طاقت ور ہے جس کے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہر شخص کی زندگی اور موت کا فیصلہ وہی ادارہ کرتا ہے۔''

صوفیہ نے اس بحث کو آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اپنے باپ کے مزاج سے خوب واقف تھی۔ وہ کچھ رک کر بولی۔ ''ان دنوں تو آپ بہت مصروف ہوں گے؟''

''بہت زیادہ۔'' آصف خاں نے جواب دیا۔ ''انتخابات میں بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ جلسوں اور کارنر میٹنگز سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہ اچھا ہوا کہ تم انتخابات سے پہلے آگئیں۔ تم میری خاصی مدد کر سکو گی۔ میں نے تمہاری عدم موجودگی ہی میں عوام سے تمہارا تعارف کرا دیا ہے۔ کل تم ایک کارنر میٹنگ میں بھی میرے ساتھ ہوگی۔''

''مجھے خوشی ہوگی ڈیڈی۔'' صوفیہ نے کہا۔ ''لیکن شاید میں ایک اچھی مقرر ثابت نہ ہوسکوں۔''

''تمہیں اچھی مقرر بنانا میرا کام ہے۔ اس کی فکر نہ کرو۔''

''ویسے تو میں اس مرتبہ ہونے والے انتخابات کے باعث بہت پُرجوش ہوں، بس کبھی کبھی ممی یاد آجاتی ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو وہ بھی آپ کو وزیراعظم بنتا ہوا دیکھتیں۔'' صوفیہ کے لہجے میں افسردگی آگئی۔

''بہت سی خواہشات ہوتی ہیں انسان کی لیکن سبھی تو پوری نہیں ہوتیں۔'' آصف خاں نے صوفیہ کا ہاتھ تھپکا۔

صوفیہ سر ہلا کر رہ گئی۔

آصف خاں پھر بولے۔ ''اور پھر یہ لازمی تو نہیں کہ میں ہی جیتوں۔ پیپلز اسٹیٹ پارٹی بھی دم خم رکھتی ہے۔''

''میرا دل کہتا ہے کہ آپ ہی جیتیں گے۔''

آصف خاں مسکرایا۔ ''پھر وہی بات زبان پر آرہی ہے کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔''

''آپ میرا دل تو چھوٹا نہ کریں۔'' صوفیہ نے بڑے

لاڈ سے شکوہ کیا۔

''آصف خاں نے ہنس کر ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھپک دیا۔

''آپ کس علاقے سے لڑ رہے ہیں؟'' صوفیہ نے پوچھا۔

آصف خاں نے ایک علاقے کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ''وہیں سے واجد امیر بھی کھڑا ہوا ہے۔''

صوفیہ چونکی۔ ''یہ تو بڑا کانٹے دار مقابلہ ہوگا۔''

''ہاں، عوام کی نظریں اسی طرف لگی ہوئی ہیں۔ مختلف ٹی وی چینلز پر اس کے بارے میں بحث مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔''

''وہاں سے اور کتنے امیدوار ہیں؟''

''سات تو مختلف پارٹیوں کے ہیں، چار آزاد ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ تین مختلف پارٹیاں اپنے امیدوار کے کاغذات نامزدگی واپس لے لیں گی۔ ان کے علاوہ دو ایک آزاد امیدوار بھی یہ قدم اٹھا سکتے ہیں۔''

''کاغذات نامزدگی واپس لینے کی آخری تاریخ کا اعلان ہو گیا؟''

''ہاں، ہو چکا ہے۔''

گھر پہنچنے تک باپ بیٹی میں سیاست ہی پر بات ہوتی رہی۔ ایک بہت بڑے بنگلے کے پھاٹک پر جیسے ہی کار رکی، گھر پر نظر ڈالتے ہوئے صوفیہ بولی۔ ''یہ کیا ڈیڈی؟ اتنی سجاوٹ کیوں ہے؟''

اسی وقت پھاٹک کھلا اور کار اندر داخل ہوئی۔

آصف خاں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ سب تمہاری واپسی کی خوشی میں ہے۔ پارٹی کے سرکردہ لوگوں کو بھی ریفریشمنٹ کے لیے بلایا ہے۔ اس بہانے ان سے تمہارا تعارف بھی ہو جائے گا۔''

گاڑی پورچ میں رک گئی۔

آصف خاں نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ کوئی ملازم کار کے قریب آ کر کار کا دروازہ کھولتا۔ وہ اس قسم کے تکلفات کا قائل نہیں تھا۔ وہ خود ہی دروازہ کھول کر کار سے اترا۔ صوفیہ بھی اتر آئی۔ وہاں ملازمین دست بستہ کھڑے تھے۔ ان سب نے سلام کیا۔ وہ خصوصاً صوفیہ کی آمد سے خوش نظر آ رہے تھے کیونکہ ان سبھی کے ساتھ صوفیہ کا رویّہ بہت زیادہ اچھا ہوتا تھا۔ انہی میں سے کچھ ملازم صوفیہ کا سامان اتارنے کے لیے کار کی طرف بڑھے۔

گھر میں داخل ہوتے ہوئے آصف خاں نے کہا۔

''تم شاور لے لو، کچھ دیر آرام کر لو پھر مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔''

''بہتر ڈیڈی۔''

آصف خاں کسی طرف چلے گئے۔ صوفیہ نے اپنی خواب گاہ کا رخ کیا۔ غسل کرنے یا آرام کرنے سے پہلے اس نے موبائل پر طالش سے رابطہ کیا۔

''ارے تم!'' طالش کی آواز آئی۔ ''تم نے دو گھنٹے یا شاید ڈھائی گھنٹے کے بعد فون کرنے کے لیے کہا تھا۔''

''اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ گھر آتے ہی مصروف ہو جاؤں گی۔ ڈیڈی نے میری واپسی کی خوشی میں کچھ اہتمام کیا ہے۔ پارٹی کے کچھ لوگوں کو ریفریشمنٹ کے لیے بھی بلایا ہے۔ مجھے ان سب سے ملایا جائے گا۔ شاید کوئی چھوٹی موٹی میٹنگ بھی رکھ لیں۔ اس میں کچھ زیادہ......''

اسی وقت دروازے پر ہونے والی دستک نے صوفیہ کو اس طرف متوجہ کیا۔ وہ سمجھ گئی کہ ملازم کار سے اس کا سامان اتار کر لائے ہوں گے۔

''آجاؤ۔'' اس نے کسی قدر بلند آواز میں کہا۔ اسے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھنے کا خیال نہیں رہا تھا۔

''آجاؤں؟'' طالش نے حیرت سے کہا۔

''سوری۔'' صوفیہ ہنسی۔ ''میں نے ملازم سے کہا تھا۔''

دو ملازم دو سوٹ کیس اٹھائے کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

طالش ہنس دیا۔

صوفیہ نے ملازمین کو سوٹ کیس ایک جانب رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے طالش سے کہا۔ ''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ریفریشمنٹ پارٹی اور میٹنگ کے چکر میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ میں اس دوران فون نہیں کر پاتی اور تم انتظار کرتے رہتے۔''

''ہاں انتظار تو کرتا۔ وہ فائل بند کر دیتا جس میں اس وقت سر کھپا رہا ہوں۔''

ملازمین سامان رکھ کر واپس جا رہے تھے۔

صوفیہ بولی۔ ''کاروبار میں اس حد تک الو ہو گئے ہو کہ فائلیں اٹھا کر گھر بھی لے آتے ہو؟''

''غلط سمجھیں تم...... کاروبار سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ڈیڈی ہی سنبھالتے ہیں یا میرا چھوٹا بھائی تابش۔''

''تو پھر کیسی فائل دیکھ رہے ہو؟''

''اپنے دفتر کی۔'' طالش نے جواب دیا۔ ''میں نے ملازمت کرلی ہے۔''

''کیا!'' صوفیہ کو حیرت ہوئی۔ ''اتنے بڑے باپ کے بیٹے کو ملازمت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟''

''شوق کی بات ہے۔'' طالش نے ہنس کر کہا۔ ''ہمیشہ سے خواہش تھی کہ اس محکمے کے لیے کام کروں۔''

''مجھے تو کبھی نہیں بتایا۔''

''سوچا تھا کہ جب وقت آئے گا تو بتادوں گا۔''

''ایسا کون سا محکمہ ہے جس میں کام کرنے کا تمہیں شوق تھا؟''

''ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔''

''یہ کیا کوئی راز کی بات ہے؟''

''کسی حد تک۔''

''تم نے مجھے تجسس میں ڈال دیا۔ اچھا خیر، مجھے اب تیار ہونا ہے پھر مہمانوں کی آمد شروع ہوجائے گی۔''

''ملاقات کب ہو گی؟'' طالش نے جلدی سے پوچھا۔ ''میں ائرپورٹ پر ہی تم سے پوچھتا۔ انکل کی وجہ سے نہیں کہہ سکا۔ جب تم لندن میں تھیں، تب بھی ہم فون پر روزانہ ہی بات کیا کرتے تھے۔ اب تم واپس آگئی ہو تو ملاقات ہونی چاہیے نا۔''

''میں خود بے چین ہوں، لیکن......''

''کوئی وقت تو ملے گا؟''

''ملاقات ہو تو اطمینان سے ہونی چاہیے۔ اگر میٹنگ ہوئی اور طویل بھی ہوگئی تو پھر شام کے بعد ہی آسکوں گی۔''

''چند گھنٹے تمہارا اور انتظار کیے لیتا ہوں۔''

''میں آنے سے پہلے تمہیں فون کردوں گی۔ اچھا اب بند کررہی ہوں۔''

''اوکے۔''

صوفیہ نے فون بند کر کے باتھ روم کا رخ کیا۔ وہ تجسس کا شکار ہوگئی تھی۔ آخر طالش نے کس محکمے میں ملازمت کی ہوگی؟ کیا شوق تھا اُسے؟

غسل کرنے اور تیار ہونے میں صوفیہ نے کم سے کم وقت لگایا لیکن ایک گھنٹا گزر ہی گیا پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی اور جیسے ہی دروازہ کھولا، سامنے ملازم کھڑا نظر آیا۔ اس کا ہاتھ اس طرح اٹھا ہوا تھا جیسے دروازے پر دستک دینے ہی والا ہو۔ صوفیہ کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ گر گیا۔

''بی بی صاحب!'' ملازم نے کہا۔ ''صاحب نے یہ پیغام بھجوایا ہے کہ تیار ہوجائیں تو عقبی لان میں آجائیں۔''

''وہاں انتظام کیا گیا ہے مہمان نوازی کا؟''

''جی بی بی صاحب۔''

''کیسے ہو تم لوگ؟'' صوفیہ نے باہر نکل کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تم لوگوں سے بات کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔''

''سب ٹھیک ہے بی بی صاحب۔'' ملازم نے ادب سے سر جھکایا۔

ملازمین کو اگر کسی بھی قسم کی پریشانی لاحق ہوتی تھی اور وہ آصف خاں سے کہنے کی ہمت نہیں کرپاتے تھے تو صوفیہ ہی سے کہتے تھے۔

ملزم کا جواب سننے کے بعد صوفیہ آگے بڑھ گئی۔

عقبی لان کے ایک حصے میں شامیانہ لگایا گیا تھا۔ وہاں اس وقت آصف خاں کے علاوہ آٹھ دس افراد تھے جن میں دو خواتین بھی تھیں۔ سب دو گروپ بنائے اِدھر اُدھر کھڑے باتیں کررہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون ان گروپس سے الگ آصف خاں سے باتیں کررہی تھیں۔

''آؤ صوفیہ!'' آصف خان نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

ان کے آواز دینے سے قبل ہی سب صوفیہ کی طرف متوجہ ہوگئے تھے کیونکہ وہ ان کے لیے اجنبی تھی۔ وہ آصف خاں کی طرف بڑھی اور باقی لوگوں کے گروپ بھی تیزی سے اس طرف آگئے۔

آصف خاں نے سب سے صوفیہ کا تعارف کرایا، پھر ہنس کر بولے۔ ''میں نے صوفیہ کو یہاں جلدی بلا کر غلطی کی۔ ابھی تو آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ بار بار تعارف کرانے کی ضرورت پیش آئے گی۔''

''اب تو سب تیزی ہی سے آئیں گے۔'' ایک خاتون نے گھڑی دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''ابھی آپ انہیں واپس بھیج دیں۔ سب لوگ آجائیں، تبھی انہیں بلایئے گا۔''

اسی وقت ایک صاحب بول پڑے۔ ''لیجیے! میر باقر تو آگئے۔''

سبھی کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ اس شخص کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہوسکتی تھی۔

''وہی اپنے روایتی لباس میں۔'' کسی نے ہنس کر کہا۔

میر باقر کے جسم پر قمیص شلوار اور شال تھی۔ شال اوڑھنے کا انداز بھی خاص قسم کا تھا۔

''یہ بس پارٹیز میں یہ لباس پہنتے ہیں ورنہ......'' جو شخص بول رہا تھا، چپ ہوگیا کیونکہ میر باقر قریب آگیا تھا۔

''خاں صاحب!'' وہ قریب آکر بولا۔ ''یہ ضرور آپ کی بیٹی ہوں گی۔'' اس کا اشارہ صوفیہ کی طرف تھا۔

''یہ اندازہ تو سبھی لگا سکتے ہیں۔'' کسی نے کہا۔

''صوفیہ صاحبہ کے سوا یہاں کوئی اجنبی ہو ہی نہیں سکتا۔''

''جی ہاں میر صاحب!'' آصف خاں نے کہا۔ ''آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے اور صوفیہ...... یہ ہیں میر باقر! خاصے بڑے جاگیردار ہیں اور ہماری پارٹی کے صوبائی صدر ہیں۔''

''خوش رہو بیٹی!'' میر باقر نے صوفیہ کے سلام کے جواب میں اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

اسی طرح لوگوں کی آمد اور تعارف کا سلسلہ جاری رہا۔ سب کی آمد کے بعد ریفریشمنٹ کا آغاز ہوا۔ سب اپنی اپنی پلیٹیں لے کر اِدھر اُدھر پھیل کر باتیں کرنے لگے۔ اس کا امکان تھا کہ موضوعِ گفتگو صوفیہ ہی ہو۔

آصف خاں بھی ایک پلیٹ میں صرف ایک سینڈوچ لیے اِدھر اُدھر گھوم کر انتظامات کا جائزہ بھی لے رہے تھے اور کبھی کہیں رک کر کسی سے ایک آدھ بات بھی کر لیتے تھے۔ صوفیہ ان کے ساتھ چل رہی تھی۔

ایک خاتون جس کا نام آصف خاں نے صوفیہ بیگم کو نشتر بتایا تھا، اچانک ان دونوں کے سامنے اس طرح آگئی کہ ان دونوں کو رکنا پڑا۔

''معاف کیجیے گا خاں صاحب!'' وہ بولی۔ ''ایک سوال شروع ہی سے میرے دماغ میں گردش کر رہا ہے بلکہ شاید اور لوگوں کے ذہنوں میں بھی ہو۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آپ سے وہ سوال کر ہی ڈالوں۔''

''اس کے لیے ہمت کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی مسز نشتر!'' آصف خاں نے مسکرا کر کہا۔ ''میری پارٹی کا ہر شخص کسی وقت بھی مجھ سے کوئی سوال کر سکتا ہے۔ آپ کیونکہ ایک اور پارٹی چھوڑ کر چند دن پہلے ہی میری پارٹی میں آئی ہیں اس لیے آپ کو اس کا علم نہیں۔ خیر، کہیے کیا سوال ہے آپ کا؟''

''صوفیہ صاحبہ پولیٹیکل سائنس پڑھ کر آئی ہیں۔ کیا آپ انہیں عملی سیاست میں بھی لانا چاہتے ہیں؟''

''یقیناً۔'' آصف خاں نے مسکرا کر کہا۔ ''میں نے تو فیصلہ کیا ہے کہ صوفیہ کا سیاست میں پہلا قدم بھی ایک اہم جگہ سے اٹھے۔ میں اسے کسی صوبے کا پارٹی صدر بنانا چاہتا ہوں۔''

صوفیہ چونکی۔ ''ڈیڈی! یہ آپ کیا فیصلہ کر رہے ہیں؟ میں تو ابھی......''

''تم ابھی چپ رہو۔'' آصف خاں نے کہا۔ ''تم سے بعد میں بات کروں گا۔'' پھر وہ مسز نشتر کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''میں...تو یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سب اندر چلیں۔ میٹنگ روم میں اس بارے میں ایک چھوٹی سی میٹنگ کر لی جائے۔''

''بہت عجلت میں ہیں آپ۔'' مسز نشتر ہنسی۔

''ہاں، میں چاہتا ہوں کہ صوفیہ خود کو کسی اور معاملے میں نہ اُلجھا لے۔'' آصف خاں نے مسکرا کر صوفیہ کی طرف دیکھا جو کسی خیال کے تحت پہلو بدلنے لگی تھی۔

اسی وقت ایک جانب سے کچھ ہنگامے کی آواز سنائی دی۔ اس جانب شامیانے میں داخلے کا راستہ تھا۔ آصف خاں، صوفیہ اور مسز نشتر وہاں سے قریب ہی تھے۔

صوفیہ نے دیکھا کہ وہاں شوفر کی وردی میں ملبوس ایک جوان العمر شخص اندر آنے کی کوشش کر رہا تھا اور ملازمین اسے روک رہے تھے۔

شوفر نے غالباً محسوس کر لیا کہ وہ اندر داخل نہیں ہو سکے گا۔ یہ احساس ہوتے ہی اس نے جیب سے ریوالور نکالا اور پے در پے تین فائر کیے۔ وہ شاید زیادہ فائر بھی کرتا لیکن ملازمین نے اسے نہ صرف دبوچ لیا تھا بلکہ اس کے ہاتھ سے ریوالور بھی چھین لیا تھا۔

جو تین گولیاں چلائی گئی تھیں، ان میں سے ایک تو کسی کو نہیں لگی، وہ صوفیہ کے قریب سے گزرتی ہوئی شامیانے کا کپڑا پھاڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ دوسری گولی نے صوفیہ کا بایاں بازو چھلنی کیا اور تیسری گولی ایک مہمان کے سینے پر لگی اور وہ سینہ تھام کر آگے جھکتا ہوا گر ہی پڑا۔

☆☆☆

طالش کی کار طوفانی رفتار سے صوفیہ کے گھر کی طرف دوڑ رہی تھی۔ صوفیہ نے اسے فون پر جو اطلاع دی تھی، وہ اس کے لیے ہیجان خیز ثابت ہوئی تھی۔ اس وقت اسے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ وہ ایک ذمّے دار آفیسر ہے جو قانونی رفتار سے زیادہ رفتار سے کار دوڑا رہا تھا۔ کہیں بھی کوئی ٹریفک سارجنٹ اسے روک سکتا تھا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ اس سڑک پر پہنچ گیا جہاں صوفیہ کا گھر تھا۔ وہاں خاصی گاڑیاں ایک کنارے سے آگے پیچھے پارک کی گئی تھیں جو طالش کے خیال کے

مطابق آصف خاں کے مہمانوں کی ہوسکتی تھیں۔ پھاٹک کے سامنے پولیس کی گاڑیاں اور ڈی آئی جی کی کار کھڑی تھی۔ سانحہ کیونکہ ایک بڑی سیاسی شخصیت کے گھر میں پیش آیا تھا اس لیے ڈی آئی جی کا آنا تعجب خیز نہیں تھا۔

طالش اپنی گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھا جہاں دو کانسٹیبل اور ایک اے ایس آئی کھڑا تھا۔

طالش کو اندر نہیں جانے دیا گیا اور کسی حد تک خشک لہجے میں اے ایس آئی نے اس سے پوچھا۔ ''کون ہیں آپ؟''

''مجھے آصف خاں صاحب کی بیٹی صوفیہ صاحبہ نے بلایا ہے۔ میرا نام طالش ہے۔ یہاں جو کچھ ہو چکا ہے، اس کی اطلاع مجھے صوفیہ صاحبہ سے مل چکی ہے۔'' طالش نے وضاحت سے جواب دیا۔

اے ایس آئی نے غور سے طالش کی طرف دیکھا اور پھر ایک کانسٹیبل کی طرف متوجہ ہو کر اسے ہدایت کی کہ وہ طالش کا پیغام ڈی ایس پی صاحب کو پہنچا دے۔

''مجھے صوفیہ صاحبہ سے ملنا ہے۔'' طالش بول پڑا۔

''فیصلہ ڈی ایس پی صاحب ہی کریں گے۔ وہی یہاں کے سارے معاملات دیکھ رہے ہیں۔'' اے ایس آئی نے جواب دیا۔

''ہوں۔'' طالش نے ہونٹ بھینچ لیے۔

کانسٹیبل پھاٹک سے اندر جا چکا تھا۔

اے ایس آئی بوکھلا کر طالش کو سیلیوٹ کرتا اگر طالش اسے اپنا سرکاری کارڈ دکھا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کسی غیر معمولی رکاوٹ کی وجہ سے ہی طالش کسی کو اپنا کارڈ دکھا سکتا تھا اور یہ کوئی غیر معمولی رکاوٹ نہیں تھی۔ ڈی ایس پی صوفیہ سے بات کرتا اور صوفیہ اسے بلوا لیتی۔ ایک دو پل کے لیے طالش کو خیال آیا کہ وہ صوفیہ کو فون کرے لیکن پھر اس نے یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد طالش اس کمرے میں پہنچا جہاں صوفیہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ وہ ساڑی اور بغیر آستین کا بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

''تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا صوفی!'' طالش تیزی سے بولا۔

''کوئی ایسا گہرا زخم نہیں لگا ہے۔'' صوفیہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''بس خراش سی آئی ہے۔ میں نے تمہیں فون پر ہی بتا دیا تھا کہ گوشت کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا۔ کل یا پرسوں تک اس پٹی کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ بیٹھو!''

''قتل کس کا ہوا ہے؟'' طالش نے پوچھا۔

''میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ پارٹی کے سرکردہ لوگوں کو بلایا گیا ہے۔ مقتول کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ سردار رند۔'' صوفیہ نے جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں صرف یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ آج تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی کیونکہ......''

''میں صرف اس پریشانی میں آیا ہوں کہ تم نے اپنے زخمی ہونے کی اطلاع بھی دی تھی۔''

''یہ بھی کہا تھا میں نے کہ گولی نے بس خراش سی پہنچائی ہے۔''

''میری پریشانی کے لیے اتنا بھی بہت تھا۔'' طالش نے کہا پھر پوچھا۔ ''باقی لوگ کہاں ہیں؟''

''پولیس نے سب کو ڈرائنگ روم میں جمع کر لیا ہے۔ ڈیڈی بھی وہیں ہیں۔ متصل کمرے میں ایک ایک آدمی کا بیان لیا جا رہا ہے۔ میرا بیان بھی لیا جا چکا ہے۔''

اب وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''مقتول......'' طالش نے اتنا ہی کہا تھا کہ صوفیہ بول پڑی۔

''سردار رند کی لاش اسپتال بھیج دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی روتی دھوتی بیوی بھی گئی ہے۔''

''وہ بھی یہیں تھی؟''

''نہیں، اسے فون کر کے اطلاع دی گئی تھی۔''

''تم نے بتایا تھا کہ تین گولیاں چلائی گئی تھیں؟''

''یہ بھی بتایا تھا کہ ایک گولی کسی کو نہیں لگی، دوسری گولی میرا بازو زخمی کر گئی اور تیسری نے سردار رند کی زندگی ختم کر دی۔ جب میں نے تمہیں فون کیا تھا، اس وقت مجھے کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوئی تھی لیکن بعد میں کئی غیر معمولی باتیں سامنے آئیں۔''

''وہ کیا؟'' طالش بول پڑا۔

''قاتل نبیل ہے جو سردار رند کا بیٹا ہے۔''

''کیا؟'' طالش چونک گیا۔ ''اور شوفر کے روپ میں؟''

''نبیل رند کے لچھن ٹھیک نہیں تھے۔ سردار رند نے اسے بہت سمجھایا بجھایا لیکن جب وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو سردار رند نے دو ماہ قبل اسے اپنے گھر سے نکال دیا

تھا۔ کوئی پندرہ بیس دن قبل اس نے میر باقر کے شوفر کی حیثیت سے ملازمت کرلی تھی۔''

''یہ میر باقر...... نام تو سنا ہوا ہے۔''

''ڈیڈی ہی کی پارٹی میں ہے۔''

''وہ بھی اس حادثے کے وقت وہاں موجود تھا؟''

''ہاں۔'' صوفیہ نے جواب دیا اور خیال ظاہر کیا۔ ''وہ ضرور مصیبت میں پھنسے گا۔''

''بات ہی ایسی ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ نشانہ شاید انکل ہوں یا تم ہو لیکن گولی نے کسی اور ہی کی جان لے لی۔''

''نہیں۔'' صوفیہ نے جواب دیا۔ ''بظاہر تو یہ نہیں معلوم ہوتا۔ میرا زخمی ہونا تو غالباً اتفاقی امر ہے۔''

''الجھا ہوا سوال یہ بھی ہے کہ اس نے شوفر کی حیثیت سے میر باقر کی ملازمت کیوں کی؟ اپنے باپ کا گھر چھوڑتے وقت اس کا ذاتی بینک بیلنس بھی کچھ کم تو نہیں ہو گا۔ اسے اتنی جلدی ملازمت کی ضرورت کیوں پیش آئی، اور ملازمت بھی اتنی معمولی...... وہ کچھ پڑھا لکھا تو ہوگا؟''

''یہ سب مجھے ابھی نہیں معلوم۔'' صوفیہ نے جواب دیا۔ ''پولیس جب اپنی ساری کارروائی مکمل کر کے چلی جائے گی، تبھی شاید مجھے ڈیڈی سے کچھ معلوم ہو۔ وہ بھی وہیں ڈرائنگ روم میں ہیں۔ ان کو تو کچھ معلومات حاصل ہو گئی ہوں گی۔''

''ابھی تم نے بتایا ہے کہ پولیس ایک ایک کر کے انہیں ڈرائنگ روم سے متصل کسی کمرے میں لے جا کر بیان لے رہی ہے۔ ممکن ہے پولیس کوئی بات انکل کو بتانا مناسب نہ سمجھے۔''

''وہ لوگ تو ڈیڈی کو بتا دیں گے کہ ان سے کیا بیان لیا گیا یا کیا پوچھ گچھ کی گئی۔''

''یہ بھی ضروری نہیں ہے۔'' طالش نے کہا۔ ''پولیس کوئی بات چھپانا چاہتی ہے تو متعلقہ شخص کو بھی سختی سے تاکید کر دیتی ہے کہ وہ اس بارے میں کسی کو نہ بتائے۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''نبیل کو کس نے پکڑا تھا؟''

''پہلے تو اسے ہمارے ملازمین ہی نے دبوچ لیا تھا بعد میں پولیس نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اسے پولیس اسٹیشن لے جایا جا چکا ہے۔''

''اس نے کچھ بتایا؟''

''بھئی مجھے کچھ نہیں معلوم۔ اب ختم کرو یہ باتیں۔ میں ویسے ہی خلفشار میں مبتلا ہوں۔ تم اور کر رہے ہو۔ کافی بنواؤں تمہارے لیے؟ خواہش مجھے بھی ہے۔''

''بنوالو۔''

صوفیہ نے ملازم کو بلایا۔

کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ تمام مہمان رخصت ہو چکے ہیں اور پولیس بھی چلی گئی ہے۔ ملازم ہی نے یہ بھی بتایا کہ آصف خاں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ صوفیہ اور طالش اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔

''یہ عجیب واقعہ ہوا انکل۔'' طالش بولا۔ ''بیٹے نے باپ کو گولی ماردی۔''

صوفیہ بولی۔ ''عجیب تو یہ بھی ہے کہ اس نے شوفر کی حیثیت سے ہماری ہی پارٹی کے رکن میر باقر کی ملازمت کی تھی۔ سردار رند اور میر باقر کے تعلقات تو ہوں گے۔ یہ عین ممکن ہے کہ میر باقر نبیل کو سردار رند کے بیٹے کی حیثیت سے جانتا بھی ہو؟''

''میر باقر کا بیان ہے کہ وہ نبیل کا چہرہ شناس نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ سردار رند کا بیٹا ہے۔''

''میر باقر نے نبیل کو کیوں ملازم رکھا تھا؟'' طالش نے سوال کیا۔

''ضرورت تھی اسے شوفر کی۔ پرانا شوفر اچھا نہیں تھا۔ میر باقر نے اخبار میں اشتہار دیا تھا جو شوفر آئے تھے، ان میں میر باقر کو نبیل ٹھیک لگا تھا۔''

''یہاں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ نبیل کو شوفر کی ملازمت کیوں کرنی پڑی۔ باپ کے گھر سے نکلتے وقت کیا اس کا ذاتی اکاؤنٹ نہیں تھا؟''

''نبیل کے لچھن دیکھتے ہوئے ہی سردار رند نے اس کا ذاتی اکاؤنٹ جوائنٹ سگنیچر سے کھلوایا تھا۔ چیک کیش کرانے کے لیے اس پر سردار رند کے دستخط بھی ضروری تھے۔''

''اتنی سختی کی تھی سردار رند نے تو پھر افلاس میں گھر کر اسے باپ سے نفرت تو ہوسکتی ہے؟''

''سردار رند اس کا سگا باپ نہیں تھا۔''

صوفیہ اور طالش چونک گئے۔

آصف خاں نے بات پوری کی۔ ''سردار رند کی بیوی ماں نہیں بن سکی تھی۔ اسے سردار رند نے یتیم خانے سے لے کر پالا تھا۔ دونوں میاں بیوی اس سے بہت پیار کرتے تھے اور اس سلسلے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی محبت سے اولاد کے رنگ ڈھنگ بگڑ جاتے ہیں لیکن یہ کلیہ بھی نہیں ہے۔''

''لیکن ڈیڈی! کیا نبیل تعلیم یافتہ بھی نہیں تھا کہ اسے ایک معمولی ملازمت کرنی پڑی؟''

''حد سے بڑھی ہوئی بے روزگاری کے باعث کچھ نوجوان ٹیکسی ڈرائیور بھی بن گئے ہیں۔''

''یہ تو میرے علم میں بھی ہے۔'' طالش نے سر ہلایا۔

''یہ میرے ذہن میں بھی آرہا ہے کہ صحیح تفتیش ہونے پر کوئی اور ہی معاملہ سامنے آئے گا۔'' صوفیہ بولی۔

''ایک بات بتائیے انکل!'' طالش نے کہا۔ ''آپ کی پارٹی میں دھڑے بندی تو نہیں ہے؟''

''وہ تو ہے۔'' آصف خاں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بلکہ ہر سیاسی پارٹی میں ہوتی ہے۔ مجھے اس بارے میں تشویش بھی ہے۔ میں نے سر توڑ محنت کر کے پارٹی کو ایک بڑا مقام دلایا ہے۔ یہ دھڑے بندی کسی وقت پارٹی کے لیے نقصان دہ بھی ہوسکتی ہے۔ کاغذات نامزدگی داخل کرتے وقت بھی دو گروپس کی وجہ سے کچھ تلخیاں پیدا ہوئی تھیں۔ معاملہ سنبھالنے میں مجھے خاصی دشواری ہوئی تھی۔''

''وہ دو گروپس کن لوگوں کے ہیں؟''

''سردار رند اور میر باقر کے گروپس بظاہر ہی ایک ہیں، اندرونی طور پر مخالفت رہی ہے۔''

''اوہ!'' طالش سوچتا ہوا بولا۔ ''پھر تو یہ معاملہ شاید کوئی اور ہی گل کھلائے۔''

آصف خاں کے چہرے سے تفکر ظاہر ہوتا رہا۔

''یہ دونوں...... یا ان میں سے کوئی ایک پارٹی کے کسی اہم منصب پر بھی......''

''ہاں۔'' آصف خاں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میر باقر ہمارے ہی صوبے کا صدر ہے۔ اس وقت سردار رند نے چاہا تھا کہ میں اسے میر باقر پر ترجیح دوں۔''

''اس کا احساس میر باقر کو بھی ہوگیا ہوگا؟''

''ہونا تو چاہیے لیکن اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔''

''سردار رند کی جگہ آپ کسے مقرر کریں گے؟'' طالش نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''اس کے لیے مشاورتی اجلاس ہوگا۔'' آصف خاں نے جواب دیا۔ ''میں فیصلہ ہمیشہ تنہا نہیں کرتا۔ مشاورت کی جاتی ہے۔ ہاں البتہ پارٹی کے آئین کے مطابق میں سال بھر میں دو مرتبہ ویٹو استعمال کرسکتا ہوں لیکن جب سے پارٹی بنی ہے، میں نے یہ حق ابھی تک تو استعمال نہیں کیا۔''

طالش کے ذہن میں ایک سوال چکرا رہا تھا جس کے لیے مناسب الفاظ کی ضرورت تھی۔ آخر وہ الفاظ اچانک اس کے ذہن میں آگئے۔

''انکل!'' اس نے پوچھا۔ ''آپ ملک سے باہر بھی جاتے ہوں گے؟''

''جانا ہی پڑتا ہے کسی غیر ملکی سیاسی پارٹی کے سربراہ سے ملنے یا کسی اور وجہ سے۔''

''تو آپ کی عدم موجودگی میں پارٹی کے معاملات کون دیکھتا ہے؟''

''میر باقر۔'' آصف خاں نے جواب دیا، پھر یکایک جیسے چونکا۔ ''اوہ! میں سمجھ گیا۔ دراصل تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اگر میں دنیا میں نہ رہا تو پارٹی کا سربراہ کون ہوگا؟''

''خدا نہ کرے ڈیڈی!'' صوفیہ بول پڑی۔ ''کیوں نہیں رہیں گے دنیا میں آپ! ایسی بات زبان پر نہیں لانی چاہیے۔''

آصف خاں ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد پھر سنجیدہ ہوگیا۔

''جب فائرنگ کی گئی، اس وقت آپ کی پوزیشن کیا تھی؟ میرا مطلب ہے، کیا سردار رند کے قریب کھڑے تھے؟''

''نہیں۔'' آصف خاں نے جواب دیا۔ ''میں صوفیہ کے ساتھ تمام مہمانوں سے ملتا پھر رہا تھا لیکن جس سمت فائرنگ کی گئی، اس جگہ اچانک مسز نشتر ہمارے سامنے آرکی اور کچھ باتیں کرنے لگی۔ ہمیں وہیں رکنا پڑا تھا۔''

''ہوں۔'' طالش نے سر ہلایا۔ ''اب میں ایک ایسا سوال کرنا چاہتا ہوں جو صوفیہ کو شاید بُرا لگے۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو طالش کہ مجھے کسی منصوبے کے تحت اس جگہ روکا گیا تھا جہاں سے فائرنگ کی گئی تھی اور نشانہ دراصل میں تھا لیکن نشانہ چُوک جانے کی وجہ سے گولی سردار رند کے جا لگی؟''

''معاملے کو ہر زاویے سے دیکھنا چاہیے انکل۔''

صوفیہ اچانک بہت زیادہ متفکر دکھائی دینے لگی۔ اس نے کہا۔ ''ایک گولی میرے بازو کو ہلکا سا زخم دیتی ہوئی گزری تھی اور میں اس وقت ڈیڈی کے قریب تھی۔''

''ہوسکتا ہے اس وقت بھی نشانہ چوکا ہو۔''

''طالش!'' آصف خاں کی مسکراہٹ اس مرتبہ کچھ مرجھائی ہوئی سی تھی۔ ''تم اس قسم کے سوالات کر رہے ہو جیسے کسی انویسٹی گیٹنگ ایجنسی سے تعلق رکھتے ہو؟''

''ہر شخص کو [illegible]یے سے دیکھنا چاہیے انکل۔''

طالش اس وقت بھی وہ بات گول کر گیا جو آصف خاں کی زبان سے نکلی تھی۔
''تم......'' آصف خاں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس معاملے کو تم اس زاویے سے بھی دیکھ رہے ہو کہ نشانہ دراصل میں تھا اور اس سے فائدہ صرف ایک شخص کو پہنچتا۔''
''جی......'' طالش نے آہستہ سے کہا۔ ''میر باقر کو۔''
''اگر تمہارا یہ قیاس درست ہے تو پھر مسز نشتر کے بارے میں بھی سوچنا پڑے گا۔''

''میں بس ہر امکان کو نظر میں رکھنا چاہتا ہوں۔''
آصف خاں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''مسز نشتر کا تعلق بھی میر باقر کے گروپ سے ہے۔''
''ڈیڈی!'' صوفیہ تیزی سے بولی۔ ''طالش کا انداز فکر غلط ثابت ہو، یا صحیح، اب آپ کو اپنی سیکیورٹی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''میں بھی یہی کہوں گا انکل۔'' طالش بولا۔
''تم کہو یا نہ کہو، مجھے اپنی صوبائی صدر کی بات تو ماننی ہی پڑے گی۔'' آصف خاں نے مسکرا کر صوفیہ کی طرف دیکھا۔
''جی!'' صوفیہ چونکی۔ طالش بھی چونکا تھا۔
''صوبائی صدر!'' صوفیہ نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔
''ہاں، میں نے کہا تھا نا کہ میں تمہیں عملی سیاست میں لانا چاہتا ہوں۔''
''مگر پہلے ہی قدم پر اتنی بڑی ذمے داری؟''
''میں جو ہوں تمہاری رہنمائی کے لیے۔ میں نے پرسوں میٹنگ طلب کی ہے۔ اسی میں یہ اعلان ہوگا کہ تم ہی اب اس صوبے کی صدر ہو۔''
''اسی صوبے کی؟'' طالش تیزی سے بولا۔ ''یعنی جس کا صدر میر باقر ہے؟''
''ہاں۔''
''یعنی آپ اس کو صدارت سے ہٹادیں گے؟''
''ظاہر ہے۔''
''کیا میر باقر کو معلوم ہے کہ آپ یہ قدم اٹھانا چاہتے ہیں؟''
''اس سے تو میں نے ابھی یہ بات نہیں کہی۔''
''پارٹی کے کسی اور فرد سے؟''
''ہاں دو ایک افراد سے صوفیہ کو سیاست میں لانے کی بات تو ہوئی ہے۔ ممکن ہے میرے منہ سے کوئی ایسا جملہ بھی نکل گیا ہو جس سے ان افراد نے اندازہ لگالیا ہو کہ میں نے صوفیہ کے بارے میں کیا سوچا ہے۔''
''تو ان افراد کے ذریعے یہ بات میر باقر کے علم میں آسکتی ہے؟''
آصف خاں نے جواب میں کچھ نہیں کہا لیکن اس کے چہرے پر سوچ بچار کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔
طالش سوچتا ہوا بولا۔ ''آپ نے اپنی پارٹی کو صحیح معنوں میں جمہوری بنالیا ہے تو پھر اس کی مخالفت ہوسکتی ہے، خصوصاً میر باقر کے گروپ کی طرف سے۔''
''باقی لوگ بھی تو ہیں۔'' آصف خاں نے کہا۔
''وہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ صوفیہ سیاست کے میدان میں پہلا قدم رکھنے جارہی ہے اور آپ اسے صوبائی صدر بنانا چاہتے ہیں۔''
''اگر اکثریت نے مخالفت کی تو میں پہلی مرتبہ اپنی ویٹو پاور کا استعمال کروں گا۔'' آصف خاں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''صوفیہ کو اس صوبے کی صدر تو بننا ہی ہے۔ اسے تربیت دینے کے لیے بھی ضروری ہے کہ یہ میرے قریب ہو۔''
''اس سے پارٹی میں کوئی انتشار تو نہیں ہوگا؟''
''میرا خیال ہے، نہیں۔'' آصف خاں نے جواب دیا۔ ''پارٹی نے متفقہ طور پر مجھے ویٹو پاور دی ہے۔''
''وہ ایک الگ بات ہے انکل! لوگوں کے ذہنوں میں تو بات رہ جائے گی کہ آپ نے اپنی بیٹی کے لیے ویٹو پاور استعمال کی جبکہ آج تک کبھی نہیں کی۔''
''وہ میں سنبھال لوں گا۔'' آصف خاں نے اعتماد سے کہا۔
''ایک بات اور انکل۔'' طالش بولا۔ ''اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ نشانہ دراصل آپ تھے، تو مسز نشتر کا کردار بھی مشکوک ہوجاتا ہے۔ اس نے آپ کو اس جگہ روکا تھا جہاں .... فائرنگ کی گئی۔''
''یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے جب مسز نشتر اور نبیل رند میں عین وقت رابطہ ہو۔ وہ قاتل کو اس وقت یہ بتادے کہ اس نے مجھے ایسی جگہ روکا ہے جہاں مجھے آسانی سے ٹارگٹ کیا جاسکتا ہے۔''
''بات تو صحیح ہے تمہاری۔''
''اور یہ ناممکن بھی نہیں۔'' صوفیہ بولی۔ ''اس نے محسوس کرلیا ہوگا کہ ہم داخلی راستے کے سامنے سے گزریں

گے لہٰذا اس نے موبائل پر نبیل رند کو ایکشن کا پیغام بھیج دیا ہو۔"

"پولیس کو نبیل رند کے موبائل سے یہ بات معلوم ہو جائے گی۔" طالش نے کہا۔

آصف خاں مسکرایا اور بولا۔ "باتیں تو اس طرح کی جا رہی ہیں جیسے واقعی سب کچھ اسی طرح ہوا ہو۔" وہ اس خیال سے قطعی پریشان نظر نہیں آ رہا تھا کہ نبیل کا ٹارگٹ شاید وہی ہو۔

طالش بولا۔ "اب پولیس کی تفتیش اور نبیل رند کے بیان سے ہی معاملہ کچھ صاف نظر آ سکتا ہے۔"

کل کے اخبار میں سب کچھ آ ہی جائے گا۔" آصف خاں نے کہا۔

"فائرنگ کے بعد نبیل نے بھاگنے کی کوشش تو کی ہو گی۔" طالش بولا۔

"یقینی بات ہے۔" آصف خاں نے کہا۔ "لیکن میرے ملازمین نے اسے ایسا دبوچا تھا کہ وہ بھاگ نہیں سکا۔" طالش نے یہ جواب سن کر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

حقیقت وہی تھی جو آصف خاں کی زبان پر مزاحاً آ گئی تھی۔ طالش واقعی ایک حساس ادارے سے وابستہ تھا۔ ابتدا میں اس کی حیثیت ادارے کے دوسرے ایجنٹوں سے زیادہ نہ تھی لیکن جب ادارے کے ڈائریکٹر جنرل نے اپنے ادارے میں ایک سیاسی ڈپارٹمنٹ کی ضرورت محسوس کی اور اس ضمن میں ادارے کے کچھ لوگوں کا انتخاب کیا تو ان کا سربراہ طالش کو مقرر کیا۔

ڈپارٹمنٹ کے پہلے اجلاس میں اس نے کہا تھا۔ "میں آپ لوگوں کو بتا تو چکا ہوں لیکن آج آپ کے اس پہلے باقاعدہ اجلاس میں وہ باتیں ایک بار پھر دہرانا چاہتا ہوں۔ ہمارے اس ڈپارٹمنٹ کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم سیاسی پارٹیوں کے داؤ پیچ میں دخل اندازی کریں۔ ہمارے لیے کوئی بھی پارٹی پسندیدہ یا ناپسندیدہ نہیں ہوگی۔ ہمارا کوئی قدم کسی سیاسی پارٹی کے حق میں ہوگا، نہ اس کی مخالفت میں۔ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے نتائج کچھ بھی نکلیں یا وہ نتائج سامنے آنے کا امکان ہو، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہو گی لیکن اگر کسی پارٹی کی سیاست، جرائم کی حدود میں جانے لگے، اس پر ہمیں کڑی نظر رکھنی ہو گی۔ سیاست داں قتل بھی کر دیے جاتے ہیں لیکن قاتل دندناتے پھرتے ہیں۔ پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی کیونکہ ان قاتلوں کو کسی مقتدر شخصیت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ ہمیں ایسے ہی معاملات کو دیکھنا ہے اور ان مقتدر شخصیات کو بھی قانون کے شکنجے میں لانا ہے، انتخابات کے دنوں میں ایسی کوئی ایک آدھ واردات تو ہو ہی جاتی ہے اور چند ماہ بعد ہمارے ملک میں عام انتخابات ہونے والے ہیں۔ ان دنوں میں آپ لوگوں کو بہت متحرک رہنا پڑے گا۔ کوئی بھی ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کر سکے۔ میں آپ لوگوں کو اس سلسلے میں بہت کچھ سمجھا چکا ہوں۔ وہ سب کچھ آپ لوگ اپنے ذہنوں پر نقش کر لیں۔ اگر اس سلسلے میں کوئی کسی قسم کے ابہام کا شکار ہو تو مجھ سے سوال کر سکتا ہے۔"

لیکن کسی نے بھی ڈائریکٹر جنرل سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ سب لوگ پہلے ہی سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ انہیں یہ بھی بتایا جا چکا تھا کہ ادارے سے اپنی وابستگی وہ کسی پر اس وقت تک ظاہر نہیں کریں گے جب اس کے سوا کوئی بھی چارۂ کار نہ رہ جائے۔

یہی وجہ تھی کہ طالش نے یہ بات نہ تو آصف خاں کو بتائی تھی اور نہ صوفیہ کو کچھ بتایا تھا۔

ادارے کے دوسرے لوگ بھی نہیں جانتے تھے کہ "بی ہائنڈ دی کرٹین" نام کا یہ نیا سیکشن کیوں قائم کیا گیا ہے، اسے کیا فرائض سرانجام دینے ہیں۔ یہ بھی کسی کے علم میں نہیں تھا کہ اس سیکشن کا انچارج کون ہے۔

طالش دوسرے دن دفتر پہنچا۔ وہ اپنے سیکشن کے دو ایک آدمیوں کو کچھ ہدایات دینا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی ڈائریکٹر جنرل نے اسے طلب کر لیا۔

"بیٹھو!" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طالش سے کہا۔

طالش بیٹھ کر استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کل کی واردات سے بے خبر تو نہ ہو گے؟" ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ "میرا اشارہ آصف خاں کے گھر کی طرف ہے۔"

"میں کل وہاں پہنچ گیا تھا سر!" طالش نے جواب دیا۔

"اچھا!" ڈائریکٹر جنرل کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "تم کیسے پہنچ گئے؟"

"آصف خاں کی بیٹی صوفیہ میری کلاس فیلو رہی ہے۔ اسی نے مجھے فون پر اطلاع دی تھی۔ میں ایسی صورت میں دیر کیسے لگا سکتا تھا۔ فوراً پہنچ گیا۔ بروقت جانے سے یہ

فائدہ ہوا کہ وہاں سبھی لوگوں کو دیکھ بھی لیا۔ یہ چہرہ آشنائی کسی وقت شاید کام بھی آئے۔"

"ہاں یہ کیس تو تمہارے سیکشن کی توجہ چاہتا ہے۔ تمہیں خاصی معلومات بھی حاصل ہوگئی ہوں گی۔"

"جی ہاں۔" طالش نے جواب دیا اور وہ سب کچھ زبان پر لے آیا جو اس کے علم میں آچکا تھا۔

"پیچیدہ معاملہ ہے۔" ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ "پولیس کے بس کی بات تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔" "تم کیا قدم اٹھاؤ گے؟" پوچھا گیا۔

"میں ابھی دفتر پہنچا ہوں۔ دو تین افراد کو کچھ ہدایات دیتا لیکن آتے ہی معلوم ہوا کہ آپ نے طلب کیا ہے۔"

"اوہ......! دراصل ابھی میں کچھ فارغ تھا، اس لیے تمہیں بلالیا۔ تم فوراً جاؤ اور اپنا کام شروع کرو۔"

طالش ڈائریکٹر جنرل کو سلام کرتا ہوا اٹھا اور اپنے سیکشن میں پہنچا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے ایک ماتحت زاہد کو طلب کیا۔

"کل آصف خاں کے گھر پر جو کچھ ہوا، وہ تمہارے علم میں آچکا ہوگا۔"

"جی ہاں، اخبارات میں سب کچھ آچکا ہے۔ ٹی وی پر خبریں بھی سنی تھیں۔"

"آصف خاں کی پارٹی میں ایک خاتون ہیں مسز نشتر۔" طالش نے کہا۔ "تم ان کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ مطلب یہ کہ ان کا ماضی اور سیاسی لوگوں سے ان کے مراسم کس حد تک ہیں۔ ان کے بارے میں دوسرے لوگوں کی رائے کیا ہے۔ ان کی گھریلو زندگی کیسی ہے۔"

"بہتر۔" زاہد نے جواب دیا۔ "میں فوراً حرکت میں آتا ہوں۔" زاہد نے اٹھنا چاہا۔

"شوکت کو بھیجتے جانا۔" طالش نے کہا۔

شوکت بھی اس کے ماتحتوں میں سے ایک تھا۔ اس سے بھی طالش نے پہلا سوال وہی کیا جو زاہد سے کرچکا تھا۔ شوکت نے بھی وہی جواب دیا جو زاہد دے چکا تھا۔

"مجھے میر باقر کے سلسلے میں معلومات درکار ہیں۔ خصوصاً یہ کہ اس نے نبیل رند کو شوفر کی حیثیت سے کیوں ملازم رکھا تھا؟"

"اس کا بیان تو سامنے آچکا ہے۔"

"وہی تو معلوم کرنا ہے کہ وہ بیان درست ہے یا نہیں۔ ممکن ہے پس منظر میں کوئی اور بات ہو۔"

"میں سمجھ گیا۔" شوکت نے سر ہلایا۔ "آپ میر باقر پر شبہ کررہے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" طالش نے کہا۔ "ابھی میں کسی پر بھی شبہ نہیں کررہا ہوں۔ ابھی میں بس ان لوگوں کے بارے میں معلومات چاہتا ہوں۔ کوئی خاص بات علم میں آئے بغیر کسی پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اب تم جاسکتے ہو۔ ایک کام اور بھی ہے لیکن وہ میں سرفراز سے لوں گا، اسے بھیج دینا۔"

دو تین منٹ بعد ہی سرفراز اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"تمہیں آصف خاں کی مخالف پارٹی پیپلز اسٹیٹ کے سربراہ واجد امیر کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔" طالش نے اس سے کہا۔

"اس کا مختصر بیان تو آچکا ہے اخبار میں۔"

"وہ میں بھی پڑھ چکا ہوں۔ اس کا بیان میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہوسکتا ہے وہ جھوٹ ہو۔ وہ پولیس کو آصف خاں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہو۔"

کسی صحافی نے واجد امیر کو فون کرکے پوچھا تھا کہ اس واردات کے سلسلے میں اس کا خیال کیا ہے تو اس نے جواب دیا تھا کہ مجھے سردار رند کے قتل ہوجانے کا بہت افسوس ہے کیونکہ وہ چند روز میں ہی آصف خاں کی پارٹی چھوڑ کر میری پارٹی میں آنے والا تھا۔ اس جواب پر صحافی نے اسے مزید کریدنے کی کوشش کی تھی لیکن واجد امیر نے فون بند کردیا تھا۔

"سیاست دانوں میں چونچیں تو لڑتی ہی رہتی ہیں۔" طالش نے مزید کہا۔ "اور انتخابات کے زمانے میں تو بیان بازیوں میں تیزی بھی آجاتی ہے۔ خیر! تمہیں وہ کرنا ہے، جو میں نے ابھی تم سے کہا ہے۔"

سرفراز کو رخصت کرنے کے بعد اس نے سگریٹ سلگائی اور ٹہلنے لگا۔ وہ عموماً سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن جب کوئی اُلجھن ہوتی تھی تو وہ بعض اوقات چین اسموکر بن جاتا تھا۔

سگریٹ پیتے ہوئے وہ تمام معاملے کو اپنے ذہن میں دہرانے لگا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ سب کچھ ویسا نہیں ہے جیسا سامنے آیا ہے۔ وہ سب کچھ اس کے لیے ایک دبیز پردہ تھا اور اسے اس پردے کے پیچھے دیکھنا تھا۔

شام تک اسے جو پہلی رپورٹ ملی، وہ زاہد کی تھی۔ اس نے بتایا کہ مسز نشتر بیوہ تھیں لیکن مرحوم شوہر نے اس کے لیے خاصا کچھ چھوڑا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ فطرتاً وہ

بہت آزاد خیال تھی۔
اس رپورٹ میں طالش کے لیے ایک اہم بات یہ تھی کہ میر باقر ہی نے نبیل رند کو اپنے شوفر کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا اور مسز نشتر سے اس کے تعلقات اتنے قریبی تھے جس کے باعث میاں بیوی کے تعلقات میں کشیدگی آ گئی تھی۔
اس رپورٹ پر کچھ غور کرنے کے بعد طالش نے زاہد سے کہا۔ ”اب یہ بھی معلوم کرو کہ ان دونوں کے تعلقات کیا کسی خاص حد تک آگے بڑھ چکے ہیں یا معاملہ بس مسز نشتر کی آزاد خیالی کا ہے۔ دوسری بات یہ بھی معلوم کرنی ہوگی کہ سردار رند اور میر باقر کے تعلقات کیسے تھے۔“
طالش کی دانست میں اس رپورٹ کے باعث کیس کی پیچیدگی میں کچھ اضافہ ہوا تھا۔
شام کے قریب ہی صوفیہ کی کال بھی آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے والد کے ساتھ پارٹی کی میٹنگ میں شریک ہوگی جس کے لیے آصف خاں کا ایک ہی ایجنڈا تھا۔ وہ صوفیہ کو صوبائی صدر بنانا چاہتا تھا۔
دوسری بات صوفیہ نے یہ بتائی کہ آصف خاں کی درخواست پر حکومت نے اس کی سیکیورٹی کا بندوبست کر دیا تھا۔
”میٹنگ کے بعد آؤں گی تمہارے گھر۔“ صوفیہ نے کہا تھا۔ ”یہ تو بتاؤں گی تمہیں کہ میٹنگ میں میرے صوبائی صدر بننے کے بارے میں کیا گفتگو ہوئی۔“
”وہ تو میں یقیناً جاننا چاہوں گا۔ دیکھنا کہ میر باقر پر کیا ردِعمل ہوتا ہے۔“
”ہاں۔“ صوفیہ نے کہا۔ ”اسے افسوس تو ہوگا صوبائی صدارت چھن جانے کا۔ اچھا اب... رات کو ملاقات پر ہی باتیں ہوں گی۔“
”کب تک آؤ گی؟“
”میٹنگ سات بجے ہے۔ میرا خیال ہے ایک گھنٹے میں ختم ہو جانی چاہیے۔ پھر بس کھانا کھا کر آ جاؤں گی۔ شاید نو بجے سے پہلے پہلے۔ ہاں اگر میٹنگ لمبی ہو گئی تو اور بات ہے۔“
”دیر ہو جانے کی صورت میں مجھے فون کر دینا۔“
”کیا کہیں جانے کا ارادہ ہے؟“
”ابھی تو کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن شاید کوئی وجہ ہو جائے کہ مجھے کہیں جانا پڑے۔“
”ٹھیک ہے۔ میں فون کر دوں گی۔“
”انتظار رہے گا مجھے۔“

وہ دونوں ایک دوسرے سے گھر پر ہی ملاقات کیا کرتے تھے۔ آصف خاں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ طالش اس کے گھر آ کر صوفیہ سے ملتا ہے یا صوفیہ اس کے گھر چلی جاتی ہے۔ طالش رہتا ہی اکیلا تھا۔ اس کے والدین کسی دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ ویسے وہ اپنے گھر والوں کو صوفیہ کے بارے میں بتا چکا تھا اور ان لوگوں نے اس کے تیور دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ وہ صوفیہ ہی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔
ساڑھے آٹھ بجے اس نے کھانا کھا لیا۔ وہ خود ہی کھانا پکا لیا کرتا تھا۔ ہاں اگر کسی قسم کی مصروفیت ہوتی تھی تو کسی ہوٹل کا رخ کر لیتا تھا۔
نو بجے صوفیہ کا فون آیا۔ ”میٹنگ طویل ہو گئی۔ ابھی ختم ہوئی ہے۔ اب کھانا کھا کر آؤں گی۔ کہیں جانا تو نہیں ہے؟“
”میرا خیال ہے کہ اب اس کا امکان نہیں ہے۔ تم صوبائی صدر بن گئیں یا نہیں؟“
”متفقہ طور پر بن گئی۔“ صوفیہ نے ہنس کر کہا۔ ”کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ میر باقر نے تو خوشی کا اظہار کیا تھا کہ اسے خاصی ذمّے داریوں کے بوجھ سے نجات مل گئی۔“
”اس قسم کی باتیں تو لوگ کرتے ہی ہیں۔ دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ بات لوگوں کے چہروں سے پڑھی جاتی ہے۔“
”اب تم سکھانا مجھے فیس ریڈنگ۔“
”ہوں۔“ طالش زیرِلب مسکرا دیا۔
”اچھا بس!“ صوفیہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
طالش پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ فی الحال تو میر باقر ہی کسی نہ کسی حد تک مشتبہ سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ مسز نشتر بھی!
چند منٹ بعد ہی فون پر سرفراز کی رپورٹ ملی۔ ”اب تک اگر کوئی خاص بات معلوم ہو سکی ہے تو وہ یہ ہے کہ واجد امیر کی پارٹی کا کوئی عسکری ونگ بھی ہے۔ یہی الزام وہ دوسری کئی پارٹیوں پر بھی لگاتا ہے۔ اس کی غیر سیاسی یا ذاتی زندگی کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس نے تین شادیاں کی تھیں۔ ایک کو وہ طلاق دے چکا ہے۔ اس سے ایک لڑکا بھی ہے جو ستائیس اٹھائیس سال کا ہے۔ اب جو دو بیویاں ہیں، ان سے بھی اس کے بچے ہیں لیکن ابھی لڑکپن کی عمر میں ہیں۔ بڑی لڑکی ساتویں جماعت کی طالبہ ہے۔“
”ٹھیک ہے۔“ طالش نے کہا۔ ”اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش جاری رکھو۔“ مزید کچھ سنے بغیر

اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔
پانچ منٹ بعد فون پر ہی شوکت کی رپورٹ بھی ملی۔ اس نے کہا تھا۔ ''وہ ایک بڑا جاگیردار ہے۔ خاصی زمینیں ہیں اس کی۔ اسے فلائنگ کا شوق ہے۔ اپنی زمینوں ہی پر اس نے رن وے بھی بنوایا ہے جہاں اس کا ایک جہاز اور ایک ہیلی کاپٹر بھی ہوتا ہے جو وہ خود ہی اُڑاتا ہے۔ لائسنس ہے اس کے پاس...... اس کے سبھی جاننے والے اس کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ شادی شدہ ہے۔ اس کی اولادیں دو ہیں۔ بڑی لڑکی تعلیم حاصل کرنے امریکا گئی ہوئی ہے۔ لڑکا کچھ آوارہ مزاج ہے، اس نے کچھ زیادہ پڑھا بھی نہیں۔ ایف اے کے بعد ہی کالج چھوڑ دیا تھا۔ میر باقر اپنے اس بیٹے سے خوش نہیں ہے۔ بس برداشت کر رہا ہے اسے کیونکہ اس لڑکے کو اس کی ماں بہت چاہتی ہے۔''
''مزید کچھ نہیں معلوم کر سکے۔'' طالش بولا۔ ''اچھا خیر، لگے رہو۔''
''بہتر۔'' شوکت نے کہا۔
طالش نے ریسیور رکھ دیا۔
پھر آدھا گھنٹا اور گزر گیا۔
اب تک تو آ جانا چاہیے تھا صوفیہ کو، وہ سوچنے لگا۔
اسی سوچ میں دس منٹ اور گزر رہے تھے کہ صوفیہ کی کال آ گئی۔
''سوری طالش!'' اس نے کہا۔ ''میں لیٹ ہو گئی۔'' اس نے کہا۔
''سیاست میں آ گئی ہو۔'' طالش نے مسکرا کر کہا۔ ''انکل نے کوئی سیاسی مسئلہ چھیڑ دیا ہوگا۔''
''ارے نہیں۔'' صوفیہ ہنسی۔ ''میں ہی راستے میں ایک جگہ رک گئی تھی۔ وہ ایک ہوٹل ہے نا تم تو جانتے ہو مجھے وہاں کا فالودہ بہت پسند ہے۔ راستے میں پڑا تو سوچا کہ یہاں سے فالودہ پی لوں۔ تمہیں فالودہ پسند نہیں ہے ورنہ تمہارے لیے لے کر آتی۔ اب واپس نکل آئی ہوں ہوٹل سے۔ پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ اچانک خیال آیا کہ اگر کہیں ٹریفک میں پھنس گئی تو اور لیٹ ہو جاؤں گی۔ بس اسی لیے تمہیں فون کیا ہے۔''
''اس وقت تو ٹریفک کی زیادتی کے باعث بھی لیٹ ہو جاتے ہیں لوگ۔''
''کوشش کروں گی کہ قدرے کم ٹریفک کی سڑکوں سے نکلوں۔''
''ایسی سڑکوں پر بھی غیر متوقع طور پر ٹریفک جام ... ہو جاتا ہے۔''
''خیر، کوشش تو...... اوہ، شٹ۔''
''اب کیا ہوا؟'' طالش مسکرایا۔
''پارکنگ لاٹ میں آئی ہی تھی کہ بجلی چلی گئی۔ گھپ اندھیرا......'' ساتھ ہی صوفیہ کی ایسی کراہ سنائی دی جیسے کسی چیز سے ٹکرا گئی ہو...... پھر وہ چیخی بھی۔ ''چھوڑو مجھے......''
''کیا ہوا صوفیہ؟'' طالش گھبرا کر کھڑا ہوا۔ اس وقت اسے صوفیہ کی کراہ پھر سنائی دی۔
''صوفیہ!'' طالش نے پکارنے والے انداز میں کہا۔
جواب میں صوفیہ کے بجائے ایک مردانہ دھیمی آواز سنائی دی۔ ''اس کا موبائل اٹھا کے بند کرو اور یہیں کسی کار کے نیچے پھینک دو۔''
''صوفیہ!'' اس مرتبہ طالش چیخ پڑا تھا۔
لیکن اب نہ صوفیہ کی آواز سنائی دی نہ کوئی اور آواز...... اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی باعث صوفیہ کا موبائل اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا جسے اٹھا کر بند کر دیا گیا تھا۔
طالش کا سارا جسم سنسنا گیا۔ اس کے ذہن میں فوری طور پر یہی خیال آیا کہ صوفیہ کو اغوا کیا جا رہا تھا اور وہ کم از کم دو آدمی تھے۔
طالش کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔ اس نے فوراً موبائل پر کسی کا نمبر ملایا۔
رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''یس سر!''

☆☆☆

اس وقت طالش کے جاری کردہ احکام کے باعث ان پولیس موبائلز نے جو اس ہوٹل کے آس پاس تھیں، ہوٹل کے اردگرد کا خاصا علاقہ گھیرے میں لے لیا اور گاڑیوں کی چیکنگ بھی شروع کر دی لیکن یہ سب کچھ ہونے میں اتنا وقت لگا تھا کہ وہ کار تیز رفتاری سے بہت دور نکل گئی تھی۔
کار کی عقبی نشست پر صوفیہ اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھ پیر ڈوریوں سے بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ایک چوڑا ٹیپ لگا تھا۔
سر پر کسی ٹھوس چیز کی ضرب سے وہ بے ہوش ہوئی تھی لیکن شاید وہ بے ہوشی طویل نہیں تھی۔ اس نے اپنی پوزیشن محسوس کر لی اور کار چلانے والے کی آواز بھی سنی۔ ''اٹھا لیا ہے اسے اور اب وہیں لے جا رہا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔''

ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ خالی تھی اس لیے صوفیہ نے سمجھ لیا کہ ڈرائیونگ کرنے والا اپنے موبائل پر کسی سے مخاطب تھا۔

''بس مجھے میدان صاف ملنا چاہیے جب میں وہاں پہنچوں۔'' آواز پھر سنائی دی۔ اس کے بعد کہا گیا۔ ''ٹھیک ہے۔''

اس کے بعد آواز نہیں آئی۔ موبائل بند کر دیا گیا تھا۔

کار بہت تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔

کار کے شیشے بند تھے لیکن ٹریفک کی کچھ آواز تو آنی ہی چاہیے تھی جو نہیں آرہی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کار کسی ویران راستے پر دوڑ رہی تھی۔ تھوڑے بہت جھٹکے بھی لگ رہے تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کوئی ہموار سڑک نہیں تھی۔

صوفیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیوں اغوا کیا گیا ہے اور کس نے اغوا کیا ہے۔ یہ بات تو واضح ہو چکی تھی کہ اغوا کرنے والے ایک سے زیادہ تھے۔ اس کے اغوا کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ کسی نے عین وقت پر ہوٹل کی پارکنگ .... کی لائٹ بند کی تھی جو شخص کار ڈرائیو کر رہا تھا، اس نے موبائل پر کسی سے بات بھی کی تھی۔ بات کرنے کے انداز سے یہ بھی ظاہر ہوا تھا کہ اغوا کرنے والے کسی اور کے پابند تھے۔ اسے اغوا کرنے والا کوئی اور تھا۔

لیکن ایسا کون کر سکتا تھا؟ صوفیہ کے دماغ میں پھر سوال ابھرا۔

کیا یہ کوئی بردہ فروش گروہ ہے؟ صوفیہ نے یہ بھی سوچا۔ اس کا دماغ شدید منتشر تھا۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھی کہ اغوا کرنے والے اس کا کیا حشر کریں گے۔

کیا وہ ان سے نجات حاصل کر سکے گی؟ اس کے دماغ میں یہ سوال بھی تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ طالش سے اس کی گفتگو اچانک منقطع ہو گئی تھی جس سے طالش کو تشویش تو ہونی چاہیے تھی لیکن کیا اس نے... بھی یہ سوچا ہوگا کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے؟ اور یہ سمجھ بھی لیا ہوگا تو یقین کرنے سے پہلے وہ اس کی اطلاع پولیس کو بھی نہیں دے سکتا تھا اور اگر دے بھی دیتا تو کیا پولیس جلد از جلد اس کا سراغ لگا لیتی؟

دماغ پر سوالات کی یورش کے باوجود صوفیہ نے سر اُچکا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے اتنا معلوم ہو گیا کہ کار کسی ویران راستے پر دوڑ رہی تھی۔ اس کا اندازہ اس نے پہلے ہی لگا لیا تھا کیونکہ ٹریفک کی آواز بالکل سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''ہوش آ گیا تمھیں؟'' ڈرائیونگ کرنے والا بولا۔ اس نے عقب نما آئینے میں اسے سر اُچکاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

صوفیہ جواباً کچھ نہیں کہہ سکی۔ اس کے ہونٹوں پر چوڑا ٹیپ لگا ہوا تھا۔ وہ ''اوں آں'' قسم کی آوازیں تو نکال سکتی تھی، بول نہیں سکتی تھی۔

''تمھیں اس ٹیپ سے کچھ دیر بعد نجات مل جائے گی۔'' ڈرائیونگ کرنے والا پھر بولا۔ ''لیکن سر مت اُچکاؤ۔ یہ ویرانہ ضرور ہے لیکن اگر اتفاقاً بھی کسی نے تمھیں دیکھ لیا تو میرے لیے پریشانی ہو جائے گی۔ اس صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں گولی مار دوں۔'' اس نے آخری فقرہ بڑے سفاکانہ لہجے میں کہا تھا۔

صوفیہ بزدل نہیں تھی لیکن ڈرائیور کے لہجے کی درندگی کے باعث اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے دوبارہ سر اُچکانے کی کوشش نہیں کی۔

''تم یہ اطمینان رکھو کہ تمھارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔'' وہ پھر بولا۔ ''تمھیں بس ہماری قید میں رہنا ہوگا۔ قید میں تمھیں کھانے پینے کے لیے بھی سب کچھ ملے گا۔ یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ تمھیں کتنے دن قید میں رہنا ہوگا۔ اس کا انحصار تمھارے باپ پر ہے۔ تمھیں کل بھی رہا کیا جا سکتا ہے اگر تمھارے باپ نے ہمارا مطالبہ تسلیم کر لیا۔''

ان باتوں سے صوفیہ کی سمجھ میں آیا کہ اسے تاوان کے سلسلے میں اغوا کیا گیا ہے۔ وہ اس کے باپ سے کسی خطیر رقم کا مطالبہ کریں گے۔

''لیکن وقت صرف پانچ دن کا ہے۔'' وہ پھر بولا۔ ''اگر پانچ دن میں ہمارا مطالبہ نہ مانا گیا تو نہیں معلوم کہ تمھارا کیا حشر کیا جائے گا۔''

صوفیہ کو اندازہ تھا کہ اس کے باپ کو اس سے بہت محبت تھی۔ وہ ان لوگوں کا مطالبہ ماننے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ یہ اندازہ وہ نہیں لگا سکتی تھی کہ کتنی بڑی رقم کا مطالبہ کیا جائے گا لیکن یہ وہ سوچ سکتی تھی کہ اس قسم کے لوگ اپنے شکار کی حیثیت ہی کے مطابق مطالبہ کرتے ہیں۔

''او، شٹ۔'' ڈرائیونگ کرنے والے کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

صوفیہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ وہ کس بات پر جھنجلایا تھا۔

پھر وہ غالباً موبائل پر کسی سے بات کرنے لگا۔

"آخر کس بے وقوف نے اس کار کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے ابھی دیکھا ہے کہ اس میں بہت کم پیٹرول رہ گیا ہے۔"

دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد وہ پھر بولا۔ "جی ہاں میں یہ راستہ دیکھ چکا ہوں۔ یہ راستہ بہت کم لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن کرتے ہیں کیونکہ اس راستے سے ایک شہر کچھ قریب پڑتا ہے۔ اسی لیے ویرانے میں ایک پیٹرول پمپ ہے لیکن میں اندازہ نہیں لگا سکتا کہ کار اس پیٹرول پمپ تک بھی پہنچ سکے گی یا نہیں؟"

دوسری طرف سے جو کچھ بھی کہا گیا ہو، ڈرائیونگ کرنے والے نے کچھ بڑبڑا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

رابطہ منقطع ہونے کی بات صوفیہ نے اس لیے سمجھ لی کہ پھر ڈرائیونگ کرنے والے نے کچھ نہیں کہا لیکن وہ زیرِلب کچھ بڑبڑاتا رہا۔ اسے اس آدمی پر غصہ آرہا ہوگا جس نے پیٹرول کی مقدار پر دھیان نہیں دیا تھا۔

صوفیہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر کار پیٹرول پمپ تک نہ پہنچ سکی تو کیا ہوگا لیکن منہ پر لگے ہوئے ٹیپ کی وجہ سے وہ کچھ بول ہی نہیں سکتی تھی۔

دماغ میں سوالات گردش کرتے رہے۔ طالش پر نہ جانے کیا ردِعمل ہوا ہو؟ کیا یہ بات ظاہر ہوگئی ہوگی کہ اسے اغوا کرلیا گیا ہے؟ کیا اس کی اطلاع پولیس کو دی گئی ہوگی؟ ان سوالات ہی کے باعث صوفیہ نے نتیجہ اخذ کیا کہ اس کے اغوا کی بات پوشیدہ نہیں رہی ہوگی۔ ڈرائیونگ کرنے والے نے کسی کو اطلاع دے دی تھی کہ اسے اغوا کرلیا گیا ہے۔ جس شخص نے اسے اغوا کروایا تھا، اس نے آصف خاں سے رابطہ کر کے اسے بتا دیا ہوگا کہ اس کی بیٹی کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ یہ اطلاع دے کر ہی آصف خاں سے رقم کا مطالبہ کیا جاسکتا تھا۔

پریشان تو ہوں گے سب، صوفیہ نے اپنے باپ اور طالش کے بارے میں اس طرح سوچا جیسے وہ خود پریشان نہیں تھی۔

وہ اپنے خیالات کے بھنور سے اس وقت نکلی جب کار کی رفتار کم ہوتی چلی گئی۔ باہر اس نے روشنی بھی محسوس کی جو پیٹرول پمپ ہی کی ہوسکتی تھی۔ ڈرائیونگ کرنے والا انجن بند کر کے کار سے اترا۔ اس وقت صوفیہ اس کی وارننگ بھول ہی گئی اور بے اختیار سر اُچکا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

وہ پیٹرول پمپ ہی تھا جہاں صرف دو افراد نظر آئے۔ ایک تو پیٹرول بھرنے والا تھا اور دوسرا سیکیورٹی گارڈ!

پیٹرول ڈالنے والا پائپ سنبھال کر کار کے قریب آیا۔ ڈرائیونگ کرنے والے نے اس سے کچھ کہا۔ کار کے شیشے بند ہونے کی وجہ سے صوفیہ کو آواز اتنی مدھم آئی تھی کہ الفاظ صوفیہ کی سمجھ میں نہیں آئے۔

کار میں پیٹرول بھرا جانے لگا۔

صوفیہ پھر سیدھی لیٹ گئی ورنہ خدشہ تھا کہ ڈرائیونگ کرنے والا اس کا اُچکا ہوا سر دیکھ لیتا۔

صوفیہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا کہ یہ ایک ایسا موقع ہے جب وہ کچھ کرسکتی ہے۔ اس نے "اوں غوں" کی آوازیں نکالنی شروع کیں اور اٹھ کر بیٹھ بھی گئی۔ اس کی اوں غوں کی آوازیں شاید باہر نہیں پہنچ سکیں اس لیے اس نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے شیشہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سیکیورٹی گارڈ کے پاس رائفل تھی۔ وہ کار سے کچھ دور تھا لیکن رائفل سے وہ بہ آسانی کسی گڑبڑ والی صورتِ حال کو سنبھال سکتا تھا۔

اس وقت پیٹرول بھرا جاچکا تھا۔ ڈرائیونگ کرنے والے نے پیسے دینے کے لیے پرس نکالا تھا۔

شیشے پر پڑنے والی ضربوں نے نہ صرف پیٹرول ڈالنے والے کو بلکہ ڈرائیونگ کرنے والے کو بھی چونکا دیا۔ اس نے ڈرائیونگ کرنے والے کی طرف دیکھ کر کچھ کہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یکدم تبدیل ہوگئے تھے۔ اس نے سیکیورٹی گارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بھی کچھ کہا۔

پیٹرول ڈالنے والا شیشہ پیٹنے کی آوازوں سے زیادہ اس پر چونکا ہوگا کہ صوفیہ کے ہونٹوں پر ٹیپ لگا ہوا تھا۔

ڈرائیونگ کرنے والا جھپٹ کر پیٹرول ڈالنے والے کی طرف آیا اور اس سے پیٹرول ڈالنے کا پائپ چھین کر اسی پر پیٹرول کی دھار ماری۔ یقیناً وہ بہت پھرتیلا بھی تھا۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کر ایک تیلی جلائی اور پیٹرول ڈالنے والے کی طرف اچھال دی۔ دوسرے ہی پل پیٹرول ڈالنے والا شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔

اس کی چیخ پکار اتنی زیادہ تھی کہ صوفیہ کو بھی سنائی دے گئی۔

ڈرائیونگ کرنے والے نے تیزی سے پیچھے ہٹ کر خود کو آگ کے شعلوں سے بچایا تھا اور پھر پیٹرول کی دھار سیکیورٹی گارڈ پر ماری تھی جو اس کی طرف رائفل تان رہا تھا۔ ڈرائیونگ کرنے والے نے تیلی جلا کر پوری ماچس ہی جلا دی اور جلتی ہوئی ماچس سیکیورٹی گارڈ کی طرف پھینکی۔

اسے فائر کرنے کا موقع نہیں مل سکا اور وہ بھی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

صوفیہ نے اپنی زندگی میں ایسا خوفناک منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دو آدمی آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے چیخ پکار کر رہے تھے۔

ڈرائیونگ کرنے والا پائپ پھینک کر کار کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا۔

صوفیہ کا دل ڈوب چکا تھا۔ اپنے بچاؤ کے لیے اس کی کوشش ناکام ہو چکی تھی اور اب اسے خدشہ تھا کہ ڈرائیونگ کرنے والا اس کے ساتھ کسی قسم کی سختی بھی کر سکتا ہے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور کار تیزی سے حرکت میں لے آیا۔

''میں تمہیں اس کی سزا تو دوں گا لڑکی!'' وہ غرایا۔

صوفیہ نے کار کے عقبی شیشے سے دیکھا کہ پیٹرول ڈالنے والا شعلوں میں گھرا ہوا زمین پر گر کر تڑپ رہا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ صوفیہ کو نظر نہیں آیا۔

کار اب بہت تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

طالش، صوفیہ کے گھر پہنچا تھا۔ اس نے آصف خاں کو بوکھلایا ہوا پایا۔ وہ طالش کو .... دیکھتے ہی بولے ''صوفیہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔''

خود طالش بھی یہ جاننے کے بعد ہی آصف خاں کے پاس پہنچا تھا۔ پہلے وہ ہوٹل میں پہنچا تھا۔ اس وقت پارکنگ لاٹ میں روشنی تھی۔ پولیس والے بھی موجود تھے۔ ہوٹل کے کچھ لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ ان کی وجہ سے پولیس نے طالش پر خصوصی دھیان نہیں دیا۔ وہ تو کسی ''نامعلوم'' جگہ سے دیے گئے احکامات پر عمل کر رہے تھے۔ ایک کانسٹیبل نے ایک موبائل اپنے افسر کو دیتے کہا۔ ''یہ ایک کار کے نیچے پڑا ہوا ملا ہے صاحب!''

اس قسم کے موبائل شہر میں بہت سے لوگوں کے پاس ہوں گے لیکن طالش نے یہی خیال کیا تھا کہ وہ موبائل صوفیہ ہی کا تھا۔ اس نے فون پر ایک مردانہ آواز سن لی تھی جس نے اپنے کسی ساتھی سے کہا تھا کہ وہ موبائل بند کر کے پھینک دو۔ یقیناً صوفیہ کے ہاتھ سے موبائل گر گیا ہوگا۔

جو پولیس موبائلز علاقے کو گھیرے میں لے کر گاڑیاں چیک کر رہی تھیں، ان کی رپورٹ بھی طالش کو مل چکی تھی۔ کسی گاڑی میں صوفیہ کو نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس کا صریح مطلب یہ تھا کہ صوفیہ کو اغوا کرنے والے بہت تیزی سے نکل گئے تھے۔

ہوٹل سے طالش سیدھا صوفیہ کے گھر پہنچا تھا۔ راستے میں اس نے موبائل پر کسی سے کہا تھا کہ اسے برابر رپورٹ دی جاتی رہے۔

آصف خاں کی بات کے جواب میں اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کچھ پولیس والوں سے میرا تعلق ہے۔ مجھے ابھی سے اس بارے میں معلوم ہوا لیکن آپ کو یہ اطلاع کس نے دی؟''

''فون آیا تھا کسی کا!'' آصف خاں نے جواب دیا۔ ''اسی نے مجھے بتایا کہ اس نے صوفیہ کو اغوا کروا لیا ہے۔ اس نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ میں خود کو الیکشن سے الگ کر لوں۔ اگر میں نے کاغذات نامزدگی واپس نہ لیے تو مجھے اپنی بیٹی کی لاش دیکھنی ہوگی۔'' آصف خاں کی آواز کچھ بھرا گئی۔ ''میں نے ابھی آئی جی کو بھی اس بات سے آگاہ کر دیا ہے۔''

''پھر آپ کا کیا ارادہ ہے؟'' طالش نے پوچھا۔ پریشانی اس کے لہجے میں بھی تھی۔

''لعنت بھیجتا ہوں میں ایسی سیاست پر۔'' آصف خاں نے کہا۔ ''مجھے اپنی بیٹی چاہیے۔ میں کل ہی کاغذات نامزدگی واپس لے لوں گا۔ آئی جی کہہ رہا تھا کہ میں تحمل سے کام لوں۔ وہ خود بھی کچھ دیر میں یہاں آنے والا ہے۔''

''کاغذات نامزدگی واپس لینے کی آخری تاریخ کیا ہے۔'' طالش نے پوچھا۔

''اس میں تو ابھی پانچ دن باقی ہیں لیکن......''

''آئی جی صاحب نے ٹھیک کہا ہے انکل!'' طالش نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''تحمل سے کام لیجیے۔ ابھی کافی وقت ہے پولیس صوفیہ کو بازیاب کرا سکتی ہے۔''

''میرے موبائل پر جو نمبر آیا تھا، میں نے فوراً اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میں صبح ہوتے ہی کاغذات نامزدگی واپس لے لوں گا لیکن مجھے فون بند ملا۔''

''وہ اس نے شاید کسی گٹر میں ہی پھینک دیا ہو۔'' طالش نے کہا۔ ''اس موبائل کی وجہ سے اس کو ٹریس کیا جا سکتا تھا۔ اب وہ آپ کو فون کرے گا تو کسی دوسرے موبائل سے کرے گا اور وہ موبائل بھی ضائع کر دے گا۔''

''میں کیا کروں!'' آصف خاں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

وہ اس وقت ایک باوقار سیاست داں نہیں، ایک بیٹی

کے باپ ...... نظر آرہے تھے جن کا دل اپنی بیٹی کے لیے تڑپ رہا تھا۔

''ہمت کیجیے انکل۔'' طالش نے انہیں فرش سے اٹھایا۔''ہمت کیجیے!''

''بیٹی کے باپ کے لیے ہمت کرنا شاید ممکن نہیں۔''

طالش نے انہیں لے جا کر ایک صوفے پر بٹھایا۔

''یہ آپ کی بیٹی کا معاملہ ہے۔'' وہ بولا۔''صوفیہ کسی ایرے غیرے کی بیٹی نہیں ہے۔ پولیس سر دھڑ کی بازی لگا دے گی۔''

''نہ جانے کب تک......'' آصف خاں اتنا ہی بول سکے۔

''آپ نے پارٹی کے لوگوں کو یا کسی اور کو تو اس کی اطلاع نہیں دی؟''

''صرف آئی جی کو فون کیا تھا۔''

''مناسب یہی ہے کہ بات راز میں رکھی جائے۔''

''کب تک؟'' آصف خاں نے دانت ہونٹوں میں دبا لیے۔

''جب تک ممکن ہو۔''

اسی وقت طالش کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

''یس!'' اس نے کہا۔

''ابھی ایک بہت اہم اطلاع ملی ہے۔'' جواب آیا۔

''ایک منٹ۔'' طالش نے بولنے والے کو روکا، پھر آصف خاں سے کہا۔''ایکسکیوز می انکل!'' اور پھر وہ کچھ دور ہٹتا چلا گیا۔''ہاں، کیا اطلاع ہے؟''

دوسری طرف سے بولنے والے نے پہلے تو ایک مقام کا نام بتایا، پھر کہا۔''وہاں پیٹرول پمپ پر ایک کار پیٹرول لینے کے لیے رکی تھی۔ پیٹرول ڈالنے والے نے اس کار میں ایک لڑکی کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر ٹیپ لگا ہوا تھا۔''

''پھر؟'' طالش نے بے چینی سے پوچھا۔

دوسری طرف سے وہی سب کچھ بتایا گیا جو اس پیٹرول پمپ پر ہوا تھا۔

''جب دونوں ہی جل گئے تو اطلاع......؟'' طالش نے پوچھا۔

''سیکیورٹی کا آدمی کچھ باہمت تھا۔ وہ جلتی ہوئی حالت میں ہی پیٹرول پمپ کی عمارت کے پچھلے حصے میں آ گیا تھا۔ وہاں گاڑیوں میں پنکچر لگانے والا...سو رہا تھا۔ سیکیورٹی والے نے پانی کے ٹب میں گر کر اپنی آگ بجھائی۔ اس کی حالت بہت غیر ہو چکی تھی لیکن اس نے کچھ ہمت سے کام لیا۔ موبائل پر پولیس ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے رپورٹ دی۔ اس کی آواز بہت رک رک کر آرہی تھی۔ پھر وہ خاموش ... ہو گیا۔ شاید بے ہوش ہو گیا ہو یا......'' جواب دینے والا ایکا یک رکا پھر بولا۔''اب پولیس کی گاڑیاں تیزی سے وہیں جا رہی ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ کوئی اور بات تو نہیں؟''

''جی نہیں۔''

طالش اپنا موبائل بند کرتا ہوا آصف خاں کی طرف لوٹا۔

''انکل آپ خود کو سنبھالیں۔ ابھی مجھے ایک پولیس والے ہی نے بتایا ہے کہ صوفیہ کو ایک کار میں کس طرف لے جایا جا رہا ہے۔''

''کہاں؟'' آصف خاں نے بے چینی سے پوچھا۔

''ابھی مجھے تفصیل معلوم نہیں ہوئی۔ جا کر پوچھنا پڑے گا۔''

اسی وقت ایک ملازم نے آ کر آصف خاں کو آئی جی کے آنے کی اطلاع دی۔

طالش بولا۔''آپ اُن سے ملیے انکل...... میں جا رہا ہوں۔ جو کچھ معلوم ہوگا، آ کر آپ کو بتاؤں گا۔ ویسے بہت ممکن ہے کہ آئی جی صورتِ حال سے آگاہ ہوں۔ آپ کو اسی سے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

آصف خاں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

طالش باہر نکلا تو آئی جی سے آمنا سامنا ہو گیا۔

''آئی جی نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ آپ کون ہیں؟''

''مجھے صوفیہ کا منگیتر سمجھیے۔ میں وہاں سے باہر اس لیے آ گیا کہ آپ انکل سے تنہائی میں بات کر سکیں۔''

آئی جی سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ایک ملازم اسے ڈرائنگ روم کی طرف لے جا رہا تھا۔ آئی جی کے ساتھ ڈی ایس پی بھی تھا۔

طالش نے اپنی کار سنبھالی اور تیز رفتاری سے روانہ ہو گیا۔ اس کی منزل وہی پیٹرول پمپ تھا جس کے بارے میں اسے اطلاع ملی تھی۔

☆☆☆

کار تیزی سے دوڑ رہی تھی اور صوفیہ کا دماغ ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ وہ اس خیال سے خوف زدہ تھی کہ اس کا اغوا

کار اب اس سے نہ جانے کیسے پیش آئے۔ عورت تو مردوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتی ہے۔ وہ خاصی صحت مند تھی لیکن صحت مند عورتیں بھی اپنے سے کم صحت مند نظر آنے والے مردوں سے مزاحمت نہیں کر پاتیں۔

''میں تمہیں اس کی سزا تو دوں گا لڑکی۔'' اغواکار نے کہا۔

اس بات سے صوفیہ کے ذہن میں ایک ہی بات آئی تھی۔ اگر وہ اسے وہ سزا دیتا جس کا خیال اسے آیا تھا تو صوفیہ دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جاتی اور اسے خودکشی کرنے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔

یکا یک وہ چونکی۔ اس نے بے تحاشا گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے آگے کہیں کوئی زبردست معرکہ چھڑ گیا ہو۔

وہ آوازیں سن کر اغواکار کا ردعمل غیر معمولی تھا۔

''گڈ۔'' صوفیہ نے اس کی آواز سنی تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ گولیاں چلنے کی آوازیں اس کے لیے متوقع تھیں اور اسے شاید انہی کا انتظار تھا۔

گولیاں چلنے کی وہ آوازیں آگے سے اور کہیں دور سے آئی تھیں۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کا سلسلہ چار پانچ منٹ میں ہی رک گیا۔

پھر ایک منٹ اور گزرا تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ ظاہر ہے کہ وہ موبائل اغواکار ہی کا ہوگا۔ صوفیہ کا موبائل تو اسی وقت اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا جب وہ اغوا ہو رہی تھی۔

اغواکار کی آواز سنائی دی۔ ''میں نے گولیاں چلنے کی آوازیں سن لی ہیں۔ یقیناً میدان صاف ہو گیا ہوگا...... جی ہاں، پیٹرول تو ختم ہو گیا تھا لیکن میں پیٹرول پمپ تک پہنچ گیا تھا۔ وہیں سے پیٹرول بھروالیا لیکن وہاں میں مصیبت میں پھنستے پھنستے بچا ہوں۔'' چند لمحے رک کر اس نے پیٹرول پمپ پر پیش آنے والا واقعہ سنایا اور کہا کہ میں اس لڑکی کو سزا تو دوں گا۔'' لیکن پھر رک کر بولا۔ ''بہتر ہے۔ ہوگا تو وہی جو آپ چاہیں گے۔'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں اب بس پانچ منٹ میں وہاں پہنچ جاؤں گا...... جی ہاں، جزیرے پر پہنچنے کے بعد آپ کو اطلاع دوں گا...'' یہ کہہ کے اس نے گفتگو ختم کر دی۔

''خوش ہو جاؤ لڑکی!'' اغواکار خشک لہجے میں بولا۔ ''تمہارے لیے سفارش آ گئی ہے۔ میں تمہیں اب کوئی سزا نہیں دے سکتا۔''

صوفیہ نے اس بات سے سکون محسوس کیا لیکن ایک بات نے اسے شدید اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ اغواکار نے فون کرنے والے سے کہا تھا کہ وہ جزیرے پر پہنچ کر فون کرنے والے کو اطلاع دے گا۔

'یہ کیسے ممکن ہے؟' صوفیہ سوچ رہی تھی، کیا یہ کار سمندر میں بھی چل سکتی ہے؟ اغواکار اسے کسی جزیرے میں کیسے لے جا سکے گا؟'

یہ بات اس کی سمجھ میں تھوڑی دیر بعد آسکی۔

پانچ منٹ بعد کار رک گئی تھی اور اغواکار انجن بند کر کے کار سے اترا تھا۔

''سب کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔'' ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

''گولیوں کی آواز سن کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔'' یہ اغواکار کی آواز تھی۔ ''وہاں اتنے محافظ ہوتے ہی نہیں ہیں جن کو تم لوگ ختم نہیں کر پاتے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر صوفیہ کے ہونٹوں سے چپکا ہوا ٹیپ اکھاڑ کر اس کی بندھی ہوئی ٹانگیں کھول رہا تھا۔

''اترو گاڑی سے۔'' اس نے سخت لہجے میں حکم دیا۔

صوفیہ کار سے اتر آئی۔ اس نے وہاں چار پانچ افراد دیکھے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں اور مشین گنیں تھیں۔ ان ہتھیاروں کی کارکردگی بھی دکھائی دے گئی۔ وہاں اِدھر اُدھر دس بارہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر صوفیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ احساس رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہی تھا کہ وہ نہایت خطرناک لوگوں میں تھی۔

''کام آسانی سے ہو گیا ہوگا؟'' اغواکار نے مسلح افراد سے پوچھا۔

''ہاں، انہیں توقع ہی نہیں ہوگی کہ وہاں اس قسم کا حملہ کیا جا سکتا ہے پھر بھی انہوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش تو کی تھی۔''

''تم لوگوں میں سے تو کوئی زخمی بھی نہیں ہوا۔'' اغواکار نے ان میں سے ایک کو غور سے دیکھا۔

''ہاں، ہم بالکل محفوظ رہے ہیں۔''

ان لوگوں کی باتوں کے دوران میں صوفیہ کی نظریں اس ہیلی پیڈ کی طرف بھی گئیں جہاں ایک ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ دوسری جانب ایک لینڈ کروزر بھی نظر آئی۔

ہیلی کاپٹر کو دیکھ کر صوفیہ کو خیال آیا تھا کہ کسی جزیرے پر جانے کے لیے شاید وہ ہیلی کاپٹر ہی استعمال کیا جائے گا۔

''بس اب تم لوگ نکل جاؤ۔'' اغواکار نے مسلح لوگوں

سے کہا۔ ''لیکن اپنے شہر کی طرف واپس نہ جانا۔ اس طرف ایک حادثہ ہو گیا ہے۔'' اغوا کار کا اشارہ یقیناً پیٹرول پمپ کی طرف تھا۔ ''امکان کم ہے لیکن شاید کسی طرح پولیس کو اس کا علم ہو گیا ہو۔ اگر تم لوگ اس طرف سے لوٹو گے تو شاید تمہیں شبہے کی نظر سے دیکھا جائے۔''

''اور یہ......'' کسی نے صوفیہ کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے میں ہی لایا ہوں۔'' اغوا کار نے منہ بنایا۔ ''اب بھی میں ہی اس کے لیے کافی ہوں۔ تم لوگ نکلو یہاں سے۔''

ان لوگوں نے سر ہلائے اور لینڈ کروزر کی طرف بڑھ گئے۔

''چلو۔'' اغوا کار نے صوفیہ کا بازو پکڑ کر ہیلی کاپٹر کی طرف قدم بڑھایا۔ اس نے لاشوں پر ایسی طائرانہ نظر ڈالی تھی جیسے اس کی نظر میں انسانی لاشوں کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

صوفیہ مجبور تھی کہ اس کے ساتھ قدم بڑھائے۔

''میرے ہاتھوں میں اب بہت تکلیف ہونے لگی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''اب یہ بھی کھولے جاسکتے ہیں لیکن اب کوئی غلط حرکت نہ کرنا۔ میرے پاس ریوالور بھی ہے۔ ایک بار تو کسی کی سفارش کی وجہ سے میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی لیکن اب اگر تم نے کچھ کیا تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

صوفیہ کچھ نہیں بولی۔ اس کے ہاتھ کھول دیے گئے۔

''کیا اب۔'' وہ بولی۔ ''ہیلی کاپٹر؟''

''ہاں۔''

ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچ کر اس نے پہلے صوفیہ کو ہیلی کاپٹر میں بٹھایا، پھر خود بھی پائلٹ کی سیٹ سنبھال لی۔ انجن اسٹارٹ کیا۔ جلد ہی وہ فضا میں بلند ہو رہا تھا۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' صوفیہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''ایک جزیرے پر۔'' اغوا کار نے جواب دیا۔ ''جب تک ہمارا مطالبہ پورا نہ ہو جائے، تم وہاں قید رہو گی۔''

صوفیہ اس کے بعد خاموش ہی رہی۔ بولنے کے لیے اس کے پاس کچھ تھا بھی نہیں۔ بس اس کے دماغ میں خیالات چکراتے رہے۔ ان میں ایک سوال بھی تھا کہ کیا اس کا کوئی ''مددگار'' اس جزیرے تک...... پہنچ سکے گا یا وہ اس قید سے اسی وقت نجات حاصل کر سکے گی جب اس کے والد ان لوگوں کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے؟

پندرہ منٹ کی پرواز کے بعد ہیلی کاپٹر نے ایک جھٹکا کھایا اور چالیس پچاس فٹ نیچے ہو گیا۔ اغوا کار نے گھبرا کر کچھ کل پرزوں کو حرکت دی۔ ہیلی کاپٹر متوازن پرواز کرنے لگا لیکن اغوا کار کے چہرے سے اب بھی پریشانی مترشح تھی۔ جب ہیلی کاپٹر نے جھٹکا کھایا تھا تو صوفیہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

''مائی گاڈ!'' اغوا کار بڑبڑایا۔ وہ ہیلی کاپٹر کی مشین چیک کر رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے یہ؟'' صوفیہ نے پریشانی سے پوچھا۔

''ابھی کچھ سمجھ میں نہیں......'' اغوا کار کے منہ سے پورا جملہ نہیں نکلا تھا کہ ہیلی کاپٹر نے پھر جھٹکا کھایا لیکن اس مرتبہ وہ نیچے نہیں گیا تھا۔

''کیا یہ خرابی ہیلی کاپٹر کو تباہ کر سکتی ہے؟'' صوفیہ کی آواز میں لرزش تھی۔

''ممکن ہے، کیا تمہیں تیرنا آتا ہے؟''

اس سوال سے صوفیہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ تیرنا تو خیر جانتی تھی بلکہ تیراکی کے ایک مقابلے میں سیکنڈ بھی آچکی تھی لیکن یہ احساس وحشت ناک تھا کہ وہ ہیلی کاپٹر سے سمندر میں کودنے پر مجبور ہو سکتی ہے۔ اس نے اغوا کار کے سوال کے جواب میں اپنے سر کو اثباتی جنبش تو دی لیکن اسے یہ خیال بھی تھا کہ اس اندھیری رات میں وہ سمندر کی سرکش لہروں سے نبرد آزما ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس نے پیراکی کے مقابلے میں حصہ تو لیا تھا لیکن وہ مقام کوئی سمندر نہیں تھا۔

''کیا پیراشوٹ نہیں ہیں؟'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہاں یہ بھی میرے لیے تعجب خیز ہے کہ پیراشوٹ نہیں ہیں جبکہ......'' اس بار پھر وہ ہیلی کاپٹر کے جھٹکے کی وجہ سے بات پوری نہیں کر سکا تھا۔ اس نے پھر کسی طرح ہیلی کاپٹر سنبھال لیا اور بولا۔ ''اب ہماری منزل دور نہیں ہے۔ بس تھوڑا ہی سا فاصلہ رہ گیا ہے۔ اگر ہمیں کودنا پڑے تو تیر کر اس جزیرے تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔ اگر واپسی کی کوشش کی تو ڈوب جاؤ گی۔ ہم سو میل سے زیادہ آگے آچکے ہیں۔ تم کتنی بھی اچھی پیراک ہو، سو میل تک نہیں تیر سکو گی۔'' اس نے یہ سب کچھ بڑی تیزی سے کہہ ڈالا تھا۔ ''جزیرے

پر نیم جنگلی سے لوگوں کی آبادی ہے۔ مجھے بھی تیر کر ہی وہاں پہنچنا ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ ہم ساتھ نہیں پہنچیں گے۔ وہ لوگ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اگر تم ان لوگوں سے کہہ دوگی کہ تم میر باقر کی مہمان ہو۔''

میر باقر کے نام نے صوفیہ کو چونکا دیا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے اغوا کروانے والا اس کے باپ کی پارٹی کا رکن ہوگا۔

''ہوں۔''

اسی وقت ایک زوردار آواز آئی، جیسے ہیلی کاپٹر کہیں سے ٹرخ گیا ہو۔

''کود جاؤ۔'' اغوا کار تقریباً چیخ پڑا۔

☆☆☆

طالش کی کار اس مقام پر جا رکی جہاں پیٹرول پمپ تھا۔ وہاں پولیس موجود تھی۔ طالش کو دو کاریں ایسی بھی دکھائی دیں جو پولیس کی نہیں تھیں۔ کچھ لوگ بھی نظر آئے جو انہی کاروں سے اترے ہوں گے۔ کسی جگہ پولیس کو دیکھ کر لوگ عموماً اس جگہ سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کچھ متجسس قسم کے لوگ ہوں گے۔ وہاں طالش نے اپنے ڈپارٹمنٹ کے ایک شخص کو اور اس کی کار بھی دیکھی۔

طالش کار سے اتر کر اس طرف بڑھا۔

دونوں کاروں کے لوگ ایک ہی جگہ کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ ایک ہی خاندان کے ہوں اور دو کاروں میں سفر کر رہے ہوں۔

''کیا صورتِ حال ہے؟'' طالش نے اپنے اسسٹنٹ کے قریب پہنچ کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

''ذرا دیر پہلے ہی پہنچی ہے پولیس۔'' اسسٹنٹ نے جواب دیا۔ ''وہ پنکچر لگانے والے سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔''

طالش نے وہیں پڑی ہوئی سوختہ لاش پر نظر ڈالی۔ دو کاروں سے اتر کر جو لوگ وہاں رکے تھے، ان میں جو عورتیں تھیں، اس لاش سے نظریں چُرا رہی تھیں۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' طالش نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔

''میں اپنی کار یہیں چھوڑ دوں؟''

''اس کی کیا ضرورت ہے، میرے پیچھے آؤ۔ ہمیں آگے جانا چاہیے۔ جس نے بھی صوفیہ کو اغوا کیا ہے، وہ اسی طرف گیا ہوگا۔ یہ بات ان پولیس والوں کو بھی معلوم ہو چکی ہوگی۔ انہیں فوراً ایک موبائل تو اس طرف روانہ کر دینی چاہیے تھی۔ چلو ہم تو چلتے ہیں۔''

طالش اور اس کے اسسٹنٹ کی کاریں وہاں سے روانہ ہوگئیں۔

طالش کی کار آگے تھی۔ وہ بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کی وجہ سے اسسٹنٹ کو بھی تیز رفتاری دکھانی پڑ رہی تھی۔

آخر وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ وہاں ایک خالی ہیلی پیڈ بھی دکھائی دیا۔ سب طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' طالش بڑبڑایا۔ ''یہاں ایک کار بھی کھڑی ہے۔ ہیلی پیڈ خالی ہے۔ اوہ خدا!'' وہ چونکا۔ صوفیہ کو یہاں سے ہیلی کاپٹر پر لے جایا گیا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے طالش نے جیب سے اپنا موبائل بھی نکال لیا تھا۔ وہ بڑبڑایا۔ ''معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ ہیلی کاپٹر کس طرف گیا ہے۔'' اس نے کسی سے رابطہ کیا اور اس سلسلے میں ہدایات جاری کیں کہ اس مقام سے پرواز کرنے والے ہیلی کاپٹر کو تلاش کیا جائے۔

پولیس نے مڑ کر دیکھا۔ پولیس کی دو موبائلز کے ساتھ ایک پرائیویٹ کار بھی تھی۔ موبائلز سے پولیس والے کود کود کر اترے۔ کار سے جو شخص تیزی سے اترا، اسے طالش پہچانتا تھا۔ وہ میر باقر تھا۔

''خدایا۔'' میر باقر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ ''اور...... اور میرا ہیلی کاپٹر بھی غائب ہے۔''

''آپ دونوں کون ہیں؟'' ایک پولیس آفیسر نے سخت لہجے میں پوچھتے ہوئے طالش اور اس کے اسسٹنٹ کی طرف دیکھا۔

''آپ شاید صوفیہ کے منگیتر ہیں۔'' میر باقر بول پڑا۔

''اور یہ میرے دوست ہیں۔'' طالش نے اپنے اسسٹنٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ دونوں کا اس طرف آنے کا مقصد؟''

''آپ کو علم نہیں کہ آصف خاں صاحب کی بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے۔'' طالش نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگوں کو تو ہم سے پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا یہاں۔''

''کیا!'' میر باقر چونکا۔ ''صوفیہ کو اغوا کر لیا گیا ہے؟''

''جی۔'' طالش نے کہا۔ ''اور جو حالات سامنے آئے

ہیں، ان سے میں نے اندازہ لیا تھا کہ صوفیہ کو اغوا کرنے والے کی کار اسی طرف آئی ہوگی۔ یہ جو اس طرف ایک کار کھڑی ہے، صوفیہ کو اسی میں لایا گیا ہوگا۔'' راستے میں پیٹرول پمپ پر جو لاش پڑی ہے، اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے آپ کو؟''

''یہ لوگ میرے ساتھ آئے ہیں۔'' میر باقر نے پولیس والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ہی انہیں بتایا تھا کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ یہاں کچھ لوگوں نے بے تحاشا فائرنگ کی تھی۔ یہاں ہیلی پیڈ کی وجہ سے میں نے کچھ محافظ یہاں رکھے تھے۔ انہی میں سے ایک نے مجھے فوراً موبائل پر اطلاع دی تھی۔ بعد میں وہ بھی مقابلہ کرتے ہوئے مارا جا چکا ہے۔ مجھے اس کی لاش دکھائی دے رہی ہے۔''

پولیس والے اپنے افسر کے اشارے پر اس مکان کی طرف دوڑ گئے تھے جو محافظوں کے لیے بنوایا گیا ہوگا۔

''تو صوفیہ کو میرے ہیلی کاپٹر میں ہی کہیں لے جایا گیا ہوگا۔'' میر باقر نے کہا۔ ''لیکن یہ کر کے اغوا کرنے والے نے سخت غلطی کی ہے۔ ہیلی کاپٹر خراب ہے۔ اسے ٹھیک کرنے کے لیے میں نے انجینئرز کو بلوایا ہے۔ وہ دن میں کسی وقت یہاں پہنچیں گے۔''

''کس حد تک خراب ہے ہیلی کاپٹر؟'' طالش نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ کسی وقت بھی تباہ ہو سکتا ہے۔''

اس جواب نے طالش کے جسم میں سنسناہٹ پھیلا دی۔

اسی وقت ایک انسپکٹر نے قریب آ کر ڈی ایس پی سے کہا۔ ''سر، ایک گاڑی کے پہیوں کے نشانات ملے ہیں۔ شاید لینڈ کروزر کے ہیں یا کسی اور بڑی گاڑی کے۔''

''یہاں کوئی لینڈ کروزر نہیں تھی۔'' میر باقر نے کہا۔ ''نہ کوئی اور بڑی گاڑی۔۔۔۔''

''تو پھر اس میں حملہ آور ہی یہاں سے بھاگے ہوں گے۔ ان نشانات پر تعاقب کرنے کے لیے نکلو۔''

''اوکے سر۔''

''یہاں کوئی ایسا شخص ملا جو ابھی مرا نہ ہو، صرف بے ہوش ہو؟''

''جی نہیں سر!'' جواب دیا گیا۔ ''سب لاشیں ہیں۔''

''اچھا تم روانہ ہو جاؤ۔'' ڈی ایس پی نے کہا، پھر ایک اور پولیس والے سے مخاطب ہوا۔ ''ایمبولینسز اور فوٹوگرافرز بلواؤ۔''

میر باقر پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

اسی دوران میں طالش ان لوگوں سے ذرا ہٹ کر موبائل پر کسی سے کہہ رہا تھا۔ ''اس کا امکان بھی ہے کہ وہ ہیلی کاپٹر تباہ ہو گیا ہو اس لیے اسپاٹ لائٹس کا بھی استعمال کیا جائے۔ ہیلی کاپٹر اگر تباہ ہوا ہوگا تو اس کے ٹکڑے سمندر میں تیرتے ہوئے نظر آ سکتے ہیں۔''

''یہ تشویش کی بات ہے کہ آپ کا ہیلی کاپٹر خراب ہو گیا تھا۔ اگر وہ تباہ ہو گیا تو آصف خاں کے لیے بہت بڑا صدمہ ہوگا۔''

''سو فیصد یقینی بھی نہیں ہے۔'' طالش نے کچھ فاصلے ہی سے قدرے بلند آواز میں کہا اور اپنا موبائل جیب میں ڈال کر قریب آتا ہوا بولا۔ ''بعض اوقات طیارے بھی تباہ ہوتے ہیں تو اکا دکا افراد زندہ بچ جاتے ہیں۔''

''یقیناً ہمیں اچھائی ہی کی امید رکھنا چاہیے۔'' میر باقر بولا۔ ''مجھے ہیلی کاپٹر کی تباہی کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ بس میں خاں صاحب کو صدمے سے دوچار ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔''

ڈی ایس پی نے سر ہلاتے ہوئے اپنی جیب سے موبائل نکالا۔

طالش سوچ رہا تھا کہ وہ فی الحال کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ وہ بس انتظار ہی کر سکتا تھا کہ ہیلی کاپٹر کے بارے میں کوئی اطلاع ملے۔

ڈی ایس پی نے موبائل پر بات شروع کی تو ظاہر ہوا کہ وہ آئی جی کو اس صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا۔

☆☆☆

صوفیہ نے جب ہیلی کاپٹر سے چھلانگ لگائی تھی تو سمندر کی ایک متموج لہر نے اسے اچھال دیا تھا۔ جب وہ نیچے گری تو اس نے دیکھا کہ ہیلی کاپٹر کے دو جلتے ہوئے ٹکڑے اسی کی طرف گر رہے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے اس نے سمندر میں غوطہ لگایا اور اندر ہی اندر تیرتی ہوئی ایک طرف بڑھی۔ ہیلی کاپٹر کے دہکتے ہوئے ٹکڑوں سے اس جگہ کا پانی بھی وقتی طور پر گرم ہو جاتا، اس لیے وہ اس سے بھی بچنا چاہتی تھی۔ کچھ دور نکل آنے کے بعد اس نے سمندر کی سطح سے اپنا سر باہر نکالا اور آنکھوں سے پانی ہٹاتے ہوئے ہر طرف نظر دوڑائی۔ اب فضا صاف ہو چکی تھی۔

اغوا کار بھی بروقت ہیلی کاپٹر سے کود سکا تھا یا نہیں، وہ

اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں کر سکتی تھی لیکن اسے ایک یہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ وہ قید سے بچ نکلی تھی۔ جزیرے پر پہنچ کر بھی اس کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ وہاں کی مقامی آبادی سے بچے۔ اغواکار کے کہنے کے مطابق وہ ان پر خود کو میر باقر کا مہمان ظاہر کرتی تو وہ لوگ کسی اعتبار سے بھی اس کے لیے ضرر رساں ثابت نہیں ہوتے لیکن اگر اغواکار بھی اس کی طرح زندہ بچ نکلا ہوگا تو یقیناً جزیرے پر پہنچے گا اور پھر وہ اس سے بچ نہیں پاتی۔

یہ سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ وہ جزیرے پر پہنچ بھی سکے گی یا نہیں؟ ہیلی کاپٹر سے کودتے وقت تو اس نے سمت کا خیال رکھا تھا لیکن متموج لہر کی ٹکر سے اچھلنے کے بعد وہ دوبارہ نیچے گری تھی تو سمتوں کا اندازہ نہیں رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ جزیرے کی مخالف سمت میں چلی جاتی اور سو میل تک تیرتے رہنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ تیرتی ہوئی کھلے سمندر کی طرف نکل جاتی۔

چہ کنم کی صورت آگئی تھی لیکن وہ اس امید پر تیرتی رہی کہ قسمت اسے جزیرے تک بھی پہنچا سکتی تھی۔ اس کے حق میں یہ اچھا ہوا تھا کہ وہ جینز میں ملبوس تھی ورنہ عموماً ساڑی ہی باندھنے لگی تھی۔ اگر ساڑی میں ہوتی تو سمندر کا پانی اس کی ساڑی نہ جانے کہاں بہا لے جاتا۔ وہ صرف بلاؤز اور زیریں لہنگے میں رہ جاتی لیکن اس کے دماغ میں یہ خیال بھی تھا کہ دونوں ہی صورتوں میں اس کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن بہتر یہی تھا کہ وہ جینز میں تھی اور تیرنا اس کے لیے آسان تھا۔

وہ اندھیرے میں ایک سمت تیرتی رہی۔ دماغ میں انواع و اقسام کے خیالات بھی چکراتے رہے۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اس کا باپ آصف خاں الیکشن سے دستبردار نہ ہو۔ کاغذات نامزدگی واپس نہ لے بیٹھے کیونکہ اس صورت میں بھی وہ اپنے باپ سے نہ مل پاتی۔ اسے کچھ ہو جانے کی صورت میں اسے اغوا کروانے والا بھی اسے آصف خاں کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ حالات... یکسر بدل چکے تھے۔

تیرتے تیرتے اس کے ہاتھ پیر شل ہونے لگے۔ اس نے محسوس کیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک نہیں تیر سکے گی لیکن یکایک اس کی امید بندھی۔ اسے کچھ فاصلے پر مدھم روشنیاں دکھائی دی تھیں۔ جو اس جزیرے کے باسیوں کے گھروں ہی کی ہو سکتی تھیں۔

رات اپنے اختتام کے قریب تو تھی لیکن ابھی اجالا نہیں پھیلا تھا۔ اگر اُجالا ہو جاتا تو اسے وہ روشنیاں نظر نہیں آسکتی تھیں۔

امید بندھی تو اس کے شل ہوتے ہوئے ہاتھ پیروں میں جیسے دوبارہ جان آگئی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اب اسے سمندر میں ڈوب کر مرنے کا خوف نہیں رہا تھا۔

جس وقت ہلکا ہلکا اُجالا پھیلنے لگا تھا، وہ جزیرے کے ساحل پر پہنچ گئی جہاں گھنی جھاڑیاں اور درخت تھے۔

اس کے پیر زمین پر لگے تو ہوا بہت ٹھنڈی ہو گئی یا ٹھنڈک کے احساس کا سبب یہ تھا اس کا لباس پانی سے تربہ تر تھا۔ وہ سردی محسوس کرنے لگی۔ اس وقت اسے یہ ڈر ہوا کہ اگر وہ یہی گیلا لباس پہنے رہی تو سردی سے اس کی طبیعت بھی خراب ہو سکتی ہے۔

ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ غالباً جزیرے کے باسی ساحل کے قریب نہیں رہتے تھے۔ ویسے اس سکوت کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ صبح ابھی باقاعدہ طلوع نہیں ہوئی تھی۔

صوفیہ نے اپنا لباس اتار کر نچوڑا اسے زمین پر پھیلا دیا۔ مٹی سے اس کا لباس خشک ہونے کے بعد بہت گندا ہوتا لیکن ان حالات میں یہ سب سوچنا حماقت ہی ہوتی۔ لباس سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس نے خود کو ایک گھنی جھاڑیوں میں اس طرح چھپایا جیسے اپنی برہنگی کو خود سے بھی چھپانا چاہتی ہو۔ اس نے اپنے پانی میں بھیگے ہوئے بالوں سے بھی پانی نچوڑا اور ہاتھوں ہی سے اپنا جسم بھی صاف کرنے لگی۔ اس کے ذہن میں خیال تھا کہ دھوپ جلد نکل آئے تو اس کے لیے بہتر ہوگا۔

خود کو گھنی جھاڑیوں میں چھپا کر بھی وہ پوری طرح چوکنا تھی اور ہر طرف نظریں دوڑا رہی تھی۔

آخر دھوپ نکل آئی۔ صوفیہ کا گیلا جسم خشک ہونے لگا اور اس کے بعد بالوں کا گیلا پن بھی بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔

یہ امکان ابھی بہرحال نہیں تھا کہ اتنی جلدی اس کا لباس بھی خشک ہو جاتا۔

پھر کچھ وقت اور گزرا تھا کہ ہلکا ہلکا سا شور سنائی دینے لگا۔ صوفیہ کے کان کھڑے ہو گئے لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ فی الحال خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ شور بستی میں جگار کی وجہ سے تھا اور دور کی آوازیں تھیں۔ صوفیہ نے اپنے کپڑے دیکھے۔ وہ ابھی نہیں سوکھے تھے۔ وہ پھر جھاڑیوں میں دبک گئی۔ اسے ابھی بھوک کا احساس تو نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ رات کا کھانا کھا کر ہی گھر سے نکلی تھی لیکن

اب پیاس کا احساس ہونے لگا تھا۔ اغوا ہونے کے بعد سے اب تک وہ پانی نہیں پی سکی تھی۔ اس کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ ایک دو گھنٹے بعد اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگیں گے اور پانی اسے بستی ہی میں مل سکتا تھا۔ پانی کے حصول کے لیے وہ بستی کی طرف جانے کا خطرہ مول لینے پر مجبور ہو جاتی۔

دھوپ کچھ اور تیز ہو گئی تو صوفیہ نے پھر اپنے کپڑے دیکھے۔ وہ سوکھ چکے تھے۔ صوفیہ نے فوراً پہن لیے۔ وہ اب جسمانی طور پر گیلی نہیں تھی اور دھوپ کی تمازت کے باعث سردی بھی نہیں لگ رہی تھی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اس طرف بڑھنا شروع کیا جدھر سے آنے والا مدھم سا شور اسی بات کی علامت تھا کہ وہاں لوگ جاگ چکے تھے۔ اس میں ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ کس کا اغوا کار بھی جزیرے پر پہنچ گیا ہو لیکن صوفیہ کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تو ضروری تھا۔ حلق میں پڑتے ہوئے کانٹے اس حد تک بھی بڑھ سکتے تھے کہ وہ بے ہوش ہو جاتی اور پھر اس پر نہ جانے کیا گزر جاتی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اور حلق میں پڑنے والے کانٹوں کی اذیت سے دھیان بٹانے کے لیے اس نے پھر وہی باتیں سوچنا شروع کر دیں جو وہ سوچتی ہی رہی تھی۔

اغوا کار کی بات سے جو ظاہر ہوا تھا، وہ یہی تھا کہ اسے میر باقر نے اغوا کروایا تھا۔ اس کے اس اقدام کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اسے پارٹی کی صوبائی صدارت سے ہٹا کر اس کی جگہ صوفیہ کو لے آیا گیا تھا۔ پارٹی میں اس کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ آصف خاں کا دایاں ہاتھ ہے۔ صدارت چھن جانے کے بعد اس کی وہ پوزیشن بھی نہ رہتی جس کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ آصف خاں کا دایاں ہاتھ ہے۔ اب صورتِ حال یہ بن گئی تھی کہ آصف خاں کا دایاں ہاتھ صوفیہ کو سمجھا جاتا۔

ایک بہت اہم نکتہ یہ بھی تھا کہ اگر آصف خاں کو کچھ ہو جاتا تو پارٹی کا سربراہ وہی بنتا۔

اس کے علاوہ بھی کچھ سوال اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ اس کے باپ کی اس وقت کیا حالت ہو گی؟ طالش پر نہ جانے کیا گزر رہی ہو، اور سب سے اہم سوال یہ کہ کیا پولیس یا اس کا کوئی بھی خواہ اس جزیرے پر پہنچ کر اسے اس جزیرے سے نکال سکے گا؟

ان خیالات کے ساتھ وہ آگے بڑھتے ہوئے محتاط نظروں سے ہر طرف دیکھتی بھی جا رہی تھی۔ اس طرح وہ ایک فرلانگ ہی آگے بڑھی تھی کہ دور سے سنائی دینے والا شور کچھ بڑھ گیا۔ اسے چیختی ہوئی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ الفاظ اس کی سمجھ میں کچھ آ رہے تھے، کچھ نہیں آ رہے تھے۔ ان ادھ سنے الفاظ سے اسے شبہ ہوا کہ ان لوگوں کو کسی لڑکی کی تلاش تھی جو کسی مقصد سے چوری چھپے اس جزیرے پر پہنچی تھی۔ صوفیہ نے زمین پر ہلکی سی دھمک بھی سنی، جیسے لوگوں نے اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کر دیا ہو۔

صوفیہ تیزی سے مڑی اور ساحل کی طرف دوڑنے لگی۔ دوڑتے ہوئے اسے یہ خیال بھی آیا کہ اس کا اغوا کار یقیناً جزیرے پر پہنچ چکا تھا۔ وہی وہاں کے لوگوں کو صوفیہ کے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا۔

لیکن وہ کہاں چھپ سکتی ہے ان لوگوں سے؟ اس کے ذہن میں ایک یہ بڑا سا سوال بھی موجود تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ کوئی بہت بڑا جزیرہ نہیں تھا۔ وہ لوگ اسے ڈھونڈتے ہوئے کسی طرح اس تک پہنچ ہی جاتے۔

☆☆☆

صبح ہو چکی تھی... جب طالش، آصف خاں کے گھر پہنچا۔ آصف خاں ٹہل رہے تھے۔ آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ رات بھر نہیں سوئے تھے۔

''اب کیا صورتِ حال ہے انکل؟'' طالش نے پوچھا۔ اس نے آصف خاں کو یکایک نہیں بتانا چاہا تھا کہ صوفیہ کس قسم کے حالات سے دوچار ہو چکی ہے اور نہیں معلوم کہ اب زندہ بھی ہے یا نہیں؟ یہ دوسری بات ایسی تھی جسے طالش بار بار اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوششیں بھی کرتا رہا تھا لیکن اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے دل کی بات ماننا چاہتا تھا کہ صوفیہ زندہ ہو گی۔

لیکن اس کی یہ کوشش بیکار تھی۔ آئی جی ذرا دیر پہلے ہی آصف خاں سے مل کر جا چکا تھا اور اس نے آصف خاں کو حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ یقیناً اس نے اپنے محکمے کے لوگوں کو ہدایت کر دی ہو گی کہ وہ اسے ایک ایک پل کی رپورٹ دیتے رہیں۔''

''نہ جانے کس نے یہ گُل کھلایا ہے؟'' آصف خاں کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''کیسا گُل؟'' طالش نے سادگی سے پوچھا۔

آصف خاں نے آئی جی کی آمد اور اس سے حاصل کردہ معلومات طالش کو بتا دیں جن سے طالش واقف تھا۔

''ہو سکتا ہے ہیلی کاپٹر تباہ نہ ہوا ہو۔'' طالش نے

آصف خاں کو تسلی دینے کی کوشش کی، حالانکہ اسے آصف خاں کے گھر کی طرف آتے ہوئے رپورٹ مل چکی تھی کہ ہیلی کاپٹر تباہ ہو گیا تھا۔ اس کی تلاش میں جانے والے ہیلی کاپٹر اسپاٹ لائٹ میں تو کچھ نہیں دیکھ سکے تھے لیکن صبح ہوتے ہی سورج کی روشنی میں ایک ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے دور سے سمندر میں کچھ تیرتے دیکھا تو اس کے قریب گیا۔ اسی نے رپورٹ دی تھی کہ وہ ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔

طالش نے حکم دے دیا تھا کہ وہ ٹکڑے سمندر سے نکالے جائیں۔ اس کے گمانِ دل کو خیال آیا تھا کہ صوفیہ شاید کسی ٹکڑے سے لپٹی تیر رہی ہو۔

اس کام کے لیے بحری پولیس کی خدمات حاصل کی جا سکتی تھیں۔

”میرا تو اپنی بچی کے سوا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے طالش۔“ آصف خاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”پولیس اب کیا کر رہی ہے؟“ طالش نے پوچھا۔

”غوطہ خوروں سے کام لیا جائے گا کہ وہ اسے سمندر میں تلاش کریں۔“ اس مرتبہ آصف خاں کی آواز رندھ ہی گئی۔

”کیا یہ حرکت میر باقر کی ہو سکتی ہے انکل؟“ طالش نے پوچھا۔

”اسے تو خود ہی اپنے ان آدمیوں سے معلوم ہوا تھا کہ ان پر رائفلوں سے حملہ کیا گیا ہے چنانچہ وہ پولیس والوں کو لے کر وہاں پہنچا تھا۔“ آصف خاں نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”اس نے اس ویرانے میں ہیلی پیڈ کیوں بنوایا ہے؟“

”ڈیڑھ دو گھنٹے کے فاصلے پر جو شہر ہیں، وہاں اگر کوئی میٹنگ ہوتی ہے تو...... صوبائی صدر کی حیثیت سے وہ وہاں جانے کے لیے ہیلی کاپٹر ہی استعمال کرتا تھا۔ میں بھی دو تین بار اس کے ساتھ اس ہیلی کاپٹر میں جا چکا ہوں۔ کبھی سان گمان میں بھی نہ آیا تھا کہ میری بچی کے لیے یہ ہیلی کاپٹر ہی......“ آصف خاں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہیلی پیڈ اس علاقے میں بنوانے کی کوئی خاص وجہ تھی؟“ طالش نے پوچھا۔

”وہ جاگیردار ہے طالش! وہاں اس کی بہت زمین ہے۔“

ان کی باتیں یہیں تک پہنچی تھیں کہ آصف خاں کے

معصومیت

ایک صاحب نے فخریہ انداز میں اپنی دفتری ساتھی سے کہا۔ ”آج تک کوئی لڑکی مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔“

”تو پھر اس کے باوجود آپ اتنے بے وقوف کیوں نظر آتے ہیں؟“ لڑکی نے معصومیت سے پوچھا۔

کراچی سے میمونہ عزیز کا سوال

مختصر مختصر

☆ سرکاری دفتر میں بڑا عہدے دار ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ دو ماہ کی چھٹی پر چلے جائیں تب بھی کسی کو آپ کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

☆ لڑکے ہی لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی لڑکیوں کو لڑکوں کا پیچھا کرتے نہیں دیکھا ہو گا۔ بھلا کبھی چوہے دان بھی چوہوں کا پیچھا کرتے ہیں؟“

امریکا سے جاوید کاظمی کا شگفتہ پارہ

موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ آصف خاں نے موبائل جیب سے نکالا اور چونک گیا۔

”یہ تو میرے لیے اجنبی نمبر ہے۔“ آصف خاں نے طالش کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”یہ اسی کی کال ہو سکتی ہے جس نے صوفیہ کو اغوا کیا ہے یا کروایا ہے۔“

”سنیے، کیا کہتا ہے۔“ طالش کے اعصاب میں تناؤ آ گیا۔

”تم بھی سنو۔“ آصف خاں نے کہتے ہوئے موبائل کا اسپیکر آن کیا اور کال ریسیو کی۔ ”ہیلو!“

”خان آصف!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم اب تک سو نہیں سکے ہو گے، اپنی بیٹی کے لیے فکرمند رہے ہو گے۔ بیٹی کی وجہ سے فکرمندی تو فطری عمل ہے لیکن تم جلد ہی اس سے مل لو گے اگر تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج اپنے کاغذات نامزدگی واپس لے لو گے۔“

”میں ایسا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی بیٹی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ آصف خاں نے کہا۔ ”میں اس سے پوچھوں گا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی گئی ہے۔“

طالش نے اس طرح سر کو ہلکی سی جنبش دی جیسے آصف خاں کا یہ جواب اس کی خواہش کے مطابق ہے۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''مجھے اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی کروں۔ اس کے اغوا کا مقصد صرف تم سے اپنا مطالبہ پورا کرانا ہے۔''

''تو اس سے میری بات کراؤ۔''

''کسی وجہ سے فوری طور پر ناممکن ہے۔ میں اس جگہ سے نہیں بول رہا ہوں جہاں تمہاری بیٹی کو رکھا گیا ہے۔''

''کب تک بات کرا سکتے ہو اس سے؟''

''تمہیں مجھ پر یقین کرنا پڑے گا۔'' سخت لہجے میں کہا گیا۔ ''اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ تم جلد از جلد میرا مطالبہ مان لو۔ اپنے کاغذات نامزدگی واپس لے لو تاکہ تمہاری بیٹی کو تم تک جلد از جلد پہنچا دیا جائے۔ اب میں پھر کسی وقت فون کر کے تم سے پوچھوں گا کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔''

''میں......'' آصف خاں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی۔

''سمجھے کچھ؟'' آصف خاں نے طالش کی طرف دیکھا۔

''ہم بعد میں بات کریں گے۔'' طالش نے جلدی سے کہا۔ ''آپ فوراً اس نمبر سے رابطہ کریں۔''

''حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے اپنے موبائل سے سم نکال دی ہوگی۔'' آصف خاں نے کہا لیکن ساتھ ہی وہ نمبر ملایا۔

نتیجہ وہی نکلا جس کا خدشہ آصف خاں نے ظاہر کیا تھا اور جیسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اس نمبر سے رابطہ نہیں ہو سکا۔

''اپنا مطالبہ منوانے کے لیے وہ بہت بے چین ہے۔'' آصف خاں کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''اس کے لیے وہ صوفیہ سے میری بات کرا دیتا یا کم از کم اتنا کہہ دیتا کہ وہ ایک آدھ دن میں میری بات کرا دے گا۔ اب وہ اس پوزیشن میں ہے ہی نہیں۔ صوفیہ اب اس دنیا میں نہیں طالش۔'' آصف خاں آبدیدہ ہو گیا۔ ''ہیلی کاپٹر ضرور تباہ ہو گیا ہوگا۔'' آصف خاں کی آنکھوں سے دو آنسو بھی ٹپک گئے۔

''اتنے مایوس نہ ہوں انکل! دنیا میں معجزے بھی ہوتے ہیں۔'' طالش نے آصف خاں کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی پھر اس نے پوچھا۔ ''اس سلسلے میں پولیس کیا کر رہی ہے؟ آئی جی نے اس بارے میں بھی کچھ بتایا تو ہو گا۔''

''تلاش شروع کر دی گئی ہے کہ ہیلی کاپٹر کہاں گر کر تباہ ہوا ہے۔''

طالش کو خیال آیا کہ پولیس کو شاید ہی سمندر کی طرف جانے کا خیال آیا ہو۔ خود طالش نے یہ کام کروایا تھا تو یہ ہدایت بھی دی تھی کہ کسی دوسرے ادارے کو اس کا علم نہ ہو۔

''آپ اس معاملے میں کسی پر شک کر سکتے ہیں؟'' طالش نے پوچھا۔

''میں کس بنیاد پر کسی کی طرف انگلی اٹھا سکتا ہوں۔''

''اس نکتے کو ذہن میں رکھیے! انتخابات سے آپ کا الگ ہو جانا کس کے لیے سودمند ہو سکتا ہے؟''

''اس طرح تو پہلا نام میرے ذہن میں پیپلز اسٹیٹ پارٹی ہی کا آئے گا۔''

''یعنی اس کا سربراہ واجد امیر؟''

''ہاں۔'' آصف خاں نے جواب دیا۔ ''اس کا اور میرا حلقہ انتخاب ایک ہی ہوگا۔ مقابلہ تو وہاں بہت سخت ہوگا لیکن واجد امیر کو خیال آ سکتا ہے کہ وہ بہت کم ووٹوں سے شکست کھا جائے۔ ویسے تو وہ دو اور حلقوں سے بھی انتخاب لڑ رہا ہے اور غالباً ان دونوں ہی حلقوں سے وہ جیت جائے گا۔ اس طرح وہ اسمبلی تک پہنچ سکتا ہے لیکن مجھ سے شکست کھانے میں اس کے وقار کو شدید جھٹکا لگے گا۔ اس کی یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ میں مقابلے سے دستبردار ہو جاؤں۔''

''کیا آپ صرف اسی علاقے سے لڑ رہے ہیں؟''

''نہیں ایک حلقہ اور بھی ہے میرا۔ وہاں سے میں یقیناً جیتوں گا۔ اس طرح اسمبلی میں تو ہم دونوں ہی پہنچ جائیں گے لیکن وزیراعظم کون بنے گا اور اپوزیشن لیڈر کون، اس کا انحصار انتخابات کے حتمی نتائج پر ہے۔ جس کی اکثریت ہوگی، وہی وزیراعظم بنے گا لیکن مجھ سے شکست کھانے سے......''

''واجد امیر کا وقار مجروح ہوگا۔'' طالش نے آصف خاں کی بات کاٹتے ہوئے انہی کا جملہ دہرا دیا۔

''ہاں۔''

''ابھی آپ نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کے ذہن میں پہلا نام تو واجد امیر ہی کا آتا ہے۔''

''ہاں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرا کوئی نام بھی ہے؟''

''ہاں۔'' آصف خاں نے تیسری مرتبہ اثباتی جواب

دیا۔ ''لیکن اس کی طرف انگلی اٹھانے میں مجھے قباحت ہے۔''

''قباحت کا سبب میں بعد میں پوچھوں گا۔ پہلے آپ وہ نام بتائیے۔''

آصف خاں نے طویل سانس لی۔ ''دوسرا نام میر باقر کا ہے۔ پارٹی میں اس کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ اگر میں انتخاب نہیں لڑتا تو وہ خاصے ممبران کو اپنا ہمنوا بنا سکتا ہے کہ اب پارٹی کا صدر اسے بنایا جائے۔''

''تو آپ نے اس کا نام لینے میں قباحت کیوں محسوس کی؟''

''وہ اپنی صفائی میں کہہ سکتا ہے اور وہ غلط بھی نہیں ہو گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ صوفیہ کو اغوا کروا کے اپنے جاگیر کے ہیلی پیڈ پر بھیجے جہاں ایک خراب ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ فرض کرلیا جائے کہ اس نے اپنے آدمی کو ہدایت کی ہوگی کہ وہ صوفیہ کو اس ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر کسی اور جگہ پہنچا دے۔ کیا وہ اس طرح اپنے ساتھ صوفیہ کو ختم کرنے کا بندوبست کرسکتا تھا جبکہ صوفیہ کی زندگی اس کے لیے اہم تھی۔ اسی کی وجہ سے تو مجھے بلیک میل کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ کیا وہ یہ کرسکتا ہے کہ کچھ اور لوگوں کے ذریعے اپنے ہیلی پیڈ کے محافظوں کو ختم کرادے تاکہ وہ صوفیہ کو اغوا کرنے والے کو ہیلی کاپٹر کے استعمال سے نہ روک سکیں۔ یہ بات ذہن تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اغوا کرنے والے کے ساتھ ساتھ ہیلی پیڈ کے اپنے محافظوں کو بھی ختم کرادے، اور پھر سب سے اہم تو اس کے لیے صوفیہ ہی تھی۔''

طالش نے تحمل سے سب کچھ سنا، پھر بولا۔ ''آپ کے دلائل میں وزن تو ہے لیکن بعض اوقات اس قسم کے کاموں کے پسِ پردہ کوئی بات ہوتی ہے جو فوری طور پر کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا آئی جی سے بھی اس موضوع پر بات ہوئی تھی؟''

''اس نے سوال ہی یہ کیا تھا کہ میں اس سلسلے میں کس پر شبہ کرسکتا ہوں۔ اب مجھے اُس کے اِس سوال کا جواب تو دینا ہی تھا۔''

''آئی جی سے بھی آپ نے یہی سب کچھ کہا ہوگا؟''

''ہاں۔''

''کوئی تیسرا نام آپ کے ذہن میں نہیں؟''

''نہیں۔'' آصف خاں نے جواب دیا۔ ''کیا تمہیں کسی اور پر بھی شبہ ہو رہا ہے؟''

طالش نے جیسے یہ سوال سنا ہی نہیں۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ آصف خاں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ طالش کچھ توقف سے بولا۔ ''مجھے کئی بار یہ خیال آچکا ہے کہ سردار رند کا قتل حادثاتی تھا۔ دراصل آپ ہی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ سردار رند کے بیٹے نبیل کو شاید اسی نے اپنا آلہ کار بنایا ہو۔ نبیل کا بیان غلط ہوسکتا ہے۔''

''تم میر باقر پر ہی زیادہ زور دے رہے ہو۔''

''آپ نے ایک بار کہا تھا کہ مجھے کسی سراغ رساں ادارے میں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے آپ کے الفاظ یاد نہیں۔ کچھ اسی قسم کی بات کی تھی آپ نے اور آپ کی یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ میرا مزاج کچھ ایسا ہی ہے۔ میں ہر ایک کو شبے کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ایک بار تو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آچکا ہے کہ شاید سردار رند نے ہی آپ کو قتل کروانا چاہا ہو۔ یہ اندازہ میں نہیں لگا سکا تھا کہ اسے آپ کو ختم کرنے سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے بیٹے کو آلۂ کار بنانے کے لیے ڈراما رچایا۔ یعنی اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیا اور کچھ پسِ پردہ کوشش ایسی کی کہ نبیل کو میر باقر اپنا شوفر بنالے، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والا خود ہی اس گڑھے میں گر سکتا ہے۔ یعنی نبیل کا نشانہ خطا گیا اور سردار رند ہی اپنے بیٹے کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ میں نے بعد میں اپنا یہ خیال ذہن سے اس لیے جھٹک دیا کہ اپنی موت کے بعد وہ صوفیہ کو اغوا کرنے کی منصوبہ بندی نہیں کرسکتا تھا۔ میں اب صرف میر باقر کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ یہ سوچنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ مسز نشتر نے آپ کو اس جگہ روک کر باتیں شروع کی تھیں جہاں .... آپ کو آسانی سے نشانہ بنایا جاسکے اور کسی طرح یہ بات میرے علم میں آچکی ہے کہ مسز نشتر کے میر باقر سے بہت قریبی تعلقات ہیں۔''

''مجھے اس کا علم نہیں۔''

''واجد امیر کی پارٹی کا کوئی عسکری ونگ بھی ہے؟'' طالش نے ایک اور سوال کیا۔

''اس بارے میں کچھ افواہیں تو ہیں۔'' آصف خاں نے جواب دیا۔ ''میں ثبوت کے بغیر کسی پر الزام تراشی نہیں کرسکتا۔''

طالش نے کچھ سوچا اور پھر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ''اب مجھے اجازت دیں، میرے کچھ ذرائع ہیں، ان سے مجھے پولیس کی اب تک کی پیش رفت معلوم ہوتی رہے گی۔ آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ صوفیہ کو کچھ نہیں ہوا۔''

آصف خاں نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

گھر سے نکلتے نکلتے طالش نے اپنی جیب سے موبائل نکال لیا۔ نمبر بھی بڑی عجلت میں ملایا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ تک پہنچتے پہنچتے دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔ دوسری طرف اسی کا ایک ماتحت تھا۔

''یس سر۔'' اس نے کہا۔

''رئیس بیگ کو جانتے ہو؟'' طالش نے پوچھا۔

''رئیس بیگ؟''

''واجد امیر کو تو جانتے ہو گے؟'' طالش کے لہجے میں جھنجلاہٹ آ گئی۔

''جی، جی، یس سر! آپ پیپلز اسٹیٹ پارٹی کے واجد امیر کو پوچھ رہے ہیں نا؟''

''ہاں۔''

طالش کچھ اور بھی کہتا لیکن دوسری طرف سے فوراً کہا گیا۔ ''رئیس بیگ پارٹی کا ترجمان ہے۔''

''مجھے اس کا فون نمبر چاہیے۔ چند بڑے ٹی وی چینلز کے کسی اینکر پرسن سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ترجمان کی حیثیت سے وہ اکثر کسی چینل پر آتا ہے یا ٹی وی والے اسے اپنے کسی پروگرام میں بلا لیتے ہیں۔''

''یہ تو ابھی پندرہ بیس منٹ کے اندر مل جائے گا۔ ایک دو سے تو میری خاصی جان پہچان ہے۔ اگر ان میں سے کوئی مل گیا تو ابھی دس منٹ کے اندر میں آپ کو بتا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' طالش نے فون بند کر دیا۔ وہ کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رات سے اب تک وہ بھی نہیں سویا تھا۔ طبیعت ڈل ہوتی جا رہی تھی لیکن آصف خاں کے لیے آنے والی نامعلوم کال نے اس کے جسم میں تازگی دوڑا دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک اہم سراغ ہاتھ لگا ہے۔

آصف خاں اور نامعلوم آدمی کی گفتگو کے دوران میں اس کے ذہن میں کھٹک سی ہونے لگی تھی۔ احساس ہوا تھا کہ وہ آواز اس نے کہیں سنی ہے۔ آصف خاں سے باتوں کے دوران میں بھی وہ آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھی۔ اس کے بولنے کے انداز میں بھی ایک خاص بات یہ تھی کہ لفظ ''کہ'' بولتے وقت اس کے لہجے میں ایک خفیف سا جھٹکا آتا تھا۔ طالش نے یہ بات اس کا کوئی ٹی وی پروگرام دیکھتے وقت بھی محسوس کی تھی۔

ہر شخص کے بولنے کے انداز میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی ہے اگر سننے والا اس پر توجہ دے تو اسے محسوس ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ ایک لفظ زیادہ بولتے ہیں جبکہ اس کے دو ایک متبادل لفظ بھی ہوتے ہیں۔ اس قسم کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

طالش سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ وہ ہلکا سا ناشتا کر کے تازہ دم ہو جانا چاہتا تھا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اس کے ماتحت کی کال آ گئی۔ اس نے رئیس بیگ کا فون نمبر معلوم کر لیا تھا۔

''گڈ۔'' طالش نے وہ نمبر ایک کاغذ پر لکھتے ہوئے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اس وقت اسے یہ بات بھی یاد نہیں رہی تھی کہ وہ گھر پہنچتے ہی ہلکا سا ناشتا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سب کچھ بھول کر اپنے موبائل پر وہ نمبر ڈائل کیے جو رئیس بیگ کے تھے۔ دوسری طرف گھنٹی بجی اور بجتی ہی چلی گئی اور آخر بند ہو گئی۔ طالش سمجھ گیا کہ رئیس بیگ نے ایک اجنبی نمبر دیکھ کر کال ریسیو نہیں کی تھی۔ خاص عہدوں پر فائز لوگ عموماً نیا نمبر دیکھ کر کال ریسیو نہیں کرتے۔

اب اس کی آواز سننے کی کیا صورت ہو؟ طالش سوچنے لگا اور سوچتا ہوا کچن کی طرف بڑھا۔ رات سے اب تک کے دورانیے میں اس کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا تھا جب صوفیہ کا سراپا اس کے تصور میں نہ رہا ہو۔

کچن میں پہنچ کر وہ کچھ کر نہیں پایا تھا کہ اس کے موبائل پر کوئی میسج آیا۔ طالش نے دیکھا کہ میسج بھیجنے والے کا نمبر وہی تھا جس کو وہ ڈائل کر چکا تھا۔

میسج میں لکھا تھا۔ آپ کون صاحب ہیں؟ آپ نے فون کیوں کیا تھا؟

طالش نے فوراً جواب دیا لیکن انگریزی میں۔ ''آپ میرا نام نہیں جانتے ہوں گے۔ میں ایک جرنلسٹ ہوں۔ تعلق خلیج ٹائمز سے ہے۔ آپ سے یہاں کی سیاسی صورتِ حال کے سلسلے میں ملاقات کرنی ہے۔ فون پر صرف اتنی بات کرنی تھی کہ کیا آپ ملاقات کے لیے وقت نکال سکتے ہیں؟ اگر نکال سکتے ہیں تو میں کب اور کہاں حاضر ہو جاؤں؟''

طالش نے جرنلزم کا حوالہ اس لیے دیا تھا کہ ہنگامی سیاسی حالات میں اس قسم کے لوگ جرنلسٹوں سے ضرور بات کرتے ہیں۔ طالش نے حوالہ بھی ایک غیر ملکی اخبار کا دیا تھا۔

ایک منٹ بعد ہی موبائل کی گھنٹی بجی۔ طالش نے اسکرین پر رئیس بیگ ہی کا نمبر دیکھا اور فوراً کال ریسیو کی۔ ''ہیلو مسٹر رئیس! خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے فون کیا۔ یہ

میرے لیے اعزاز ہے۔''

''یہ بتایئے کہ آپ کا موضوعِ گفتگو کیا ہوگا ملاقات میں؟'' رئیس بیگ نے کہا۔

اس کی آواز طالش کے لیے جانی پہچانی تھی۔ وہ ٹی وی چینلز پر کئی بار اسے دیکھ اور سن چکا تھا۔ آصف خاں سے بات کرتے ہوئے اس نے اپنی آواز بدلنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔ اسی لیے طالش اسے فوراً نہیں پہچان سکا تھا اور یہ خیال اسے کچھ دیر بعد آیا تھا کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔ لفظ ''کہ'' کہتے وقت اس کے لہجے میں جو خفیف سا جھٹکا آتا تھا، وہ طالش نے اس وقت بھی محسوس کیا۔ اس کے خیال میں یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

جواب میں اس نے رئیس بیگ سے کہا۔ ''میں نے شاید میسج میں آپ کو بتا دیا تھا کہ میں آپ سے یہاں کی سیاست کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ ایک جرنلسٹ ہیں۔ یہاں کی سیاست پر تو آپ کی نظر ہوگی۔''

''میں اس بارے میں آپ کا تجزیہ جاننا چاہوں گا۔ انتخابات کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے اور کون سی پارٹی کس حد تک ووٹ لے سکتی ہے۔''

''تب تو میں سمجھتا ہوں کہ انٹرویو ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لے سکتا ہے۔''

لفظ ''کہ'' پر وہ خفیف سا جھٹکا اب بھی تھا۔

''میں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' طالش نے کہا۔

''آپ کے علم میں ہوگا کہ ان دنوں سیاسی سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ ایسے حالات میں مجھ جیسے لوگوں کی مصروفیت بڑھ جاتی ہے۔ میں آپ کے لیے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں نکال سکوں گا۔''

''بہتر ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنے سوالات کو زیادہ سے زیادہ سمیٹوں۔''

''یہی ضروری ہے۔ میں کل تک تو بہت مصروف ہوں۔ آپ پرسوں شام پانچ بجے میری پارٹی کے دفتر آجائیں۔''

''میں حاضر ہوجاؤں گا۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

یہ شخص اس معاملے کے حل کی کنجی ثابت ہوگا، طالش نے سوچا اور فوراً موبائل پر اپنے اسی ماتحت سے رابطہ کیا جس نے رئیس بیگ کا نمبر بتایا تھا۔

''یس سر!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''اچھا ٹھہرو!'' طالش نے کہا۔ ''مجھے ایک کام کا خیال آگیا۔ میں تمھیں دوبارہ فون کروں گا۔ دو منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔'' اس نے جواب سنے بغیر لائن کاٹی اور آصف خاں سے رابطہ قائم کیا۔ اس نے ان سے پوچھا۔

''بلیک میلر کی گفتگو آپ اپنے موبائل میں ٹیپ کرتے رہے ہیں؟''

''جب اس کی پہلی کال آئی تھی تو اس کی بات نے مجھے اتنا پریشان کردیا تھا، مجھے ریکارڈنگ کا خیال ہی نہیں آیا۔ اب آج تمہارے سامنے جو بات ہوئی ہے، وہ میں نے ریکارڈ کرلی ہے۔''

''چلیں وہ بھی کافی ہے، کام چل جائے گا۔ آپ وہ ریکارڈنگ سی ڈی پر منتقل کرلیں، بلکہ دو سی ڈی پر۔''

''آخر بات کیا ہے طالش؟''

''وہ کام آئیں گی، پولیس آپ سے معلوم کرے گی کہ بلیک میلر کا فون دوبارہ آیا یا نہیں تو آپ اسے موبائل ہی کی ریکارڈنگ سنوا دیجیے گا۔ سی ڈی محفوظ رکھیے گا۔ ان میں سے ایک تو میں آپ سے آج ہی جلد از جلد کسی وقت لے لوں گا۔''

''اچھا۔'' آصف خاں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''اب اس وقت تو مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تم کسی سرکاری خفیہ ادارے کے لیے کام کررہے ہو؟''

''میں کسی وقت آپ کو بتاؤں گا۔'' طالش یہ جواب دینے کے لیے مجبور ہوگیا، پھر اس نے کہا۔ ''میں نے جو کام آپ سے کہا ہے، وہ جلد از جلد کر ڈالیے۔ میں سی ڈی لینے جلد از جلد آؤں گا۔''

''صوفیہ کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟''

''آج کسی وقت بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ ایک اہم سراغ ملا ہے۔''

آصف خاں سے کسی اور سوال کی توقع ہونے کے باعث طالش نے رابطہ منقطع کردیا اور پھر فوراً ہی اپنے ماتحت سے رابطہ کیا۔

''سنو!'' اس نے ماتحت سے کہا۔ ''آج ہی کسی وقت رئیس بیگ کو اغوا کرکے ہیڈکوارٹر لے جانا ہے۔ یہ احتیاط ضروری ہے کہ اس سلسلے میں کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ اسے اغوا کرنے کے بعد مجھے اطلاع دو۔ میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔ اس کے لیے تم جتنے ساتھیوں کی مدد چاہو، لے لینا۔''

طالش کے سیکشن میں اس کے اس ماتحت کو اس کا دایاں ہاتھ سمجھا جاتا تھا۔ سیکشن میں کام کرنے والے اس کی ہر ہدایت کو طالش ہی کی ہدایت سمجھتے تھے۔

رابطہ منقطع کرنے کے بعد طالش نے ناشتا کیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ بہت پُرجوش تھا۔ اسے اپنی کامیابی یقینی نظر آرہی تھی۔ اس نے رئیس بیگ سے جو باتیں کی تھیں، وہ بھی ریکارڈ کر لی تھیں۔ اس کی وہ ریکارڈنگ اور آصف خاں بھی رئیس بیگ سے آج کی باتیں ریکارڈ کر چکے تھے۔ طالش کے خیال میں ان ریکارڈنگز کے باعث رئیس بیگ کی زبان کھلوانے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی۔

☆☆☆

لوگوں کے شور و غل کو پیچھے چھوڑتی ہوئی صوفیہ ساحلِ سمندر تک پہنچ گئی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی تلاش میں جزیرے کا چپّا چپّا چھان ڈالا جائے گا۔ صوفیہ کی نظر میں وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں آئی تھی جہاں وہ اس طرح چھپ سکتی کہ وہ لوگ اسے تلاش نہیں کر پاتے، اس لیے اسے صرف ایک ہی تدبیر سوجھی تھی، یا خود بہ خود اس کے ذہن میں آئی تھی۔

ساحل پر پہنچ کر وہ تیزی سے سمندر میں آگے بڑھی۔ اس کا جسم بتدریج پانی میں چھپتا چلا گیا۔ آخر وہ اس جگہ تک پہنچ گئی کہ پانی اس کی کمر سے اوپر تک آگیا۔ اب اس نے غوطہ لگایا اور زیرِ آب تیرتی ہوئی آگے بڑھی۔ یہاں تک کہ وہ گہرے سمندر میں پہنچ گئی۔ وہ سمندر میں زیرِ آب رہتے ہوئے آدھا گھنٹا تو آسانی سے گزار سکتی تھی۔ اس نے اس کی مشق کی تھی جب اس نے تعلیم کے زمانے میں پیراکی سیکھی تھی اور پیراکی کے ایک مقابلے میں حصہ لیا تھا، اسی زمانے میں اس کی دوستی ایک ایسی لڑکی سے ہوگئی تھی جو گھنٹا بھر بھی زیرِ آب رہ سکتی تھی۔ اسی کی دیکھا دیکھی صوفیہ نے بھی حبسِ دم کی مشقیں کی تھیں۔ وہ آدھے گھنٹے تک سانس لیے بغیر زندہ رہ سکتی تھی۔ وہ اس سے زیادہ مشق بھی کرتی لیکن تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد اسے اپنے وطن لوٹنا پڑا۔ یہاں آکر اسے حبسِ دم کی مزید مشق کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ سب کچھ اس نے شوقیہ کیا تھا۔ یہ بات تو اس کے سان گمان میں بھی نہ تھی کہ اس کی یہ مشق کسی دن اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔

وہ دائیں جانب تیرنے لگی تاکہ ساحل سے زیادہ دور نہ ہوسکے۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ آدھے گھنٹے بعد وہ سطحِ آب پر ابھری اور اسی وقت ساحل کے قریب اسے تلاش کرنے والے ہوئے تو وہ ان کی نظر میں آجائے گی۔ اس صورتِ حال سے بچنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ وہ کھلے سمندر کی طرف تیرنا شروع کر دے اور اتنی دور نکل جائے کہ سطحِ آب پر اس کا سر ابھرے تو کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔

یہ فیصلہ اس نے اس وقت کیا جب اسے تیرتے ہوئے لگ بھگ پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے کھلے سمندر کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اسے اس سمت میں بارہ تیرہ منٹ سے زیادہ نہیں تیرنا چاہیے کیونکہ واپسی میں بھی اسے بارہ تیرہ منٹ لگتے۔ وہ اس سے زیادہ دیر تک سانس نہیں روک سکتی تھی۔

تیرتے ہوئے وہ ذہنی خلفشار میں بھی مبتلا رہی۔ کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے کب تک دوچار رہے گی۔ وہ میڈیکل کی طالبہ نہیں رہی تھی اس لیے اسے علم نہیں تھا کہ اگر اسے سارا دن سمندر میں گزارنا پڑا تو اس کے جسم پر اس کے کیا اثرات ہوں گے۔ کہیں وہ بخار میں مبتلا نہ ہوجائے۔ یہاں وہ اس کا مداوا تو نہیں کرسکتی تھی۔

ان پریشان کن خیالات کے ساتھ اس نے تیرنا جاری رکھا لیکن اس پریشانی میں بھی اس نے خیال رکھا کہ بارہ تیرہ منٹ سے زیادہ نہ تیرے۔ وقت کے بارے میں بھی وہ صرف اندازہ ہی لگا سکتی تھی۔ اس کی کلائی پر واٹر پروف گھڑی موجود تھی جس کے ہندسے چمکتے بھی تھے لیکن آنکھیں کھولنے پر پانی کی دھندلاہٹ آجاتی اور اسے ہندسے تو کیا، گھڑی بھی ٹھیک سے نظر نہیں آتی۔

وہ اس وقت مشکلات ہی مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔

اندازے سے اس نے جب بارہ تیرہ منٹ کا فاصلہ طے کرلیا تو سطحِ آب کی طرف اٹھنا شروع کیا اور پھر سر صرف اتنا اوپر نکالا کہ پانی سے وہ پوری طرح باہر نہ نکلے۔ وہ اتنی ہی ابھری کہ اس کے ہونٹ تک پانی سے رہے۔ پوری طرح سر باہر نکالنے میں یہ خدشہ تھا کہ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود ساحل سے اسے دیکھ لیا جاتا اگر وہاں کوئی ہوتا۔

اس طرح اسے سانس لینے کا بھی موقع مل گیا۔ ساحل پر اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے قدرے اطمینان کی سانس لی اور دو تین منٹ تک اسی پوزیشن میں رہی۔ وہ زیادہ سے زیادہ سانسیں لے کر خود کو کسی حد تک تازہ دم کرنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد اس نے سطحِ آب پر ہی آہستہ آہستہ

تیرنا شروع کیا۔ اس کی نظریں جزیرے کے ساحل ہی کی طرف رہیں۔ وہ ذرا بھی خطرہ محسوس کرتی تو بلاتاخیر ڈبکی لگا جاتی۔

اور جب وہ ساحل کے خاصی قریب ہوگئی تو اس نے کئی افراد کو ساحل کی طرف آتے دیکھا۔ وہ فوراً زیرِآب چلی گئی۔ سانسیں لینے کا موقع مل جانے کے باعث وہ مزید بیس منٹ زیرِآب رہ سکتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اتنی دیر میں وہ لوگ اس جگہ سے واپس لوٹ جائیں گے یا اپنے دائیں بائیں کسی طرف بڑھیں گے۔ اس وقت صوفیہ کو سمندر سے باہر نکلنے کا موقع مل سکتا تھا۔ اس کی دانست میں یہ امکان نہیں تھا کہ وہ اتنی دیر تک اسی جگہ موجود رہیں۔

جب اس کے ہاتھ زمین سے ٹکرائے تو اس نے سمجھ لیا کہ وہ ساحل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اگرچہ اسے خیال تھا کہ اب وہ لوگ وہاں نہیں ہوں گے، تاہم اس نے بہت احتیاط سے سر ابھارا لیکن اتنا نہیں کہ گردن تک باہر آجاتی۔ اس نے سکون محسوس کیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ ساحل پر پہنچ گئی اور پہلے ہی کی طرح خود کو ایک گھنی جھاڑی میں چھپا لیا۔ کوئی اس جھاڑی کے بالکل قریب آجاتا، تبھی اسے دیکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ اس کی نوبت نہیں آنے دیتی۔ قدموں کی آہٹ سنتے ہی وہ بہت تیزی سے سمندر کا رخ کرتی۔

رات کی طرح اس نے اپنے کپڑے نہیں اتارے۔ اگر سوکھنے کے لیے کپڑے اتارتی تو خطرہ محسوس کرنے پر اسے کپڑے اپنے ہاتھ میں لے کر سمندر میں اترنا پڑتا اور اسے تیرنے میں دشواری پیش آتی۔

پیاس سے اب اس کا بہت بُرا حال ہو چکا تھا۔ حلق میں کانٹے تو پہلے ہی پڑ چکے تھے اور اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ببول کے کانٹے بن گئے تھے، لیکن وہ اس کا مداوا اس وقت تک نہیں کر سکتی تھی جب تک بستی میں پہنچ کر کہیں سے پانی نہ حاصل کر لے۔

دفعتاً اس نے کچھ آہٹ سنی۔ وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے اغواکار کو دیکھا جو ایک آدمی کے ساتھ کچھ فاصلے سے گزر رہا تھا۔ اس کی توجہ جھاڑی کی طرف نہیں تھی۔ دونوں ہی ننگے پیر تھے۔ اغواکار نے یہ ضروری سمجھا ہوگا کہ جوتے نہ پہنے جائیں۔ جوتوں کی آہٹ جلدی سنائی دے جاتی ہے۔

دوسرے آدمی کے جسم پر صرف تہبند اور واسکٹ نما صدری تھی۔ سر پر چمڑے کا ایک گول پہیا سا تھا جس میں کسی پرندے کے تین پر لگے ہوئے تھے۔

''ہم اسے نہیں ڈھونڈ سکے جانو!'' اغواکار کی مدھم آواز سنائی دی کیونکہ وہ بستی کی طرف جا رہے تھے اور جھاڑی سے کچھ دور تھے۔

جواب میں جانو نامی شخص نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جواب دیا کہ اسے ڈھونڈنے میں کوئی کسر تو ان لوگوں نے اٹھا نہیں رکھی۔ اس جواب میں صوفیہ نے ''قادر بابا'' کے الفاظ بھی سنے اور اس کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ اس کے اغواکار کا نام قادر تھا۔

''اس نے چھپنے کے لیے کوئی بہت ہی خاص جگہ ڈھونڈی ہے۔'' قادر کی پہلے سے زیادہ مدھم آواز سنائی دی۔ ''اپنے سب آدمیوں سے کہو کہ وہ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ اب بس انتظار کرنا ہوگا۔ بڑھتی ہوئی بھوک پیاس اسے موت ہی کی طرف لے جائے گی یا وہ خود کو ہمارے حوالے کر دے گی۔''

آواز بتدریج مدھم ہوتی چلی گئی تھی۔

جواب میں جانو نے جو کچھ بھی کہا، وہ صوفیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ وہ دونوں اب زیادہ دور نکل گئے تھے۔

قادر کے منہ سے ''بھوک'' کا لفظ سن کر صوفیہ کا دھیان اپنی بھوک کی طرف گیا۔ حلق میں پڑنے والے کانٹوں کی تکلیف کے باعث اس کا دھیان بھوک کی طرف نہیں گیا تھا۔

ان دونوں کی باتوں سے جو صورتِ حال سامنے آئی تھی، وہ صوفیہ کے لیے خاصی حد تک اس لیے اطمینان بخش تھی کہ اب اسے تلاش نہیں کیا جاتا، قادر انتظار کرتا کہ وہ خود کو اس کے حوالے کردے۔

مر جاؤں گی لیکن خود کو اس کے حوالے نہیں کروں گی، صوفیہ نے فیصلہ کیا۔

☆☆☆

طالش نے اپنے ماتحت سرفراز کی کال وصول کی۔

''سر!'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''ابھی تک میں واجد امیر کے بارے میں تو کوئی خاص بات معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں سنی جاتی ہیں کہ اس کی پارٹی کا کوئی عسکری ونگ بھی ہے اور اس بارے میں پولیس بھی شکوک وشبہات کا شکار ہے لیکن اس بارے میں کوئی ثبوت حاصل نہیں کیا جا سکا ہے مگر مجھے ایک بات ایسی معلوم ہوئی ہے جو شاید آپ کے لیے اہمیت کی حامل ہو۔''

''جلدی سے وہ بھی بیان کر ڈالو، میں جلدی میں ہوں۔'' طالش کو واقعی جلدی تھی۔ اسے آصف خاں کے گھر جا کر ان سے ریکارڈنگ کی سی ڈی لینی تھی جو تیار کی جا چکی تھی۔

سرفراز نے کہا۔ ''واجد امیر کی پارٹی کا ترجمان ایک شخص رئیس بیگ ہے۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ پہلے وہ آصف خاں ہی کی پارٹی میں تھا۔ سال ڈیڑھ سال پہلے آصف خاں نے اسے اپنی پارٹی سے نکال دیا تھا۔''

''اوہ......'' طالش کے منہ سے نکلا۔ ''کیوں؟ ایسا کیوں کیا تھا آصف خاں نے؟''

''پارٹی کے ایک قریبی ذریعے کے مطابق رئیس بیگ میں کچھ منفی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ آصف خاں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے سوچنے کا انداز مجرمانہ ہے۔ غالباً اسی لیے انہوں نے اسے اپنی پارٹی سے الگ کیا تھا۔ اس کے چند روز بعد ہی وہ واجد امیر کی پارٹی میں چلا گیا۔''

''اس معاملے میں وہ میری نظر میں آچکا ہے لیکن یہ تم نے ایک نئی بات معلوم کی کہ پہلے وہ آصف خاں کی پارٹی میں تھا۔

ہوں! اور کوئی خاص بات؟''

''یہ گمان بھی کیا جا رہا ہے کہ پارٹی کا عسکری ونگ اسی کے انڈر میں ہے۔ اس کے سوا مجھے ابھی اور کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ میں واجد امیر کے ماضی کے بارے میں چھان بین کر رہا ہوں لیکن ابھی اس بارے میں بھی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی ہے۔''

''خیر!'' طالش نے کہا۔ ''تم اپنا کام جاری رکھو۔'' پھر اس نے رابطہ منقطع کیا اور اپنے گھر سے نکل کر آصف خاں کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اگرچہ ابھی تک اسے یہ اطلاع نہیں ملی تھی کہ اس کے آدمیوں نے رئیس بیگ کو اغوا کر لیا ہے لیکن وہ چاہتا تھا کہ سی ڈی تو جلد از جلد حاصل کر لے تاکہ رئیس بیگ کے اغوا کے بعد وہ فوری طور پر اس سے کام لے سکے۔

آصف خاں سے اس نے سی ڈی لے لی۔ اس نے...

...محسوس کیا کہ آصف خاں اب اس کی شخصیت کے بارے میں اس پر سوالات کی بوچھاڑ کرنے ہی والا ہے اس لیے وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ''میں بہت جلدی میں ہوں۔ میں بس یہ سی ڈی لینے آیا تھا۔ اس کے ذریعے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔''

''اچھا...!'' انہوں نے طویل سانس لی۔ ''میں تم سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتا تھا لیکن تم بہت عجلت میں نظر آ رہے ہو اس لیے وہ باتیں پھر کسی وقت سہی۔''

''اس سی ڈی میں جو ریکارڈنگ ہے، مجھے اس سے بہت اہم کام لینا ہے۔'' طالش نے جاتے جاتے کہا۔

اب وہ سیدھا اپنے گھر ہی جاتا لیکن موبائل پر اسے اطلاع ملی کہ رئیس بیگ کو اس کی کار سمیت اغوا کر کے متعین کردہ جگہ پہنچا دیا گیا ہے۔

''گڈ!'' طالش نے کہا۔ ''میں فوراً وہاں آ رہا ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کر کے کار کی رفتار بڑھائی ہی تھی کہ اس کا موبائل پھر گنگنا اٹھا۔ اس مرتبہ کال کرنے والا وہ ماتحت تھا جس نے سمندر میں تیرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کے ٹکڑوں کی اطلاع دی تھی۔ اس مرتبہ اس نے ایک ایسی اطلاع دی کہ طالش کے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ اس اطلاع سے وہ ایک نتیجہ اخذ کر سکتا تھا۔ اس نے رابطہ منقطع کیا اور اس ماتحت سے رابطہ کیا جس نے رئیس بیگ کو اغوا کرنے کی اطلاع دی تھی۔

''تم مجھ سے فوراً اسٹریٹ نمبر چھ پر میکڈونلڈ کے سامنے ملو۔ اس جگہ کا انتخاب میں نے اس لیے کیا ہے کہ تم... وہاں پندرہ منٹ میں پہنچ سکتے ہو اور میں بھی اس وقت تک پہنچ جاؤں گا۔ ایک آدھ منٹ کا فرق پڑ سکتا ہے۔''

''میں آتا ہوں سر!''

''فوراً نکلو۔'' طالش نے کہا اور رابطہ منقطع کر کے کار کی رفتار بڑھا دی۔ وہ ذرا بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اب کچھ اور کام کرنا تھا لیکن وہ رئیس بیگ کے معاملے کو بھی زیادہ ٹالنا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا۔

یہ اتفاق تھا کہ دونوں کاریں سیکنڈز کے فرق سے میکڈونلڈ کے سامنے رکیں۔ طالش نے ماتحت کو اپنی کار میں بلایا اور اسے سی ڈی دیتے ہوئے کہا۔ ''اس میں رئیس بیگ کی آواز ریکارڈ ہے۔ وہ اس میں آصف خاں کو بلیک میل کر رہا ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے اسے یہ سنا دینا۔ اگر وہ اسے جعلی قرار دے تو اسے بتا دینا کہ ایکسپرٹ بتا دیں گے کہ یہ جعلی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس سے کچھ سختی کرنی پڑے تو وہ بھی کر گزرنا۔ اس کی زبان ہر قیمت پر کھلنی چاہیے۔''

''ہم ہر ممکن کوشش کریں گے سر!''

''میں یہ سی ڈی لے کر خود وہاں پہنچتا لیکن مجھے ایک اور ضروری کام آ پڑا ہے۔ مجھے فوراً اس پر توجہ دینا ہے۔''

''ہم کوشش کریں گے کہ ہمیں آپ کی کمی محسوس نہ ہو۔''

''بس اب روانہ ہو جاؤ۔''

ماتحت فوراً کار سے اتر گیا اور طالش نے کار کو حرکت میں لانے میں ذرا بھی دیر نہیں کی۔ وہ بتدریج رفتار بڑھاتا ہی

چلا جارہا تھا۔

☆☆☆

جزیرے پر صوفیہ کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔ بھوک سے زیادہ پیاس اُسے بے حال کرنے لگی تھی۔ اس عالم میں اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا اگر اس کے ہاتھ پر گھڑی بندھی نہ ہوتی۔

اس طرح بے بسی کی موت مرنے سے تو بہتر ہے کہ کچھ کیا جائے۔ وہ سوچنے لگی، ان بے پناہ درختوں میں کوئی ایسا درخت تو ہونا چاہیے جس پر جنگلی ہی پھل لگے ہوئے ہوں۔ ایسے پھل کم یا زیادہ تلخ ہوتے ہیں لیکن ان کے کڑوے رس سے اتنا تو ہوتا کہ اس کے حلق میں پڑے ہوئے کانٹے ختم ہوجاتے۔ ذہن میں آنے والے اس خیال کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور ایک طرف بڑھنے لگی۔ اس کی نظر درختوں کا جائزہ لیتی جارہی تھی۔ آخر اسے ایک ایسا درخت نظر آ ہی گیا جس پر امرود کے سائز کے پھل لگے ہوئے تھے۔ اس کے لیے درخت پر چڑھنا تو ممکن نہ تھا۔ اس نے کسی پتھر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ آخر اسے ایک ایسا پتھر مل ہی گیا جو اتنا وزنی بھی نہیں تھا کہ وہ اٹھا نہ سکتی اور نہ اتنا ہلکا تھا کہ اپنے ہدف پر لگ کر اثر نہ کرتا۔ صوفیہ نے وہ پتھر اٹھا کر پوری طاقت سے ایک ایسی شاخ پر مارا جس پر زیادہ پھل لگے ہوئے تھے۔ اگر اس کا نشانہ غلط ہوجاتا تو وہ کوئی اور پتھر اٹھاتی لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تین پھل زمین پر آ گرے۔ اس نے جلدی سے وہ پھل اٹھائے، ان پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ صوفیہ نے ان میں سے ایک کو اپنے کپڑوں سے صاف کیا۔

پھل میں بہت زیادہ کڑواہٹ نہیں تھی لیکن کم بھی نہیں تھی۔ اس کی کڑواہٹ کے باوجود صوفیہ اسے نگل ہی گئی۔ اس سے حلق کچھ پُرسکون ہوا۔ اس نے سارا پھل کھالیا۔ حلق میں پڑے ہوئے کانٹے ختم ہوگئے تو اس نے اس طرح لمبی لمبی سانسیں لیں جیسے کسی سخت مرحلے سے گزری ہو پھر اس نے دوسرا پھل کھایا۔ اب رس کی کڑواہٹ کچھ کم محسوس ہوئی۔ تیسرا پھل کھانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اب معدے میں کچھ گیا ہے۔ اس نے اپنی حالت میں کچھ بہتری محسوس کی۔ اس کا جی چاہا کہ مزید پھل توڑ کر کھائے لیکن پھر اس خیال سے رک گئی کہ وہ کڑوے جنگلی پھل کھانا اس کے لیے نقصان دہ نہ ثابت ہوجائے۔

بھوک پیاس کی وجہ سے وہ پھل کھانے میں اتنی مصروف ہوئی تھی کہ اسے اپنے اردگرد کے ماحول کا کچھ احساس ہی نہیں رہا تھا۔ اب جو اس نے کسی طرف جانے کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ دس پندرہ مقامی افراد اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ انہی میں جانو بھی تھا اور قادر بھی جو استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بہت بھوکی ہو؟'' اس کے سوال میں بھی مذاق اُڑانے کی کیفیت تھی۔

''میرا منصوبہ کارگر ہی رہا۔'' وہ پھر بولا۔ ''میری ہدایت پر یہ سب لوگ ہر جگہ سے یہ کہتے ہوئے گزرے کہ اب اس کی تلاش بے کار ہے۔ سب اپنے گھروں کو جائیں اور اس وقت کا انتظار کریں جب بھوک پیاس سے تنگ آکر خود ہی اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردے گی۔ تم جہاں بھی چھپی ہوئی تھیں، وہاں تم نے یہ بات سن لی تھی اور اسی لیے تم اطمینان سے باہر نکل آئیں۔''

صوفیہ خاموش رہی۔ وہ بولتی بھی کیا۔

''چلو!'' قادر نے سر سے ایک طرف اشارہ کیا۔

''کہاں؟'' صوفیہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''تمہیں ایک کمرے میں پہنچانا ہے۔ وہاں تم آرام کرنا۔ کل سے اب تک جاگتی رہی ہو۔ خیر، سونے کا موقع تو مجھے بھی نہیں ملا ہے، بلکہ ابھی مجھے اور جاگنا ہے۔'' پھر اس نے دوبارہ کہا۔ ''چلو...... میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔''

صوفیہ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہی کرے جو اس سے کہا جارہا تھا۔ قادر کے ساتھ اتنے لوگ تھے کہ وہ اسے زبردستی لے جاسکتے تھے۔

''لانچ ٹھیک ہوگئی ہوگی؟'' قادر نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے جانو سے پوچھا۔

جانو نے خیال ظاہر کیا کہ ٹھیک ہوگئی ہوگی۔ اس نے کئی آدمی اس کی خرابی دور کرنے پر لگائے تھے۔

صوفیہ کو بھی قادر اپنے دائیں ہاتھ پر چلا رہا تھا۔

''یہ لوگ مچھیرے ہیں۔'' قادر نے اس سے کہا۔ ''کشتیوں پر مچھلی کا شکار کرتے ہیں پھر ایک لانچ کے ذریعے وہ شہر پہنچائی جاتی ہیں۔ دو دن سے ان کی لانچ خراب تھی جس سے انہیں خاصا نقصان پہنچا ہے۔ بہرحال اب وہ لانچ میرے کام آئے گی۔ ہیلی کاپٹر سے کودتے وقت موبائل گر گیا تھا۔ میں کسی کو اطلاع بھی نہ دے سکا کہ ہم پر کیا گزری ہے۔ ویسے ہیلی کاپٹر کی تباہی تو حکومت کے علم میں آ گئی ہوگی۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں نے جزیرے کا رخ نہیں کیا اور یہ اچھا ہی ہوا۔ اب میں لانچ پر جا کر کسی کو سارے حالات سے آگاہ

کردوں گا اور دوسرا موبائل لے کر آؤں گا۔ میں خود اس سے بے خبر ہوں کہ تمہارے باپ نے ہمارا مطالبہ پورا کیا یا نہیں۔ اگر کر دیا ہے تو تمہیں واپس پہنچا دیا جائے گا۔ میری واپسی تک تم آرام کرنا۔ اوہ ہاں تم بھوکی پیاسی بھی ہو۔ تمہارے آرام کرنے سے پہلے تمہیں کچھ کھلا پلا دیا جائے گا۔ مہمان نواز لوگ ہیں یہ۔''

قادر بولتا چلا گیا تھا لیکن صوفیہ اب بھی خاموش رہی تھی۔

آبادی میں پہنچنے پر صوفیہ نے مچھلی کی بُو محسوس کی اور اسے ابکائی آتے آتے رہ گئی۔

بستی کی عورتیں اور بچے اس طرح جمع ہو گئے تھے جیسے صوفیہ ان کے لیے کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔ جانو کے ڈانٹنے پر وہ لوگ منتشر ہوئے۔

صوفیہ کو جہاں پہنچایا گیا، وہ ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس تھا۔ صوفیہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ مچھیروں کی اس بستی میں ایسی کوئی عمارت بھی ہوگی۔

''یہاں تم آرام کر سکتی ہو۔'' قادر نے اسے ایک کمرے میں پہنچا کر کہا۔

وہ پُرآسائش کمرا قیمتی ساز و سامان سے مزین تھا۔

قادر اور صوفیہ کے ساتھ جانو بھی کمرے میں آیا تھا۔ اس نے قادر کو بتایا کہ کھانے پینے کے لیے کچھ لانے کی ہدایت اس نے کسی کو کر دی ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' قادر نے کہا۔ ''اب تم جلدی سے جاؤ اور آکر مجھے بتاؤ کہ لانچ ٹھیک ہوگئی ہے یا نہیں۔''

جانو سر ہلا کر چلا گیا۔

''یہ اس بستی کا سردار ہے۔'' قادر نے صوفیہ کو بتایا۔ ''اس کے سر پر جو پر ہیں، وہ صرف سردار ہی لگا سکتا ہے۔ تم نے کسی اور کے سر پر ایسے پر نہیں دیکھے ہوں گے۔''

صوفیہ یہ بات نوٹ کر چکی تھی۔ قادر پھر بولا۔

''میں نے جب جزیرے کی طرف تیرنا شروع کیا تھا تو میں نے تمہیں بھی جزیرے کی طرف تیرتا ہوا دیکھ لیا تھا لیکن اس وقت سمندر اتنا سرکش تھا کہ میں تمہارے قریب نہیں پہنچ سکا۔ بہرحال مجھے یہ اطمینان تھا کہ جزیرے پر تم مجھے مل ہی جاؤ گی لیکن تم نے پریشان خاصا کیا۔ تم کہاں چھپی ہوئی تھیں؟''

''سمندر میں۔'' صوفیہ نے جھوٹ بولنا ضروری نہیں سمجھا۔

''کیا؟'' قادر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہی ایک تدبیر میری سمجھ میں آئی تھی۔ میں زیرِ آب رہ کر آدھے گھنٹے تک سانس روک سکتی ہوں۔''

''واہ۔'' قادر نے کہا۔ ''اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔''

''میرے والد سے کیا مطالبہ کیا گیا ہے؟'' صوفیہ نے پوچھا۔ ''وہ میری خاطر بڑی سے بڑی رقم دے سکتے ہیں۔''

''ان سے رقم کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے۔''

''پھر؟'' صوفیہ نے پوچھا۔ اسے اب مکمل اطمینان ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

قادر نے جواب دیا۔ ''ان سے مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ وہ الیکشن میں حصہ نہ لیں، اپنے کاغذات نامزدگی واپس لے لیں۔''

''تو...... تو...... میر باقر؟...... میر باقر کے ایجنٹ ہو تم؟''

قادر جواب دیے بغیر ہنس کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے ایک آدمی کھانے پینے کا کچھ سامان لایا تھا۔

صوفیہ کے لیے یہ بڑی اذیت ناک بات تھی کہ اس کے والد کو انتخابات سے الگ رکھنے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اپنی بیٹی کی خاطر وہ یہ مطالبہ تسلیم بھی کر سکتے ہیں۔

''اب پیٹ تو بھر لو۔'' قادر نے اس سے کہا۔

صوفیہ نے کھانے کی طرف دیکھا جو موٹی سی روٹیوں اور ایک پیالہ سالن پر مشتمل تھا۔

''فوری طور پر یہی ممکن تھا۔'' قادر نے اس سے کہا۔

جانو دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ لانچ روانگی کے لیے تیار ہے۔

''میں جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔'' قادر، صوفیہ سے کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔ ''یہاں تم خود کو بالکل محفوظ سمجھو...... کھانا کھا کے آرام کر لو۔''

''یہ کھانا میں نہیں کھا سکوں گی۔ سالن سے ایسی بُو آرہی ہے جیسے سڑی ہوئی مچھلی ہو۔ میں صرف پانی پی لوں گی۔'' اس نے پانی کے برتن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''تمہاری مرضی۔'' قادر نے کہا۔ ''میں نے ابھی کہا تھا کہ فی الحال یہی ممکن ہے۔ میں واپس آؤں گا تو تمہارے کھانے کے لیے کچھ لیتا آؤں گا۔''

وہ صوفیہ کے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر جانو کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اسی وقت ایسی دھمک سنائی دی جیسے کچھ افراد دوڑتے

ہوئے قریب آرہے ہوں۔ وہ دھمک... وزنی جوتوں کی تھی جو قادر نے بھی سنی ہوگی۔ اس نے کچھ پریشانی کے عالم میں دروازہ کھولا۔ فوراً ہی ایک ریوالور کی نال اس کے سینے سے آلگی۔ ''اپنے ہاتھ اوپر اٹھادو۔'' قادر سے کہا گیا۔

ریوالور والا سادہ کپڑوں میں تھا لیکن اُس کے پیچھے نیول پولیس کے باوردی لوگ تھے۔

''طالش!'' صوفیہ خوشی سے چیخ پڑی۔

قادر کے سینے سے ریوالور کی نال لگانے والا طالش ہی تھا۔

☆☆☆

مسز نشتر، واجد امیر ہی کے گھر کے ایک کمرے میں بیٹھی اس سے کہہ رہی تھی۔ ''اب ہوگا کیا؟''

''میرا دماغ خود بہت بُری طرح اُلجھا ہوا ہے۔'' پریشان نظر آنے والے واجد امیر نے کہا۔ ''میں نے اس کام کے لیے منصوبہ بندی تو بہت اچھی کی تھی۔ میر باقر کے اس جزیرے کے بارے میں مجھے تم سے معلوم ہوا تھا اس لیے میں نے رئیس بیگ سے بھی کہا تھا کہ وہ صوفیہ کو اس جزیرے پر پہنچادے۔ اب یہ تو مجھے معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ہیلی کاپٹر خراب حالت میں ہے۔''

''میر باقر مجھے اسی ہیلی کاپٹر میں اپنے ساتھ اس جزیرے پر دو بار لے جاچکا ہے۔ تمہیں بتایا تھا میں نے کہ وہاں اس کا ریسٹ ہاؤس ہے۔ اب ان دنوں میر باقر سے ایسی کوئی بات ہی نہیں ہوئی کہ وہ مجھے ہیلی کاپٹر کی خرابی کے بارے میں اطلاع دیتا۔ اگر یہ بات میرے علم میں ہوتی تو کیا میں تمہیں نہیں بتاتی؟''

واجد امیر نے متفکرانہ انداز میں سر ہلایا۔

''رئیس بیگ اب کیا کہہ رہا ہے؟'' مسز نشتر نے پوچھا۔

''وہ بھی پریشان ہے۔ دبے الفاظ میں وہ یہ بھی کہہ چکا ہے کہ میں نے ہی اسے ہیلی کاپٹر خراب ہونے کے بارے میں باخبر نہیں کیا تھا۔''

''آصف خاں سے اس نے پھر بات کی؟''

''دو مرتبہ کرچکا ہے۔ دوسری بار آصف خاں نے کہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے بات کرکے مطمئن ہونا چاہتا ہے۔ رئیس بیگ نے جواب دیے بغیر لائن کٹ کردی تھی۔ یہ ممکن ہی کہاں رہا ہے کہ صوفیہ سے اس کی بات کرائی جائے۔''

''جب پولیس کو ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے مل چکے ہیں سمندر میں اور غوطہ خوروں سے بھی کام لیا گیا ہے کہ ہیلی کاپٹر کے

ماں باپ کا پیغام

جس دن تم ہمیں ضعیف دیکھو۔ تب صبر کرنا اور ہمیں سمجھنے کی کوشش کرنا۔

☆☆☆

جب ہم کوئی بات بھول جائیں تو ہم پر غصہ نہ کرنا اور اپنا بچپن یاد کرنا۔

☆☆☆

جب ہم ضعیف ہوکر چل نہ پائیں تو ہمارا سہارا بننا اور اپنا پہلا قدم یاد کرنا۔

☆☆☆

جب ہم بیمار ہوجائیں تو وہ دن یاد کرکے ہم پر اپنے پیسے خرچ کرنا۔ جب ہم تمہاری خواہشیں پوری کرنے کے لیے اپنی تمام خواہشیں قربان کرتے تھے۔

لاعلاج

بیوی اپنے شوہر کا موبائل چیک کررہی تھی۔ اس میں نمبر کچھ اس طرح سے محفوظ تھے۔ دل بہلانے کا علاج، خوشی کا علاج، غم کا علاج، بیوی نے اپنا نمبر ڈائل کیا تو لکھا تھا۔ ''لاعلاج۔''

خوب صورت باتیں

دشمن سے زیادہ خطرناک وہ ہے جو دوست بن کر بےوفائی کرے۔

دنیا میں سب سے مہنگی چیز عزت اور سب سے قیمتی چیز دوستی ہے۔ کسی کو دوست بنانے سے پہلے اپنے دل میں ایک قبرستان بنالو تاکہ اس میں دوست کے عیب دفن کرتے جاؤ۔

بورے والا سے عبدالجبار رومی انصاری کی ضیافت

مسافروں کی لاشیں مل سکیں لیکن کوئی لاش نہیں ملی ہے۔ تو کیا اس کا امکان نہیں کہ وہ ہیلی کاپٹر کی تباہی سے پہلے ہی اس سے کود گئے ہوں؟"

"یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب قادر کو احساس ہو جائے کہ ہیلی کاپٹر میں کوئی خرابی ہے اور وہ گرنے والا ہے۔"

"تم نے مجھے نام نہیں بتایا تھا پائلٹ کا۔"

"تم ٹھیک سمجھیں۔ قادر ہی نام ہے اُس کا۔ وہ ایک ریٹائرڈ پائلٹ ہے یا تھا شاید ریٹائرڈ نہ ہو۔ کسی اور باعث ادارے سے نکالا گیا ہو۔ رئیس بیگ نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا تھا اور مجھے کوئی سوال کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ مجھے تو بس پھل کھانے تھے، پیڑ گننے کی ضرورت نہیں تھی۔ ساری ذمّے داری میں رئیس بیگ پر ڈال چکا تھا اور مجھے اس پر اعتماد بھی ہے۔ میں پہلے بھی اس سے دو ایک کام لے چکا ہوں جو اس نے بڑی خوش اسلوبی سے کیے تھے۔"

"میں پھر اپنا سوال دہراؤں گی...... بلکہ پہلے ایک بات اور کہوں...... اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ دونوں ہیلی کاپٹر کی تباہی کے اندیشے سے پہلے ہی کود گئے تھے تو اگر وہ دونوں تیرنا جانتے ہیں تو زندہ بھی بچ سکتے ہیں۔ اگر وہ مر گئے ہوتے تو ان کی لاشیں تو غوطہ خوروں کو ملنی چاہیے تھیں۔"

"کل رات سمندر بہت پُرجوش تھا۔ لاشیں بہہ کر دور نکل جائیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ صوفیہ کے بارے میں تو مجھے علم نہیں کہ وہ اچھی تیراک تھی یا نہیں اور قادر کے بارے میں بھی رئیس بیگ کو اس کا علم نہیں۔"

"ہوسکتا ہے وہ دونوں اچھے پیراک ہوں اور جزیرے تک پہنچ گئے ہوں اور قادر کا موبائل اس دوران میں گر گیا ہو اس لیے وہ اطلاع نہ دے سکا ہو۔"

"اس موضوع پر رئیس بیگ سے بات ہو چکی ہے میری۔ اس نے بھی اس بات کا امکان ظاہر کیا ہے کہ وہ دونوں ہی اچھے پیراک ہوں اور جزیرے تک پہنچ گئے ہوں۔ وہ میر باقر کا نام لے کر جزیرے پر بسے ہوئے ماہی گیروں کو بے وقوف بنا سکتے ہیں۔ جزیرے کے وہ لوگ بہت سیدھے سادے لوگ ہیں۔ یہ مجھے تم نے ہی بتایا تھا۔"

"اگر رئیس بیگ سے اس بارے میں تمہاری بات ہو چکی ہے تو یہ معلوم کرنے کی کوشش تو کی جانی چاہیے کہ وہ اس جزیرے پر ہیں یا نہیں۔"

"رئیس بیگ خود بھی یہ سوچ چکا ہے۔ وہ آج رات کرائے کی لانچ میں جزیرے پر جائے گا۔ دن کی روشنی میں وہ اس طرف نہیں جانا چاہتا۔ نیول پولیس کی لانچوں سے سامنا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

"یہ ضروری ہے کہ وہ وہاں جائے۔ اچھا، ہاں...... میں نے ابھی کہا تھا کہ میں اپنا ایک سوال دہراؤں گی۔ اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ دونوں مر چکے ہیں تو اب کیا ہوگا۔ اس معاملے میں اب کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"رئیس بیگ کے دوسرے فون تک وہ کاغذات نامزدگی واپس لینے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی بتا چکا ہوں تمہیں کہ وہ بیٹی سے بات کرنے پر اصرار کر رہا ہے۔"

مسز نشتر نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ دونوں زندہ مل جائیں۔"

"لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ مر چکے ہوں۔"

"صوفیہ سے بات نہ ہونے کی صورت میں آصف خاں کاغذات نامزدگی واپس لے گا یا نہیں؟"

"میں کیسے جان سکتا ہوں کہ وہ کیا سوچ رہا ہوگا اور کیا کرے گا۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ واجد امیر کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ملازم تھا اور یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ ایک پولیس آفیسر اس سے ملنے آیا ہے۔

"پولیس۔" مسز نشتر کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ "کیا کچھ معلوم ہو گیا پولیس کو؟"

"کسی پولیس آفیسر کا اس طرح آنا معنی خیز تو ہے۔" واجد امیر کے چہرے پر بھی فکرمندی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ "لیکن ملنا تو پڑے گا۔ اگر ٹالنا چاہا تو صورتِ حال شاید کوئی منفی رخ اختیار کر لے۔" پھر اس نے ملازم کو ہدایت کی کہ وہ پولیس آفیسر کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔

"اس وقت میں بھی یہاں ہوں۔" مسز نشتر تشویش سے بڑبڑائی۔

"تم اسی کمرے میں رہو۔ میں جا کر ملتا ہوں۔" واجد امیر نے کہا۔

مسز نشتر نے اس طرح سر ہلایا جیسے واجد امیر کا مشورہ معقول ہو۔

واجد امیر ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

پولیس آفیسر ایک ڈی ایس پی تھا جس کے ساتھ سادہ لباس میں ایک جوان العمر شخص بھی تھا۔

واجد امیر نے بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "میں حیران ہوں کہ پولیس نے میرے گھر آنے کی زحمت کی، خیریت تو ہے؟"

ڈی ایس پی نے اسے کوئی جواب دینے کے بجائے

اپنے سامنے آئے ہوئے شخص کی طرف دیکھا جو بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

''میرا نام طالش ہے۔'' وہ واجد امیر کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔''میرے جسم پر وردی تو نہیں لیکن میں ایک سرکاری منصب پر ہوں۔ ممکن تو یہ بھی تھا کہ آپ کو پولیس ہیڈ کوارٹر طلب کرلیا جاتا لیکن اس میں ایک اندیشہ تھا کیونکہ آپ کے دل میں چور ہوتا اس لیے آپ پولیس ہیڈ کوارٹر آنے سے گریز کرتے، کوئی بہانہ بنادیتے یا...... خیر چھوڑیں۔ اسی لیے ہمیں خود آنا پڑا۔''

''میرے دل میں کیا چور ہوسکتا ہے؟'' واجد امیر نے چونکنے کے باوجود مسکرانے کی کوشش کی۔

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ میں پہلے کسی تمہید کے بغیر آپ کو بتادوں کہ آپ اس وقت خود کو زیرِ حراست سمجھیں۔''

پریشان ہوجانے کے باوجود واجد امیر نے تیز لہجے میں کہا۔''وہ کیوں؟ کیا میں نے کسی کو قتل کردیا ہے؟ کہیں ڈاکا مارا ہے؟ یا کوئی اور جرم کیا ہے؟''

''جی ہاں۔'' طالش کی سنجیدگی برقرار رہی۔''آپ آصف خاں کو بلیک میل کررہے ہیں۔ آپ نے ان کی بیٹی صوفیہ کو اغوا کروایا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آصف خاں الیکشن میں حصہ نہ لیں۔''

''کیا خرافات ہے یہ۔'' واجد امیر نے تیزی دکھائی۔''مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی بیٹی کو اغوا کرلیا گیا ہے۔''

''یہ بات اخبارات تک نہیں پہنچنے دی گئی تھی۔'' طالش نے کہا۔''خیر، اب آپ کا کھیل ختم ہوچکا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہم مسز نشتر کو بھی حراست میں لینا چاہتے ہیں کیونکہ انہوں نے اس جرم میں سہولت کار کا کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے ہی آپ کو اس جزیرے کے بارے میں بتایا ہوگا جہاں صوفیہ کو اغوا کرکے لے جایا گیا۔ ٹھہریں...'' طالش نے ہاتھ اٹھا کر واجد امیر کو بولنے سے روکا اور اپنی بات جاری رکھی۔''جزیرے سے صوفیہ کو بازیاب کرا کے اور قادر کو گرفتار کرکے ہی ہم واپس شہر آئے ہیں اور میر باقر سے بھی ہماری بات ہوچکی ہے۔ وہ اعتراف کرچکے ہیں کہ وہ جزیرہ حکومت سے خریدنے کے بعد وہاں انہوں نے ایک ریسٹ ہاؤس بنوایا تھا اور کبھی کبھی مکمل آرام کرنے کے لیے وہاں جایا کرتے ہیں۔ مکمل آرام ہی کی وجہ سے انہوں نے اس جزیرے کے بارے میں مسز نشتر کے علاوہ کسی کو نہیں بتایا تھا۔ آپ کو مسز نشتر ہی سے معلوم ہوا ہوگا۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ انہوں نے سہولت کار کا کام سرانجام دیا ہے۔''

قادر کی گرفتاری کا.... سن کر واجد امیر کی جان نکلنے لگی تھی، پھر یہ جان کر تو اس کا جسم ہی ٹھنڈا پڑنے لگا کہ رئیس بیگ کو بھی گرفتار کیا جاچکا ہے۔

''اور رئیس بیگ نے اعترافِ جرم بھی کرلیا ہے۔'' طالش نے اپنی بات جاری رکھی۔''اس کے علاوہ اس کے لیے کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا کیونکہ جب اس نے آصف خاں سے بات کی تھی تو اس کی آواز ریکارڈ کرلی گئی تھی۔ ایکسپرٹ بتا دیں گے کہ وہ اسی کی آواز ہے۔''

''تو ان باتوں کا الزام مجھ پر کیوں لگایا جارہا ہے؟'' واجد امیر نے غصے کا اظہار کیا۔''آپ کو سزا دینی ہے تو رئیس بیگ کو دیں۔''

''اس کی جان تو چھوٹ نہیں سکتی تھی۔'' طالش نے کہا۔''لہٰذا اس نے سرکاری گواہ بننے کا وعدہ لے کر یہ بھی بتادیا کہ سب کچھ اس نے آپ کی ہدایت پر کیا تھا۔''

''جھوٹا الزام لگایا ہے اس نے مجھ پر۔''

''ہم بھی یہ سوچ سکتے تھے لیکن اس نے اس کا ثبوت بھی فراہم کردیا۔ یہ منصوبہ آپ کافی دن سے بنا رہے تھے اس لیے کئی مرتبہ فون پر بھی آپ نے اس سے بات کی تھی۔ اس نے اپنے موبائل میں آپ کی باتیں ریکارڈ کرلی تھیں۔ وہ کیونکہ فطرتاً جرائم پیشہ ہے اس لیے اس نے سوچا ہوگا کہ اس قسم کی باتوں کی ریکارڈنگ کسی وقت شاید اس کے کام آجائے۔''

''سب بکواس ہے۔'' واجد امیر غرایا۔

اس وقت ڈی ایس پی بول پڑا۔''آپ کے خلاف ہمارے پاس جو ثبوت ہیں، ان کی وجہ سے آپ کو حراست میں لیا جارہا ہے اور بس یہی ہمارا کام ہے۔ آپ عدالت میں ثابت کیجیے گا کہ یہ سب بکواس ہے۔ عدالت ہی مجاز ہے کہ آپ کو سزا دے یا آپ کو باعزت بری کردے۔ اب آپ مسز نشتر کو بلوایئے اندر سے۔ آپ اگر جھوٹ بولیں گے کہ وہ یہاں نہیں ہے تو یہ بچکانا جھوٹ ہوگا۔ وہ بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کرسکتی کیونکہ پولیس آپ کے گھر کے چاروں طرف موجود ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ یہاں ہے۔ اس کی کار آپ کے گھر کے احاطے میں موجود ہے۔''

واجد امیر اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔ اس کے انداز میں بےبسی بھی تھی۔

ذرا دیر بعد ہی وہاں سے ایک .... پولیس موبائل روانہ ہوئی جس میں مسز نشتر بھی تھی اور واجد امیر بھی۔

☆☆☆

اسی شام طالش جب آصف خاں کے گھر میں تفصیل بتا رہا تھا، اس وقت صوفیہ بڑی محبت سے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈالے بیٹھی، مسکراتی ہوئی طالش کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''جزیرے سے واپسی پر نیول پولیس کے سامنے تمہیں کچھ بتانا ممکن نہیں تھا صوفیہ!'' طالش کہہ رہا تھا۔ ''ان لوگوں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ میں کون ہوں، اور ان سبھی کو نہیں، ان کے صرف افسر کو جس سے میں نے اپنے محکمے کے سربراہ کی بات بھی کرادی تھی۔ اس کے بغیر مجھے ان کا تعاون حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔''

''ہمیں تم نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا اپنے بارے میں۔'' آصف خاں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''اب آپ کو بتادوں گا انکل۔'' طالش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بس یہ خیال رکھنا ہوگا آپ کو کہ کسی اور کو نہ بتا بیٹھیں۔ میری ملازمت ختم ہوسکتی ہے۔''

''نیوی والوں کو جو بتادیا۔'' صوفیہ بول پڑی۔

''وہ مجبوری تھی اور اس کی اجازت ہے کہ ایسے حالات میں خود کو ظاہر کر دوں لیکن آپ لوگوں کو بتانے کے لیے میرے پاس کوئی جواز نہیں۔''

''تم کو معلوم کیسے ہوگیا کہ میں اس جزیرے پر ہوں؟'' صوفیہ نے پوچھا۔

''ابھی وہی بتانے جارہا ہوں۔'' طالش نے کہا۔ ''مجھے اپنے ماتحت سے صرف اتنی رپورٹ ملی تھی کہ ہیلی کاپٹر کا کوئی اور ٹکڑا یا کسی کی لاش نہیں مل سکی حالانکہ جزیرے کے آگے تک کا سمندر چھان مارا گیا تھا۔ اس رپورٹ نے مجھے چونکایا۔ وہاں کسی جزیرے کی موجودگی میرے علم میں نہیں تھی۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم ایک اچھی پیراک ہو اس لیے مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے تم ہیلی کاپٹر کی تباہی سے پہلے ہی اس سے کود گئی ہو اور تیر کر اس جزیرے میں جاپہنچی ہو۔ بس اسی وقت میں نے اپنی کار کا رخ نیول ہیڈ کوارٹر کی طرف کردیا۔ ایک تو لانچ کی ضرورت تھی، دوسرے یہ بھی ممکن تھا کہ تمہیں اغوا کرنے والوں کے کچھ ساتھیوں سے بھی ٹکراؤ ہوجائے۔ ایسی صورت حال میں نیول پولیس کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ وہاں رسمی کارروائیاں مکمل کرنے کے بعد میں لانچ میں اس جزیرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ دراصل میرا دل شروع ہی سے کہہ رہا تھا کہ تم زندہ ہو۔ جزیرے پر پہنچ کر ہم تیزی سے آگے بڑھ کر بستی میں پہنچ گئے۔ اس وقت مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہاں کوئی بستی بھی ہوگی لیکن بستی کے لوگوں کی وجہ سے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ سب ڈرے ڈرے سے نظر آنے لگے تھے۔ پھر جب وہاں ہمیں ایک ریسٹ ہاؤس نظر آیا تو ہم نے بستی کے ایک آدمی سے پوچھا، اس وقت ریسٹ ہاؤس میں کون ہے۔ سہمے ہوئے اس شخص نے صحیح صحیح جواب دے دیا۔ اس کے بعد ہی میں نیول پولیس کے ساتھ وہاں گھس پڑا تھا۔''

صوفیہ نے خوش ہوکر بچوں کی طرح تالیاں بجائیں۔

آصف خاں بولے۔ ''رئیس بیگ، واجد امیر اور مسز نشتر کے بارے میں تو تم پہلے ہی بتا چکے ہو لیکن سردار رند کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''ابھی اس بارے میں چھان بین جاری ہے۔ شاید آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی ہو لیکن یہ امکان ہے کہ نبیل کا جنون ہی اتنا بڑھا ہوا ہو کہ وہاں آکر اس نے اپنے باپ ہی کو گولی ماری ہو۔ اس طرح وہ ایک الگ کیس بن جائے گا۔ ذاتی طور پر میرا خیال یہی ہے کہ وہ ایک الگ معاملہ ہے کیونکہ صوفیہ کو اغوا کرنے کی منصوبہ بندی تو پہلے ہی کچھ دن سے جاری تھی۔ غالباً آپ ہی کے کسی آدمی کے ذریعے واجد امیر کو صوفیہ کی واپسی کا علم ہوا ہوگا۔''

''یہ مسز نشتر تو بڑی ذلیل عورت ثابت ہوئی۔'' آصف خاں بولے۔ ''ایک طرف اس کے تعلقات میر باقر سے تھے تو دوسری طرف وہ واجد امیر کو بھی اپنے جال میں پھنسائے ہوئے تھی۔''

''جی ہاں۔'' طالش نے کہا۔ ''اس کے ذہن میں ہوگا کہ شاید واجد امیر ہی کی پارٹی انتخابات میں جیت جائے۔''

''بہرحال، کہانی تو اب ختم ہی ہوئی۔''

''جو میری کہانی ہے۔'' صوفیہ ہنسی۔ پھر اس نے کہا۔ ''اچھا اب تم مجھے کہیں آئسکریم کھلانے لے چلو۔''

''گھر میں آئسکریم نہیں ہے کیا؟'' آصف خاں بول پڑے۔

''یہ بات نہیں ڈیڈی! آئسکریم کا تو بس بہانہ ہے۔ میں بڑا اذیت ناک وقت گزارنے کے بعد کچھ دیر اب کھلی فضا میں رہنا چاہتی ہوں۔'' صوفیہ کھڑی ہوگئی۔

''کھانا واپس آکر کھاؤ گی؟''

''ابھی تو کھانے کے وقت میں ایک گھنٹے سے زیادہ ہے۔ میں اس سے پہلے واپس آجاؤں گی۔'' صوفیہ نے جواب دیا، پھر طالش سے بولی۔ ''تم ابھی تک بیٹھے ہی ہوئے ہو۔''

''بھئی ذرا ان سے پوچھنے تو دو کہ یہ ہیں کیا بلا؟''

''میں ان سے پوچھ لوں گی۔ پھر آپ کو بتادوں گی۔'' طالش مسکراتا ہوا کھڑا ہوگیا۔



سفر کے بعد

جمال دستی

هر سفر کا کبھی نہ کبھی ضرور اختتام ہوتا ہے... زندگی کے سفر میں بھی کئی موڑ آتے ہیں... اور بالآخر وہ آخری موڑ بھی آجاتا ہے جہاں زندگی کا سفر تمام ہوتا ہے... ایسے ہی سفر پر روانہ ہو جانے والے باپ کی محبت کا ماجرا... دوسری دنیا میں بھی بیٹے کی محبت نے اسے بے چین رکھا ہوا تھا...

محبت کے اظہار کا دل گداز اور انوکھا انداز......

وہ ایک انتہائی حیرت انگیز پیغام تھا۔

سہیل بتا نہیں سکتا تھا کہ اس پیغام کو دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوئی تھی۔

بے پناہ خوف، دکھ، پریشانی، سب کچھ وہ ایک پیغام میں تھا۔ وہ پیغام اسے اپنے موبائل پر موصول ہوا تھا۔ بہت ہی پیار بھرا میسج تھا۔ صرف یہ لکھا تھا۔ ''بیٹے، میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے سارے دکھ جھٹک کر زندگی کے

راستے پر کامیابی سے سفر کرتے جاؤ۔ ریڈی اسٹڈی گو۔ شاباش۔ بس بہت ہوگیا رونا دھونا۔ مرد کا بچہ بن۔'' یہ ایک دعا تھی۔ ایک خواہش تھی۔ ایک تمنا تھی۔

وہ ساری رات بے چین رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آسکی تھی۔ ایک مہربان چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے رہا تھا۔

دوسری صبح اس کی ماں نے اس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے بیٹے، خیریت تو ہے نا؟''

''وہ ماما، بات یہ ہے کہ......'' وہ کچھ بتاتے بتاتے رک گیا۔ اس نے دوسری بات کر دی۔ ''ماما بس نیند نہیں آسکی تھی۔ بے چینی سی تھی۔''

''تم نے کھانا پینا بھی کم... کر دیا ہے۔'' ماں نے کہا۔

''ہوسکتا ہے۔ میں اس کا دھیان رکھوں گا۔''

دفتر میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک بے نام سا خوف اس پر مسلط تھا لیکن وہ صرف خوف ہی نہیں تھا بلکہ اس میں دکھوں کی آمیزش بھی تھی۔ اس کے دفتر کے ساتھی ارشد نے بھی اس کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ ''کیا بات ہے یار۔ تو بہت پریشان سا دکھائی دے رہا ہے؟''

''ہاں یار، بات ہی کچھ ایسی ہے۔''

''تو ایسا کر میرے کیبن میں آجا۔'' ارشد نے کہا۔

وہ ارشد کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ارشد نے اس کے لیے چائے منگوالی تھی۔

''ہاں اب بتا کیا بات ہے؟'' ارشد نے پوچھا۔

سہیل نے اپنی جیب سے اپنا موبائل نکال کر ارشد کے آگے کر دیا۔ ''یار پہلے یہ میسج پڑھ لے... پھر بات کروں گا۔''

ارشد نے میسج پڑھ کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہاں، اچھا میسج ہے۔ پیار بھرا حوصلہ دلانے والا۔ اس میں کیا خاص بات ہوگئی؟''

''خاص بات یہ ہے کہ یہ میسج مجھے کل رات ملا ہے۔'' سہیل نے بتایا۔

''تو پھر؟''

''بے وقوف انسان کیا تو یہ نہیں جانتا کہ میرے والد صاحب کے انتقال کو دو مہینے ہو رہے ہیں اور ان کی طرف سے یہ میسج مجھے کل مل رہا ہے۔''

''اوہ، میں نے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔'' ارشد بھی حیران رہ گیا۔

''ارشد یہ میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔''

''یہ تم نے عقلمندی کی۔'' ارشد نے کہا۔ ''تم نے اپنی امی سے تو کوئی ذکر نہیں کیا؟''

''نہیں یار۔ پاپا کی موت کے بعد وہ ویسے ہی دل کی مریضہ ہو چکی ہیں۔''

''نمبر چیک کیا؟''

''ہاں، نمبر پاپا کے موبائل کا ہی ہے۔ شاید تم کو میں نے بتایا نہیں کہ پاپا کا موبائل مجھ سے گم ہو گیا تھا۔''

''نہیں، یہ مجھے نہیں معلوم۔''

''پاپا کی موت کے بعد ان کا موبائل میری جیب ہی میں رہتا تھا۔ پھر تدفین کے موقع پر وہ موبائل میری جیب سے کہیں گر گیا۔ قبرستان ہی میں گرا تھا۔ سب نے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن نہیں ملا تھا۔ دوسری طرف اپنی الجھنوں کی وجہ سے مجھے بند کروانا یاد ہی نہیں رہا اور اب یہ میسج میرے سامنے ہے۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کسی نے یوں ہی مذاق میں تمہیں میسج کر دیا ہو۔''

''میں رات بھر اس امکان پر بھی غور کرتا رہا ہوں۔'' سہیل نے بتایا۔ ''لیکن ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میسج میں جو انداز اختیار کیا گیا ہے، وہ میرے پاپا ہی کا ہے۔ وہی کہتے تھے جب میں کبھی زندگی سے تھک کر بیٹھ جاتا تو وہ کہتے تھے۔ بیٹا ریڈی اسٹڈی گو۔ چل کھڑا ہو جا۔ مرد کا بچہ بن شاباش۔ ان کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔ اس میسج میں بھی انہوں نے وہی لکھا ہے۔''

''مائی گاڈ، یہ تو بہت حیرت انگیز بات ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہارے پاپا دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی تمہیں ہمت دے رہے ہیں۔ زندگی سے لڑنے کا حوصلہ دے رہے ہیں۔''

''ہاں بھائی، بات تو یہی ہے لیکن یہ کتنی عجیب اور خوف زدہ کرنے والی بات ہے۔ کیا پاپا کی روح ابھی تک بھٹک رہی ہے؟ تم مشورہ دو... میں کیا کروں؟''

''بھائی، تم ابا کے نام کا صدقہ، خیرات کرو۔'' ارشد نے کہا۔ ''اگر ہوسکے تو کسی عالم دین سے بات کرو۔ اس قسم کے معاملات وہی دیکھ سکتے ہیں۔''

''میں کسی عالم کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

پھر کئی دنوں تک کچھ نہیں ہوا۔ ایک دن اس کی ماں نے کہا۔ ''بیٹے تمہیں یاد ہے۔ کل کون سی تاریخ ہے؟''

''یاد ہے ماما لیکن اب کچھ کرنے کو دل نہیں

چاہتا۔ میری برتھ ڈے کی خوشیاں پاپا کے ساتھ تھیں۔ وہ اس طرح خوش ہوتے تھے جیسے خود ان کی سالگرہ ہو رہی ہو۔ یاد ہے وہ بچوں والی ٹوپی بھی پہن لیتے تھے۔ میوزک پر ڈانس بھی کرتے تھے۔ میں کہتا بھی تھا۔ ''پاپا! کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ دیکھنے والے کیا کہیں گے۔'' لیکن انہیں کسی کی پروا نہیں ہوتی تھی اسی لیے ماما اب ان کے بعد کچھ کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کچھ خیرات کردوں۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔'' لیکن اسی رات ایک اور میسج آگیا۔ ''کیا حماقت ہے بیٹے۔ تم اپنی برتھ ڈے کیوں سلیبریٹ نہیں کررہے۔ ابے مرد بن۔ چل۔ خوشی منا۔ اپنی ماں کو کہیں گھمانے لے جا۔ اور اگر کوئی گرل فرینڈ پال رکھی ہے تو اس کو بھی لے جا۔''

یہ انداز اس کے پاپا کے سوا کسی کا نہیں ہوسکتا تھا۔ بالکل بے تکلفانہ دوستانہ، سہیل خود کہا کرتا تھا کہ میرے سب سے اچھے دوست میرے پاپا ہیں اور اب اسی پاپا کے میسج نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔

کیا ہو رہا تھا یہ سب۔ اس رات کی نیند بھی چلی گئی تھی۔ یہ ایک ناسمجھ میں آنے والی بات تھی۔ لیکن جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ سامنے تھا۔ موبائل کی تحریر جھوٹ نہیں بول سکتی تھی اور نہ ہی کوئی اور اس کے پاپا کا انداز اور لہجہ اپنا سکتا تھا۔

وہ تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنے پاپا کو منوں مٹی کے نیچے دبا کر آگیا تھا۔

اس نے جب دفتر جا کر ارشد کو اپنے موبائل کا پیغام دکھایا تو وہ بھی پریشان ہوگیا۔ ''یار! میں ایک مشورہ دیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''تیری جان چھوٹ جائے گی۔''

''وہ کیا ہے؟''

''تم اپنا نمبر بدل لو۔'' ارشد نے کہا۔

سہیل سوچتا رہا پھر اس نے انکار کردیا۔ ''نہیں بھائی، یہ مشکل ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''پہلی بات تو یہ کہ یہ اگر غیر مرئی سلسلہ ہے۔ کسی قسم کا کوئی روحانی چکر ہے تو نمبر بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' سہیل نے کہا۔ ''اور دوسری بات یہ ہے کہ پاپا کے اس قسم کے میسج میرا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔ لاکھ غیر فطری سہی لیکن پاپا سے ایک قسم کا رابطہ تو ہے نا۔ مجھے بڑا حوصلہ مل رہا ہے جیسے آج میں پاپا کی خواہش پر اپنی برتھ

ڈے سلیبریٹ کررہا ہوں۔ میں نے ماما کو بھی راضی کرلیا ہے۔''

''تم نے ان کو کچھ بتایا تو نہیں؟''

''نہیں، ابھی تک حوصلہ نہیں ہوسکا ہے۔''

''ان کو بتانا بھی نہیں۔''

''لیکن جو کچھ بھی ہورہا ہے، کیا یہ حیرت انگیز نہیں ہے؟''

''حد سے زیادہ۔ اب تم ایک کام کرو کہ خود اپنا صدقہ بھی دے دو۔ اس قسم کے معاملات جان لیوا بھی ہو سکتے ہیں۔''

سہیل جانتا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہورہا ہے، وہ ان نیچرل ہے۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص اپنی موت کے بعد اس طرح رابطہ قائم کرے۔ ایسا صرف کہانیوں اور فلموں میں ہوا کرتا ہے۔

اس کے باوجود جو کچھ بھی ہورہا تھا وہ انتہائی حیرت کی بات تھی۔

اب اسے پاپا کے پیغام کا انتظار بھی رہنے لگا تھا۔ ارشد نے اسے ایک عالم دین کے بارے میں بتایا جو نہ صرف اسکالر تھے... بلکہ روحانیت کے مرتبے پر بھی فائز تھے۔

ایک شام سہیل ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہ ایک عام سا گھر تھا۔ کسی قسم کا آستانہ وغیرہ نہیں تھا۔ ان کی بیٹھک میں کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ جو ان کو عام ڈگر کے باباؤں سے الگ ثابت کررہی تھیں۔

ان کا نام حسین قادری تھا۔ وہ بہت تپاک سے ملے تھے۔ سہیل کی کہانی نے انہیں حیرت میں ڈال دیا تھا۔

''ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔ جو روح عالم ارواح کو چلی جائے، اس کا زمین والوں سے کوئی رشتہ نہیں رہتا۔''

''لیکن قبلہ میرے ساتھ تو ایسا ہی ہورہا ہے۔'' سہیل نے کہا۔

''میں استخارہ کرکے دیکھتا ہوں۔'' قادری صاحب نے کہا۔ ''تم بس اپنے آپ کو پاک وصاف رکھو اور صدقہ دیتے رہو۔''

اس طرح اور کئی دن گزر گئے۔ کوئی میسج نہیں آیا۔

رمضان کا مہینہ آگیا۔ سہیل تراویح کے لیے اپنے پاپا ہی کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ وہ دونوں شہر کی ایک بڑی مسجد میں تراویح ادا کرتے تھے۔

ایک دن اس کی ماں نے پوچھا۔ ''بیٹے اس بار تم محلے کی مسجد میں تراویح پڑھ لینا۔''

''نہیں امی، اس بار دل نہیں چاہ رہا۔'' سہیل نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''پاپا کے بغیر اچھا نہیں لگے گا۔''

ماں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ''بیٹے زندگی کا کاروبار اسی طرح چلتا ہے۔ ہم مرنے والوں کے ساتھ مرتے نہیں ہیں۔ زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تم ابھی جوان ہو۔ ایک پہاڑ جیسی زندگی تمہارے سامنے پڑی ہے۔ تم اس پر دھیان دو۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔''

اس نے بتانا چاہا کہ ماما، پاپا میرے ساتھ ہی ہیں۔ ان کا پیغام آتا رہتا ہے۔ وہ اپنے موبائل پر رابطہ کرتے ہیں لیکن وہ یہ سب ماں کو نہیں بتا سکا۔ ماں کی حالت ایسی نہیں تھی۔ وہ ویسے بھی بہت کمزور اور دل کی مریضہ تھی۔ وہ اس حیرت انگیز بات کو سُن کر برداشت نہیں کرپاتیں۔

اسی رات اس کے پاپا نے اس سے پھر رابطہ کیا۔ اس بار کا میسج بھی حیرت انگیز اور خوف زدہ کردینے والا تھا۔

''میرے بیٹے۔ میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہوگے۔ اس رمضان میں، میں جو تمہارے ساتھ نہیں ہوں لیکن میری یادیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ خبردار، میرے ساتھ جس طرح عید مناتے تھے، اس بار بھی ویسے ہی منانا۔ ہاں یار، تجھ پر نیلا رنگ بہت اچھا لگتا ہے تو اس عید پر نیلا جوڑا بنوانا یا خرید لینا۔ سمجھے، میں اب تمہیں اُداس نہ دیکھوں ورنہ مجھے سکون نہیں ملے گا۔ خدا حافظ، تمہارا پاپا۔''

سہیل میسج پڑھ کر بہت دیر تک روتا رہا جو کچھ بھی ہورہا تھا، وہ بہت حیرت انگیز تو تھا لیکن اس کے ساتھ ہی بہت درد بھرا بھی تھا۔ کیا اس کے پاپا کو اس کا اتنا خیال تھا کہ وہ اپنی موت کے بعد بھی اس کے لیے پریشان رہتے تھے۔

دوسری صبح اس نے اپنے دفتر کے ساتھی ارشد کو پھر اپنے پاپا کا پیغام دکھا دیا۔

ارشد چکرا کر رہ گیا۔ ''یار معاملہ سمجھ سے باہر ہوتا جارہا ہے۔''

''تم اندازہ کرلو کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہوگی؟''

''ہاں بھائی، میں تمہاری کیفیت کو سمجھتا ہوں۔''

''اب تو میری یہ حالت ہوگئی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ ماما کو بتا ہی دوں۔ کب تک اس راز کو دل میں چھپائے

رہوں گا۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی دن پھٹ جاؤں گا۔''

''تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس کا یہی حال ہوتا۔'' ارشد نے کہا۔

اس شام سہیل جب گھر پہنچا تو اس کی ماما نے بتایا۔ ''بیٹے، تمہارے لیے ڈاکٹر قدسیہ کا فون آیا تھا۔''

''کون ڈاکٹر قدسیہ؟''

''اس اسپتال کی ڈاکٹر جہاں تمہارے پاپا داخل تھے۔''

''کیوں فون آیا تھا؟ کیا کہہ رہی تھی؟''

''کہا تو کچھ نہیں۔ تم سے ملنا چاہ رہی ہے، کل بلایا ہے۔''

''لیکن ہم نے تو اسپتال کے سارے ڈیوز کلیئر کر دیئے تھے ماما۔'' سہیل نے کہا۔

''ہوسکتا ہے کوئی اور کام ہو۔ تم کل چلے جانا۔''

سہیل دوسرے دن آفس سے آف کر کے اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر قدسیہ اپنے کمرے ہی میں تھی۔ وہی اس اسپتال کی انچارج تھی۔ سہیل نے جب اپنا تعارف کروایا تو اس نے بتایا۔ ''سہیل صاحب! آپ کی ایک امانت میرے پاس ہے۔ وہی واپس کرنے آپ کو بلایا ہے۔''

''امانت؟ کون سی امانت؟ میں نہیں سمجھا۔''

''ایک موبائل فون۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ اس نے میز کی دراز سے ایک فون نکال کر سہیل کی طرف بڑھا دیا۔ ''کیا آپ اس کو پہچانتے ہیں؟''

''جی، جی ہاں۔ یہ تو میرے پاپا کا تھا۔ یہ آپ کے پاس کہاں سے آ گیا؟''

''آپ کے پاپا نے مجھے دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''عام طور پر ہم اس قسم کے چکر میں نہیں پڑتے... لیکن آپ کے پاپا کی شخصیت ایسی تھی کہ میں ان کی بات سے انکار نہیں کر سکی۔''

''خدا کے لیے کھل کر بتائیں کہ کون سی بات؟ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ پاپا کا موبائل فون قبرستان میں کہیں گر گیا ہے۔ میں تلاش بھی کرتا رہا تھا۔''

''جی نہیں، وہ گرا نہیں تھا۔ میں آپ کو بتاتی ہوں۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے ان کی حالت سنبھل گئی تھی۔ وہ مکمل ہوش میں تھے۔ میں یہاں ایک بات بتا دوں کہ میں نے ایسا محبت کرنے والا باپ نہیں دیکھا۔''

''جی ڈاکٹر، میرے پاپا ایسے ہی تھے۔ مجھے ان پر فخر ہے۔''

''وہ ایک آئیڈیل باپ تھے۔ اس وقت بھی انہیں آپ ہی کی فکر تھی۔ انہیں یہ احساس تھا کہ ان کی موت کے بعد آپ کا کیا حال ہوگا۔ آپ شاید خود کو سنبھال نہیں سکیں۔''

''یہ بات تو ہے ڈاکٹر۔ میں تو مرنے کے قریب ہو گیا تھا۔ پاپا کی جدائی میری برداشت سے باہر تھی۔'' سہیل نے بتایا۔

''اسی لیے انہوں نے آپ کے لیے ایسا انتظام کر دیا کہ ان کی موت کے بعد بھی ان کے میسج آپ کو ہر مرحلے پر ملتے رہیں۔ تاکہ آپ میں زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا ہو اور آپ زندگی کی دوڑ میں حصہ لیتے رہیں۔ تھک کر بیٹھ نہ جائیں۔''

سہیل بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ ''میں نہیں سمجھا۔ کیسے انتظامات۔ کیا کیا تھا انہوں نے؟''

''انہوں نے مجھے کچھ میسج ڈکٹیٹ کروائے تھے اور یہ وصیت کی تھی کہ ان کی موت کے بعد میں یہ میسج آپ کو آپ کے فون نمبر پر بھیجتی رہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ شاید میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔''

سہیل رو رہا تھا۔ ''جی ڈاکٹر! پاپا کے میسج اور آپ کی فرض شناسی نے مجھے زندہ رکھا ہے۔ ورنہ میں تو بکھر گیا تھا۔''

''اب میں آپ کو ان کا آخری میسج سینڈ کر رہی ہوں اس کے بعد ان کا موبائل فون لے جائیں۔ یہ آپ ہی کی امانت ہے۔''

ڈاکٹر نے سہیل کے پاپا کے فون سے آخری میسج سہیل کو بھیج دیا۔ جس میں اس کے پاپا نے لکھوایا تھا۔ ''بیٹے، یہ راز تم پر کھل چکا ہوگا کہ میرے پیغامات تمہارے پاس کس طرح آ رہے ہیں۔ یہ میرا آخری پیغام ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ زندگی کی کھلی بانہوں نے تمہیں اپنے حصار میں لے لیا ہوگا۔ اپنا اور اپنی ماں کا خیال رکھنا اور میری مغفرت کی دعائیں کرتے رہنا۔ خدا حافظ، تمہارا پاپا۔''

سہیل نے اس موبائل کو اپنی الماری میں بڑی حفاظت سے رکھ دیا۔ اگرچہ سب کچھ واضح ہو چکا ہے پھر بھی وہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے اس موبائل کو دیکھتا ہے کہ شاید...... شاید اس کے پاپا کا کوئی اور میسج اس کے نام آ گیا ہو لیکن موبائل کا اسکرین خالی رہتا ہے۔

’’کیا ہم ایک نہیں ہوسکیں گے؟‘‘ راحیلہ نے انجم سے پوچھا۔ ’’کیا ہمارے اختلافات اسی طرح چلتے رہیں گے؟‘‘

’’سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟‘‘ انجم نے ایک گہری سانس لی۔

’’لعنت ہو اس پورے سسٹم پر۔‘‘ راحیلہ جھلّا کر بولی۔

’’سسٹم پر لعنت مت بھیجو۔ اس بات پر بھیجو کہ ہمارا

عید مبارک

منظر امام

ہر سال کی عید کا اپنا الگ مزہ اور لطف ہوتا ہے... عید کے دن سے کوئی نہ کوئی یادوابستہ ہوتی ہے... ایسے ہی ایک گھرانے کے گرد گھومتی کہانی... جس کے مکین ایک ہوتے ہوئے بھی الگ الگ سمتوں میں کھڑے تھے... خاندان کا سربراہ ان کی دوری سے سخت پراساں تھا...

عید کے دن کو یادگار بنادینے والی خوشیوں کا دلچسپ احوال



خاندان کیسا ہو گیا ہے۔ دو ہی بھائی ہیں اور دونوں کے درمیان اتنی دوری۔ ایک دوسرے کی شکل تک دیکھنے کو تیار نہیں۔ عید چاچا میرے ابا کو دیکھنا نہیں چاہتے اور میرے ابا تمہارے ابا کو۔''

''یہ اباؤں کی جنگ ہماری نئی نسل کو کیوں تباہ کر رہی ہے۔ ارے بھائی ایک بار جھگڑا ہو گیا تھا۔ اب اسے ختم کرو لیکن نہیں برسوں ہو گئے ہیں...... اسی کو لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''اور دادا ابو سے ملنے بھی دونوں الگ الگ جاتے ہیں۔'' انجم نے کہا۔

وہ دونوں ایک درخت کے سائے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گرمی بہت تھی۔ دونوں نے سامنے والی کینٹین سے کولڈ ڈرنکس لے لی تھیں اور چسکیاں لیتے لیتے خاندانی حالات پر تبصرہ کرتے جا رہے تھے۔

''راحیلہ ایک بات بتاؤں، ہمارے دادا ابو، ایک گریٹ انسان ہیں۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ انہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کے دونوں بیٹے کبھی ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر سکتے اسی لیے انہوں نے ان دونوں کے حصے دے کر انہیں الگ کر دیا اور خود تنہا زندگی گزارنے لگے۔''

''ان کا بڑھاپا ایک طرف قابلِ رشک بھی ہے تو قابلِ افسوس بھی۔'' انجم نے کہا۔ ''قابلِ رشک اس لیے کہ ایک اچھا سا گھر ہے جس میں ان کی پسند کی کتابیں ہیں۔ وہ دن بھر ان ہی کتابوں میں الجھے رہتے ہیں۔ ملازم آتے ہیں اور کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے گھر کی سجاوٹ اپنے ذوق کے مطابق کر رکھی ہے۔''

''فرانسیسی طرز کی کھڑکیاں ہیں۔'' راحیلہ نے بات آگے بڑھائی۔ اس کا لہجہ خواب ناک ہو گیا تھا۔ ''ایک پائیں باغ بھی ہے۔ چاروں طرف پھولوں کے پودے لگے ہوئے ہیں۔ رات کے وقت دادا ابو کا پورا گھر پھولوں کی خوشبو سے مہکا ہوتا ہے۔''

''اور دوسری طرف۔'' انجم نے کہا۔ ''دوسری طرف صورت یہ ہے کہ ایک تنہا انسان ہیں۔ دو، دو بیٹے ہیں۔ میرے اور تمہارے باپ۔ دو، دو بہوئیں ہیں۔ ہماری مائیں لیکن کیا فائدہ؟''

''زندگی میں یہ سب کیوں ہوتا رہتا ہے انجم؟'' راحیلہ نے پوچھا۔

''شاید اسی کا نام زندگی کے سو رنگ ہے۔ اگر یہ سب نہ ہو تو کیسے پتا چلے کہ اختلاف کس کو کہتے ہیں۔''

کسی کی آواز آئی۔ ''او ہو، تو تم دونوں یہاں ہو؟''

وہ نعمان تھا ان کا کلاس فیلو۔ گول مٹول سا جو لڑھکتا ہوا ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ عادت کے مطابق اس کے ہاتھ میں ایک جلتا ہوا سگریٹ بھی تھا اور دوسرے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کا کین۔ وہ ان دونوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔

''بھائی دس بار سمجھایا ہے کہ راستہ چلتے ہوئے سگریٹ مت پیا کر۔'' انجم نے کہا۔ ''اس طرح پھیپھڑوں پر دگنا بوجھ پڑ جاتا ہے۔''

''ہاں یار یہ بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔'' نعمان نے سگریٹ ایک طرف اچھال دی۔ ''اب کم از کم راستے میں تو نہیں پیوں گا۔''

''لیکن تم سگریٹ پیتے ہی کیوں ہو؟'' راحیلہ نے پوچھا۔

''راحیلہ تم تو جانتی ہو کہ تمہاری دوست نے میرے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ اس کا غم غلط کرنے کے لیے سگریٹ پیتا ہوں۔''

''ابے جنونی قسم کے عاشق تو غم غلط کرنے کے لیے شراب پیتے ہیں۔'' انجم نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بھائی۔'' نعمان نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن میں شراب افورڈ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے سگریٹ پر گزارا ہے۔ تم یہ بتاؤ یہاں کیا میٹنگ ہو رہی ہے؟''

''کچھ نہیں...... بس وہی خاندانی مسئلہ ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ میرے دادا ابو کے دو ہی بیٹے ہیں۔ ایک عید چاچا، راحیلہ کے ابو اور ایک میرے ابو۔ لیکن بدقسمتی سے دونوں بھائیوں میں اختلافات ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھتے بھی نہیں ہیں۔''

''ہوں۔'' نعمان نے ایک گہری سانس لی۔ ''ایک بات بتاؤ تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہو۔ ایک ساتھ پڑھتے بھی ہو۔ ایک دوسرے سے دوستی بھی ہے۔ تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان اختلافات ختم کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے۔''

''دیکھو، ہم دونوں پڑھے لکھے ہیں۔ باشعور ہیں۔ اپنا اچھا برا سوچتے بھی ہیں۔ ہم دونوں نے بہت ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور بھی کیا ہے لیکن پھر وہی پرابلم

ہمارے سامنے آجاتی ہے۔"

"کون سی پرابلم؟"

"وہی جینیٹک پرابلم۔ فرسٹ کزنز کے درمیان ہونے والی شادیوں کے اثرات۔ جو آنے والی نسل کے لیے بہت خطرناک ہو سکتے ہیں۔"

"میرے پاس باقاعدہ ریسرچ ورک ہے۔" راحیلہ نے کہا۔ "بہت ممکن ہے کہ اس شادی کے بعد پہلی اولاد نارمل ہو۔ لیکن دوسری اولاد کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے جینیٹک انجینئرنگ کی جاتی ہے جو کچھ اسلامی ملکوں میں جائز قرار دی گئی ہے۔"

"دیکھو یہ خطرہ تو ہے لیکن دوسری طرف ہمارے اباؤ اجداد کی شادیاں آپس میں ہوا کرتی تھیں اور کوئی خاص پرابلم سننے میں نہیں آئی۔"

"تم یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن آج کا زمانہ کل سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ آج ہم ذہنی، جسمانی اور روحانی طور پر بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست ہیں۔ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم شادی بھی کر لیں۔" راحیلہ نے اپنا نکتۂ نظر بیان کیا۔

"یہ ایک الگ بات ہے تو پھر جلدی سے تم دونوں کسی نہ کسی سے عشق شروع کر دو۔ تاکہ ایک طرف تو ہو جاؤ۔" نعمان نے کہا۔

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" راحیلہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں فی الحال میں دس سال تک عشق کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" نعمان نے کہا۔

☆☆☆

فریدہ نے دروازہ کھولا تو اس کی دوست اور پڑوسن میمونہ دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔

"آؤ، اندر آجاؤ۔" فریدہ نے اسے اندر بلا لیا۔

میمونہ اندر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے پلیٹ میز پر رکھ دی تھی۔

"یہ لو۔" میمونہ نے کہا۔ "تمہارے لیے حلوہ بنا کر لائی ہوں۔"

"ارے تم اتنا تکلف کیوں کرتی ہو؟"

"اس میں تکلف کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ جب میں کھا رہی ہوں تو میری پڑوسن کیوں نہ کھائے؟"

"چلو مہربانی تمہاری۔"

"یہ بتاؤ اپنے سسر کی طرف جانا ہوا؟" میمونہ نے پوچھا۔

"نہیں تو پچھلے ایک مہینے سے نہیں جا سکی ہوں۔" فریدہ نے بتایا۔

"اور تمہاری دیورانی؟"

"اس کا مت پوچھو۔ اس کا بس چلے تو وہیں بڑے میاں کے گھر ڈیرا ڈال لے۔"

"تو پھر تم کیوں غلطی کرتی ہو؟" میمونہ نے کہا۔ "تم کیوں نہیں جاتیں؟"

"کیا کرنا ہے جا کر؟"

"یہ مت کہو۔ تم کو ابھی تک عقل نہیں آئی ہے۔ تمہارے بڑے میاں کے پاس ابھی بھی بہت کچھ ہوگا۔ جیسا تم بتاتی ہو کہ وہ بہت آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔"

"تو پھر خود ہی سوچ لو۔ یہ ٹھاٹ باٹ پیسوں کے بغیر نہیں آتے۔"

"ارے اب کچھ بھی نہیں رکھا ان کے پاس۔ سرکاری ملازم تھے۔ اس کی اچھی خاصی پنشن آجاتی ہے۔ اسی سے گزارا ہوتا ہے اس کے علاوہ جو کچھ بھی تھا، وہ دونوں بھائیوں کو دے کر فارغ کر دیا۔"

"یہ تمہاری سوچ ہے فریدہ۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ بڑے میاں کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ ارے وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا بندہ ہے۔ اتنی آرام کی زندگی یوں ہی نہیں گزر رہی ہوگی۔ تم بیٹھی رہو گی اور وہ تمہاری دیورانی سب لے جائے گی۔"

"تو پھر کیا کروں میں؟"

"ہفتے میں کم از کم ایک دفعہ ضرور جاؤ۔ ایک بات بتاؤ، تمہارا انجم کیا کہتا ہے؟"

"ارے وہ تو اپنے دادا پر جان دیتا ہے۔" فریدہ نے کہا۔ "ویسے وہ بھی انجم کو بہت مانتے ہیں۔"

"بس، بس تو پھر تم کس سوچ میں پڑی ہو؟"

"چلو، میں اسی ہفتے ان کے پاس جاتی ہوں۔"

"بڑے میاں کو اپنی مٹھی میں کر لو۔ خدمت کرو ان کی پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

اسی دوران مبارک بھی گھر میں داخل ہو گیا تھا۔ مبارک کو دیکھ کر میمونہ نے سلام کیا اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

''اب کیا شوشا لے کر آئی تھی؟'' مبارک نے پوچھا۔

''یہ بے چاری تو صحیح مشورہ دے کر گئی ہے۔'' فریدہ نے کہا۔ ''کہہ رہی تھی کہ اپنے سسر کے پاس اپنی دیورانی کا زیادہ عمل دخل نہ ہونے دو۔ ورنہ تمہارے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔''

''کہتی تو ٹھیک ہی ہے لیکن پرابلم یہ ہے کہ بابا کے پاس عید کا بہت آنا جانا ہے۔ وہ راحیلہ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ خیر پیار تو انجم سے بھی کرتے ہیں۔ پچھلے ہفتے میں کئی بار بابا کے پاس گیا ہوں۔ لیکن جب دیکھو عید ان کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ لگتا ہے اس کو اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔''

''میمونہ کہہ رہی تھی کہ بڑے میاں کے پاس ہوسکتا ہے کہ اور بھی بہت کچھ ہو۔''

''ارے نہیں، میں جانتا ہوں بابا کے پاس اب کچھ نہیں رہا۔ جو کچھ بھی تھا وہ عید کے حوالے کر دیا ہے۔''

''اور آپ دیکھتے رہے؟''

''تو کیا کرتا، اسی لیے تو اب کسی سے ملنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ کیا صلہ ملا ہے مجھے سعادت مندی کا۔'' مبارک اکھڑے لہجے میں بولا۔

''دل چھوٹا نہ کریں۔ کبھی کبھی چلے جایا کریں۔ ورنہ لوگ کہیں گے۔ لو اس نے تو اپنے باپ کو بھی چھوڑ دیا۔''

''لوگوں کے کہنے کے خیال ہی سے تو چلا جاتا ہوں، ورنہ...'' مبارک بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

''ایک بات کان کھول کر سن لیں۔'' زینت نے اعلان کیا۔ ''میں اب آپ کے ابا کے پاس نہیں جاؤں گی۔ مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ ہر ہفتے حاضری دی جائے۔''

''ہر ہفتے کون کہتا ہے۔ کبھی کبھی چلی جایا کرو۔ ورنہ خوامخواہ بدنامی ہو گی۔'' عید نے کہا۔

''کس بات کی بدنامی۔ ہم بس یہی سوچتے رہیں۔ ویسے بھی آج کل فرصت کہاں ہوتی ہے۔ آپ کو یاد نہیں ہے کہ ایک بار میں آپ کے ابا کی محبت میں دو دن رہنے چلی گئی تھی تو انہوں نے اپنے خاندان کے بزرگوں کے قصے سنا سنا کر جینا حرام کر دیا۔ رات کو تین بجے تک جگائے رکھا۔ اب مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے... ایسی باتوں سے، گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔''

''یہ تو ہے، میں خود بھی بور ہو جاتا ہوں۔'' عید نے کہا۔ ''لیکن ان کے پاس اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ بس کتابیں پڑھتے رہتے ہیں اور پرانے دنوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔''

''توبہ ہے۔ ان کے پاس بھی کتنی فرصت ہوا کرتی ہے۔''

اسی دوران راحیلہ بھی آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اعلان کر دیا۔ ''دو دن کی کالج کی چھٹیاں ہیں۔ میں دو دنوں کے لیے دادا ابو کے پاس جا رہی ہوں۔''

''کمال ہے، کیا ان کی باتیں سن سن کر تمہارا دل نہیں بھرا۔''

''ماما محبت سے کبھی دل نہیں بھرتا۔'' راحیلہ نے کہا۔ ''ان کی باتیں مجھے جینے کا حوصلہ دیتی ہیں۔''

''کیا رکھا ہے، ان باتوں میں، وہی پرانے قصے۔''

''ان ہی میں تو وزڈم پوشیدہ ہے ماما لیکن آپ کیا سمجھیں گی؟''

''ہاں، سب تو تم سمجھتی ہو یا تمہارے دادا ابو سمجھتے ہیں۔''

''دادا ابو جیسا انسان صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔'' راحیلہ نے کہا۔

''میں تو ایک بات جانتی ہوں کہ اب فریدہ کا وہاں آنا جانا کم ہو گیا ہے۔''

''تمہارے لیے تو یہ خوشی کی بات ہو گی۔'' عید نے کہا۔

''کیوں نا ہو۔ اس کو دیکھ کر میری جان جل جاتی ہے۔''

''اب کیا کیا جائے۔ رشتے تو نبھانے پڑتے ہیں نا۔'' مبارک نے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔'' راحیلہ نے کہا۔ ''اس بے وجہ کے اختلاف کو ختم کیوں نہیں کر دیتے؟''

''لڑکی، ہوش میں رہ کر بات کر۔'' زینت نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''مجھے ہر وقت کی طرف داری اچھی نہیں لگتی۔''

راحیلہ بُرا سا منہ بنا کر اٹھ گئی۔

☆☆☆

عید نے اخبار دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔

حیرت انگیز خبر تھی۔ ''مشہور دانشور محبوب شامی کے

نام پچیس کروڑ کا انعام نکل آیا۔ محبوب شامی نے کسی زمانے میں ہالینڈ میں ہونے والی ایک انعامی اسکیم کا ایک ٹکٹ خرید کر گھر میں رکھ لیا تھا۔ مگر وہ کہیں رکھ کر بھول گئے تھے۔ پچھلے دنوں ہالینڈ میں جب قرعہ اندازی ہوئی تو اس نمبر پر پہلا انعام نکلا۔ بڑی مشکلوں سے اس نمبر کے ٹکٹ کے مالک کا پتا چلایا گیا تو یہ نمبر پاکستان کے دانشور محبوب شامی کے پاس تھا۔ محبوب شامی نے وہ ٹکٹ تلاش کرلیا ہے اور وہ بہت جلد انعامی رقم حاصل کرنے ہالینڈ جارہے ہیں۔''

''زینت زینت۔'' عید گلا پھاڑ کر چلایا۔ ''جلدی ادھر آؤ۔''

''کیا ہوگیا؟'' دوسرے کمرے سے زینت کی آواز آئی۔

''یہاں آؤ تو سہی۔'' عید نے کہا۔

زینت اس کے پاس آگئی۔ ''کیا بات ہے کیوں شور کررہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم یہ خبر پڑھو۔'' عید نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

خبر پڑھ کر خود زینت کے ہوش اڑ گئے۔ ''میرے خدا پچیس کروڑ۔ کہیں یہ کوئی اور شخص تو نہیں۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پورے پاکستان میں محبوب شامی نام کا دانشور صرف ایک ہے اور وہ ہے میرے ابا۔''

''ہائے میں مرگئی۔'' زینت نے کہا۔ ''تو پھر جلدی سے فون کریں۔ انعام وغیرہ کی بات نہ کرنا۔ کوئی سچائی ہوئی تو خود ہی بتادیں گے۔ وہ اتنی بڑی خبر کو چھپا نہیں سکتے۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے اس طرح میرا بھرم بھی رہ جائے گا۔''

☆☆☆

''بچو! تم لوگوں نے تو کمال کردیا۔'' محبوب شامی نے کہا۔

''دادا ابو، یہ سب نعمان کے ذہن کا کرشمہ ہے۔'' راحیلہ نے نعمان کی طرف اشارہ کیا جو خود بھی ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''آج بہت دنوں کے بعد دونوں بیٹوں نے فون کر کے میری خیریت معلوم کی ہے۔'' محبوب نے بتایا۔

''انکل، میں نے جب پورے حالات سنے تو میرے ذہن میں یہ ترکیب آگئی۔'' نعمان نے کہا۔ ''اخبار والوں سے میری جان پہچان ہے۔ بس ان کو قابو میں کیا اور

خبر چھپ گئی۔''

''لیکن اگر تصدیق وغیرہ کی ضرورت ہوئی تو پھر کیا ہو گا؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارے یہاں اس قسم کی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی تردید چھپ جائے گی، بس ختم۔''

انجم، راحیلہ اور نعمان صبح ہی محبوب شامی کے پاس اخبار لے کر پہنچ گئے تھے۔ محبوب اس خبر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''یہ کیسی خبر ہے۔ یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔''

''یہ ایسا جھوٹ ہے دادا ابو جو دلوں کو ملانے کی کوشش میں بولا گیا ہے۔ خدا بھی معاف کر دے گا۔''

''آپ نے خود دیکھا کہ دونوں نے فون کیا ہے۔'' راحیلہ نے کہا۔

''لیکن اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں۔ دیکھ لیجیے گا۔ کچھ دیر بعد ماما کا بھی فون آئے گا۔'' راحیلہ نے کہا۔ ''آپ ان سے اچار گوشت بنا کرلانے کی فرمائش کیجیے گا اور آپ جانتے ہیں کہ فریدہ آنٹی اچار گوشت بہت اچھا بناتی ہیں۔ ماما ترکیب معلوم کرنے کے لیے فریدہ آنٹی کو فون کریں گی۔ اس طرح دونوں کے درمیان بات چیت کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔''

''لڑکی تیرا ذہن تو کام دکھا رہا ہے۔'' محبوب نے پیار سے کہا۔

''آپ دیکھتے جائیں دادا ابو، اس عید پر دونوں ایک نہ ہوئے تو ہمارا نام بدل دیجیے گا۔''

''اسی طرح آپ میری ماما سے اس کڑھائی والے کرتے کی فرمائش کریں۔ یہ کام زینت آنٹی بہت اچھا کرتی ہیں۔ ماما مجبور ہو کر زینت آنٹی سے رجوع کریں گی۔ اس طرح آہستہ آہستہ بات بڑھتی جائے گی۔''

''اور جب انہیں یہ پتا چل جائے گا کہ اس خبر میں کوئی صداقت نہیں تھی تو پھر؟''

''بہت ممکن ہے کہ اس وقت تک ہمارا مقصد حل ہو چکا ہو'' انجم نے کہا۔ ''اور مقصد کیا ہے؟ یہی نا کہ ان سب کو ایک کر دیا جائے۔ چھوٹا سا تو خاندان ہے اس میں بھی اختلافات۔ اگر کسی بڑے نیک مقصد کے لیے تھوڑا بہت جھوٹ بھی بول دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' انجم نے کہا۔

''بچو! میں نے تو معاملات تم لوگوں پر چھوڑ دیے ہیں، اب تم جانو۔''

''کچھ نہیں ہوتا دادا ابو، آپ بس دیکھتے جائیں۔''

اسی دوران میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ راحیلہ نے فون ریسیو کیا۔ ''ہیلو، ہاں ماما! میں دادا ابو کے پاس ہوں، بات کریں گی؟''

اس نے محبوب کی طرف دیکھا۔ ''دادا ابو، ماما آپ سے بات کریں گے۔'' پھر سرگوشی کی۔ ''وہ اچار گوشت مت بھولیے گا۔''

محبوب نے ریسیور لے لیا۔ وہ اس وقت ان کے اشارے پر چل رہا تھا۔ اس نے وہی کہا جس کی پلاننگ کی گئی تھی۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو، میں نے اچار گوشت کا شوشا تو چھوڑ دیا ہے۔''

''بس اب وہ فریدہ آنٹی سے بات کریں گی۔''

''بچو تم لوگ تو کمال کی سازش کرنے لگے ہو۔''

''اسے سازش نہ کہیں دادا، پلاننگ کہیں۔'' انجم نے کہا۔

''بھائی، اب تم لوگ جانو۔ میں نے تو اپنی بال تمہارے کورٹ میں ڈال دی ہے۔''

☆☆☆

بہت دنوں کے بعد وہ سب ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہوئے تھے۔

مبارک، عید، فریدہ، زینت، انجم اور راحیلہ اس گھر کی رونق اچانک واپس آگئی تھی۔ ایسی رونق بہت پہلے ہوا کرتی تھی۔ جب دونوں بچے اس گھر میں شرارتیں کرتے پھرتے۔ عید اور مبارک۔ ایک دوسرے سے سیاست پر الجھے رہتے۔ فریدہ اور زینت ایک دوسرے سے گپ شپ کیا کرتیں۔ اور محبوب سب کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ سب رات کو بیٹھ کر بیت بازی بھی کرتے۔

ان سبھوں کا شعری ذوق بہت اچھا تھا۔ فریدہ کو بے شمار اشعار یاد تھے۔ وہ ہمیشہ جیت جایا کرتی اور جرمانے کے طور پر زینت کو کھانا بنانا پڑتا۔

بہت خوب صورت دن تھے۔ زندگی بہت سبک رفتاری سے چل رہی تھی پھر اچانک جیسے کسی کی نظر لگ گئی اور نظر بھی ایسی کہ سب ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے تک کے روادار نہیں رہے تھے۔

بچے اگرچہ سمجھ دار ہو چکے تھے لیکن والدین کے سامنے وہ بھی مجبور تھے۔

پہلے مبارک اپنی بیوی فریدہ کے ساتھ آیا تھا۔ فریدہ

محبوب کے لیے ایک چادر لیتی آئی تھی۔ یہ چادر اس نے اپنے لیے خریدی تھی۔ اس پر بہت اچھی کشیدہ کاری تھی۔ زینت اچار گوشت کا تحفہ لے کر آئی تھی۔

ایک بار پھر سب کچھ وہی تھا۔ وہی بچے وہی محبتیں تھیں۔

البتہ عید اور مبارک ابھی تک ایک دوسرے سے کھنچے ہوئے تھے۔ وہ آپس میں بات تو کر رہے تھے لیکن بہت اکھڑی اکھڑی۔

اس سب کے باوجود ایک برف کی تہ تھی جو آہستہ آہستہ پگھلتی جا رہی تھی۔

محبوب شامی کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ دونوں بیٹے ایک دوسرے کو دیکھ کر بھڑکے نہیں تھے بلکہ کچھ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہے تھے۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔

ان دونوں میں سے کسی نے اب تک اس انعامی رقم کا ذکر نہیں کیا تھا۔

وہ مصلحت سے کام لے رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے جلد بازی کی تو محبوب شامی صاحب کھٹک جائیں گے۔

اس رات دونوں بھائی بہت دنوں کے بعد ایک ساتھ بیٹھے اسی معاملے پر باتیں کر رہے تھے۔ ''بھائی، بابا تو بہت گہرے نکلے۔ اتنی بڑی خبر ہم سے چھپا کر رکھ لی۔''

''خدا بھلا کرے اخبار والوں کا۔'' مبارک نے کہا۔

''ورنہ ہمیں تو پتا ہی نہیں چلتا۔''

''ابھی بھی تو کچھ نہیں بتا رہے ہیں۔'' عید برا سا منہ بنا کر بولا۔

اسی وقت فریدہ اور زینت دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ عید اور مبارک نے چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''تم دونوں خیریت سے تو ہو نا'' مبارک نے پوچھا۔

''کیوں ہماری خیریت کو کیا ہوا؟'' فریدہ نے چمک کر کہا۔

''ایک ساتھ دکھائی دے رہی ہو۔''

''جس طرح آپ دونوں ایک ساتھ دکھائی دے رہے ہیں۔'' زینت مسکرا کر بولی۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیے۔

''پھر بھی بات کیا ہے؟'' عید نے پوچھا۔

''ہم دونوں نے یہ سوچا ہے کہ اس عید پر ابو کو کوئی خاص تحفہ دیا جائے۔'' زینت نے کہا۔ ''ہم دونوں وہی پلاننگ کر رہے تھے۔''

''یہ بہت اچھا سوچا تم دونوں نے۔'' مبارک نے کہا۔

''میں تو بہت اچھا سا سوٹ دے رہی ہوں۔'' فریدہ نے بتایا۔ ''ان کے ذوق کے مطابق، اس کے ساتھ جوتوں کی جوڑی۔''

''ارے بابا کے پاس خود اتنی دولت آ چکی ہے کہ دس جوڑے خرید سکتے ہیں۔'' مبارک نے کہا۔

''میں جانتی ہوں لیکن جو کچھ اپنی طرف سے محبت کے ساتھ دیا جائے نا، اس کی اہمیت کچھ اور ہوتی ہے۔''

''میں انہیں کتابوں کا ایک سیٹ دے رہی ہوں۔'' زینت نے بتایا۔

''کتابوں کا سیٹ؟'' عید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ آئیڈیا کہاں سے لائیں؟''

''راحیلہ کا آئیڈیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ دادا ابو کو شاعری کی کتابیں بہت پسند ہیں۔ میں اس کے ساتھ جا کر خرید کر لائی ہوں۔''

''واقعی یہ ان کے لیے اچھا تحفہ ہوگا، وہ پسند کریں گے۔''

''انجم نے مجھے بھی کچھ کتابوں کے نام لکھوائے ہیں۔'' فریدہ نے کہا پھر اس نے زینت کی طرف دیکھا۔ ''تم چلو گی میرے ساتھ؟''

''ہاں، چلوں گی۔'' زینت نے کہا۔ ''ابھی خود میری بھی شاپنگ رہتی ہے۔''

دونوں بھائی حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

محبوب شامی کے کمرے میں انجم اور راحیلہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''میرے بچو! یہاں تک تو ہو گیا ہے، اب کیا ہوگا؟'' محبوب نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا دادا ابو۔'' انجم نے کہا۔

''کیسے ٹھیک ہوگا؟ جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ دولت وغیرہ فراڈ تھا تو جتنی محنت ہوئی ہے سب ختم ہو جائے گی۔''

''اس کے لیے آپ کو ایک شاندار تقریر کرنی ہو گی۔'' راحیلہ نے کہا۔

''وہ تو میں نے سوچ رکھی ہے۔'' محبوب مسکرا کر بولے۔

''دادا ابو، بعد میں چاہے کچھ بھی ہو، میں تو سب کو ایک ساتھ کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ دونوں خواتین شاپنگ کرنے ایک ساتھ جارہی ہیں۔''

''اور دونوں مرد حضرات ایک ساتھ سر جوڑے مستقبل کی پلاننگ کررہے ہیں۔'' راحیلہ نے کہا۔

''کاش یہ سب کچھ دولت کی محبت کے بغیر ہوتا۔'' محبوب کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ''دولت کی لالچ نے انہیں ایک دوسرے کے قریب کردیا ہے۔''

''دادا جان، آپ ان خودغرض لوگوں کو بتادیں کہ زندگی میں دولت کے علاوہ بھی کچھ چیزوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ کل عید کا دن ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل ہی آپ یہ دھند صاف کردیں۔ بتادیں سب کو کہ آپ نے یہ ڈراما کیا تھا اور یہ ڈراما اس لیے کیا تھا کہ سب ایک چھت کے نیچے جمع ہو سکیں۔''

☆☆☆

سب عید کی نماز پڑھ کر واپس آگئے تھے۔

محبوب، عید مبارک اور انجم۔ جبکہ عورتیں مختلف پکوان بنانے میں مصروف تھیں۔

بہت دنوں کے بعد دونوں بہوئیں سلام کرنے محبوب کے سامنے ایک ساتھ آئی تھیں۔

محبوب نے سب کو دعائیں دے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کی ہدایت کی۔

سب ایک ہی کمرے میں جمع ہوگئے تھے۔

محبوب نے بولنا شروع کیا۔ ''آج مجھے وہ دن یاد آرہا ہے۔ عید ہی کا دن تھا۔ مبارک سائیکل چلاتے ہوئے گر گیا تھا۔ اس کو بہت چوٹ آئی تھی اور عید نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا تھا۔ اسی طرح ایک بار جب ایک بائیک والا عید کو ٹکر مار کر بھاگنے لگا تھا تو مبارک نے اس پر پتھراؤ شروع کردیا تھا۔ میں بڑی مشکلوں سے مبارک کو سمجھا کر واپس لایا تھا۔ کیا خوب صورت دن ہوتے تھے۔ ان دنوں کی صرف ایک بات یاد رکھنے والی ہے۔ اور وہ ہے محبت۔ محبت۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ چھوٹی سی زندگی تھی اور چھوٹی خوشیاں تھیں۔ ماں اس زمانے میں زندہ تھی۔ وہ ہر ایک کے لیے گھنی چھاؤں کی طرح تھی۔ دونوں میں سے کسی کو کانٹا بھی لگ جائے تو بیٹھ کر روتی رہتی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ اس کی موت کے بعد محبت کا پرندہ ہماری منڈیر سے نہ جانے کس طرف پرواز کرگیا۔ ہماری دیواریں محبت کے بغیر خالی رہ گئیں۔ ایک حبس سا ہوگیا تھا۔ کوئی ہوا کا جھونکا نہیں تھا، میں اس گھر میں سب کو ایک ساتھ دیکھنے کو ترس گیا تھا پھر ایک جھوٹ سب کو اس گھر میں واپس لے آیا۔''

''جھوٹ؟'' مبارک نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، میرے بچو۔ جھوٹ اور یہ جھوٹ ان کے ذہن کی پیداوار ہے جو اس دور میں بھی محبت اور رشتوں کو اہمیت دیتے ہیں اور وہ ہیں انجم اور راحیلہ۔ تم مبارک باد دو۔ ان دونوں کو کہ یہ ابھی تک رسم وفا نبھائے جارہے ہیں۔ تمہارے درمیان لاکھ اختلافات سہی۔ لیکن یہ جانتے ہیں کہ اگر رشتوں کے درمیان سے محبت کے دھاگے ٹوٹ جائیں تو خاندان خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہوجاتا ہے۔ ہوا کا عام سا جھونکا بھی اڑا کر لے جاسکتا ہے۔

''ان دونوں نے اس المیے کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ یہ آج کی نسل تم سب سے بلکہ ہم سے بھی بہت بڑی ہے۔ اگر تم لوگ اس بات پر مایوس ہورہے ہو کہ تمہارے بابا کے پاس کچھ نہیں نکلا تو کیا یہ دولت کچھ کم ہوگی کہ تم سب پھر سے ایک ہوجاؤ، یہ گھر پھر سے آباد ہوجائے۔''

سب نے اپنی اپنی گردن جھکالی تھی۔

''زندگی صرف دولت کا نام نہیں ہے میرے بچو! اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ مجھے جو تحفے میں نئے جوڑے میری دونوں بہوؤں نے لاکر دیے ہیں، کیا میں بازار سے اسے خرید نہیں سکتا ہوں لیکن ان میں وہ پیار کالمس تو نہیں ہوگا نا، کیوں فریدہ؟''

''جی، جی ابو۔'' فریدہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

''تو پھر تم سب اب کھلے دل سے ایک دوسرے سے گلے ملو۔ یہ سمجھو تمہیں دولت مل چکی۔ وہ دولت جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہوسکتا۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عید کھڑا ہوا۔ ''بھائی!'' اس نے مبارک کی طرف اپنے بازو پھیلا دیے۔

مبارک بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ دونوں پوری گرم جوشی سے ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔

''دادا ابو، ایک بات پر غور کریں۔'' راحیلہ نے کہا۔ ''عید اور مبارک مل کر عید مبارک ہوگئے نا۔''

''ارے ہاں، واقعی یہ عید ہم سب کے لیے بہت مبارک ہے۔''

اس گھر میں اب قہقہے گونج رہے تھے۔

کارنامہ

تنویر ریاض

کسی بھی ادارے یا شعبے میں نئے آنے والوں کا عجیب و غریب صورت حال سے ضرور واسطہ پڑتا ہے... اسے بھی ایک چھوٹے سے قصبے میں آزمائشی مدتِ ملازمت کے مراحل سے گزرنا تھا... اسے نہیں معلوم تھا کہ ایک چھوٹی سی جگہ پر کوئی بڑا کارنامہ کس طرح اس کے حصے میں آسکتا ہے...

مجرموں کے پیچھے تنہا جانے والے پولیس والے کے بلند ارادوں کی کہانی......



پہلے کبھی میں بوسٹن پولیس میں ہوا کرتا تھا جہاں میں نے ہومی سائڈ یونٹ میں سراغ رساں کے طور پر خدمات انجام دیں اور اگر اسے خودستائی نہ سمجھا جائے تو میرا خیال ہے کہ میں کافی اچھا سراغ رساں تھا لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ مجھے ایک کرپشن اسکینڈل کی وجہ سے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے ڈسٹرکٹ سی سکس کرپشن اسکینڈل کے بارے میں سنا بھی نہ ہوگا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسے اسکینڈل کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ اخباروں میں جو شائع ہوا اور جو کچھ میڈیا کو بتایا گیا وہ حقائق کے بالکل برعکس تھا۔ کیونکہ اس میں بڑی مچھلیاں پھنس رہی تھیں۔ اس لیے بڑی ہوشیاری سے پتلی گردن والوں کے لیے پھندا تیار کیا گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ

تحقیقات ہوئیں جس کے نتیجے میں مجھ سمیت کئی بے گناہ لوگوں کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا جبکہ اس اسکینڈل سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔

ایک سال بعد میں ناردرن نیو ہیمپشائر کے ایک دیہاتی اور دور دراز قصبے داکر کے پولیس ڈپارٹمنٹ میں کام کر رہا تھا جو میرے پرانے ڈسٹرکٹ کی نائٹ شفٹ سے بھی بہت چھوٹا تھا اور میرے لیے وہاں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے میں بڑی دقت پیش آرہی تھی۔ کیونکہ میرے لیے یہ ماحول بالکل نیا تھا۔ وہاں کا عملہ صرف چار افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں کوئی سارجنٹ، کیپٹن، لیفٹیننٹ یا سراغ رساں نہیں تھا۔

مجھے وہاں کام کرتے ہوئے پہلا ہفتہ ہی ہوا تھا کہ چیف نے مجھے ایک کاغذ پکڑاتے ہوئے کہا۔

”سین، میں تمہارے ذمے ایک کام سونپ رہا ہوں۔ تم مسز نیلسن کے گھر چلے جاؤ۔“

”ضرور۔“ میں نے میز سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا جو ہم چاروں آفیسرز کی مشترکہ میز تھی۔ ہمارا دفتر ٹاؤن ہال کے نیچے تہ خانے میں واقع تھا اور ہمیں کسی بھی وقت گشت پر جانے کے لیے تیار رہنا ہوتا تھا اور میں اس آزمائشی مدت کے آغاز پر کچھ کر کے دکھانا چاہ رہا تھا کیونکہ مجھے چھ مہینے کی جدوجہد کے بعد یہ ملازمت ملی تھی لیکن میں سراغ رساں نہیں بلکہ ایک عام پولیس آفیسر کے طور پر خدمات انجام دے رہا تھا اور میری شدید خواہش تھی کہ جلد از جلد کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دوں جس کے بعد پولیس سراغ رساں بننے کی راہ ہموار ہو جائے۔

میں نے پوچھا۔ ”مسئلہ کیا ہے؟“

چیف مجھ سے عمر میں پندرہ برس بڑا تھا اور اس نے اپنی ساری زندگی اسی قصبے میں گزار دی تھی۔ پولیس میں آنے سے پہلے وہ فوج میں خدمات انجام دے چکا تھا۔ اس نے کہا۔

”گزشتہ شب کوئی اس کا میل باکس لے کر بھاگ گیا۔“

وہ کاغذ کا ٹکڑا کوئی باقاعدہ فارم یا شیٹ کی شکل میں نہیں تھا جس پر شکایت درج کی جاتی ہے بلکہ کاپی کے ایک صفحے پر چند لائنیں گھسیٹ دی گئی تھیں۔ اس پر مسز نیلسن کا نام پتا، فون نمبر اور سب سے نیچے میل باکس کے بارے میں شکایت درج تھی۔

میں نے اس کاغذ کو غور سے پڑھا اور چیف کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے سر کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کان، موٹی ناک اور نیلی آنکھیں تھیں لیکن وہ دل کا بہت اچھا تھا اور ہمیشہ نرم لہجے میں بات کیا کرتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا یہ حقیقت ہے؟“

اس نے کہا۔ ”بالکل ورنہ میں تم سے کیوں کہتا؟“

اس وقت ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ دوسرے تین پولیس والوں کو میں گھوسٹ ملازمین سمجھتا تھا کیونکہ میں نے اپنی شفٹ کے دوران انہیں بہت کم دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک گلیسن عنقریب ریٹائر ہونے والا تھا جبکہ راجر اور رکی بہن بھائی تھے۔

”کیونکہ......“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا پہلا ہفتہ ہے اور......“

یہ میرا پہلا ہفتہ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہی وہ مناسب وقت ہے جب نئے آنے والوں کے ساتھ کوئی کرتب یا مذاق کیا جاتا ہے۔ مجھے یاد تھا کہ بوسٹن میں میرے ساتھ پہلے مہینے میں کیا ہوا تھا۔ ہر جگہ نئے پولیس والوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ وہاں جا کر اس پتے پر مطلوبہ مکان تلاش کروں اور اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو یا یہ مسز نیلسن کوئی سر پھری اور وہمی عورت ہو یا شراب کے نشے میں مدہوش کوئی مطلقہ جو دروازے سے ہی مجھے بھگا دے۔

میرا دل چاہا کہ زور سے قہقہہ لگاؤں لیکن چیف سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ مذاق کے موڈ میں نہیں ہے۔

میں نے وہ کاغذ جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ ”کوئی مسئلہ نہیں، میں چلا جاتا ہوں۔“

اس دن مجھے بہت سی باتوں کا علم ہوا۔ یعنی یہ کہ چھوٹے قصبے میں جرائم بھی چھوٹے ہوتے ہیں جبکہ بوسٹن جیسے شہر میں یہ ایک بڑی بات تھی اور یہ کہ مسز نیلسن ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر تھی جس کا نزدیک ترین ہمسایہ بھی آدھ میل کے فاصلے پر رہتا تھا۔ اس لیے یہ بالکل سامنے کی بات تھی کہ کسی نے ایک خاص مقصد کے تحت اس کے میل باکس سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ اب وہ رو رہی تھی اور اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔

لہٰذا میں نے اپنے طور پر تحقیقات شروع کی۔ مختلف جگہوں کی پیمائش اور تصاویر لیں پھر مجھے گیلی زمین پر ٹائروں کے نشانات نظر آئے۔ پڑوسیوں اور داکر لیک کافی شاپ میں بیٹھنے والے بوڑھوں سے بھی بات چیت کی۔ کچھ

اگلوانے کے لیے ان کی خاطر تواضع ضروری تھی۔ اس کے لیے مجھے اپنی جیب سے بھی کچھ خرچ کرنا پڑا۔

اس تحقیقات کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ حرکت ایک بے وقوف طالب علم کی تھی جسے کئی برس پہلے مسز نیلسن نے اپنے مضمون سوشل اسٹڈیز میں 'ڈی' گریڈ دیا تھا۔ وہ اب تک اس بات کو اپنے دل میں لیے ہوئے تھا۔ ایک رات وہ شراب کے نشے میں امریکن لیکن ہال سے باہر نکلا تو اسے مسز نیلسن سے پرانی دشمنی یاد آگئی۔ اس نے انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور اس کا میل باکس لے کر چلا گیا۔

میں نے ملزم کا پتا چلا لیا تھا تاہم اسے گرفتار نہیں کیا گیا۔ البتہ اسے جرمانے کی ادائیگی کے ساتھ مسز نیلسن کا نقصان پورا کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اس دوران میں اس کے ساتھ رہا جب اس نے اپنی دوست گلوریا کے ساتھ جا کر نیا میل باکس خریدا اور اسے مسز نیلسن کے دروازے پر لگا دیا۔

جب وہ اپنا کام مکمل کر چکے تو مسز نیلسن ہاتھ میں چھڑی پکڑے باہر آئی۔ اس نے بغور کام کا جائزہ لیا اور بولی۔ ''جوئے۔''

جوئے نے شرمندہ ہوتے ہوئے نظریں زمین پر جما دیں اور آہستہ سے بولا۔ ''جی میڈم۔''

''میں نے کئی برس پہلے جو گریڈ دیا وہ تمہارے لیے ایک تحفہ تھا۔ تم آج بھی پہلے کی طرح احمق اور کند ذہن ہو۔''

دوسرے دن چیف نے مجھے مسز نیلسن کا لکھا ہوا ایک ستائشی خط دکھایا جس میں میری تحقیقات اور کارکردگی پر مبارک باد دی گئی تھی۔ اس نے وہ خط میری ذاتی فائل میں لگاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا آغاز ہے سین۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ایسی ہی کارکردگی دکھاؤ گے۔''

چھ ماہ بعد جب میرا آزمائشی پیریڈ ختم ہو رہا تھا اور میں ملازمت مستقل ہونے کے تصور میں کھویا ہوا تھا کہ چیف نے آکر میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا اور بولا۔ ''کیا تمہارے پاس کوئی کام ہے؟''

''ہاں، میں سوچ رہا تھا کہ اپنی گاڑی میں لنچ سے پہلے روٹ فائیو کا ایک چکر لگا لوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

اس نے میری طرف ویسا ہی ایک کاغذ بڑھایا جس پر اس نے اپنے ہاتھ سے کچھ لکھا ہوا تھا اور بولا۔ ''تمہیں لین کولن کے گھر جانا ہے جو ٹاؤن فائر لین تھری پر واقع ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا معاملہ ہے؟''

''لین نے اپنے گھر کے قریب پانی میں ایک آبدوز دیکھی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اسے چیک کرو۔''

میں تھوڑا سا ہچکچایا۔ کیا یہ بھی کوئی نیا مذاق ہے۔ ایک نئے آدمی کو ایسا کام دو کہ بھاگ بھاگ کر تھک جائے لیکن چیف کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی مذاق نہیں کر رہا ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن...... مسئلہ کیا ہے۔ اسے کیا تکلیف ہو رہی ہے؟''

چیف نے کہا۔ ''اس نے شکایت کی ہے کہ اس آبدوز کی رگڑ سے اس کی موٹر بوٹ کا رنگ خراب ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ساحل کے انتہائی نزدیک آکر متعلقہ قوانین کی خلاف ورزی بھی کر رہی ہے۔''

میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس معاملے کا تعلق ریاستی اداروں سے نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کوسٹ گارڈ یا میرین پٹرول؟''

چیف میرے قریب آیا اور اس کاغذ پر انگلی مارتے ہوئے بولا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ اس نے پہلے میرین پٹرول کو ہی فون کیا تھا لیکن جواب میں انہوں نے قہقہہ لگایا اور فون بند کر دیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے وہ کاغذ اپنی جیب میں رکھا اور بولا۔ ''اس شخص کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ کیا یہ......؟''

چیف نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ یہ کوئی پاگل یا سرپھرا ہے لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

باہر جانے سے پہلے میں نے ایک پرانے نقشے کو غور سے دیکھا جو دروازے کے ساتھ ہی لٹکا ہوا تھا۔ اس میں واکر کے علاوہ اس کی جھیل اور اردگرد کے دیہاتوں کی بھی بہت عمدہ تصویر کشی کی گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں کچی سڑکوں اور فائر لین کی بھی نشاندہی کی گئی تھی جو عام طور پر کسی نقشے یا راستہ بنانے والی تنصیبات میں نہیں ہوتی۔ میرا خیال تھا کہ اپنے جی پی ایس ریسیور کی مدد سے میں مطلوبہ جگہ تک پہنچ جاؤں گا لیکن ایک گھنٹے بعد بھی میں ایک کچی سڑک پر تھا پھر میری نظر ایک پرانے اور زنگ آلود بورڈ پر گئی جس پر لکھا تھا۔ ''کینیڈا کی سرحد۔ پانچ میل۔''

اس دن کے بعد سے میں نے جی پی ایس کا سوئچ

آف کر کے اپنی دراز میں رکھ دیا۔

وہ جون کا ایک گرم دن تھا۔ اس سے پہلے میموریل ڈے کی وجہ سے گہما گہمی رہی لیکن اب نسبتاً خاموشی تھی۔ اس کے بعد چار جولائی کی تقریبات شروع ہونے والی تھیں جن کے بارے میں مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ اس دن بار بی کیو، آتش بازی اور شراب پی کر ساحل پر ہنگامہ آرائی کرنے والوں پر نظر رکھنا ہوگی۔ میں نے اپنی فورڈ کراؤن وکٹوریہ کروزر اسٹارٹ کی اور کولن کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے واکر جھیل میں نظر آنے والی آبدوز کی جگہ کا معائنہ کرنا تھا۔

فورڈ کمپنی نے کروزر کا یہ ماڈل پانچ سال پہلے بنانا بند کر دیا تھا جس کا مطلب تھا کہ پولیس ڈپارٹمنٹ کو اگلے پانچ برسوں میں ایک نئی کروزر ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔ میری گاڑی کا ائرکنڈیشننگ سسٹم شاید اس وقت سے کام نہیں کر رہا تھا جب میں نے بوسٹن پولیس ڈپارٹمنٹ میں ملازمت شروع کی تھی۔ لہٰذا میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا۔ واکر میں چار طرح کی سڑکیں ہیں۔ پہلی پختہ، دوسری وہ نیم پختہ سڑکیں جن کی دیکھ بھال ٹاؤن کی طرف سے کی جاتی ہے۔ تیسری عام کچی سڑک جو ناہموار اور جگہ جگہ سے اونچی نیچی ہوتی ہے اور چوتھی وہ پگڈنڈیاں جو ٹائروں کے چلنے سے وجود میں آتی ہیں۔

کولن کے گھر جانے والی سڑک تیسری اور چوتھی قسم کا مکسچر تھی۔ جنگل میں داخل ہونے کے بعد دو مرتبہ میری کروزر زمین میں دھنستی ہوئی محسوس ہوئی۔ سڑک کے دونوں جانب جھکی ہوئی درختوں کی شاخیں اور ٹہنیاں میری گاڑی سے رگڑ کھا رہی تھیں۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد سڑک چوڑی اور بہتر ہوگئی اور دو ایک منزلہ کاٹیج سے گزرنے کے بعد اس کا اختتام لین کولن کے گھر پر ہوگیا۔

وہ کافی اچھا مکان تھا۔ اس کا ایک منزلہ ڈھانچا چوڑائی میں پھیلا ہوا تھا جس میں بہت سی کھڑکیاں تھیں جو جھیل کی جانب کھل رہی تھیں۔ اس سے متصل ایک گیراج تھا جس میں دو کاریں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ جیسے ہی میں گاڑی سے باہر آیا تو مجھے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اس مکان کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے بنانے میں کافی خرچہ ہوا ہوگا۔

ایک سیاہ اور سفید کتا مکان کے کونے سے بھاگتا ہوا سیدھا میری طرف آیا۔ اب اس کے بھونکنے میں شدت آگئی تھی۔ میرے سامنے آکر وہ رک گیا اور زمین پر لیٹ کر اپنی چاروں ٹانگیں اوپر اٹھا دیں۔ اس طرح اس کا پیٹ نمایاں ہوگیا۔

ایک مرد کی آواز آئی۔ ''یہ اسپنسر ہے۔ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر اسی طرح بھونکتا ہے لیکن اگر تم اس کا پیٹ سہلاؤ گے تو یہ ہمیشہ کے لیے تمہارا دوست بن جائے گا۔''

میں نے جھک کر اس کا پیٹ سہلایا اور کھڑا ہوگیا۔ وہ شخص دراز قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس نے سفید ٹی شرٹ، خاکی پتلون اور کشتی بانی کے جوتے موزوں کے بغیر پہن رکھے تھے۔ اس کے بال سفید اور سخت تھے۔ وہ جب میرے قریب آیا تو میں نے سوچا کہ اس کی عمر ساٹھ ستر یا ہوسکتا ہے کہ پچہتر برس ہو۔ میں نے یہاں ایک بات نوٹ کی تھی کہ اس خطے سے تعلق رکھنے والے کئی مرد اور عورتیں، اسی سال کی عمر ہونے کے باوجود بھی وہ پینسٹھ سے زیادہ کے نظر نہیں آتے تھے۔

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ سونے کی چین والا بریسلیٹ اس کی کلائی میں جھول رہا تھا۔ ''لین کولن۔''

''سین سولیون۔'' میں نے کہا۔

اس نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ''ہاں، تم ساؤتھی بوائے ہو۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ساؤتھی بوائے ہی ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''تمہارے خاندان کا کوئی اور فرد بھی پولیس میں ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرے ایک انکل ولیم جنگ عظیم دوم کے دوران ملٹری پولیس میں تھے۔ اس کے بعد وہ پرائیویٹ سراغ رساں بن گئے۔''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ مجھے مکان کے عقبی حصے کی طرف لے گیا۔ اسپنسر بھی ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ وہاں کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ واکر جھیل کا کھلا ہوا چوڑا کنارہ اور دور سے نظر آتی سفید پہاڑیوں کی چوٹیاں اور قریب میں ہی گول پتھر، مٹی اور گھاس کے گچھے نظر آرہے تھے۔ وہاں سے ایک طویل گودی پانی میں جارہی تھی جس کے دائیں جانب ایک کیاک کشتی اور بائیں جانب ہلکے نیلے رنگ کی اسپیڈ بوٹ لنگر انداز تھی۔ یہ پراپرٹی دراصل ایک کھاڑی کا حصہ تھی جس کے دائیں جانب زیرآب ٹیلوں کا جھرمٹ تھا اور وہاں دور دور تک کوئی پڑوسی نظر نہیں آرہا تھا۔

پانی سے باہر وہاں دو چوڑے تلے والی کشتیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اب تک میں یہ نہیں جان سکا تھا کہ وہاں کتنے لوگ ہیں۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔ ''یہ ہے ہمارا چھوٹا سا جنت کا ٹکڑا۔ کئی برسوں تک ہم دونوں یعنی میں اور میری بیوی نے اپنا تن پیٹ کاٹ کر بچت کی تب کہیں جا کر یہ جگہ خریدنے کے قابل ہوئے اور اب ہم فخر سے اسے اپنا کہہ سکتے ہیں۔''

میں نے مکان کے عقبی حصے پر نظر ڈالی۔ وہاں ایک بہت بڑا پورچ بنا ہوا تھا جس کے نیچے کئی کرسیاں اور چھوٹی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہاری بیوی کہاں ہے مسٹر کولن؟''

''وہاں۔'' اس نے جھیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں پریشان ہو گیا اور شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔

''یہ سن کر افسوس ہوا۔''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ہوتا ہے۔ موت کا فرشتہ موقع ملتے ہی روح قبض کر لیتا ہے۔ چھ برس پہلے میلانی کی باری آئی۔ کسی نے چھپ کر گولی چلائی اور اس کی راکھ وہاں بکھر گئی۔'' اس نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ ''لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا بلکہ اس کی وجہ وہ آبدوز ہے۔''

''میں...... میرا اندازہ ہے کہ......''

وہ تیزی سے مڑا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں پاگل ہوں؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ آبدوز کیسی ہوتی ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ زیرِآب چلنے والی کشتی دیکھنے میں کیسی لگتی ہے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے یہاں ایک آبدوز دیکھی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اپنی نوٹ بک اور پین نکالتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کب اور کیسے وہ آبدوز دیکھی؟''

کولن نے کہا۔ ''میں پچھلے دو دنوں میں اسے دو مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ میں یہاں اپنی گودی کے سرے پر بیٹھا ہوا تھا جب تین دن قبل اسے پہلی بار دیکھا۔''

''وہ دیکھنے میں کیسی لگ رہی تھی؟''

اس نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا کہ وہ دیکھنے میں کیسی لگ رہی تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ اس میں کوئی ٹاور ہوگا۔ عرشے پر کوئی گن اوپر کی جانب اٹھی ہوئی ہوگی جیسی کہ جنگ عظیم دوم کے دوران استعمال ہونے والی آبدوزوں میں نصب ہوتی تھی۔''

''میں جاننا چاہتا ہوں مسٹر کولن کہ آبدوزوں کے بارے میں یہ معلومات تمہیں کہاں سے ملیں؟''

اس نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے کبھی نیوی میں کام کیا ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا کبھی تمہارا تعلق کسی خفیہ ایجنسی سے رہا ہے؟''

''نہیں، لیکن میں پولیس سراغ رساں رہ چکا ہوں۔''

''پھر تم نہیں سمجھو گے، میں بتاتا ہوں۔'' اس نے جھیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اندھیرا پھیلنے سے تھوڑی دیر پہلے جنوب مشرق سے شمال مغرب کی جانب میں نے پانی میں ایک ابھار دیکھا۔ پہلے تو میں اسے نظر کا دھوکا سمجھا کہ شاید پانی میں سورج ڈوبنے کا عکس پڑ رہا ہے یا کسی کشتی کے گزرنے سے لہروں میں تلاطم پیدا ہوا ہے لیکن نہیں وہ زیرِآب ایک ڈھانچا تھا جو حرکت کر رہا تھا۔ میں اس کی وجہ سے پانی پر بننے والی لہریں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک بڑے سائز کی آبدوز تھی۔ اس کی لمبائی غالباً تیس چالیس فٹ ہو گی۔

میں تمام باتیں نوٹ بک میں لکھتا جا رہا تھا۔ اس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''اس کی حرکت وہاں سے شروع ہوئی۔'' اس نے جنوب مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ان چٹانوں کے پاس سے گزرتی ہوئی اس راستے پر چلی گئی۔''

''کیا تمہارے علاوہ بھی کسی نے اس آبدوز کو دیکھا؟''

''نہیں۔''

''کیا تم نے پولیس کو فون کیا؟''

اس نے دوبارہ بازو اپنے سینے پر باندھ لیے اور بولا۔ ''نہیں، یہ ایک بہت ہی عجیب معاملہ تھا اور میرے لیے اس کی وضاحت کرنا مشکل تھا۔ میں نے اپنے تجربات سے یہی سیکھا ہے کہ اگر کسی بات کی وضاحت نہ کر سکو تو اسے وہیں ختم کر دو جب تک کہ وہ دوبارہ نہ ہو اور وہ ہو گئی۔''

''اوہ، میں سمجھ گیا۔''

اس نے اس طرح ناک سکیڑی جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں اور بولا۔ ''کل پھر یہ واقعہ پیش آیا۔ اسی وقت اور اسی جگہ میں نے اسے حرکت کرتے ہوئے دیکھا لیکن اس

مرتبہ وہ ساحل کے قریب آ گئی اور اس نے گودی کے قریب میری کشتی کو ٹکر ماری۔ اس کے بعد وہ اسی راستے پر دوبارہ چلی گئی۔''

''یہ بھی دیکھنے میں اسی سائز کی لگ رہی تھی؟''

''ہاں۔''

''کوئی آواز؟''

''نہیں۔''

''پھر تم نے پولیس کو فون کیا؟''

اس نے ایک سرد آہ بھری اور بولا۔ ''نہیں، میرے دوست۔ پہلے میں نے اپنے کچھ پرانے دوستوں کو فون کیا لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے اور انہوں نے اس جھیل میں کسی آبدوز کو نہیں دیکھا پھر میں نے کوسٹ گارڈ کو بتایا لیکن ان کا کہنا تھا کہ یہ علاقہ ان کی حدود میں نہیں آتا اور میرین پٹرول سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن جب میں نے میرین پٹرول کو فون کیا تو ان کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ اس شخص نے پہلے تو ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا کہ گزشتہ دو سال سے ان کے فنڈ میں مسلسل کٹوتی ہو رہی ہے اور انہیں بڑی احتیاط سے خرچ کرنا ہوتا ہے۔ وہ کسی نامعلوم آبدوز کی تلاش میں پٹرول ضائع نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد مجھے پولیس کو فون کرنا پڑا۔''

''لیکن تم نے پولیس کو کیوں فون کیا؟'' میں نے پوچھا۔

کولن بولا۔ ''ٹاؤن کا قانون یہ کہتا ہے کہ پانی میں چلنے والی کشتیوں، جہازوں یا آبدوزوں کو گودی سے کم از کم پچاس فٹ دور رہنا چاہیے۔ اس آبدوز نے قانون کی خلاف ورزی کی جو کہ صریحاً جرم ہے پھر اس نے میری پاور بوٹ کو ٹکر مار کر نقصان پہنچایا اور یہ دوسرا جرم ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ گودی کی طرف چل پڑا۔ میں اور اسپنسر اس کے پیچھے تھے۔ میں اس عمر میں اس کی مہارت اور پھرتی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اتنی تیزی سے کشتی میں چھلانگ لگا دے گا۔

''وہاں دیکھو، عقبی حصے کی طرف۔'' اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر ذرا زور سے ٹکر لگتی تو میری کشتی بالکل تباہ ہو جاتی۔''

میں بڑی احتیاط سے کشتی میں اترا اور جھک کر عقبی حصے کی طرف دیکھنے لگا۔ جب میری نظر دائیں جانب گئی تو وہاں مجھے رگڑ کے نشان نظر آئے اور اس جگہ سے سیاہ رنگ بھی اکھڑ گیا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔

''اس نے میری ذاتی ملکیت کو نقصان پہنچایا ہے اور قانون کی نظر میں یہ جرم ہے۔'' وہ غصے سے بولا۔

''یقیناً ہے۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا اور اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہو کر اس کے ساتھ واپس گودی کی طرف چل دیا۔ میں نے جھیل، ابھری ہوئی چٹانوں اور اس آبی راستے کی طرف دیکھا جس پر وہ آبدوز گئی تھی۔ وہ راستہ چوڑا اور گولائی میں تھا اور آگے جا کر اونچے درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ سورج بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اچانک ہی مجھے جھیل کے پانی سے خوف آنے لگا اور مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں نے کولن کے بارے میں سوچا جو یہاں تنہا رہ رہا تھا اور ایک کتے کے سوا اس کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ اندھیری اور سنسان راتوں میں اس پر کیا گزرتی ہوگی، اگر اس کی طبیعت خراب ہو جائے یا کوئی اور مسئلہ ہو تو وہ کسے بلائے گا۔ مجھے بھی یہاں تک پہنچنے میں بیس منٹ لگ گئے تھے۔

وہ بوڑھا اور ریٹائرڈ شخص اس ویرانے میں تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ ایسے میں اگر کوئی بات اسے پریشان کر رہی تھی تو یہ ٹھیک نہیں تھا۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کولن نے کہا۔ ''اب تم کیا کرو گے؟''

''وہی جو مجھے کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں۔''

میں جب پولیس اسٹیشن واپس آیا تو میرا خیال تھا کہ اس بارے میں چیف کو تفصیلی رپورٹ دوں لیکن وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی ہمیشہ کی طرح غائب تھے چنانچہ میں اوپر ٹاؤن ہال میں چلا گیا اور چند منٹ تک واکر کا نقشہ اور ٹیکس دینے والوں کی فہرست دیکھتا رہا تاکہ معلوم ہو سکے کہ واکر جھیل کے اس حصے کا مالک کون تھا۔ لیکن وہ سب بہت مبہم تھا اور وہاں کے ایک ملازم کی مدد کے باوجود میں اس بارے میں کوئی صحیح اندازہ قائم نہیں کر سکا۔

مجھے یہ جان کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کہ وہ ایک بڑی جھیل تھی جس کے اطراف میں کئی ایسی جگہیں تھیں جہاں کوئی سڑک، گھر یا آبادی کا کوئی نشان نہیں تھا۔

جب میں اپنے اپارٹمنٹ واپس آیا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایک بار پھر مجھے کیپٹن کولن کے بارے میں سوچ کر جھرجھری آ گئی۔ وہ ایک ایسی جگہ پر رہ رہا تھا جس کے قرب و جوار میں کوئی روشنی نہیں تھی اور اس اندھیرے میں کوئی

نامعلوم چیز پانی میں حرکت کرتی ہوئی نظر آئے تو اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ ہر قیمت پر اس آبدوز کی حقیقت جان کر رہوں گا۔ ویسے تو یہ میرے فرائض میں شامل تھا لیکن کولن کی تنہائی اور پریشانی کو دیکھتے ہوئے اس جذبے میں شدت آگئی تھی۔

اگلے روز سہ پہر میں چیف سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس نے پوری بات سننے کے بعد پوچھا۔ ''اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''میں ٹاؤن کی حفاظتی کشتی لے کر وہاں جاؤں گا اور کولن کی جگہ پر کھڑی کردوں گا۔''

''تمہارا خیال ہے کہ شاید وہ آبدوز پھر آئے گی۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اس آبدوز کو دو دن میں دو مرتبہ دیکھا گیا ہے۔ اگر یہ شیڈول برقرار رہتا ہے تو آج شام کو اندھیرا پھیلنے سے پہلے کسی وقت وہ آبدوز پھر آسکتی ہے۔''

''مجھے بتاؤ کہ تمہارا منصوبہ کیا ہے؟''

میں اسے دروازے کے ساتھ لٹکے ہوئے بڑے نقشے کے پاس لے گیا اور خاکہ بنا کر بتایا کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور کیا ہوسکتا ہے۔ چیف نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارا سامنا آبدوز سے ہوگیا تو کیا کرو گے؟ اسے ڈبو دو گے؟''

''صرف اس صورت میں اگر اس نے کوئی مخالفانہ حرکت کی۔'' میں نے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اچھا مذاق ہے۔''

''میں مذاق نہیں کررہا۔''

اس کے بعد میں ٹاؤن کی گودی گیا اور واکر پولیس ڈپارٹمنٹ کی حفاظتی کشتی کی زنجیر کھول دی۔ یہ ایک پرانی بوسٹن وہیلر تھی جسے نیویارک کی ایک فیملی نے دو سال قبل پولیس کو عطیہ کیا جب ان کے خاندان کا ایک فرد جھیل میں ڈوب گیا تھا۔ دو مرتبہ کوشش کرنے کے بعد میں اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے بہ آسانی اسے باہر نکالا اور جھیل کے شمال کی جانب روانہ ہوگیا جہاں لین کولن رہتا تھا۔

پانی پر سفر کرنے میں بہت مزہ آرہا تھا۔ گو کہ گزشتہ رات میں نے جو خواب دیکھا اس کی وجہ سے میں خاصا منتشر تھا۔ مجھے پام کے درخت نظر آئے پھر میں نے دیکھا کہ مجھے ہیلی کاپٹر کی مدد سے نکالا جارہا ہے۔ مجھے ایک بڑی سی گلابی رنگ کی عمارت بھی نظر آئی۔ شاید وہ کوئی اسپتال تھا۔

لیکن اس وقت مجھے کوئی پام کا درخت دکھائی نہیں دیا۔ میرے سامنے ایک کھلی ہوئی چوڑی جھیل تھی اور چند ماہی گیر کشتیوں میں سوار مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔

میں نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ بوسٹن وہیلر زیادہ تر گودی پر کھڑی رہتی ہے۔ چیف یا دوسرے تین پولیس والے اسے کبھی استعمال نہیں کرتے۔ جب میں نے چیف سے پوچھا تو اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''تم جانتے ہو کہ جھیل پر لوگ تفریح کرنے، مچھلیاں پکڑنے یا کسی الگ تھلگ جگہ میں تیراکی کرنے جاتے ہیں۔ ابھی تک ایسی کوئی ہنگامی صورتِ حال پیش نہیں آئی کہ ہم اس کشتی کو استعمال کرتے۔''

لیکن میں اپنی فیملی یا دوستوں کے ساتھ تفریح کرنے نہیں جارہا تھا۔ مجھے بوسٹن ہاربر کے آس پاس کشتی چلانے کا وسیع تجربہ تھا۔ اسی لیے میں بڑے مزے سے بوسٹن وہیلر کو چلا رہا تھا۔ یہ میرے لیے ایک اور اچھا دن تھا کیونکہ میں سرکاری کام سے پانی پر سفر کررہا تھا اور کاؤنٹی ڈسپیچ کی پہنچ سے بھی دور تھا۔ واکر کے اس حصے میں ریڈیو کام نہیں کرتا تھا۔ لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

میرا رخ شمال کی جانب تھا اور مجھے کولن کی جگہ تک پہنچنے میں ایک گھنٹا لگتا۔ مجھے چند کشتیاں نظر آئیں لیکن کوئی بھی اتنے قریب نہیں تھی کہ میں اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو شناخت کرسکتا۔ درختوں سے گھرے ہوئے جزیرے جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ گو کہ کاک پٹ میں نقشہ موجود تھا۔ اس کے باوجود ان جزیروں کے نام جاننا بہت مشکل تھا لیکن اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی۔

بعض اوقات پانی کی سطح یا زیرِ آب جو کچھ ہے، وہ نقشوں پر ظاہر نہیں ہوتا۔ ایسی ندیاں، کھاڑی اور آبی راستے تھے جو کسی نقشے پر دکھائی نہیں دیے۔ میں نے یہی بات ایک دفعہ چیف سے پوچھی تو اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''پانی کی سطح کے نیچے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ پانی کے بہاؤ میں تیزی آجائے تو کھاڑیاں بنتی ہیں اور جب اس میں کمی ہو تو یہ کھاڑیاں غائب ہوجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ جھیل کی تہ میں بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ خاص طور پر چٹانیں جو کشتی کے نچلے حصے کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ اس طرح اب تک دو کشتیاں جھیل میں ڈوب چکی ہیں۔''

میں نے کولن کی جگہ کے قریب پہنچ کر انجن کی رفتار کم

کی۔ اس وقت ہوا نہیں چل رہی تھی اور پانی کی سطح ساکت تھی۔ مجھے وہاں سے گزرتی ہوئی ایک پونٹون کشتی نظر آئی جو آہستہ خرامی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ اس میں بیٹھی ہوئی بکنی میں ملبوس دو حسیناؤں نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا اور اس وقت مجھے وہ فون کال یاد آگئی جو میری عنقریب سابق ہونے والی بیوی کونی نے کی تھی۔

''میں جنوب کی رہنے والی ہوں اور تمہارے ساتھ ولارڈ جیسی فضول جگہ پر نہیں رہ سکتی۔''

''واکر۔'' میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو بھی نام ہو۔'' اس نے تنک کر جواب دیا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

اب میں وقت گزاری کے لیے ایک دائرے کی شکل میں آہستہ آہستہ کشتی چلا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گودی کے آخری سرے پر لین کولن لان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور برابر میں نیچے زمین پر اس کا پالتو کتا اسپنسر ٹانگیں پسارے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور میں نے بھی جوابی اشارہ کر کے اسے بتا دیا کہ پولیس اپنا کام کر رہی ہے۔ جھیل سے اس کی رہائش گاہ بالکل مختلف نظر آرہی تھی۔ اسے بہت اچھے طریقے سے ڈیزائن کیا گیا تھا۔

میں نے کشتی کو کچھ دور لے جا کر اسے نیوٹرل میں ڈالا اور دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ پکڑ کر انتظار کرنے لگا۔ لین نے گلے میں دوربین لٹکا رکھی تھی اور اس کی نظریں بھی جھیل پر تھیں۔ اس نے ایک دو مرتبہ مجھے دیکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس پر یہ ظاہر کیا جیسے میں اسے نہیں دیکھ رہا۔

اچانک ہی بطخیں ٹرٹرانے لگیں۔ کہیں دور سے مرغابیوں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ پانی میں ایک دائرہ بنا اور میں نے سطح آب پر کسی چیز کو تیرتے اور اپنا سر پانی سے باہر نکالتے دیکھا۔ آسمان سیاہ ہو چکا تھا اور سورج افق کے پار ڈوب رہا تھا۔ لین کی گودی پر اس کا کتا اسپنسر چاروں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر گودی کے کنارے پر جھک گیا۔ اس کی دم تیزی سے ہل رہی تھی اور میں نے پانی کے اندر کسی چیز کو حرکت کرتے دیکھا۔

میں کھڑے ہو کر پانی کے ابھار کو دیکھنے لگا جو عین اسی جگہ پر تھا جو لین نے بتائی تھی۔ مجھے ڈزنی کی ایک پرانی فلم یاد آگئی جس میں کس طرح ایک آبدوز جنگی جہازوں کو نشانہ بناتی تھی بالکل اسی انداز میں وہ ابھار میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس وقت مجھے پچھتاوا ہونے لگا کہ میں نے کولن کی بات پر کیوں شک کیا۔ پانی کا وہ ابھار میری کشتی کے بالکل قریب سے گزر گیا اور پانی کی لہروں سے میری کشتی ڈولنے لگی۔

لین نے چلا کر کچھ کہا لیکن میں نے اسے نظرانداز کر کے اپنی کشتی کے انجن کو نیوٹرل سے نکالا اور اس آبدوز کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ میں نے اپنی کشتی کی رفتار کم رکھی کیونکہ اس سے آگے نکلنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کا تعاقب کرتے ہوئے مجھے کئی خیالات نے گھیر لیا۔ مثلاً یہ کہ میں تنہا کیوں اس مشن پر آیا۔ میرا ریڈیو بھی کام نہیں کر رہا۔ اگر مدد کی ضرورت پیش آئی تو میں کیسے رابطہ کر پاؤں گا۔ وہ متحرک شے جیسے ہی ان ٹیلوں کے قریب پہنچی جو ایک دوسری کھاڑی اور راستے کی نشاندہی کر رہے تھے تو وہ گہرے پانی میں چلی گئی۔

میں نے انجن نیوٹرل میں ڈالا اور میری نگاہ بڑے بڑے گول پتھروں پر گئی۔ ان میں سے قریب ترین پتھر پر زرد اور سفید رنگ کے نشانات تھے جس کا مطلب تھا کہ کوئی بدقسمت موٹر بوٹ اس سے ٹکرائی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ کسی نشاندہی کرنے والے کے بغیر میں کس طرح ان پتھروں سے بچ کر گزر سکوں گا۔ میں نے اوپر والے کا نام لے کر انجن اسٹارٹ کیا اور آہستہ آہستہ ان چٹانوں سے گزرنے لگا۔ وہی آبدوز مجھے راستہ دکھا رہی تھی۔

میں بہت محتاط طریقے سے آگے بڑھ رہا تھا۔ دو مرتبہ میری کشتی کسی چیز سے ٹکرائی لیکن بہرحال میں ان چٹانوں سے گزر کر ایک تنگ آبی راستے میں داخل ہوگیا جس کے دونوں کناروں پر درخت اور جھاڑیاں تھیں جن کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ اس کے دوسرے سرے پر پانی کا ابھار موجود تھا۔ میں نے اپنی کشتی گھمائی اور آہستہ رفتار سے اس راستے پر آگے بڑھ گیا۔ آگے جا کر یہ راستہ دائیں جانب مڑ کر کشادہ ہوگیا۔ وہاں کا منظر میرے لیے حیران کن تھا۔

اس جگہ کھاڑی چوڑی ہوگئی تھی اور اسے پوری طرح درختوں نے چھپا رکھا تھا۔ اس کے کنارے پر ایک میدان اور ساحل تھا جو ٹرکوں سے ریت ڈال کر بنایا گیا تھا۔ وہاں ایک ٹریلر اور تین پک اپ ٹرک کھڑے ہوئے تھے جبکہ دو بڑی میزوں پر اوزار، ویلڈنگ کے آلات اور دیگر مشینری رکھی ہوئی تھی۔ بائیں جانب ایک کھینچنے والا ٹرک کھڑا ہوا تھا جس کے پچھلے حصے سے ایک کیبل بندھا ہوا تھا اس کا ایک سرا ٹرک اور دوسرا سرا آبدوز سے بندھا ہوا تھا، جسے کھینچ کر لکڑی

کے تختے پر لایا گیا تھا۔

یہ وہی آبدوز تھی جس کا تعاقب کرتے ہوئے میں وہاں تک پہنچا تھا۔ دیکھنے میں اس کی لمبائی ساٹھ سترفٹ تھی۔ وہ سیاہ فائبر گلاس سے بنائی گئی تھی۔ گویا میں نے جو خواب دیکھا، وہ سچ تھا۔ اس کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے تھے۔

پام کے درخت، گلابی رنگ کی عمارتیں....

منشیات کی اسمگلنگ، اس آبدوز کو اسمگلنگ کے لیے استعمال کیا جارہا تھا۔ سارا معاملہ فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا۔

میں نے اپنی کشتی کا انجن نیوٹرل کیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اسی وقت ایک دو نہیں بلکہ پانچ آدمی پانی کے کنارے پر آئے، ان سب کے ہاتھوں میں پستول یا سیمی آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ مجھے لگا کہ یہاں آنے کا فیصلہ کر کے میں نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔

ان میں سے چار ہسپانوی لگ رہے تھے جبکہ پانچواں جس نے قدم آگے نہیں بڑھایا تھا چلاتے ہوئے بولا۔ ''تم یہاں کیا کررہے ہو؟''

''میں ایک تحقیقات کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔''

مجھ سے بات کرنے والا بھاری جسم کا مالک تھا اور اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ اس نے جینز اور گہرے سبز رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی اور کمر میں پستول لٹکا ہوا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ میرا باپ کون ہے؟'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم نے اپنی ماں سے نہیں پوچھا؟''

وہ مجھے غصے سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام جارج واکر ہے اور یہ زمین ہمارے خاندانی ٹرسٹ کی ملکیت ہے۔ میرا باپ بورڈ کا چیئرمین ہے۔ اس لیے اگر تم کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتے تو تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔''

''یہ جھیل کسی کی خاندانی ملکیت نہیں ہے۔'' میں نے مسلح افراد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے بڑے تربیت یافتہ انداز میں رائفلیں پکڑی ہوئی تھیں جس سے میں قدرے خوف زدہ ہوگیا تھا۔ ''اور میں سرکاری ڈیوٹی انجام دے رہا ہوں۔''

''مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔'' جارج نے کہا۔ ''تمہارے پاس صرف ایک منٹ ہے، اپنی کشتی کا رخ موڑو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

جارج کے برابر میں کھڑے ہوئے شخص نے ہسپانوی زبان میں کچھ بولنا شروع کیا تو دوسرے آدمیوں نے اپنی رائفلوں کا رخ میری طرف کرلیا اور میرے خوف زدہ دماغ میں اپنے بچاؤ کے لیے کئی امکانات اور منظرنامے گردش کرنے لگے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ اپنی کشتی کو پیچھے کر کے میں فائر کرنے میں پہل کروں اور اس کے بعد پانی میں چھلانگ لگا کر تیرتا ہوا دور نکل جاؤں۔ عین اسی وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

زرد روشنی کا ایک چمکتا ہوا نقطہ جارج واکر کے سینے کے وسط پر نمودار ہوا۔ اس کے بعد وہ دوسرے آدمی کے سینے پر گیا اور پھر جارج پر واپس آگیا۔ بقیہ لوگوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کردیں۔

''جارج۔'' میں نے مضبوط اور پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''جنگل میں میرا ایک ساتھی موجود ہے، اس نے لیزر کی روشنی میں تمہیں اپنے نشانے پر لے لیا ہے۔''

قیدی

ہوٹل کے کاؤنٹر کو رات کے تین بجے انٹرکام پر کال موصول ہوئی۔ ''تمہارا بار کب کھلے گا؟'' دوسری طرف سے مخمور لہجے میں سوال آیا۔

''سر! دوپہر بارہ بجے کھلے گا۔''

بات ختم ہوگئی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ وہی فون آیا۔ کلرک نے تحمل سے پرانا جواب دہرادیا۔ جب تیسری بار وہی کال، اسی سوال کے ساتھ آئی تو کلرک نے کہا۔ ''سر! بار تو دوپہر میں کھلے گا۔ اگر آپ کو طلب شدید ہے تو حکم فرمائیں۔ میں روم سروس کے ذریعے تعمیل کرائے دیتا ہوں۔''

''روم سروس پر لعنت...... ہزار بار لعنت۔ میں بار میں بند ہوگیا ہوں...... پتا نہیں دوپہر کب ہوگی اور میں یہاں سے نکلوں گا۔ بار کو تالا لگانے سے پہلے یہ مردود سارے ٹوائلٹ کیوں نہیں چیک کرتے، میں وہاں پڑا رہا اور یہ نکل گئے۔''

رومیو کی تھائی لینڈ سے بے بسی

وہ بےخوف انداز میں بولا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔تم صرف دو ہی تو ہو۔''

میں نے اپنا پستول نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تمہارے کم از کم دو یا تین آدمی پہلے ہی راؤنڈ میں مارے جائیں گے۔کیا تم ایسا چاہو گے؟''

ہم ایک دوسرے کو کچھ دیر دیکھتے رہے پھر اس نے ہسپانوی زبان میں اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا اور انہوں نے اپنی رائفلیں زمین پر پھینک دیں۔اس کے بعد بھی وہ ننھا سا نقطہ حرکت کرتا رہا پھر میں پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد اپنی کشتی کو ساحل پر لے آیا۔

میرے پاس ہتھکڑیوں کے صرف دو سیٹ تھے یعنی میں ان میں سے صرف چار کو ہتھکڑی لگا سکتا تھا چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ ''تم کھینچنے والے ٹرک پر جاؤ اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر کے بیٹھ جاؤ۔''

اس میں اب بھی تھوڑی سی اکڑ باقی تھی۔ اس نے مجھے دھمکاتے ہوئے کہا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔ٹاؤن کے لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''میں بوسٹن سے آیا ہوں اور پورا ٹاؤن مجھ سے ڈرتا ہے۔جاؤ ٹرک میں بیٹھو۔''

چند منٹ بعد مجھے اس کے ایک ساتھی کی تلاشی کے دوران سیل فون مل گیا اور میں نے اس سے چند ضروری فون کیے۔جب پہلی پولیس کار وہاں پہنچی تو جنگل کے کسی پوشیدہ مقام سے آنے والا زرد روشنی کا نقطہ غائب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کئی گھنٹوں بعد میں اپنے دفتر میں بیٹھا کافی کا تیسرا کپ پی رہا تھا کہ چیف میرے قریب آیا اور مجھے شاباش دیتے ہوئے بولا۔

''تم نے زبردست کام کیا ہے سین۔''

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس وقت تمام ٹی وی کے لوگوں اور رپورٹرز کو تمام تفصیلات مل گئی ہوں گی؟''

''کیوں نہیں، یہ ایک بڑی خبر ہے۔''

میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کچھ سوچا اور بولا۔ ''کتنی دلچسپ بات ہے کہ مجھ سے اس کیس کی تحقیقات کرنے کے لیے کہا گیا۔''

''دنیا کا کام اسی طرح چلتا ہے۔'' چیف نے کہا۔ ''ویسے بھی تم ڈیوٹی پر تھے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن...... تمہارے پاس دوسرے تین آفیسرز اور بھی تھے جو مجھ سے زیادہ تجربے کار ہیں جو یہاں کے حدود اربعہ کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں اور تم نے ایک رنگروٹ کو بھیج دیا۔''

چیف نے کوئی جواب نہیں دیا بس مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے ایک بار پھر بتاؤ کہ تم فوج میں کیا کرتے تھے؟''

''وہی جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔'' اس نے محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''شاید تم کوئی ایسا کام کرتے تھے جو چھپ کر گولی چلانے والے کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جیسے لیزر لائٹ۔''

''شاید۔'' اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''اور اگر لین کولن کی بات کی جائے تو وہ اس بارے میں پریشان ضرور تھا لیکن اپنے طور پر کوئی تحقیقات کرنا نہیں چاہتا تھا حالانکہ اس کی گودی پر ایک کشتی کھڑی ہوئی ہے، اس کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ اس میں بیٹھ کر آبدوز کا تعاقب کرتا لیکن وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی مرضی تھی۔''

''شاید۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ملوث ہونا چاہتا تھا لیکن بہت زیادہ نہیں۔اس نے یہی کافی سمجھا کہ ہمیں فون کر دے تاکہ اس کا نام سامنے نہ آئے اور اس کا بڑھاپا سکون سے گزر جائے۔''

چیف خاموش رہا تو میں نے کہا۔ ''جیسے تم...... تم جانتے تھے کہ وہ جگہ کس کی ملکیت ہے۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔تمہارے لیے یہ بڑا آسان تھا کہ وہاں جاتے اور ضرورت پڑنے پر مجھے مدد فراہم کرتے۔''

اس کے بعد بھی وہ کچھ نہ بولا تو میں نے کہا۔ ''اگر میں ناکام ہو جاتا تو تم جارج واکر کے باپ سے کہہ سکتے تھے کہ اس رنگروٹ نے یہ سارا فساد کھڑا کیا ہے۔میری ملازمت ختم ہو جاتی اور معاملہ دب جاتا۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر چیف مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مبارک ہو، تم نے آزمائشی مدت کامیابی سے مکمل کر لی۔ اب تمہاری ملازمت مستقل ہو گئی ہے۔کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ میں نے تمہاری مدد کس طرح کی۔ زرد روشنی کے نقطے کی وجہ سے تم نے انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔بہرحال یہ تمہارا ہی کارنامہ کہلائے گا۔''

بزرگوں اور راہبوں کی زندگی انتہائی محدود ہوتی ہے... ان کا دائرۂ حیات اپنی معین کردہ حدوں تک ہی محیط رہتا ہے... وہ باہر کی دنیا سے اپنا تعلق توڑ کے صرف عبادت... ریاضت میں مشغول رہ کے اپنا وقت گزارتے ہیں... ایک ایسی ہی خانقاہ میں بسر ہونے والے شب و روز... جہاں اچانک ہی ایک بھونچال آگیا...

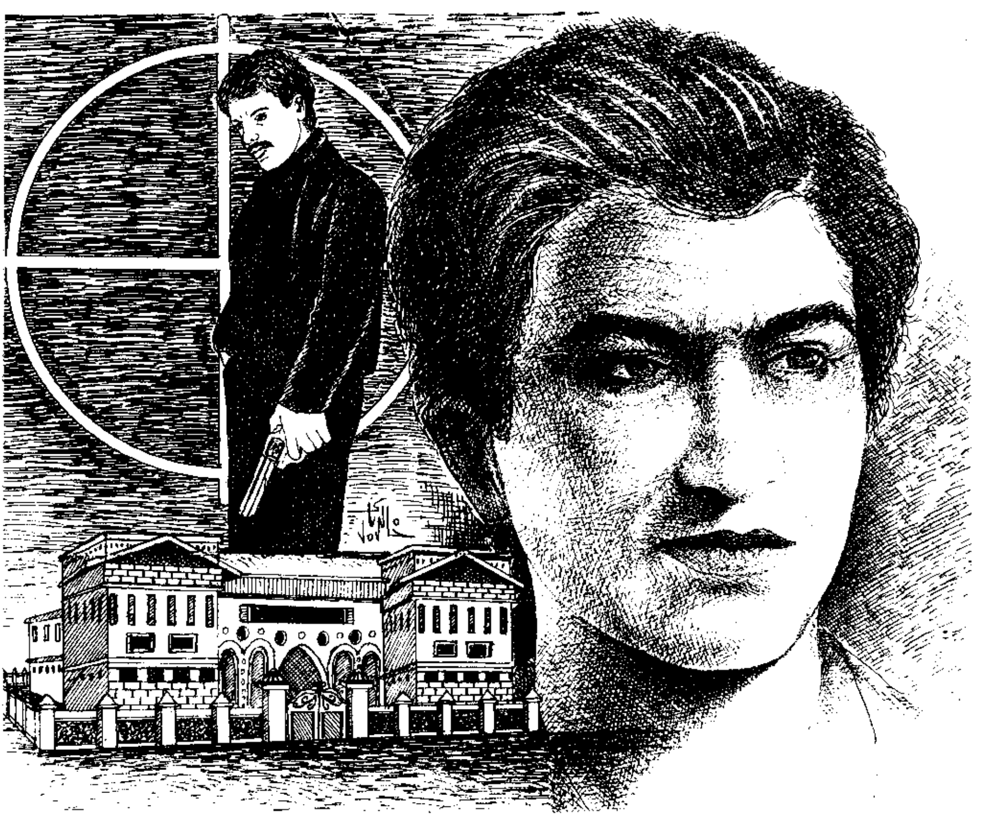
قاتل

السیت... یگانگت اور محبت کے جذبوں میں ڈوبے ذہنوں کی کرشمہ سازی

نسرین منصور

میرا نام جیفری ہے۔

جی ہاں۔ میں گورکن تھا لیکن میرا اصل کام جنگلی پھولوں کے مرغزار کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ بہتر ہے کہ میں اس کی وضاحت کر دوں۔ اس خانقاہ میں میرے رہنے کی اصل وجہ خدا کی عبادت تھی اور میرا بیشتر وقت عبادت یا مطالعے میں گزرتا تھا۔ بہرحال ہم سب راہبوں کے ذمے مختلف کام تھے اور میں اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ مجھے اس کام کے لیے منتخب کیا گیا۔ اگر کوئی اسے آسان کام سمجھتا ہے تو میں بتادوں کہ ایسا نہیں ہے۔ جنگلی پھولوں کے مرغزار



کی بھی کسی باغ کی طرح ہی دیکھ بھال کرنا ہوتی ہے اور یہ ویسے بھی ایک مشہور مرغزار تھا جو لندن کے وسط میں واقع جارجین کریسنٹ کے عقب میں تھا۔

پہلے کبھی اس خانقاہ کی جگہ تین مکان ہوا کرتے تھے، ان کے باغ مشترکہ تھے جو دو ایکڑ پر پھیلے ہوئے تھے۔ لوگ انہیں دیکھنے دور دور سے آتے اور ان کی خوب صورتی کی تعریف کرتے۔ میرے مرغزار کی تصویریں لی جاتیں، فلمیں بنتیں اور مشہور رسالوں میں اس پر فیچر شائع ہوتے۔ ان رپورٹوں میں اکثر میرا بھی تذکرہ ہوتا لیکن میں اس معاملے میں بہت محتاط رہتا تھا اور کبھی خود کو نمایاں کرنے یا اپنی اہمیت جتانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے شہرت کی خواہش نہیں تھی۔ یہ اس عہد کے خلاف ہوتا جو میں نے راہبانہ زندگی اختیار کرتے وقت کیا تھا۔

خانقاہ سے قریب ترین جگہ پر میں نے سبزیاں اگائی تھیں لیکن ہمارے باورچی برادر بیری کے علاوہ کسی کو ان سے دلچسپی نہیں تھی۔ میرا شاندار مرغزار اس کے بعد شروع ہوتا تھا اور ان کے بیچ ایک بل کھاتا ہوا سرسبز اور تراشی ہوئی گھاس کا راستہ تھا۔

مرغزار کے آخری سرے پر ایک شیڈ تھا جہاں میں اپنے اوزار رکھا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی وقفے کے دوران وہاں آرام بھی کر لیتا۔ اس طرح مجھے کچھ غور وفکر کرنے کا موقع مل جاتا۔ شیڈ کے بائیں جانب شہد کی مکھیوں کے لیے بنایا ہوا مصنوعی چھتا تھا۔ جنگلی پھولوں کے مرغزار کے لیے شہد کی مکھیاں پالنا بہت ضروری ہے اور دائیں جانب وہ قبریں تھیں جن میں میرے وہ ساتھی دفن تھے جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو میں نے ان کے لیے قبریں تیار کیں اور جب فادر اسپیریئر نے ان کی آخری رسومات ادا کر دیں تو میں نے انہیں دفن کر کے ہر ایک کی قبر پر لکڑی کی صلیب لگا دی۔ ان کے لیے اس سے زیادہ پُرسکون جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

اس طرح میں خدا کی تعظیم وتکریم کر رہا تھا۔ دوسرے لوگوں کی اپنی اپنی ذمے داریاں تھیں جیسا کہ میں نے بتایا۔ بیری ہمارا باورچی تھا اور یہ مہارت اس نے خانقاہ میں آنے کے بعد ہی حاصل کی تھی۔ وہ سیدھی بات کرنے کا عادی تھا اور ہر طرح کی تنقید اور طنز کو برداشت کر لیتا۔ راہِ راست پر آنے سے پہلے وہ کچھ وقت جیل میں بھی گزار چکا تھا۔ ہمارے لیے وہ جو کھانا تیار کرتا، اس میں کوئی جدت نہ ہوتی اور وہ اپنے آپ کو کسی مشکل میں ڈالے بغیر بڑے آرام سے اپنا کام کر لیتا۔ اس کے زیادہ تر کھانوں میں بھنا ہوا گوشت، چھوٹی مچھلی، پھلیاں اور ابلے ہوئے آلو شامل ہوتے جبکہ شوربہ ہفتے میں ایک مرتبہ ملتا۔ گوکہ میرا معدہ اکثر شکایت کرتا۔ اس کے باوجود دوسرے لوگوں کی نسبت بیری سے میرے اچھے تعلقات تھے۔

وہاں سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور سنجیدہ شخص برادر الفریڈ تھا جو خانقاہ کے لیے ضروری سامان کا بندوبست کرتا اور ہماری ضروری اشیا کا آرڈر فون یا انٹرنیٹ کے ذریعے کر دیتا تھا۔ اس سامان میں میرے بیج اور اوزار بھی شامل تھے۔ اسے کیونکہ کمپیوٹر سے بھی واقفیت تھی اس لیے وہ ضرورت پڑنے پر بیرونی دنیا سے بھی رابطہ کر لیتا تھا۔

برادر لیوک ہمارا معالج تھا اور خانقاہ میں آنے سے پہلے ڈاکٹر کے طور پر پریکٹس کیا کرتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک سوشلسٹ تھا اور کوئی کام کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی اصل ذمے داری کے علاوہ برتن دھونے اور فرش صاف کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتا تھا۔

برادر ونسنٹ اپنی سابقہ زندگی میں کمرشل آرٹسٹ تھا جو بڑی محنت سے چودھویں صدی کی مناجات کی کتاب کو اصل شکل میں بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا جسے اس طویل عرصے میں نقصان پہنچا جب اسے برش اور رنگوں سے تھوڑی سی فرصت ملتی تو وہ لائبریری کے معاملات بھی دیکھا کرتا تھا۔

ہمارے بڑے پادری کا نام ایمبروز تھا۔ وہ ایک الگ تھلگ رہنے والا باوقار شخص تھا۔ اس کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی تھی۔ خانقاہ میں آنے سے پہلے وہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر رہ چکا تھا۔

اس کہانی کو پڑھنے والے حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں ماضی کا صیغہ استعمال کر رہا ہوں جبکہ میں اب بھی روحانی زندگی گزار رہا ہوں اور میں نے ایک باغ کا انتظام سنبھالا ہوا ہے لیکن یہ زیادہ پرانی بات نہیں جب ایک روز صبح کی عبادت کے بعد فادر ایمبروز نے ہم سب کو اپنی اپنی بینچوں پر بیٹھے رہنے کے لیے کہا۔ یہاں میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ چھوٹا سا گرجا دو کمروں کی درمیان دیوار توڑ کر بنایا گیا تھا۔

''میں تم لوگوں سے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' بڑے پادری نے کہا۔ ''یہ کوئی

ڈھکی چھپی بات نہیں کہ حالیہ برسوں میں ہماری تعداد کم ہوئی ہے گزشتہ دو سالوں میں ہمارے پانچ ساتھی داغِ مفارقت دے چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ ہمارا چھوٹا سا قبرستان بھر چکا ہے لیکن مرنے والوں کی تعداد زندہ لوگوں سے زیادہ ہے۔ اب ہم میں سے کوئی بھی جوان نہیں رہا۔ دس سال پہلے جو کام بہ آسانی ہو جاتے تھے اب مشکل لگنے لگے ہیں۔ میں نے گزشتہ موسم گرما کے اختتام پر جیفری کو بوائی کرتے دیکھا تھا اور مجھے لگا کہ یہ خاصا محنت طلب کام ہے۔''

کیونکہ اس نے براہِ راست میری مثال دی تھی اس لیے میرا جواب دینے کا حق بنتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''فادر! میں شکایت نہیں کر رہا لیکن اگر مجھے درانتی کے بجائے بجلی سے چلنے والی گھاس کاٹنے کی مشین مل جائے تو میرا کام بہت آسان ہو جائے گا۔''

''جیفری۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے صرف تمہاری مثال دی تھی۔ مجھے اس سے آگے بھی کچھ کہنا ہے۔ شاید میں بیری اور اس کی کوکنگ کی مثال بھی دے سکتا تھا۔''

''میرے پکانے میں کیا خرابی ہے؟'' بیری نے پوچھا۔

''شوربہ۔'' لیوک نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل بدذائقہ ہوتا ہے۔''

''کیا تم نے کچھ کہا؟'' فادر ایمبروز نے پوچھا۔

''سوچنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔'' لیوک نے ٹالنے کے لیے کہا۔

ایمبروز نے کہا۔ ''میں تم لوگوں کو مختصراً بتا دوں کہ خدائے بزرگ و برتر نے میرے دماغ میں یہ بات ڈال دی ہے کہ ہمیں یہاں سے کسی اور جگہ منتقل ہو جانا چاہیے جو ہمارے اراکین کی تعداد کے لحاظ سے مناسب ہو۔ یہ خوب صورت عمارت اور میدان کسی اور مقصد کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔''

اس کی بات سن کر ہم سب حیران رہ گئے اور ہم پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد لیوک نے زبان کھولی۔ ''وہ مقصد کیا ہو سکتا ہے؟''

''میں فائنگ ہل میں واقع ایک ایسے اسکول سے واقف ہوں جس کے پاس انتہائی نامناسب جگہ ہے۔ وہ عمارت اس کے مقابلے میں بہت چھوٹی اور خستہ حالت میں ہے۔''

''تمہاری تجویز ہے کہ وہ اسکول ہماری عمارت میں آ جائے؟''

''یہ میری تجویز نہیں ہے لیوک جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر نے یہ بات میرے دماغ میں ڈالی ہے۔''

''ہماری خانقاہ اسکول میں تبدیل ہو جائے گی؟ یہ کیسے ممکن ہے؟''

''بالکل ممکن ہے۔ یہ گرجا اسمبلی ہال کے طور پر استعمال ہوگا۔ ہماری خواب گاہیں کلاس روم میں تبدیل ہو جائیں گی۔ دوسرے کمروں میں لیبارٹری اور کینٹین بنا دی جائے گی۔''

''اور میرے مرغزار کا کیا ہوگا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

ایمبروز نے اس طرح ہاتھ پھیلائے جیسے اسے اس سوال کی توقع تھی۔ ''وہ کھیل کے میدان میں تبدیل ہو جائے گا۔''

صدمے سے میری زبان گنگ ہو گئی۔ میں چشمِ تصور سے اس میدان میں اسکول کی لڑکیوں کو ہاکی کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا اسٹوڈیو آرٹ روم بن جائے گا۔'' ونسنٹ نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس مقصد کے حصول کے لیے آمادہ ہو۔'' پادری نے کہا۔ ''کیا ہمارا یہ عمل اس عہد کے مطابق نہیں ہے جو ہم نے یہ زندگی اختیار کرتے وقت قربانی اور انکارِ ذات کے جذبے کے تحت کیا تھا؟''

''مگر ہم جائیں گے کہاں؟''

''مجھے یقین ہے کہ خداوند اس کا بھی بندوبست کر دے گا۔''

''کیا ہم کچھ کہہ سکتے ہیں؟'' بیری نے پوچھا۔

''بالکل جو تمہارا دل چاہے کہو لیکن جو آسمانوں پر بیٹھا ہے اسی سے کہنا۔''

راہبانہ زندگی کی ایک مشکل یہ بھی تھی۔ ہم اپنے طور پر صلاح مشورہ تو کر لیتے لیکن فیصلے کا اختیار صرف اسے تھا جسے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پادری خدا کا نام لے کر جو چاہے، فیصلہ کر سکتا تھا۔

ہم اپنی نشستوں سے صدمے اور افسوس کی کیفیت میں اٹھے اگر خدا کی یہی مرضی تھی تو ہمیں سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔

میں اپنے خوب صورت مرغزار میں واپس آ گیا اور انکارِ ذات کے بارے میں سوچنے لگا لیکن میں نے محسوس کیا

کہ یہ کافی مشکل مرحلہ ہے۔ میں نے مایوسی کے عالم میں ایک جھاڑ بیری کو کاٹنا شروع کر دیا جو اسٹرابیری کے پودوں کا راستہ روک رہی تھی۔ ایک گھنٹے تک سخت محنت کرنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ میں نے حال ہی میں اگلے سال کے لیے سبزیوں کے بیجوں کا آرڈر دیا تھا۔ اگر فادر ایمبر وز کی تجویز حقیقت میں بدل گئی تو ہمیں ان سبزیوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لہٰذا میں الفریڈ سے ملنے چلا گیا جو خانقاہ کے لیے سامان کی خریداری کیا کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک بہت بڑا اسٹور روم تھا جس میں سامان رکھنے کے لیے چھت تک الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہاں میرے سامان کے لیے ایک الگ حصہ مخصوص تھا۔ میرے ذہن میں جو بات تھی وہ میں نے اسے بتا دی۔

''تم نے بالکل ٹھیک سوچا ہے۔'' اس نے کمپیوٹر اسکرین پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ ہمیں یہ آرڈر منسوخ کرنے میں دیر تو نہیں ہوگئی۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ فادر ایمبر وز نے آج صبح کیا کہا تھا؟''

''بالکل نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تمہیں کوئی پریشانی ہے؟''

''مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ ہمارے مرحومین کی قبروں پر لڑکیاں ہاکی کھیلیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب وہاں صرف ان کی باقیات رہ گئی ہیں۔ ان کی روحیں تو پہلے ہی جنت میں جا چکی ہوں گی۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ کاش میں نے یہ نہ کہا ہوتا۔

''جو لکھ دیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ سب سے سینئر راہب ہونے کی وجہ سے وہ فادر ایمبر وز کی حمایت کرنے پر مجبور ہے۔

میں نے اپنے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ ونسنٹ تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''یہ کوئی یونین کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ کیا ہم ہڑتال کرنے والے ہیں یا تم لوگ کچھ اور سوچ رہے ہو؟''

''برادر جیفری میرے پاس اگلے سال کے لیے بیجوں کی خریداری کا آرڈر منسوخ کروانے آیا تھا۔'' الفریڈ نے کہا۔ ''اب ہمیں مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے۔''

''ایسا مستقبل جس میں کوئی مرغزار نہ ہو۔ اس طرح برادر جیفری اس شیڈ سے بھی محروم ہو جائے گا جہاں وہ دوپہر کو سوتا ہے۔''

''ہمیں نہیں معلوم کہ کل کہاں ہوں گے۔'' میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے امید ہے کہ ہم جہاں بھی ہوں گے، وہاں ایک باغ ضرور ہوگا۔''

''میرے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' ونسنٹ نے کہا۔ ''مجھے صرف ایک چھوٹا کمرا، ایک میز اور ایک کرسی چاہیے اور اس کے علاوہ میرا مصوری کا سامان۔ کیا ہمارے اسٹاک میں زرد رنگ موجود ہے؟''

''ہاں کافی مقدار میں ہے۔'' الفریڈ نے جواب دیا۔

''میں تھوڑا سا اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور جیفری مجھے یقین ہے کہ تمہیں بھی نئی جگہ پر باغ لگانے کے لیے میدان مل جائے گا۔ اگر ہمیں لندن سے باہر جانا پڑا تو تمہیں پودے اور سبزیاں اگانے کے لیے کئی ایکڑ زمین مل جائے گی۔''

کوئی نہیں جانتا کہ آنے والے وقت میں کیا ہونے والا ہے کہ اچانک ہی ایک ایسا حادثہ رونما ہوا کہ ہم خانقاہ سے جانے کی پریشانی بھول گئے۔ بڑے پادری کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ اس نے معدے میں درد کی شکایت کی۔ اس کے ساتھ ہی اسے دست اور الٹیاں بھی شروع ہوگئیں۔ ہم میں سے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ برادر بیری کے پکائے ہوئے کھانے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے لیکن برادر لیوک کی تشخیص کے مطابق پادری کے معدے اور آنتوں میں انفیکشن کی وجہ سے ورم آگیا تھا۔ اس مرحلے پر صرف یہی ہو سکتا تھا کہ مریض کو بہت سا پانی پلایا جائے۔ اس طرح یہ انفیکشن ختم ہو جائے گا لیکن بے چارہ پادری جانبر نہ ہو سکا۔ اس کی حالت اس تیزی سے بگڑی کہ ہم اسے اسپتال بھی داخل نہ کرا سکے۔

ہم ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا واقعی یہ وائرس تھا یا زہر خورانی کی وجہ سے ایسا ہوا۔ زہر خورانی کا امکان اس لیے نہیں تھا کہ ہم سب نے بھی وہی کھانا کھایا اور کسی کی بھی طبیعت خراب نہیں ہوئی۔ پوسٹ مارٹم سے اس کی موت کی وجہ معلوم ہو سکتی تھی لیکن لیوک نے کہا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کی تشخیص حتمی ہے۔ اس نے مستند ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے پادری کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کیا اور مقامی کورونر کو اس کی اطلاع دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ میں نے قبر کھودی اور فادر کو پورے

عزت واحترام کے ساتھ دفن کردیا گیا۔

سوگ ختم ہونے کے بعد ہم دوبارہ اپنی عبادات اور کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ونسنٹ دوبارہ اپنے کام پر واپس آگیا۔ بیری کھانا پکانے کے معاملے میں پہلے سے زیادہ محتاط ہوگیا۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ کھانے میں تازہ اشیا استعمال کررہا ہے اور باقاعدگی سے اپنے ہاتھ دھوتا ہے۔ ان دنوں لیوک کے پاس کوئی مریض نہیں تھا۔ اس لیے وہ دواخانے کی جھاڑ پونچھ میں لگ گیا۔ میں نے ایک لکڑی کی صلیب بنائی۔ اس پر پادری کا نام کندہ کیا اور اس کی قبر پر لگادی۔ اس کے بعد میں اپنے پودوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگیا۔ ہمیشہ کی طرح رنگ بدلتا اور خوب صورت مرغزار میرے لیے باعث تسکین تھا۔

نئے پادری کے انتخاب پر کوئی بحث نہیں ہوئی کیونکہ الفریڈ سینیارٹی کے لحاظ سے موزوں ترین امیدوار تھا اور اپنی سنجیدگی و متانت کے اعتبار سے وہ ہر ایک کے لیے قابلِ احترام تھا۔ بہرحال ہم نے علامتی الیکشن کا انعقاد کیا جس میں وہ واحد امیدوار تھا۔ اس کی جگہ برادر مائیکل نے سامان کی خریداری اور کمپیوٹر آپریٹر کی ذمے داری سنبھال لی جو بے حد قابل اور منظم راہب تھا۔

ایک روز سہ پہر کے وقت میں اپنے شیڈ میں لیٹا آرام کررہا تھا کہ کسی نے کھڑکی پر دستک دی۔ وہ مائیکل تھا۔ میں نے اسے اندر بلالیا تو وہ بولا۔ ''میں نے تمہاری نیند تو خراب نہیں کی؟''

''نہیں، میں جاگ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ میری عادت ہے کہ آنکھیں بند کرکے غوروفکر کرتا ہوں۔''

''میں چند دنوں سے کچھ سوچ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کس بارے میں؟''

''فادر ایمبروز کی اچانک موت کے بارے میں۔''

''اس کی کافی عمر ہوچکی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''بالآخر ہم سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے۔''

''لیکن اس طرح اچانک نہیں۔ وہ تو چند گھنٹوں میں ہی چلا گیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں اسے زہر تو نہیں دیا گیا؟''

میں نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''زہرخورانی کا خیال آیا تھا لیکن ہم سب نے بھی وہی کھانا کھایا تھا اور کوئی بھی بیمار نہیں ہوا۔ اس لیے زیادہ امکان یہی ہے کہ اس کی موت وائرس کی وجہ سے ہوئی۔''

''میرا اشارہ زہرخورانی کی جانب نہیں تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ اسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔''

''اوہ میرے خدا۔ تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟''

''معاف کرنا۔'' مائیکل نے کہا۔ ''لیکن میرے پاس ایسی معلومات ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ کسی کے ساتھ شیئر کرنا ضروری ہے۔ جب میں نے اسٹور کا چارج لیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ وہاں موجود سامان کی فہرست تیار کی جائے اور میں نے ایک ایسا آئٹم دیکھا جو میرے لیے نیا تھا۔ اسے آرپی منٹ orpiment کہتے ہیں۔''

''وہ ایک قسم کا رنگ ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''برادر ونسنٹ کو اپنے کام کے سلسلے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ زرد رنگ کا شیڈ ہے جو قرونِ وسطیٰ کے مصور استعمال کرتے تھے۔''

''میں سمجھ گیا لیکن کیا تم نے اس کے پیکٹ دیکھے ہیں۔ ان میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ اس میں زہر شامل ہے۔ میں نے انٹرنیٹ پر چیک کیا۔ یہ ایک حصہ گندھک اور دو حصے سنکھیا کو پگھلا کر تیار کیا جاتا ہے۔''

میں یہ انکشاف سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے دھیمی آواز میں جواب دینے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری پُرسکون خانقاہ میں شور شرابا ہو۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''شاید برادر ونسنٹ کے علم میں یہ بات ہو۔''

''میں نے نیٹ پر اس زہر کی علامات بھی دیکھی ہیں۔'' مائیکل نے کہا۔ ''ان میں متلی، قے، پیٹ کا درد اور دست وغیرہ شامل ہیں۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ وائرس کی وجہ سے معدے اور آنتوں پر ورم آگیا ہے۔''

''مائیکل، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' میں نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم میں سے کسی کے پاس بھی فادر ایمبروز کو زہر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔''

''ممکن ہے کہ اس قتل کا کوئی محرک نہ ہو لیکن ذریعہ موجود تھا۔''

''ہمیں اس بات کو یہیں ختم کردینا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''یہ بے مزہ ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔''

''نہیں، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ سنکھیا کا کوئی ذائقہ نہیں ہوتا اور اگر تمہیں یاد ہو تو وہ جمعے کا دن تھا اور اس رات شوربہ

بنا تھا جب فادر ایمبر وز کی موت واقع ہوئی۔ ممکن ہے کسی نے اس میں وہ زرد رنگ کا پینٹ ملا دیا ہو۔"

"ہم سب نے وہ شوربہ لیا تھا لیکن کوئی بیمار نہیں ہوا۔"

"اگر کسی کا ارادہ فادر ایمبر وز کو زہر دینے کا تھا تو وہ اس کے پیالے میں تھوڑا سا زہر ملا سکتا تھا۔"

"لیکن کب؟"

"جیسا کہ تم جانتے ہو کہ بیری چاولوں کے ساتھ پیالوں میں شوربہ ڈالتا ہے پھر ہم میں سے کوئی ایک وہ ٹرے لے کر میز پر آتا ہے پھر ہم برکت کے لیے سر جھکاتے اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کسی نے فادر کے پیالے میں زہر ڈال دیا ہوگا۔"

صاف لگ رہا تھا کہ اس نے اس بارے میں تفصیل سے سوچا تھا اور اس پر یقین بھی کر لیا تھا۔

"کیا تم برادر بیری پر قتل کا الزام لگا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے جو ٹرے لے کر میز تک گیا یا جو فادر ایمبر وز کے برابر یا اس کے سامنے بیٹھا۔"

"تمہارا خیال ہے کہ وہ ہم میں سے کوئی ہے۔"

"ہاں بالکل۔" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "جب میں نے کہا کہ اس قتل کا کوئی محرک نہیں تھا تو میں نے تھوڑی سی رعایت دینے کی کوشش کی تھی۔ اگر کوئی کسی کے لیے برا سوچتا ہے تو یہ بھی ایک محرک ہے۔ فادر ایمبر وز کا ارادہ ہم سب کو دوسری جگہ لے جانے کا تھا اور کسی کو بھی یہ تبدیلی پسند نہیں آرہی تھی۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم اس کی بات سن کر حیران و پریشان ہو گئے تھے اور ایمبر وز سے چھٹکارا حاصل کر کے ہی ہم اس خانقاہ کو بچا سکتے تھے۔"

میں نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مائیکل! یہ سراسر بہتان ہے۔ کیا تمہیں وہ عہد یاد دلانے کی ضرورت ہے جو ہم نے یہاں آتے وقت کیا تھا۔ ہم میں سے کوئی بڑے پادری سے سوال کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسے نقصان پہنچانا تو دور کی بات ہے۔"

وہ قائل ہوتے ہوئے بولا۔ "میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔"

"پھر میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اس بات کو اپنے دماغ سے نکال دو اور کسی دوسرے شخص سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ میں بھی بھول جاؤں گا کہ تم نے مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات کہی تھی۔"

کئی مہینے گزر گئے۔ میں نے اگست کے آخر میں نئی فصل کے لیے بیجوں کی بوائی کی لیکن مائیکل کی کہی ہوئی بات میرے لیے خطرے کی گھنٹی بن گئی۔ میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ اس نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ گو کہ میں نے اس کی گفتگو کو بھول جانے کا وعدہ کیا تھا اس کے باوجود اپنے ساتھیوں کے کردار پر شک کرنے سے اپنے آپ کو نہ روک سکا جب ایک بار شک کا بیج جڑ پکڑ لے تو اسے پھلتے پھولتے دیر نہیں لگتی۔

میرے ذہن میں پہلا نام الفریڈ کا آیا۔ ایمبر وز کی موت کے بعد اسے خانقاہ میں سب سے اونچا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا اور اسٹور کا انچارج ہونے کی وجہ سے اس کی زرد رنگ کے پینٹ تک بہ آسانی رسائی تھی۔ اسی طرح ونسنٹ بھی یہ زہریلا پینٹ استعمال کر سکتا تھا گو کہ اس نے خانقاہ کے منتقل ہونے کی تجویز پر لاتعلقی ظاہر کی تھی لیکن جب پہلی بار یہ بات سامنے آئی تو اس کا ردعمل خاصا سخت تھا۔ لیوک ڈاکٹر تھا اور شاید وہ ہم سب سے زیادہ اس زہر کے خطرات کے بارے میں جانتا تھا۔ برادر بیری کھانا پکاتا تھا اور اس کے لیے کھانے میں زہر ملانا بہت آسان تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے اوپر ہونے والی تنقید سے خاصا پریشان رہتا تھا جبکہ مائیکل کو ایمبر وز کی موت سے یہ فائدہ ہوا کہ اسے الفریڈ کی جگہ مل گئی اور وہ خانقاہ کے لیے سامان کی خریداری کرنے لگا پھر وہ دوسروں کے بارے میں شکوک کیوں پھیلا رہا تھا۔

کام کے دوران میں اس طرح کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہے لیکن میں انہیں نظرانداز کر دیتا۔ اکتوبر کے آخر میں ہمارے نئے پادری نے اعلان کیا کہ وہ ایک چھوٹے سے کام کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے خانقاہ سے باہر جا رہا ہے۔ ہم نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کی غیر موجودگی میں ہم برادر لیوک کی اقتدا میں عبادت کرتے رہے۔ لیکن جب ایک ہفتے بعد اس کی واپسی ہوئی اور اس نے گرجا میں خطاب کیا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔

اس نے گلا صاف کیا اور محتاط الفاظ میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔

"جو کچھ میں کہنے والا ہوں۔ شاید تم لوگ اسے پسند نہ کرو لیکن پہلے میری پوری بات سن لو اور جب یہ تمہاری سمجھ میں آجائے گی تو تم اس پر بہتر طریقے سے غور کر سکو گے۔ چھ ماہ قبل ہمارے مرحوم فادر ایمبر وز نے اس عمارت کو خالی کرنے کا سوال اٹھایا تھا تاکہ اسے اسکول کو دے دیا جائے۔ اس کے جانشین کی حیثیت سے یہ میرا فرض بنتا ہے

کہ اس کے شاندار آئیڈیا پر غور کروں۔ جیسا کہ اس نے واضح کر دیا تھا کہ یہ خیال خدائے بزرگ و برتر نے اس کے دماغ میں ڈالا تھا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ میں ایک عمارت دیکھنے گیا تھا جسے خدا کی مدد سے ہم خانقاہ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہ عمارت ہمارے اراکین کے لیے بہت مناسب ہے۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد لیوک نے پوچھا۔''وہ عمارت کیسی ہے۔ کیا وہ کوئی مکان ہے؟''

''نہیں، وہ ایک لائٹ ہاؤس ہے۔''

''خدا ہمیں محفوظ رکھے۔'' بیری نے سرگوشی کی۔

''آج کل وارننگ لیمپ آٹو میٹک ہو گئے ہیں اور ان میں سولر بیٹری استعمال کی جاتی ہے۔ اس لیے کسی نگہبان کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس لائٹ ہاؤس میں رہنے کی جگہ کافی ہے۔'' الفریڈ نے کہا۔''زیادہ تر کمرے تمہاری خواب گاہوں سے چھوٹے ہیں لیکن ان میں زیادہ پرائیویسی ہے۔''

''میں جو سن رہا ہوں، اس پر یقین نہیں آرہا۔'' ونسنٹ نے پتلی آواز میں کہا۔

''وہاں کچن کی سہولت بھی ہے۔'' الفریڈ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز بالکل کسی اسٹیٹ ایجنٹ جیسا تھا۔''اور ٹیلی گراف روم کو ہم گرجا میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس عمارت سے ملحق نگہبان کا مکان ہے جہاں ہماری اجتماعی سرگرمیاں ہو سکتی ہیں۔''

''یہ لائٹ ہاؤس کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسکاٹ لینڈ کے شمال مغربی ساحل سے پرے۔''

''ساحل سے پرے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''وہ ایک لائٹ ہاؤس ہے، جیفری۔''

''کچھ لائٹ ہاؤس خشکی پر بھی ہوتے ہیں۔''

''وہ ساحل سے ایک میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ ہے اور چٹانوں سے گھرا ہوا ہے۔''

''یعنی وہ لائٹ ہاؤس بھی کسی مخصوص چٹان پر بنایا گیا ہے۔'' میں نے کہا۔''کیا وہاں کوئی باغ ہے؟''

''بس اسی چیز کی کمی ہے۔'' الفریڈ نے اعتراف کیا۔

''تم نے بتایا کہ وہاں کچن کی سہولتیں موجود ہیں۔'' بیری بولا۔''کیا میں وہاں ڈبل اوون اور دو انگیٹھیاں استعمال کر سکتا ہوں؟''

''مجھے یقین ہے کہ وہاں ایک مٹی کے تیل کا چولھا ہے۔''

''میں اس پر یقین نہیں رکھتا۔ اس چولھے پر اتنے سارے لوگوں کے لیے کھانا بنانا بہت مشکل ہے۔''

''میں اپنا مصوری کا کام کہاں کروں گا؟'' ونسنٹ نے پوچھا۔

''اوپر کی منزل پر۔ لیمپ روم میں۔'' بیری نے ناگوار لہجے میں کہا۔

فادر الفریڈ کسی بھی سوال کے لیے سنجیدہ نہیں تھا۔ اس نے کہا۔''ہمیں اپنی سوچ میں لچک پیدا کرنی چاہیے۔ اس طرح ہم ایک نئے ماحول میں ایڈ جسٹ کر سکیں گے۔ پہلے اس تصور کو حقیقت بننے دو پھر ہم انفرادی ضرورتوں پر بات کر لیں گے۔''

جمعے کو حسبِ معمول بیری نے شوربے کا سالن بنایا۔ ہمیشہ کی طرح اس میں مرچیں تیز تھیں۔ اس لیے جب ہم نے فادر الفریڈ کو پانی کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا تو کسی کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔ ہم بھی ہمیشہ جمعے کی رات بہت زیادہ پانی پیتے تھے۔ جب اس نے اپنے منہ اور حلق میں جلن کی شکایت کی جو معدے کی جانب بڑھ رہی تھی تو ہم مسکرائے بغیر نہ رہ سکے لیکن ہماری پریشانی اس وقت بڑھ گئی جب اسے زور کی ابکائی آئی اور وہ باہر کی طرف بھاگا۔

چار گھنٹے بعد ہمارا بڑا پادری اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

برادر لیوک جو آخری وقت تک اس کے ساتھ تھا، اس کی حالت کو معمول پر لانے میں ناکام رہا۔ مریض کو مسلسل قے ہوتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی دست اور کپکپی بھی طاری ہو گئی۔ اس نے جلد میں خارش اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے کی بھی شکایت کی۔ مرنے سے کچھ دیر قبل اس کا پورا جسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اس پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ اس کے چہرے کے پٹھے اکڑ گئے تھے اور نبض ڈوب رہی تھی لیکن آخری وقت تک اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔

اگلے روز صبح کی عبادت کے بعد برادر لیوک نے ہمیں فادر الفریڈ کے آخری لمحات کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو ایک بار پھر ہم اس حادثے کے بارے میں گفتگو کرنے پر مجبور ہو گئے۔

بیری کا اصرار تھا کہ فادر کی موت شوربے کے سالن کی وجہ سے نہیں ہوئی۔''یہ یقیناً وہی وائرس ہے جس نے فادر ایمبروز کی جان لی تھی۔'' اس نے کہا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' مائیکل نے اختلاف کیا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بالکل وہی علامات تھیں۔''

لیوک بولا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ میرا اعتماد بھی ڈانواں ڈول ہوگیا ہے۔ میں نے کبھی اس طرح کا وائرس نہیں دیکھا بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے محکمۂ صحت کو اطلاع کردینی چاہیے۔ کہیں یہ کوئی نئی وبا نہ ہو۔''

''اس سے پہلے ہمیں دوسرے امکانات پر غور کرلینا چاہیے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''غالباً اسے زہر دیا گیا ہے۔''

میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''مائیکل! یہ بات ہمارے درمیان پہلے بھی ہو چکی ہے۔ اس طرح کے اندازوں سے ہماری برادری کو نقصان پہنچے گا۔''

''وہ تو پہلے ہی پہنچ چکا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا چھ مہینے میں دو اموات ایک بڑا نقصان نہیں ہے؟ میں تمہارے کہنے پر خاموش ہوگیا تھا لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہمارے اسٹور میں ایک زہریلا مادہ موجود ہے۔''

''وہ کیا؟'' بیری نے کہا۔

''آرپی منٹ۔ یہ وہ رنگ ہے جو ونسنٹ استعمال کرتا ہے۔ اس میں دو تہائی مقدار سنکھیا کی ہے۔''

سب لوگوں نے ونسنٹ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ مائیکل نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ ''اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ونسنٹ نے کھانے میں زہر ملایا ہوگا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کے اسٹوڈیو یا میری الماری سے یہ رنگ نکال سکتا ہے کیونکہ میں اسٹور میں تالا نہیں لگاتا۔''

''اور اسے ایمبروز اور الفریڈ کو قتل کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔'' بیری نے کہا۔

''تم اپنے ذہن پر زور دے کر سوچو کہ کس طرح کسی اور طریقے سے اس زہر کو تمہارے تیار کردہ سالن میں ملایا جا سکتا ہے؟'' مائیکل نے کہا۔

بیری اس حملے سے سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا کہ لیوک بولا۔ ''آخر فادر الفریڈ کو قتل کرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟''

''سیدھی سی بات ہے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''وہ بھی ایمبروز کی طرح ہمیں یہاں سے لے جانا چاہ رہا تھا جبکہ ہم میں سے کوئی بھی اس جزیرے پر جانے کے لیے تیار نہیں۔''

''یعنی قتل کے لیے محرک، ذریعہ اور موقع تینوں شرائط پوری ہورہی تھیں۔'' لیوک نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ہم اس معاملے کو اپنے طور پر حل کرلیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو، یہ دہرا قتل ہے؟'' مائیکل نے بے یقینی سے کہا۔

''ہم نہیں چاہتے کہ پولیس اس کی تحقیقات کرے اور اخبارات اسے اچھالیں۔''

میں نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ یقیناً فادر ایمبروز کی قبر بھی کھودنا چاہیں گے۔ اس کے آرام میں خلل نہیں پڑنا چاہیے۔''

بیری نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا۔''

مائیکل تنہا رہ گیا تھا۔ وہ خوف زدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہم ایک قاتل کی پردہ پوشی کررہے ہیں جبکہ ہم خدا کے بندے ہیں۔''

''اور وہ ہمارا منصف ہے۔'' لیوک نے کہا۔ ''اگر ہم غلطی کریں گے تو وہ بتادے گا کیوں نہ ہم اس کی بارگاہ میں جھک جائیں؟''

یہی وہ لمحہ تھا جب ہمیں احساس ہوا کہ سینئر راہب ہونے کی وجہ سے لیوک ہی بڑے پادری کے منصب کے لیے بہتر انتخاب ہوسکتا ہے۔ یہاں تک کہ مائیکل نے بھی اپنا ہونٹ چبایا اور سر جھکا دیا۔

میں نے ایک اور قبر کھودی اور اس میں فادر الفریڈ کو دفن کردیا گیا۔ ہم میں سے کسی نے بھی یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ لیوک نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں کیا لکھا اب وہ ہمارا روحانی رہنما تھا اور اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہ ہوتا۔ میں نے حسبِ معمول لکڑی کی صلیب بنائی اور اسے قبر کے سرہانے نصب کردیا۔

اس کے بعد لائٹ ہاؤس کا تذکرہ دوبارہ نہیں ہوا۔ اس معاملے میں فادر لیوک نے بہت سمجھداری کا ثبوت دیا۔ وہ اپنے پیشروؤں کی طرح حاکمانہ مزاج نہیں رکھتا تھا بلکہ ہم سے بھی مشورہ کیا کرتا اور ہم نے اسے بتادیا تھا کہ اسی خانقاہ میں رہنا چاہتے ہیں اور اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔

زندگی اپنے معمول پر آگئی تھی۔ میں مرغزار پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ قبروں کی صفائی کا بھی خیال رکھ رہا تھا۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے تھے۔ وہ جنوری کی ایک سہ پہر تھی۔ میں معمول کے مطابق شیڈ میں آرام کررہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہاں مائیکل کھڑا تھا۔ اس کی آمد میرے لیے غیر

متوقع تھی۔

''کوئی خاص بات؟'' میں نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

''کہہ سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''بڑا پادری تم سے اپنے دفتر میں ملنا چاہ رہا ہے۔''

''ابھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، وہ تمہارا انتظار کررہا ہے۔''

اس کا دفتر عمارت کی بالائی منزل پر واقع تھا۔ مائیکل مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ راستے میں اس نے کوئی بات نہیں کی اور ہم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ فادر لیوک کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اپنی میز پر دونوں ہاتھ باندھے ہمارا ہی انتظار کررہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی بولا۔ ''تم دونوں اندر آجاؤ۔''

اس کمرے میں بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی نہیں تھی۔ لہٰذا ہم اس کے سامنے اسکول کے بچوں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہوگئے۔

''میں فادر ایمبروز اور فادر الفریڈ کی موت کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا ہوں۔'' فادر لیوک نے کہا۔ ''مائیکل نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے ایمبروز کی موت کے بعد اس کو زہر دیے جانے کے امکان پر تم سے بات کی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم سب اس پر متفق ہیں۔''

مائیکل بولا۔ ''لیکن اس وقت تو تم نے کہا تھا کہ یہ شبہات اپنے تک ہی رکھوں۔''

''ہاں یہ سچ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ پہلا موقع تھا جب کسی نے ایسی بات کی اور یقیناً اس سے ہماری برادری میں انتشار پیدا ہوتا۔''

فادر لیوک نے مائیکل سے کہا۔ ''جو کچھ تم نے مجھ سے کہا ہے وہ جیفری کو بھی بتادو۔''

لگتا تھا کہ مائیکل اس صورت حال سے پوری طرح لطف اندوز ہورہا ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ ''جب میں نے خریداری کی ذمے داری سنبھالی تو میری کمپیوٹر تک بھی رسائی ہوگئی اور مجھے آر پی منٹ کے بارے میں اپنے نظریے کی تصدیق کرنے کا موقع مل گیا۔ واقعی یہ رنگ آرسینک سلفائڈ سے بنایا جاتا ہے اور اسے قرون وسطیٰ کے راہب ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودوں کو روشن رکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔''

میں نے بے اختیار کہا۔ ''تم کافی چالاک ہو۔''

فادر لیوک نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''جیفری اس کی بات سنو۔''

مائیکل نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''بہرحال جب میں نے انٹرنیٹ پر آرسینک کے اثرات کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ فادر لیوک نے جن علامات کی نشاندہی کی تھی، وہ اس سے مختلف تھیں۔ ان میں منہ کی جلن، قے اور ڈائریا وغیرہ تو ان اثرات سے مطابقت رکھتی تھیں لیکن جلد کی خارج، نظر کا دھندلا ہونا اور فالج وغیرہ کا آرسینک سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔''

''یہ علامات ایمبروز اور الفریڈ دونوں میں بڑی واضح تھیں۔'' فادر لیوک نے کہا۔

مائیکل بولا۔ ''یہ جاننے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ ان دونوں کو کوئی ایسا زہر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے فالج ہوسکتا ہے پھر میں نے ایک اور ریسرچ کی جو معدنی زہر سے شروع ہوکر زہریلے پودوں تک چلی گئی۔''

میں خاموشی سے یہ سب سنتا رہا کیونکہ میں سمجھ چکا تھا کہ گفتگو کا رخ کس طرف جارہا ہے۔

''بالآخر میں ایک لمبے خوب صورت نارنجی رنگ کے پودے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جو جڑ سے لے کر پتوں تک زہریلا ہوتا ہے۔ اسے تھوریا ناگ پھنی بھی کہا جاتا ہے۔ اس زہر سے منہ میں جلن اور سنسناہٹ ہوتی ہے پھر یہ سن ہوجاتا ہے۔ زہر کا اثر جب آنتوں تک پہنچتا ہے تو شدید قے کے دورے اٹھتے ہیں۔ جسم ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور فالج کی وجہ سے متاثرہ شخص بولنے کے قابل نہیں رہتا۔ بالآخر دم گھٹنے سے اس کی موت واقع ہوجاتی ہے۔''

''میں نے بھی دونوں مرتبہ یہی علامات دیکھی تھیں۔'' لیوک بولا۔

''اس سے تو یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ زہریلا پودا خانقاہ میں موجود ہے۔ انٹرنیٹ پر اس پودے کی تصویریں اور اشکال موجود ہیں لہٰذا مجھے اس کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی، اس کے لیے سایہ دار اور گیلی جگہ مناسب ہوتی ہے۔ میں تمہاری نیند کے دوران کئی روز تک سہ پہر میں مرغزار کے اس کنارے پر جاتا رہا جہاں پانی کی نکاسی ہوتی ہے۔ تم نے ایسی جگہ یہ پودے لگائے جو کسی کو نظر نہ آسکیں لیکن میں نے انہیں تلاش کرہی لیا۔ کیا تم انہیں استعمال کرنے اور شوربے میں ملانے کا اعتراف کرتے ہو؟''

فادر لیوک نے کہا۔ ''خدا سب کچھ سن رہا ہے جیفری۔''

میں نے اعتراف کرنے میں بالکل بھی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ مجھے جھوٹ بولنا نہیں آتا لہٰذا میرے پاس سچ بولنے کے سوا کوئی رستہ نہیں تھا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے کچھ جڑوں کو پیس کر انہیں استعمال کیا۔ میں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ کھانے کے وقت بڑے پادری کے برابر میں بیٹھوں اور جب اس نے دعا پڑھی تو میں نے اس زہر کی تھوڑی سی مقدار اس کے پیالے میں چھڑک دی کیونکہ میں اپنے خوب صورت مرغزار کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔''

''لہٰذا تم نے دو اچھے آدمیوں کی جان لے لی؟'' مائیکل نے مجھے شرمندہ کرنے کے لیے کہا۔

فادر لیوک نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اب مجھے پولیس کو اطلاع دینا ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر میں کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اسے کھولا اور اس پر چڑھنے لگا۔

''نہیں جیفری۔'' فادر لیوک چلاتے ہوئے بولا۔ ''خودکشی بہت بڑا گناہ ہے۔''

لیکن وہ مجھے نہیں روک سکا۔ میں پہلے ہی دو آدمیوں کو قتل کر کے گناہ گار ہو چکا تھا۔ عمارت کی چھت زمین سے پچاس فٹ کی اونچائی پر تھی۔ اگر میں وہاں سے چھلانگ لگاتا تو میرے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فادر لیوک کھڑکی میں سے سر نکال کر مجھے روکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھ پر اس کے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

میں نے چھت پر سے اپنے مرغزار پر ایک نگاہ ڈالی اور اسے دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ گزشتہ شب کی کہر میں بھیگے ہوئے پودے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ یہ خوب صورتی مجھے کبھی زمین سے نظر نہیں آئی۔

میں چھت کے کنارے پر پہنچا اور پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ میں اپنے اندر ہمت پیدا کر رہا تھا۔ اب مجھے کھڑے ہو کر اپنے بازو سر سے اوپر کر کے چھلانگ لگانی تھی۔ اچانک ہی ایک آواز آئی۔ ''جیفری، ایسا مت کرو۔''

ایک لمحے کے لیے تو میں یہ سمجھا کہ شاید خدا مجھ سے مخاطب ہے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ یہ آواز اوپر سے نہیں بلکہ نیچے زمین سے آئی تھی۔ وہ برادر بیری تھا جو سبزیوں کی کیاریوں پر کھڑا دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر بول رہا تھا۔

میں نے جواب میں کہا۔ ''مجھے مت روکو۔ میں گنہگار ہوں۔ میں نے دو قتل کیے ہیں۔''

''یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' اس نے چلا کر کہا۔ ''تمہاری خودکشی سے معاملہ اور خراب ہو جائے گا۔''

میں نے بیری سے کہا۔ ''میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ پولیس آنے والی ہے۔ میں اپنے مرغزار سے جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔''

وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں زیادہ سے زیادہ عمر قید ہو گی۔ یہ اتنی بری نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ میری بات کا یقین کرو۔ تمہیں ایک کوٹھری میں کسی دوسرے شخص کے ساتھ رہنا ہوگا۔ وہاں کی خوراک بھی اچھی ہو گی۔ یہ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں اور اگر تمہارا رویہ اچھا رہا تو تمہیں سی کیمبگری کی جیل میں بھیج دیا جائے گا جہاں تم اپنا باغبانی کا شوق پورا کر سکتے ہو۔''

''کیا تم واقعی ایسا سمجھتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، میں جانتا ہوں۔''

میں نے جیل کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن بیری کو اس کا ذاتی تجربہ تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں وہاں رہ کر معاشرے کا قرض اتار سکتا تھا اور میرے کام سے دوسرے مستفید ہوتے۔ میں نے سر جھکا دیا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

جیل کی زندگی بڑے مزے کی ہے۔ یہاں بھی مجھے خانقاہ کی طرح روحانی زندگی گزارنے کا موقع مل رہا ہے۔ بیری میرا محسن تھا جس نے مجھے حرام کی موت مرنے سے بچا لیا۔ میں ہمیشہ اسے اپنی دعاؤں میں یاد رکھتا ہوں۔ داروغہ نے مجھے سبزیوں کے کھیت کا انچارج بنا دیا ہے۔ میں نے اس سے جنگلی پودے لگانے کی اجازت لے لی ہے لیکن ان میں کوئی زہریلا پودا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میں نے وہاں پر اوزار رکھنے کے لیے شیڈ بھی بنا لیا ہے جہاں میں دوپہر میں ایک گھنٹے کے لیے جاتا ہوں اور داروغہ بھی مجھے اس دوران میں ڈسٹرب نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں مراقبہ کر رہا ہوں۔ مجھے جیل اور خانقاہ کی زندگی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا البتہ یہاں کا کھانا بہتر ہے۔ کبھی کبھی یہ احساس مجھے شدت سے ستانے لگتا ہے کہ میں قاتل ہوں۔ میں نے دو بے گناہ لوگوں کا خون کیا ہے۔ کاش وہ مجھے باغ سے محروم کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ کوئی انہیں بتا دیتا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بازی

عکسِ فاطمہ

وقت کی گردشیں عجب رنگ ڈھنگ دکھاتی ہیں... اس پر انسان کبھی پریشان... کبھی حیران اور کبھی اپنی بے بسی پر قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے... وہ بھی گردشِ حالات کا ستایا ہوا تھا... ہر لمحہ اس کی آزمائش ہو رہی تھی... یہاں تک کہ وہ زندگی سے بیزار ہو کے اس کے خاتمے کے لیے دعاگو ہو گیا...

سوچنے پر مجبور کرتی ایک پرلطف ہنستی مسکراتی تحریر......



یہ ایک سیدھی سادی کہانی ہے۔ اس کہانی میں مزاح کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر اتفاق سے نکل آئے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ہوا یہ کہ بے روزگاری نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔

کہیں ڈھنگ کی جاب بھی نہیں مل رہی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ میں اپنے محلے کی ایک لڑکی سے عشق بھی کر رہا تھا۔ وہ ایسی لڑکی تھی...... جس کے نزدیک محبت کا مطلب یہ تھا کہ کھاتے پیتے رہو۔

وہ جب بھی ملتی، یہی کہتی۔ ''ارے سنا تم نے۔ طارق روڈ پر جو نیا ہوٹل کھلا ہے، اس کی کڑاہی بہت زبردست ہوتی ہے۔ تم نے تو سنا ہی ہوگا؟''

''ہاں سنا تو ہے۔''

''تو پھر چلیں۔ میں تیار ہوکر آتی ہوں۔''

''نہیں آج نہیں، کل چلیں گے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں جب بھی کوئی فرمائش کرتی ہوں۔ تم دوسرے دن پر کیوں ٹال دیتے ہو؟''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ دوسرا دن اس لیے ہوتا ہے کہ اس دن میں لوگوں سے ادھار لے کر اس کی فرمائش پوری کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد میں اس کے لیے کسی سے چار پانچ سو پکڑتا اور دوسری شام اسے کڑاہی کھلانے لے جاتا۔ ایک پرابلم یہ بھی تھی کہ اس کی خوراک بھی بہت اچھی تھی۔ اس کا اسٹارٹ ہی چار روٹیوں سے ہوتا تھا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس نے میرا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ کیونکہ میرے پاس اس دن اسے کھانا کھلانے کے پیسے نہیں تھے۔ اس دن مجھے اس پر بہت غصہ آیا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''تم ایک بے وفا لڑکی ہو۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ تم نے تو زندگی بھر ساتھ نبھانے کی بات کی تھی۔ اب اس بات پر ساتھ چھوڑ رہی ہو کہ میں تمہیں کھانا نہیں کھلا سکا ہوں۔''

''تم ذرا خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو۔'' اس نے کہا۔ ''فرض کرو کہ تم ایک لڑکی ہوتے تو کیا اس کا ساتھ دے سکتے جو ایک وقت کا کھانا نہیں کھلا سکے۔ وہ زندگی بھر کیا کھلاتا؟''

میری سمجھ میں اس کی بات آگئی۔ اور ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیا۔

اس کے بعد کی کہانی سیدھی سادی تو ہے لیکن بہت عبرت انگیز بھی ہے۔

میں نے اپنے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا۔ پہلے تو وہ دیر تک ہنستا رہا پھر سنجیدہ ہوکر بولا۔ ''میری جان۔ اس سے کیا بات سمجھ میں آئی؟''

''یہی کہ وہ میرا ساتھ چھوڑ گئی۔'' میں نے کہا۔

''لیکن کیوں؟''

''ظاہر ہے کہ میرے پاس پیسے نہیں ہوتے۔'' میں نے کہا۔

''یہی بات ہے۔ اب تم پیسے پیدا کرنے کی کوشش کرو۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''یاد رکھو۔ اگر تمہارے پاس پیسے آگئے تو اس جیسی دوسری لڑکیاں تمہارے قریب آنے میں دیر نہیں کریں گی۔''

''یار۔ کیا کروں میں۔ تم خود ہی دیکھ لو۔ میری تعلیم بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ مجھ میں کام کرنے کی صلاحیت بھی ہے لیکن صرف سفارش نہیں ہے۔ یا رشوت کے پیسے نہیں ہیں۔''

''ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا۔ ''میرے ایک جاننے والے کی فرم ہے۔ ان کے یہاں صرف میرٹ کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کون کس کا رشتے دار ہے۔ کس کے پاس کس کی پرچی ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ ان دنوں ان کے یہاں ایک جاب خالی ہے۔ تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔''

''ارے اس میں کیا پوچھنا۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''بھیج دو مجھے۔''

''کل ہی چلے جاؤ۔'' اس نے مجھے ایڈریس سمجھا دیا۔

میں دوسری صبح اس فرم کے دفتر پہنچ گیا۔

مجھے باس کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ کمرے میں مجھ سے پہلے دو اور بھی افراد تھے۔ وہ دونوں سوٹ پہن کر آئے تھے۔ جبکہ میں عام سے لباس میں تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' باس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اپنی فائل باس کے حوالے کردی تھی۔ باس نے فائل دیکھ لینے کے بعد ایک ہنکاری لی۔ ''سلیم نام ہے تمہارا؟ اس نے پوچھا۔

''یس سر، سلیم ہی نام ہے۔'' میں نے بتایا۔

''ہوں۔ دیکھیں مسٹر سلیم۔ یہ جو ہمارا دفتر ہے۔ اس میں ہم صرف ذہانت کو دیکھتے ہیں۔ سارے فیصلے میرٹ پر ہوتے ہیں۔ یہ دیکھا جاتا ہے بندے کی نالج کیسی ہے۔ ہم کسی سفارش یا رشتے کو لفٹ نہیں دیتے۔ سمجھ گئے؟''

''یس سر، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر پاکستان میں آپ جیسے کچھ اور لوگ ہوں تو پاکستان کا نقشہ ہی بدل جائے۔''

وہ مسکرا دیا۔ ''آپ جس پوسٹ کے لیے آئے ہیں اس کے لیے یہ دونوں بھی آئے ہیں۔'' اس نے سامنے بیٹھے دونوں بندوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایک میرا پھوپی زاد بھائی ہے۔ جو میرا دوست بھی ہے۔ اور دوسرا میری مسز کا بھائی ہے۔ یعنی میرا سالا۔ سمجھ گئے۔''

''جی سمجھ گیا۔ یہ دونوں تو آپ کے بہت قریبی ہوئے۔''

''ہاں اس کے باوجود میرٹ کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کروں گا۔ آپ تینوں سے ایک ہی معیار کے سوالات کیے جائیں گے۔''

''واہ سر۔'' میں اتنا ہی بول سکا۔ ''مجھے تو اس بات کی خوشی

ہے کہ اس دفتر میں سفارش کا رواج نہیں ہے۔''

''چلیں شروع کرتے ہیں۔'' اس نے اپنے پھوپھی زاد کی طرف دیکھا۔ ''بتاؤ۔ دنیا کا جو سب سے بڑا بحری مسافر بردار جہاز ڈوبا تھا، اس کا نام کیا تھا؟''

''جی جناب ٹائی ٹینک۔'' اس نے جواب دیا۔

''گڈ۔ بالکل درست۔ تمہارا سلیکشن ہو گیا۔'' اس نے کہا۔ پھر اس نے دوسرے کی طرف یعنی اپنے سالے کی طرف دیکھا۔ ''اب تم بتاؤ۔ اس جہاز میں کتنے آدمی تھے؟''

''جناب۔ پندرہ سو۔'' اس کے سالے نے جواب دیا۔

''بہت خوب۔ تم بھی سیلیکٹ ہو گئے۔ مبارک ہو۔'' پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''مسٹر اب تم ان پندرہ سو آدمیوں کے نام بتاؤ۔'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا؟'' میں یہ بے تکا سوال سن کر حیران رہ گیا۔

''ہاں بھائی ان پندرہ سو کے نام بتائیں۔'' اس نے کہا۔

میں بُری طرح بھنا کر رہ گیا تھا۔ ''لیں سنیں۔ ایک کا نام تھا جیک ہیریسن۔ ایک عورت کا نام تھا ازابیلا۔ پھر ایک کا نام تھا جیک ہیریسن۔ پھر ایک عورت کا نام تھا ازابیلا۔ پھر ایک کا نام تھا جیک ہیریسن اور ایک عورت کا نام تھا ازابیلا۔''

''کیا مذاق ہے یہ؟'' وہ دہاڑنے لگا۔

''یہ اتفاق ہے جناب کہ اس جہاز میں ہر عورت ازابیلا تھی اور ہر مرد جیک ہیریسن تھا۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا یہ مذاق میری سمجھ میں نہیں آیا۔'' وہ غصے سے بولا۔

''میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ جب آپ کو اپنے رشتے داروں ہی کو رکھنا تھا تو اس قسم کے انٹرویو کی ضرورت ہی کیا تھی۔ لائیں میری فائل دیں۔'' میں نے میز پر رکھی ہوئی فائل اٹھائی اور اس دفتر سے بھناتا ہوا باہر آ گیا۔

میں نے واپس آ کر طاہر کو موبائل پر ساری صورتِ حال بتا دی۔ طاہر وہی دوست تھا جس نے مجھے اس دفتر میں انٹرویو کے لیے بھیجا تھا۔ وہ بہت دیر تک ہنستا رہا اور افسوس بھی کرتا رہا۔

لیکن کیا فائدہ تھا۔ اس بے چارے نے تو میرے ساتھ بھلائی کی تھی۔ اب دفتر ہی الٹا تھا تو کیا کیا جائے۔

وہ رات بہت کچھ سوچتے ہوئے گزر گئی تھی۔ کیا تھا میرا مستقبل۔ کیا کرنا تھا مجھے، کیسی ستم ظریفی تھی۔ میں نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کر رکھی تھی لیکن جاب کی راہ میں بے تکی رکاوٹیں حائل آ رہی تھیں۔

دوسری صبح گیارہ بجے کے قریب طاہر میرے پاس آ گیا۔ گیارہ بجے کو میں نے صبح اس لیے کہا ہے کہ ہم جیسے بے روزگاروں اور بے کاروں کی صبح گیارہ بارہ بجے ہی ہوتی ہے۔

طاہر نے آتے ہی چائے کی فرمائش کر دی۔ بہت ہی بور ہو کر میں نے اس کے لیے چائے بنائی۔

''یار میرے لیے کچھ ناشتا وغیرہ تو لیتے آتے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن میں تو کچھ نہیں لایا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''عجیب آدمی ہو۔ دس بار کہہ چکا ہوں کہ جب میرے پاس آیا کرو تو کچھ کھانے کو لیتے آؤ۔ میرے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ چائے بھی کسی طرح بنالی ہے۔''

''چلو آئندہ سے خیال رکھوں گا۔ تم اپنے انٹرویو کا بتاؤ۔''

''بتایا تو ہے کہ میرے ساتھ کیسا سلوک ہوا ہے۔ کیسا سوال کیا گیا تھا اور پہلے سے اپنے کزن اور سالے کو سلیکٹ کر لیا گیا تھا۔''

''یار اس دفتر میں ایسا تو ہوتا نہیں ہے۔ نہ جانے تمہاری قسمت کیسی ہے؟''

اسی دوران موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے نمبر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ نمبر اسی دفتر کا تھا۔

''یار یہ نمبر تو اسی دفتر کا ہے۔'' میں نے طاہر سے کہا۔

''کس دفتر کا؟''

''وہی جہاں میں انٹرویو کے لیے گیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''انہوں نے کل بلایا ہے۔''

''ضرور جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اچھی خبر تمہارے انتظار میں ہو۔''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔ ورنہ کون بلاتا ہے؟''

میں دوسرے دن اس دفتر میں دوبارہ پہنچ گیا۔ جہاں سے ناکام ہو کر باہر آیا تھا۔ اس بار مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس نے فوری طور پر مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔

میں نے اندر جا کر اسے سلام کیا۔ اس بار میرا انداز بہت مختلف تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر سلیم۔ آپ کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ شاید مجھ سے زیادتی ہو گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں ایک باضمیر انسان ہوں۔ کسی کے ساتھ ناانصافی برداشت نہیں ہوتی۔ اسی لیے دوبارہ بلا لیا ہے۔''

''واہ سر آپ جیسا انسان تو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔'' میں نے اس کو مکھن لگا دیا۔

''شرمندہ نہ کرو۔ میں ایک عام سا انسان ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یاد آیا تم نے اپنی سی وی میں لکھا تھا کہ تمہیں ہسٹری سے بہت دلچسپی رہی ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''یس سر، ہسٹری میرا پسندیدہ سبجیکٹ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر تو تم سکندرِاعظم کے بارے میں بھی جانتے ہوگے؟'' اس نے پوچھا۔

''یس سر، وہ تو میری پسندیدہ پرسنالٹی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر اس کے پھوپھا کا نام بتادو۔''

''پھوپھا کا نام؟'' میں جھلا کے رہ گیا۔

''ہاں بھائی، اس کے پھوپھا کا نام۔'' اس نے کہا۔

''کمال کرتے ہیں سر آپ۔ میں اس کے پھوپھا کا نام کیسے بتاسکتا ہوں؟''

''مسٹر سلیم۔ میں اپنی فرم میں کسی ایسے شخص کو جاب نہیں دے سکتا جس کو سکندرِاعظم کے پھوپھا کا نام بھی معلوم نہ ہو۔'' اس نے کہا۔

''مجھے اپنی جہالت کا اعتراف ہے سر۔ اب آپ مجھے ہٹلر کے بڑے بہنوئی کا نام بتادیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔''

''مسٹر سلیم، انٹرویو تمہارا ہورہا ہے۔ میرا نہیں۔''

''ارے لعنت بھیجتا ہوں ایسے انٹرویو پر۔ بار بار بے وقوف بنانے کے لیے بُلا لیتے ہیں۔''

میں اس کمرے سے باہر آگیا۔ میں نے دروازے پر اس کی آواز سنی۔ وہ بلند آواز میں خود سے کہہ رہا تھا۔ ''کمال ہے کیسے پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ ان کو سکندر کے پھوپھا کا نام بھی نہیں معلوم۔ نہ جانے زندگی میں کیا کریں گے۔''

دل تو چاہا کہ واپس جاکر اسے اپنے پھوپھا کا نام بھی یاد دلا دوں۔ پھر میں لعنت بھیج کر اس دفتر سے واپس آگیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ اچانک کسی گاڑی کے بریک لگنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ میں اپنی بے دھیانی میں بیچ سڑک پر چلا آیا تھا اور ایک گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

گاڑی چلانے والی ایک خوبصورت سی لڑکی تھی۔ ''کیا بات ہے کیا مرنے کا ارادہ ہے؟'' اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا۔

''جائیں مس۔'' میں نے جھلا کر کہا۔ ''اپنا رستہ لیں۔ زندگی تو آپ جیسوں کے لیے ہوتی ہے۔ ہم تو بے کار کے لوگ ہیں۔ مر بھی جائیں تو کون پوچھتا ہے؟''

''فلمی ڈائیلاگ بول رہے ہو یا زندگی سے واقعی تنگ آچکے ہو؟''

''تنگ آچکا ہوں محترمہ۔ ورنہ مجھے ڈائیلاگس بولنے کا ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ لو میرا کارڈ۔'' لڑکی نے پنا وزیٹنگ کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ ''کل میرے دفتر آجانا۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی کے بارے میں تمہارا نقطہ نظر بدل جائے۔''

میں نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں نے اس کارڈ کو غور سے دیکھا۔ بہت سلیقے سے چھپا ہوا کارڈ تھا۔ اس سے پتا چلا کہ وہ لڑکی خود جتنی خوبصورت تھی۔ اس کا ذوق بھی ویسا ہی اعلیٰ تھا۔

میں جب اپنے گھر پہنچا تو پڑوسی نے بتایا کہ کچھ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ میرے قرض خواہ ہی ہوسکتے تھے۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ چند لمحوں تک میں نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔ خوف سا محسوس ہورہا تھا۔ آخر کب تک۔ دروازہ کھولا تو طاہر دروازے پر کھڑا تھا۔ ''یار کیا ہو گیا تھا۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہے تھے؟''

''یار کیا بتاؤں۔ منحوس شکلیں دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''بیٹھو۔ میں چائے بناتا ہوں۔ میں نے بھی نہیں پی ہے۔''

وہ دری پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ کمرے میں صوفے وغیرہ کا کوئی تکلف نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے پہلا گھونٹ لیتے ہی بُرا سا منہ بنالیا۔ ''یار یہ کیسی چائے بنائی ہے۔ اس میں تو چینی ہی نہیں ہے۔''

''ظاہر ہے جب چینی ڈالی جائے گی تو ہوگی نا۔'' میں نے کہا۔

''سلیم تیری بھی کیا زندگی ہے؟'' اس نے افسوس کا اظہار کیا۔

''بالکل درویشوں والی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس نماز روزے سے مار کھا گیا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کا دن بھی ناکامی کا تھا۔'' اس نے کہا۔

''مکمل ناکامی تو نہیں۔ ایک لڑکی مل گئی تھی۔ اس نے اپنے دفتر میں بُلایا ہے۔'' میں نے بتایا۔

"لڑکی کہاں سے مل گئی تھی؟"

"یار میں اس کی گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "پھر اس نے میری حالت پر ترس کھاتے ہوئے مجھے اپنا کارڈ دے دیا اور کہا کہ میں کل اس کے دفتر آجاؤں۔"

"ضرور جاؤ۔" طاہر نے کہا۔ "تم نے سنا ہوگا کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے کسی لڑکی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہو اور تمہیں کامیاب کردے۔"

"یار میں نے اب ایسے خواب دیکھنے چھوڑ دیے ہیں۔"

"پھر سے شروع کردو۔ خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ کامیابی تمہارے انتظار میں ہے۔"

☆☆☆

دوسرے دن میں پھر اپنی قسمت آزمانے چلا تھا۔

دفتر تو بہت شاندار تھا۔ میرا مطلب ہے کہ دفتر جس عمارت میں تھا، وہ عمارت بہت اچھی تھی، لیکن اس پر کوئی بورڈ وغیرہ نہیں لگا تھا۔ اسی لیے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ دفتر کس چیز کا ہے۔

بہرحال میں نے دروازے کی گھنٹی بجادی۔ کچھ دیر میں دروازہ کھل گیا تھا۔

ایک خوبصورت سی لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔ "جی فرمائیں۔" اس نے پوچھا۔

"میں مس فریحہ سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"اوہ۔ آپ وہی تو نہیں ہیں۔ جو کل فریحہ کی گاڑی سے ٹکراتے ہوئے بچے ہیں... اور آپ کی کنڈیشن بہت خراب ہو رہی تھی۔ آپ کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کئی دنوں سے کچھ کھایا نہیں ہے۔"

"محترمہ۔" میں بھنا گیا۔ "اگر آپ میری بے عزتی سے فارغ ہو چکی ہوں تو میں کچھ کہوں۔" میں نے کہا۔

اتنی دیر میں کسی اور کی آواز آئی۔ "زرین کون ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ وہی ہیں جن کو تم نے کل اپنا کارڈ دیا تھا۔" اس لڑکی نے بتایا۔ جس کا نام زرین پکارا گیا تھا۔

"تو اندر لے آؤ۔ دروازے پر کیوں کھڑا رکھا ہے؟"

وہ لڑکی مجھے اندر لے گئی۔ بہت عام سا فرنیچر تھا۔ عام سا دفتر تھا۔ کل والی لڑکی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک بڑی سی میز تھی۔ اس کمرے میں بس وہی ایک ڈھنگ کی چیز دکھائی دے رہی تھی۔

"اوہ تم آگئے؟" اس لڑکی نے پوچھا۔ جس نے اپنا کارڈ دیا تھا۔ اس کا نام فریحہ تھا۔

"جی ہاں۔ میں آگیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"آپ کی ایجوکیشن کیا ہے؟" اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"آٹھویں سے بتاؤں۔ یا بالکل لاسٹ کا بتاؤں؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ پہلی سے شروع کریں۔" اس نے کہا۔

"پہلی میں نے گورنمنٹ اسکول سے کیا تھا۔ اس وقت میرے ہیڈ ماسٹر برکت صاحب ہوا کرتے تھے۔ میری عمر چار سال تھی۔ جب میرے ابو مجھے ایڈمیشن کے لیے لے گئے تھے۔"

فریحہ کے برابر بیٹھی ہوئی زرین نے کہا۔ "فریحہ یہ سب کیا شروع کردیا۔ ان سے کام کی بات کرو۔"

"ٹھیک ہے میں ان سے کام کی بات کرتی ہوں۔" فریحہ نے زرین کی طرف دیکھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کس قسم کا دفتر ہے اور میری جاب کیا ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو بھیک مانگنے کا تجربہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

اس سوال نے مجھے چکرا دیا تھا۔ "محترمہ ابھی تک تو نہیں ہے۔ لیکن حالات اگر ایسے ہی رہے تو ہو ہی جائے گا۔"

"چلیں پہلے تو آپ اپنا نام بتائیں۔" اس نے کہا۔

"سلیم نام ہے میرا۔" میں نے کہا۔

"سلیم صاحب۔ بات یہ ہے کہ ہم نے ایک این جی او شروع کی ہے۔ اس کو چلانے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ ویسے تو میرے ڈیڈی ایک دولت مند انسان ہیں لیکن وہ میری اس ایکٹیویٹی سے خوش نہیں ہیں۔"

"ویسے یہ این جی او ہے کس قسم کی؟" میں نے پوچھا۔

"ہم پاکستان بھر کے بھکاریوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کررہے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"بھکاریوں کو؟"

"جی ہاں۔ کیوں کہ ہمارے یہاں کا عام آدمی تو ایک پلیٹ فارم پر کبھی جمع نہیں ہوگا... اسی لیے بھکاریوں سے اسٹارٹ لے رہے ہیں۔"

"چلیں یہ تو مان لیا... لیکن میری کیا ڈیوٹی ہوگی؟ اور کیا سیلری ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

''جہاں تک سیلری کا تعلق ہے، وہ آپ کی اپنی محنت پر ہوگا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آپ جتنا بھیک مانگ کر...... یعنی ڈونیشن لائیں گے۔ اس کا تیس پرسنٹ آپ کا ہوگا۔''

میں بُری طرح بھنا گیا۔ ''کیا میں آپ کو اتنا ہی بے وقوف نظر آرہا ہوں؟''

''نظر تو نہیں آرہے لیکن انسان کا کیا بھروسا۔ کس وقت بے وقوف ہوجائے۔''

''محترمہ۔ آپ اپنی یہ قیمتی جاب اپنے پاس ہی رکھیں میں جارہا ہوں۔''

میں اس دفتر سے بہت بور ہوکر باہر آیا تھا۔ پتا نہیں ان لڑکیوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا تھا۔ کیا میں شکل سے بھکاری نظر آتا تھا؟ حد ہوگئی۔''

میں نے جب یہ کہانی طاہر کو سنائی تو وہ بہت دیر تک ہنستا رہا۔ ''یار کمال ہوگیا۔ یہ آج کل کی لڑکیاں اسی قسم کی ایکٹیویٹی کرتی ہیں۔ وہ یقیناً کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں گی۔ انہوں نے وقت گزارنے کا یہ طریقہ نکالا ہوگا۔''

''لیکن میری تو توہین ہوئی ہے نا؟'' میں نے کہا۔

''خدا جانے تمہارے ساتھ کیا کیا تماشے ہوتے ہیں؟''

''یار میں تو اب بور ہوچکا ہوں۔ ایک لڑکی پسند بھی آئی تو وہ عجیب ہی نکلی۔''

اسی دوران میں فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اس پر اسی لڑکی کا نمبر آرہا تھا جس کے یہاں میں اپنی بے عزتی کرانے گیا تھا۔ میں بڑبڑایا۔ ''کیا چاہتی ہے وہ؟''

''خیریت؟ کس کا فون ہے؟''

''اسی کا جس کے یہاں میں گیا تھا۔ میں تو اٹینڈ نہیں کررہا۔''

''بات تو کرکے دیکھو۔''

میں نے موبائل ریسیو کرلیا۔ دوسری طرف وہی لڑکی تھی۔ ''ہیلو سلیم صاحب سے بات کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں سلیم ہی بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں فریحہ بول رہی ہوں۔ آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔ وہی این جی او والی۔''

''جی ہاں پہچان لیا ہے۔ میں نے آپ کا نمبر اپنے موبائل میں سیو کرلیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''فرمائیں کیسے یاد کیا؟''

''سلیم صاحب۔ کیا آپ مجھ سے مل سکتے ہیں؟'' اس نے کہا۔

''بے کار آدمی ہمیشہ فری ہی ہوتا ہے محترمہ۔ بتائیں کہاں ملنا ہے؟''

''سلازار ریسٹوران دیکھا ہے آپ نے؟'' اس نے پوچھا۔

''باہر سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔''

''اب اندر سے بھی دیکھ لیں گے۔'' اس نے کہا۔

''ایک بات بتائیں۔ اس مہربانی کی کیا وجہ ہے؟''

''آپ مل تو لیں پتا چل جائے گا۔'' اس نے کہا۔

فون بند کرنے کے بعد میں نے طاہر سے کہا۔ ''یار میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میرے ساتھ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ ایک بار ایک دفتر میں انٹرویو کے لیے گیا تو وہاں الٹے سیدھے سوالات ہونے لگے۔ وہاں سے بور ہوکر بھاگ آیا۔ تو اسی دفتر میں پھر بلا لیا گیا۔ دوبارہ گیا تو پھر بے تکا سوال کیا گیا۔ برا بھلا کہتے ہوئے واپس آگیا۔ اس لڑکی کے پاس گیا تو وہاں بھی بے تکی بات کی گئی۔ وہاں سے واپس آگیا۔ اب پھر اسی لڑکی نے بلایا ہے۔ پھر وہی ہوگا جو اس دفتر میں ہوا تھا۔''

''یار کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ ہر جگہ ایک ہی سچویشن ہو۔ تم جاکر تو دیکھو۔ ہوسکتا ہے کہ اس بار کوئی بہتری تمہاری قسمت میں ہو۔ دن ایک جیسے نہیں رہتے۔ تم جاؤ۔''

''اس بار ایک تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ اس نے ایک ہوٹل میں بلایا ہے۔''

''میری جان پھر تو تم ضرور جاؤ۔'' طاہر نے کہا۔ ''اس بار معاملہ کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں یار۔ جانا تو پڑے گا۔ ویسے بھی وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔''

سلازار شہر کا ایک خوبصورت اور مہنگا ریسٹوران تھا۔ اس لڑکی نے وہاں ملنے کی بات کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو اس کی این جی او کو ڈونیشن ملنے لگے تھے...یا پھر کوئی اور بات تھی۔

بہرحال میں سلازار پہنچ گیا۔ وہ لڑکی پہلے سے موجود تھی۔ وہ اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ وہ دوسری بھی موجود تھی جس کا نام زریں تھا۔ فریحہ نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ میں ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ غور سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں ابھی تک اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں بُلانا بھی اُن کی کوئی ایکٹیویٹی ہو۔

بہرحال فریحہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔
''سلیم صاحب، ہمیں یہ تو اندازہ ہو گیا کہ آپ ایک مہذب انسان ہیں اور آپ کو جاب کی بھی ضرورت ہے۔''
''چلیں یہ تو ظاہر ہو گیا کہ مجھے جاب کی ضرورت ہے لیکن یہ کیسے پتا چلا کہ میں ایک مہذب انسان ہوں۔'' میں نے کہا۔
''یہ اندازہ تو بہت آسان ہے۔'' زریں نے کہا۔ ''کیونکہ آپ لڑکیوں کو دیکھ کر پھیل نہیں گئے بلکہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ ورنہ بہت سے تو جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کہتے ہیں چاہے جتنی بھیک منگوا لو۔ لیکن یہیں رکھ لو۔''
فریحہ ہنس کر بولی۔ ''بہت سے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جی فکر ہی نہ کریں ہمیں بھیک مانگنے کا تجربہ ہے۔ ہمارے باپ دادا بھی یہی کرتے تھے۔''
دونوں ہنس رہی تھیں۔ اب میں بھی ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی جو بوریت تھی، وہ ختم ہو چکی تھی۔ اگر یہ سب ان کی ایکٹیویٹی بھی تھی تو بھی زندہ دل لڑکیاں معلوم ہوتی تھیں۔
''سلیم صاحب جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ آپ کل ہی میرے گھر آ جائیں۔ میں ڈیڈی سے ملاقات کروا دیتی ہوں۔ آپ کی اچھی سی جاب ہو جائے گی۔''
''فریحہ ان کو گھر کیوں بلا رہی ہو۔ آفس بلا لو۔''
''نہیں یار ڈیڈی کی کل فلائٹ ہے۔ وہ دس پندرہ دنوں کے لیے یورپ جا رہے ہیں۔ اسی لیے میں سوچتی ہوں کہ جتنی جلدی ان کا کام ہو جائے اتنا اچھا ہے۔''
اس بار دونوں سنجیدہ معلوم ہو رہی تھیں اسی لیے میں بھی ان کی باتیں سنجیدگی سے سن رہا تھا۔
''میں آپ کو اپنا ایڈریس سمجھا دیتی ہوں۔'' فریحہ نے کہا۔
''دیکھیں محترمہ۔ مجھ میں اب زیادہ خواب دیکھنے کی ہمت نہیں رہی۔'' میں نے کہا۔ ''اس قسم کے تجربے کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔''
''یہ کوئی خواب نہیں ہے سلیم صاحب۔'' فریحہ نے کہا۔ ''آپ کل آ تو جائیں۔''
''ٹھیک ہے۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''حاضر ہو جاؤں گا۔''
اس کے بعد فریحہ نے کھانے پینے کو بہت کچھ منگوا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی پیمنٹ اسی نے کی تھی۔ اس دوران ہماری باتیں بھی ہوتی رہی تھیں اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ ان دونوں نے مل کر این جی او فقیروں سے بھیک کی عادت ختم کروانے کے لیے کھولی تھی۔ لیکن اس کا رسپانس نہ ہونے کے برابر تھا۔
ایک بات سوچ کر میں نے اس سے کہا۔ ''دیکھیں مجھے اپنے گھر بلانے سے پہلے اپنے ڈیڈی سے میرے بارے میں بات کر لیں۔''
''میں انہیں سب بتا چکی ہوں۔ ان کو اپنے دفتر کے لیے ایک منیجر کی ضرورت ہے۔ اسی لیے انہوں نے آپ سے ملنے کی بات کی تھی۔ ورنہ میں ان کی اجازت کے بغیر آپ کو کیسے بلا سکتی تھی۔''
دوسرے دن میں اس کے گھر پہنچ گیا۔
کیا شاندار گھر تھا۔ گیٹ پر گارڈ کھڑے تھے۔ شاید ان لوگوں کو میرے بارے میں بتا دیا گیا تھا۔ اسی لیے ایک ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔ وہ روم بھی بہت شاندار تھا۔
میں ابھی اس ڈرائنگ روم کی سجاوٹ دیکھ ہی رہا تھا کہ فریحہ داخل ہوئی۔
وہ اکیلی نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا ڈیڈی بھی تھا۔ اور یہ وہی تھا جس نے مجھ سے سکندر اعظم کے پھوپھا کا نام دریافت کیا تھا۔ جس کے یہاں میں انٹرویو کے لیے گیا تھا۔
میں نے اس کو دیکھتے ہی کسی مشین کی طرح بولنا شروع کر دیا۔
''جی جناب میں بتاتا ہوں۔ چنگیز خان کے بہنوئی کا نام اولگا تھا۔ مارکوپولو کے بھتیجے نے چار شادیاں کی تھیں۔ فرعون کی ممانی کی چھوٹی بہن کو ملیریا ہو گیا تھا۔ ترکی کے زلزلے میں چھ ہزار نو سو تیس آدمی مرے تھے۔ ہٹلر کی خالہ زاد بہن کا نام ایلینا تھا۔ اس کے علاوہ......''
''ارے ارے۔'' فریحہ نے چیخنا شروع کر دیا۔ ''کیا ہو گیا ہے تم کو۔ یہ سب کیا بولے جا رہے ہو؟''
اس کے ڈیڈی نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس کے ڈیڈی نے آگے بڑھ کر میرے شانے پر تھپکی دی۔ ''رہنے دو۔ اب یہ سب بکواس یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنے دفتر کے سارے نالائقوں کو باہر نکال دیا ہے۔ تم کل سے اپنی ڈیوٹی جوائن کر لو۔ تم منیجر ہو۔''
فریحہ حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔
اس دن مجھے پتا چلا کہ کوئی ضروری نہیں ہے دوسری بار بھی ویسا ہی ہو۔ قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔



طاہر جاوید مغل

انگارے

سینتیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی ہوئی [illegible] اور
دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کرسکا اور شکیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہوکے واپس ڈنمارک جارہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پاچکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسر پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ناتب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادر نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے دو بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آگیا۔ سیف عرف سیفی کی گتھی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے

ساتھ بروناِئی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی وار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیر زمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیر زمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ جاماجی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارا قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا۔ ہر طرف گولیاں...... شیلنگ اور دھواں دھار لڑائی تھی۔ بالآخر پسی ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنوں سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب تخت کے حق دار قسطینا اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤد بھاؤ کے پاس تھا لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ پاکستان آچکا تھا ہر طرف قتل و غارت گری پھیلا رہے تھے...... ڈیتھ اسکواڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی معصوم لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہو گیا تھا میں اور انیق نے ان کے ٹھکانے کا کھوج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ادھر جاماجی سے خورسنہ آچکی تھی اور سجاول کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔ ڈیتھ اسکواڈ کا خاتمہ بے حد ضروری تھا۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر ان کے ٹھکانے کو تباہ کر دیا اور خود بھی بمشکل یعنی جان بچا پایا۔ اس مقام پر زبردست بلاسٹ ہوا اور مجھے بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ ٹیکساری گینگ سے بچنے کا ہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا کہ میں سب کی نظروں میں مردہ رہوں۔ اپنے چہرے پر سرجری کے ذریعے تبدیلیاں کروا کے میں اپنوں میں اجنبی بن گیا تھا۔ سیف کے گھر اور تاجور تک رسائی کے بعد میں مطمئن تھا مگر تاجور کی شادی دارب فیملی میں طے پا چکی تھی تاجور کے بغیر میری زندگی ادھوری تھی، میں اسے ساتھ لے آیا تھا مگر اچانک انیق کی آمد ہوئی، اس نے سیف کے حوالے سے غلط باتیں کر کے تاجور کا دل متنفر کر دیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں انیق کی اس حرکت پر مشتعل تھا۔ وہ بیاہ کے داراب ہاؤس جا چکی تھی۔ بالآخر ہم نے انیق کی دشمنی کا کھوج لگایا۔ وہ بابا نادانی کے کالے علم کی زد میں تھا ... جو کچھ کر رہا تھا وہ بابا نادانی کروا رہی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میرے پاس سجاول کے قریبی ساتھی باقر چھوٹے کا نمبر موجود تھا۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کی اور اس سے رابطہ ہو گیا۔ ’’سجاول کا اب کیا حال ہے؟‘‘

وہ بولا۔ ’’ہم سردار کو صبح سویرے ہی یہاں صادق آباد لے آئے تھے۔ اسپتال میں ان کا دوا دارو ہوا ہے۔ ڈرپ بھی لگائی گئی ہے۔ اب طبیعت چنگی ہے۔ سوئے ہوئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم دو تین گھنٹے میں یہاں سے فارغ ہو جائیں گے اور واپس لالہ موسیٰ جانے کا سوچ سکیں گے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’ٹھیک ہے، سوچ لینا...... مگر ابھی فوراً ایک کام کرو۔ وہاں لالہ موسیٰ میں سجاول نے جن خاص بندوں کو اپنے گھر کی نگرانی پر لگایا ہوا ہے، ان کا انچارج کون ہے؟‘‘

’’خود فیض چاچا ہے، کیوں کیا کہنا ہے؟‘‘

’’ابھی، اسی وقت فیض چاچا کو فون لگاؤ اور اسے بتاؤ کہ یونس کے ساتھ کیا ہوا ہے......‘‘

’’وہ میں نے بتا دیا تھا رات کو ہی۔‘‘ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

’’پوری بات سنو۔‘‘ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ’’فیض کو بتاؤ کہ یونس کچھ غلط لوگوں کی گرفت میں چلا گیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اس کے ہوش حواس خراب کر سکتے ہیں۔ اس کو نشہ آور دوائیں کھلا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی

بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ تم نے خود بھی دیکھا ہے کہ انہوں نے سردار سجاول کے ساتھ کیا کیا ہے، دیکھا ہے یا نہیں؟''

''ہاں دیکھا تو ہے۔'' وہ ذرا بھرائی آواز میں بولا۔ شاید اس نے دو تین پیگ لگا رکھے تھے۔

''تم ابھی فیض کو بتاؤ کہ اگر یونس، سردار کے گھر کی طرف آئے یا آس پاس دکھائی دے تو اسے روکنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حواس میں نہ ہو۔ وہ سردار کے بیوی بچے کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی فون کرتا ہوں۔''

''فون کرو اور پھر مجھے اسی نمبر پر بتاؤ کہ وہ کیا کہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' باقر نے کہا۔

میں فوراً انیق کے گھر واپس آیا۔ اس کے لیے گوٹھ کی عورتیں اور رشتے دار خواتین قرآن خوانی میں مصروف تھیں۔ ان میں وہ پیاری سی گوری چٹی لڑکی بھی تھی جو اس کی منگیتر کی بہن تھی...... اور جسے اب وہ اپنی چھوٹی بہن سمجھتا تھا۔ اس گھر کے در و دیوار میں کئی حسرت ناک منظر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف وہ سرخ موٹر سائیکل کھڑی تھی جسے وہ گوٹھ میں قیام کے دوران میں استعمال کرتا تھا۔ ایک الماری کے اوپر اس کا ہیلمٹ دھرا تھا۔ سامنے صحن کی دیوار کے ساتھ ساتھ وہ خوشنما پھول دار پودے تھے جن کو وہ اپنے ہاتھ سے پانی دیتا تھا اور تراشتا خراشتا تھا۔ کیا پتا ان پودوں کے ساتھ اس کی کچھ خاص یادیں وابستہ ہوں۔ ان پودوں کی تعداد تین تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے درختوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔

ان سارے مناظر سے نگاہ چرا کر اور انیق کے اہلِ خانہ کو پُرسہ دے کر میں اور فخر گوٹھ سے نکل آئے۔ داؤد بھاؤ کی اسپیشل اسٹیشن ویگن اب موجود نہیں تھی۔ وہ ہم سے پہلے ہی گوٹھ سے واپس روانہ ہو چکا تھا۔ اب میں اور فخر بھی لاہور اور پھر لاہور سے آگے لالہ موسیٰ پہنچنا چاہتے تھے۔ یہ بات اب صاف تھی کہ اگر ہانا وانی، ابھی تک پاکستان میں ہے تو پھر اس کا رخ بھی یقیناً وسطی پنجاب کی طرف ہوگا۔ وہ سارے افراد جو اس کا ٹارگٹ ہو سکتے تھے، اسی علاقے میں تھے۔

گوٹھ سے بہاولپور اور پھر وہاں سے لاہور تک براستہ سڑک ایک طویل سفر تھا، تاہم جو گاڑی ہمارے لیے مقامی زمیندار نے مہیا کی تھی، وہ ایک اچھی حالت کی 2008ء ماڈل ٹویوٹا تھی اور ہم مناسب رفتار سے سفر کرتے تو تقریباً چودہ گھنٹے میں لاہور پہنچ سکتے تھے۔ لاہور سے آگے لالہ موسیٰ جانے کی ضرورت پیش آتی تو بھی دو تین گھنٹے میں یہ آسانی پہنچا جا سکتا تھا۔

راستے میں، میں نے باقر کو ایک بار پھر فون کیا، اس نے بتایا۔ ''سردار ہوش میں آ گئے ہیں۔ مقامی پولیس والوں نے ہمیں گھیرا ہوا تھا۔ گرفتاری شرفتاری کی بات بھی ہو رہی تھی پر اب سردار صاحب کے ایک بہت بڑے افسر دوست کا فون جہلم سے آ گیا ہے۔ وہ شاید خود بھی یہاں پہنچ رہے ہیں، لگتا ہے کہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''جس فون کا میں نے کہا تھا، اس کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہیں فون کر کے بتانے ہی والا تھا۔ میں نے چاچے فیض کو فون کر کے ساری بات سمجھا دی ہے، وہ ہوشیار ہو گیا ہے۔''

''سوال جواب تو نہیں کر رہا تھا؟''

''پریشان تو تھا، پر میں نے کہا ہے کہ ابھی جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے مطابق چلو لالہ موسیٰ آ کر تمہیں سب کچھ بتائیں گے۔''

''ٹھیک ہے فیض کا نمبر مجھے بھی بھیج دو۔ میں اُس سے رابطہ رکھوں گا۔''

باقر سے بات کرنے کے بعد مجھے کچھ تسلی ہو گئی۔ اب میرا سارا دھیان لاہور اور لالہ موسیٰ کی طرف تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہاں کچھ خطرناک ہلچل ہونے والی ہے۔

☆☆☆

رات کو ہم نے ملتان کے ایک متوسط درجے کے ہوٹل میں قیام کیا اور صبح سویرے پھر نکل کھڑے ہوئے۔ باقر نے مجھے ابھی تک فیض محمد کا سیل نمبر نہیں بھیجا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ بھی یاد دہانی کرائی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ سجاول نے اسے منع کر رکھا ہے۔ (باقر کے نزدیک تو میں ایک آؤٹ سائڈر ہی تھا۔ یعنی سکھیرا گاؤں کے ایک زمیندار کا ڈرائیور) سجاول کے بارے میں پتا چلا کہ اسے عارضی طور پر حراست میں لے لیا گیا ہے۔ وہ جس اسپتال میں تھا وہیں پر پولیس کی نفری تعینات کر دی گئی تھی۔ بھوگلا قصبے کے ہوٹل سے ملنے والی لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں کے لیے بھی ریڈ چھاپے مارے جا رہے تھے۔

سہ پہر دو بجے کے قریب ہم ملتان روڈ پر سفر کرتے ہوئے لاہور کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی

جہاں قریب ہی میرا آبائی گاؤں مراد پور تھا جہاں سے میری اس دردبھری کہانی کی شروعات ہوئی تھی۔ میں اپنی من موہنی چچا زاد بہن فائزہ کی شادی میں شرکت کے لیے ڈنمارک سے یہاں پہنچا تھا اور پھر اسے اپنی چچی سمیت کفن میں لپیٹ کر قبر میں اتارنا پڑ گیا تھا (خیر یہ تو چند روز بعد کا واقعہ تھا اس سے پہلے ہی ایک زخمی کو اسپتال پہنچانے کی پاداش میں، میں پولیس گردی کا شکار ہوا تھا) پتا نہیں کیوں یونہی دل چاہا اور میں نے گاڑی ملتان روڈ سے اتار کر آبائی گاؤں کی طرف موڑ دی۔

''کہاں جارہے ہو؟'' فخر نے چونک کر پوچھا۔

''تمہیں اپنا گاؤں دکھاؤں، چند منٹ کے لیے؟'' میں نے کہا۔

اس نے میرے چہرے کے کھوئے کھوئے تاثرات پر ایک نگاہ ڈالی اور خاموش ہوگیا۔ چار پانچ منٹ بعد ہی ہم اس ذیلی سڑک کے اسی موڑ سے گزرے جہاں کسی نامعلوم کار سوار نے عارف کی موٹر بائیک کو ٹکر مار کر نشیب میں گرایا تھا اور اسے تڑپتا چھوڑ کر فرار ہوگیا تھا۔

وہ سارے پرانے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔ خستہ حال مقامی اسپتال۔ مقامی تھانہ جس میں برگد کے درخت کے نیچے مویشی بندھے ہوئے تھے اور پھر بے مہار پولیس اہلکاروں کے ناقابل فراموش رویے، رشوت ستانی، بےحسی اور پھر عام لوگوں کی بدنظمی، کم علمی اور دیگر قباحتیں، لیکن جو کچھ بھی تھا، یہ میرا وطن تھا اور میں نے اسے دل و جان سے قبول کیا تھا..... میں آج بھی کررہا تھا۔ تاہم سینے میں کچھ زخم ایسے تھے جو انمٹ ہوچکے تھے۔

''یار، یہ تو کافی بڑا گاؤں ہے بلکہ اسے قصبہ کہنا چاہیے۔'' فخر نے کہا۔

''قصبہ بھی کیا..... ہوسکتا ہے کسی وقت ''لاہور'' ہی اس کو ہڑپ کرلے۔ یہ شہر ہی بن جائے۔ دیکھ نہیں رہے کس طرح کھیتوں کھلیانوں کو رہائشی کالونیوں کی شکل دی جارہی ہے۔ یہ جو سامنے دوسڑکیں نظر آرہی ہیں، ان کے درمیان ہماری آبائی حویلی تھی۔ اب اس کا نام ونشان نہیں ہے۔ بس یہی چاہتے تھے یہاں کے بڑے لوگ۔''

سامنے ہی مراد پور کا قبرستان نظر آیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ ''اپنی قبر'' ہی دیکھ لوں۔ دھماکے میں ''مرنے'' کے بعد یہیں تو ''دفنایا'' گیا تھا شاہ زیب کو۔ میں نے گاڑی قبرستان کے دروازے کے قریب روک لی۔

''آؤ تمہیں اپنی ''قبر'' دکھاؤں۔'' میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

فخر نے چونک کر میری جانب دیکھا، پھر ایک گہری سانس لے کر میرے ساتھ گاڑی سے باہر نکل آیا۔ یہ کافی بڑا اور پرانا قبرستان تھا۔ اس بات کا پورا پورا خدشہ موجود تھا کہ جلد یا بدیر اس قبرستان کو بھی کسی سڑک یا کالونی کے کسی بلاک کے نیچے دفنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اگر اب تک یہ بچا ہوا تھا تو شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے گرد چار دیواری موجود تھی اور ابھی وہ لوگ بھی قرب وجوار میں موجود تھے جن کے پیاروں کی قبریں یہاں پائی جاتی تھیں۔

جنتر اور کیکر کے درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے اور قبروں کے کتبے پڑھتے ہوئے ہم ایک کتبے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ کتبے پر میرا نام لکھا تھا..... شاہ زیب عمر 26 سال..... تاریخ وفات وغیرہ وغیرہ۔ دوسری قبروں کی طرح ''میری اس قبر'' پر بھی گلاب کی چند سوکھی پتیاں موجود تھیں، تاہم آثار سے پتا چلتا تھا کہ یہاں کوئی کم کم ہی آتا ہے۔ اردگرد خشک پتے بکھرے ہوئے تھے اور کتبے پر بھی گرد تھی۔

''اپنی ہی قبر پر کھڑے ہونا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا کیسا لگتا ہے، یہ آج ہی پتا چلا۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہاں، بہت کم لوگوں کو ایسا تجربہ ہوا ہوگا۔'' فخر بھی زیرلب بولا۔

اچانک میں چونکا۔ مجھے یاد آیا کہ میری چچازاد فائزہ اور چچی آمنہ کی قبریں بھی تو اسی قبرستان میں ہیں۔ تین چار برس پہلے انہیں لحد میں اتارنے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ معمولی سی کوشش کے بعد مجھے ان کی قبریں بھی مل گئیں۔ ماں، بیٹی ایک دوسرے کے پہلو میں خاموش لیٹی تھیں۔ وہ دردناک مناظر نگاہوں میں گھومے جب آگ نے انہیں زندہ جلا دیا تھا اور پھر اس کے بدلے لالہ نظام اور اس کے ساتھیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ لالہ نظام کے جسم کا قیمہ میں نے ہی کیا تھا، اسے ایک بھاری لوڈر کے نیچے کچلا تھا۔

''جی صاحب جی..... کوئی خدمت؟'' ایک آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

ہمارے سامنے قبرستان کا عمر رسیدہ رکھوالا کھڑا تھا۔ اس نے ایک بنیان اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ میں نے کہا۔ ''چاچا! ان دونوں قبروں کی صفائی کردو۔''

وہ شاپی سے گیا اور پانی کی بالٹی اور جھاڑو وغیرہ لے آیا۔ ندامت میں اس نے صفائی ستھرائی کر کے قبروں پر پانی چھڑک دیا۔ بولا۔ ''آپ دونوں عزیز ہیں حفیظ صاحب کے؟''

وہ میرے چچا کا نام لے رہا تھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا اور مختصراً بتایا کہ ملتان روڈ سے گزر رہے تھے، قبریں دیکھنے کا خیال آ گیا، وہ بولا۔

''حفیظ بھائی کہاں ہیں، ان کا نیا گھر بھی خالی پڑا ہے، کئی مہینوں سے ان کا پتا نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پتا تو ہمیں بھی نہیں۔ بس اتنی خبر ملی تھی کہ شاید بھائی کے پاس کہیں باہر ملک چلے گئے ہیں۔''

قبریں صاف ستھری نظر آنے لگی تھیں۔ ہم نے فاتحہ پڑھی اور پھر اس تیسری قبر کی طرف آ گئے جس پر میرے نام کا کتبہ تھا۔ یقیناً کچھ راکھ اور ناقابلِ شناخت ہڈیوں کو میری ''باقیات'' قرار دے کر اس قبر میں دفن کر دیا گیا تھا۔

گورکن نے اس قبر کی بھی صفائی کر دی اور پانی وغیرہ چھڑک دیا بولا۔ ''حفیظ صاحب پر اوپر نیچے بڑے سخت صدمے آئے ہیں۔ پہلا دھچکا بیوی اور بیٹی کی موت کا لگا، پھر بیٹا جیل چلا گیا اور پھر یہ جوان بھتیجا اللہ کو پیارا ہو گیا۔''

فخر بولا۔ ''اس قبر پر کبھی کوئی آتا ہے یا نہیں؟''

گورکن نے کہا۔ ''حفیظ صاحب دو چار دفعہ یہاں آئے۔ بارشوں میں لیپائی وغیرہ بھی کروائی تھی تینوں قبروں کی۔ اب تو وہ بھی نہیں ہیں۔'' پھر وہ ذرا چونک کر بولا۔

''ہاں شروع شروع میں ایک لڑکا آیا کرتا تھا۔ دیر تک گم صم بیٹھا رہتا تھا، روتا رہتا تھا، کہتا تھا یہ میرے بڑے بھائی کی قبر ہے، بلکہ بھائیوں سے بھی کہیں زیادہ پیارے کی قبر۔ لاہور سے آتا تھا...... ایک دو دفعہ تو رات بھر یہاں رہا۔''

''نام کیا تھا؟'' فخر نے پوچھا۔

''نام تو میں نے کبھی نہیں پوچھا۔ درمیانہ قد تھا، اکیس بائیس سال عمر ہوگی۔ اچھی شکل صورت تھی......''

میں نے کہا۔ ''گھونگریالے بال تو نہیں تھے...... گردن پر بائیں طرف کٹ کا پرانا نشان تھا؟''

''جی جی...... وہی...... کوئی رشتے دار تھا آپ کا؟''

میرے سینے میں درد کی تیز ٹیس اٹھی۔ گورکن، انیق کی بات کر رہا تھا۔ انیق جو میری قبر پر آ کر روتا رہا تھا لیکن اب وہ خود قبر میں تھا۔ گلبرگ کے دھماکے والے واقعے کو اب سات آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ انیق کا یہاں آنا یقیناً اُن دنوں کی بات تھی جب وہ ابھی باناوانی کے ہتھے نہیں چڑھا تھا...... اور اس نے اپنی طلسمی آنکھوں کے زور سے اور خاص منشیات کی مدد سے اسے ہوش و خرد سے بیگانہ نہیں کیا تھا...... وہ میری ''ابدی جدائی'' پر تڑپا تھا اور اب میں اس کی ابدی جدائی پر تڑپ رہا تھا۔

باناوانی کا چہرہ پچھلے تین چار روز سے مسلسل میرے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ میرے سینے میں بے رحم کچوکے لگا رہا تھا۔ فخر نے جھک کر ''میری قبر'' کی مٹی کو چھوا اور سرگوشی میں بولا۔ ''ایک بات نوٹ کی تم نے؟ یہ قبر زیادہ پرانی نہیں لگ رہی۔ لگتا ہے کہ چار چھ ہفتے پہلے ہی بنی ہو۔''

یہ بات میں نے بھی محسوس کی تھی۔ قبر کی مٹی کچھ نرم تھی اور ساخت ایسی نہیں تھی جیسی آٹھ ماہ پرانی قبر کی ہونی چاہیے۔ گورکن کا نام اللہ دتا تھا، وہ بغور ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اللہ دتا! یہ مٹی کچھ بھربھری اور نرم لگ رہی ہے اور اس کتبے کو بھی دیکھ کر لگتا ہے جیسے چند ہفتے پہلے لگایا گیا ہے؟''

اس نے ایک گہری سانس لی اور چند لمحے ہچکچانے کے بعد بولا۔ ''میرا ابھی یہی خیال تھا کہ آپ کو اس واقعے کا پتا نہیں جو یہاں دو ڈھائی مہینے پہلے ہوا ہے۔''

''کون سا واقعہ؟'' فخر نے استفسار کیا۔

گورکن نے پاس ہی ایک کمرے کے باہر بچھی ہوئی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے کہنے پر ہم چارپائی پر آن بیٹھے، وہ ایک خستہ حال موڑھے پر بیٹھ گیا اور بولا۔

''یہاں بڑا عجیب معاملہ ہوا ہے۔ میں چوبیس گھنٹے یہاں موجود رہتا ہوں۔ قبروں کی جتنی بھی رکھوالی ہو سکتی ہے، کرتا ہوں۔ اس دن میں بس ایک دو گھنٹے کے لیے ایک رشتے دار کی طرف گیا تھا۔ رات کا کھانا کھاتے ہی میں واپس پلٹ پڑا۔ قبرستان کے باہر دو بڑی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ پھر ایک دم بہت سی گولیاں چلیں۔ میں ڈر کر واپس گاؤں کی طرف بھاگا۔ گاؤں میں بھی فائرنگ کی آواز سنی گئی تھی۔ وہاں سے بھی لوگ باہر نکل آئے۔ ہم سات آٹھ بندے مل کر قبرستان کی طرف آئے۔ اس وقت کچھ لوگ قبرستان میں سے نکل رہے تھے۔ ان میں کئی ایک کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ وہ تیزی سے گاڑیوں میں بیٹھے اور نکل گئے۔ ہم میں سے کسی کی بھی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ انہیں روک سکے۔ وہ بڑے خطرناک لوگ دکھائی دیتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہم قبرستان میں آئے۔ یہاں باقی تو سب ٹھیک ٹھاک تھا مگر حفیظ صاحب کے بھتیجے شاہ زیب کی قبر کھلی پڑی تھی۔''

''کھلی پڑی تھی؟'' فخر نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں جی...... بات تو افسوس کی ہے لیکن ہوا ایسے ہی ہے۔ ان لوگوں نے قبر کھود کر کفن اور جو کچھ اس میں تھا لکڑی کے تابوت میں سے باہر نکالا اور اس پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ اِدھر اُدھر سے کچرا اور کوڑا اکٹھا کر کے کھلی قبر میں پھینک دیا گیا۔ سرہانے پر سنگِ مرمر کا بڑا اچھا کتبہ لگا ہوا تھا۔ اس پر اتنی فائرنگ کی گئی کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ یہ جو کتبہ اب قبر پر لگا ہوا ہے وہ ایڈووکیٹ عبداللہ نے دوبارہ لگوایا ہے، جو مرنے والے کا دوست ہے۔ شاید آپ بھی جانتے ہوں، عبداللہ کو؟''

میں بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

فخر نے گورکن اللہ دتا سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے یہ کن لوگوں کا کام تھا؟''

''کوئی ڈھاڈے دشمن ہی ہو سکتے ہیں۔ ایسا کام کرنے کے لیے پتھر کا کلیجا چاہیے ہوتا ہے۔ ہم نے کفن کے ٹکڑے اور ادھ جلی ہڈیوں کو پھر جمع کیا۔ مشکل سے ادھا کلو وزن ہوگا۔ ہم نے ان چیزوں کو پھر دفنا دیا۔ سارے مراد پور کو اس واقعے کا بڑا دکھ ہوا۔ ایڈووکیٹ عبداللہ نے اپنے طور پر کوشش بھی کی مگر یہ ذلیل حرکت کرنے والوں کا کچھ پتا نہیں چلا۔''

میں نے پوچھا۔ ''جو لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر فرار ہوئے وہ کس طرح کے تھے، کس طرح کے کپڑے پہن رکھے تھے؟''

''کپڑے تو عام شہریوں والے ہی تھے...... ہاں ایک خاص بات یاد آئی۔ ان میں ایک ہٹی کٹی عورت بھی تھی۔ میں نے اسے کافی دور سے دیکھا لیکن لگتا تھا کہ اس نے کالے شیشوں والی عینک پہن رکھی ہے۔ بس ایک جھلک ہی نظر آئی اُس کی۔ پھر وہ چھ گز لمبی جیپ کے اندر بیٹھ گئی۔''

میرے سینے میں جیسے ایک زوردار گھونسا لگا۔ شک درست ثابت ہو گیا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے فخر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی غم و غصے کی لہر نمودار ہو گئی تھی۔ ہاناوانی نے ان سب لوگوں کو مارنے کی قسم کھا رکھی تھی جو کسی بھی طرح اس کے بیٹے کے قتل میں شریک رہے تھے۔ ان میں سرفہرست یقیناً میرا نام ہی رہا ہوگا لیکن میں چونکہ اس کے انتقام سے پہلے ہی ''مارا'' جا چکا تھا لہٰذا اس نے اپنے سینے کی آگ کو ''میری قبر کی بے حرمتی'' سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ واقعہ اس جنونی کیفیت کا غماز تھا جو اس وقت جاماجی کی اس خطرناک عورت میں پائی جا رہی تھی۔

گورکن نے ہمیں وہ کتبہ بھی دکھایا جو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔ میرے نام کا وہ ٹوٹا پھوٹا پتھر ایک گوشے میں جنتر کی جھاڑی کے نیچے پڑا تھا۔ اس پر یقیناً آٹومیٹک رائفل سے گولیاں برسائی گئی تھیں۔ چچا حفیظ تو یہاں موجود نہیں تھے اور میرے دوست عبداللہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ان لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھا ورنہ یقینی بات تھی کہ وہ بھی زندہ نہ بچتا۔

ہمارے پاس وقت کم تھا۔ ہم زیادہ دیر قبرستان میں ٹھہر نہیں سکے۔ گورکن اللہ دتا کو قبروں کی نگہداشت کی ہدایت کر کے اور اس کی جیب میں کچھ معقول رقم ڈال کر ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ گاڑی ایک بار پھر تارکول کی سڑک پر دوڑنے لگی۔

فخر نے کہا۔ ''ہاناوانی یوں تو عملیات کی بڑی ماہر بنتی ہے۔ اس کے عقیدت مند پتا نہیں اسے ''معرفت'' کے کس درجے پر فائز کرتے ہوں گے مگر وہ ایک ایسی قبر پر غصہ اتارتی رہی جو تمہاری تھی ہی نہیں۔''

''ہاں، اس کی یہ بے خبری قابلِ توجہ ہے...... لیکن...... دوسری طرف دیکھا جائے تو وہ غیب دانی کا دعویٰ نہیں کرتی۔ یا کم از کم ہمیں تو کسی ایسے دعوے کا علم نہیں۔ اس کا سارا تکبر اور ظالمانہ رویہ اس کے ''ہپناٹزم'' کے حوالے سے ہے اور اپنی یہ غیر معمولی صلاحیت تو اس نے ہر جگہ ثابت کی ہے۔''

اسی دوران میں میرے سیل فون پر کال آ گئی۔ یہ سجاول کا ساتھی باقر چھوٹا ہی تھا۔ ''کیا بات ہے باقر؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یار! ایک کام خراب ہو گیا ہے مجھ سے۔ رات کو میں کچھ نشے میں تھا۔ میں لالہ موسیٰ میں فیض چاچے کو وہ فون نہیں کر سکا جس کا تم نے کہا تھا۔''

میں شپٹا گیا۔ ''اس کا مطلب ہے تم نے جھوٹ بولا۔ بہت بڑی بے وقوفی کی ہے تم نے...... نہ فون کیا اور نہ مجھے فیض کا نمبر دیا۔ اگر وہاں کچھ ہو گیا تو پھر؟''

چند لمحے کے توقف کے بعد وہ کانپتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''یار وقاص! ابھی تو مسئلہ ہے...... وہاں...... گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میں چلایا تھا۔

''ابھی پندرہ بیس منٹ پہلے مجھے پتا چلا ہے......'' وہ ہکلایا۔

''کیا پتا چلا ہے؟''

''یونس وہاں آیا تھا۔ وہ سردار کی بیوی اور بچے کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر کہیں لے گیا ہے۔''

میں گالی کم ہی نکالتا تھا لیکن اس وقت باقر کے لیے دو چار گالیاں بے ساختہ میرے منہ سے نکل گئیں۔ میں نے گاڑی ایک سائڈ پر روک دی۔

میری گالیاں سن کر اس نے بھی غصہ دکھایا، بولا۔ ''وقاصے! منہ سنبھال کر بات کرو۔ غلطی بندے بشر سے ہی ہوتی ہے، مجھ سے بھی ہوگئی ہے...... اگر......''

''یہ چھوٹی غلطی ہے جو تو نے کی ہے۔ سردار کو تباہ کر دیا ہے تو نے۔ اگر یونس واقعی اس کے بیوی بچے کو لے گیا ہے تو اب وہ زندہ نہیں بچیں گے۔''

''دیکھ وقاصے! بات کا بتنگڑ نہ بنا۔ ابھی تو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ یونس سردار کے گھر کیوں گیا اور اس کے بیوی بچے کو کس لیے وہاں سے لے کر گیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ان کو حفاظت کے لیے ہی کہیں لے گیا ہو۔''

''تو میرے سامنے ہوتا تو تیرے منہ پر ضرور ایک جوتا مارتا۔'' میں نے تلملا کر کہا۔

''اوئے تجھ سے کہہ رہا ہوں منہ سنبھال کر بات کر...... جو ہونا تھا ہوگیا ہے۔ اب یہ سوچ کہ اس کو ٹھیک کیسے کرنا ہے...... اور...... ایک بات میں تجھے صاف صاف بتا دوں وقاصے! اس بات کا پتا اگر سردار کو چلا تو پھر میرے ساتھ تو جو ہوگا وہ ہوگا لیکن تیرے میرے درمیان بہت بُرا ہو جائے گا۔ تو مجھے ٹھیک سے جانتا نہیں ہے۔ میں قبر تک بندے کا پیچھا کرتا ہوں۔''

وہ سردار سے خوف زدہ تھا اور اب مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب میں نے اس پر مزید لعنتیں ارسال کیں تو وہ نرم پڑ گیا اور پھر منت سماجت پر اتر آیا۔ یقیناً اس کا دل بھی گواہی دے رہا تھا کہ وہاں لالہ موسیٰ میں کوئی غیر معمولی قسم کی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ کوئی ایسی گڑبڑ جو اس کی سمجھ سے باہر تھی لیکن تھی ضرور۔

میں نے جھلا کر فون بند کر دیا اور گاڑی پوری رفتار سے لاہور کی طرف بڑھا دی۔ لاہور سے آگے ہم موٹر وے یا جی ٹی روڈ کا راستہ اختیار کر کے دو ڈھائی گھنٹے میں لالہ موسیٰ پہنچ سکتے تھے۔ کئی دفعہ انسان کے بدترین اندیشے اس کی سوچ کے عین مطابق حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں، لگتا تھا کہ یہاں بھی یہی کچھ ہوا ہے، یونس اس خطرناک عورت کے انوکھے اثر میں آچکا ہے اور لالہ موسیٰ کے اس گھر میں سے خورسنہ اور اس کے بچے کو لے کر نکل گیا ہے۔ کیا وہ انہیں مار دے گا؟ کیا وہ خورسنہ پر مجرمانہ حملے کی کوشش کرے گا؟ کیا بانا وانی ان دونوں کو یرغمال بنا لے گی اور ان کے ذریعے کوئی مطالبہ منوانے کی کوشش کرے گی؟ اس طرح کے کئی سوالات ذہن میں چنگھاڑ رہے تھے۔

☆☆☆

شام کے سات بجے تھے جب ہم لالہ موسیٰ میں داخل ہوئے۔ باقر چھوٹا مجھے اس جگہ کا پتا بتا چکا تھا جہاں سجاول نے خورسنہ اور اس کے بچے ذیشان کو رکھا ہوا تھا۔ اس نے فیض کو بھی بتا دیا تھا کہ ہم اس کے پاس آرہے ہیں۔ فیض محمد کو میرا نام باقر نے وہی بتایا تھا جو اسے معلوم تھا۔ یعنی وقاص۔ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ سردار سجاول مجھ پر اعتماد رکھتا ہے۔

ہم لالہ موسیٰ کے گنجان علاقے میں داخل ہوئے۔ بڑے پوسٹ آفس کے قریب ایک چائے خانے میں ہماری اور فیض محمد کی ملاقات ہوئی۔ میں فیض محمد کو اس وقت سے جانتا تھا جب ہم کوٹلی والے ڈیرے پر قیام پذیر تھے۔ اس قیام کے دوران میں فیض محمد سے میری اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ یقیناً وہ اب بھی مجھے یاد کرتا ہوگا...... لیکن فی الوقت وہ بے خبر تھا کہ میں ایک نئی شباہت کے ساتھ اس کے سامنے موجود ہوں۔ فیض محمد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ سخت الجھا ہوا تھا۔ بولا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ باقر اتنا پریشان کیوں ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یونس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ میرے لیے اس پر یقین کرنا بڑا مشکل ہو رہا ہے۔ سردار تو یونس پر جتنا اعتماد کرتے ہیں شاید مجھ پر بھی نہ کرتے ہوں۔''

''بات وفاداری یا دغابازی کی نہیں ہے۔ فیض محمد...... مجبوری کی ہے۔ یونس کو شاید مجبور کر دیا گیا ہے، خیر یہ بات لمبی ہو جائے گی۔ آپ ہمیں یہ بتاؤ کہ وہ کب یہاں پہنچا اور ان دونوں کو کیسے لے کر گیا؟'' ان دونوں سے میری مراد خورسنہ اور ذیشان تھے۔

فیض نے اپنی کھچڑی داڑھی کھجائی اور بولا۔ ''وہ صبح آٹھ بجے کے قریب اسی سفید سوزوکی میں آیا تھا جس میں دو تین بار پہلے بھی آچکا ہے۔ ہم سے کوئی بات کیے بغیر وہ اندر چلا گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد سردار کی بی بی صاحبہ اور بچہ باہر نکلے۔ وہ بڑے آرام سے باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے، وہ یونس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بچہ آگے بیٹھا، بی بی صاحبہ پیچھے بیٹھیں۔ میں نے یونس سے پوچھا کہ سیکیورٹی کی لوڑ تو نہیں، وہ بولا کہ نہیں ایسی کوئی لوڑ نہیں، ہم ابھی

واپس آجاتے ہیں۔''
فخر نے پوچھا۔ ''فیض چاچا...... تمہیں یونس کی بات چیت میں کوئی فرق محسوس ہوا؟''
''نہیں، فرق تو کوئی نہیں لگا...... ہاں...... ذرا نشے میں لگتا تھا...... اور یہ کوئی ایسی نئی بات تو نہیں تھی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اکثر صبح کے وقت بھی دو تین پیگ لگا لیتا ہے۔''
میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو فیض چاچا، تم نے بتایا ہے کہ وہ نو بجے کے قریب بی بی اور بچے کو لے کر یہاں سے نکلا، اب ایک گھنٹے بعد رات کے نو بج جائیں گے وہ ابھی تک واپس نہیں آئے۔''
''پریشانی تو بہت زیادہ ہے۔ پر اگر کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو اس میں ہمارا تو ذرہ بھر قصور نہیں ہے۔ سردار نے یونس کو یہاں آنے جانے کی پوری اجازت دے رکھی تھی بلکہ شاید تم لوگوں کو بھی پتا ہو کہ سردار کے بیوی بچے کے لیے اس گھر کا انتظام اور اس کی سیکیورٹی کا بندوبست بھی یونس نے ہی کیا ہوا تھا......'' صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے فیض محمد کی آواز میں ہلکی سی لرزش آ گئی تھی۔
چائے خانے میں ٹی وی آن تھا، ایک معروف نیوز چینل لگا ہوا تھا۔ اچانک ایک خبر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا اور پوری طرح جکڑ لیا۔ نیوز کاسٹر جو خبر پڑھ رہی تھی وہ قریبی شہر نما قصبے کھاریاں کے حوالے سے تھی۔ خبر کے مطابق کھاریاں کے قریب جی ٹی روڈ سے قریباً آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر جھاڑیوں سے ایک جواں سال عورت اور بچے کی لاش ملی تھی۔ دونوں کو نہایت پاس سے فائرنگ کر کے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔ نامعلوم قاتل کسی بڑی جیپ پر سوار آئے تھے اور لاشیں پھینک کر فرار ہو گئے تھے۔ نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خونی واقعہ آج دوپہر کے وقت پیش آیا ہے۔ ابتدائی اندازے کے مطابق یہ دونوں لاشیں ماں اور بچے کی ہیں......''
خبر سن کر پورے جسم میں سنسنی اور درد کی لہریں دوڑ گئیں۔ دھیان سیدھا خورسنہ اور اس کے خوبرو بچے کی طرف ہی گیا۔ تو کیا جاباجی کی دلکش خورسنہ بھی اس سفاک دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکی تھی...... وہ جو اپنے دل میں محبت کی جوت جلائے ہوئے تھی...... ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے سجاول سے ملنے یہاں پہنچی تھی اور پھر اسی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ کیا اس سچی کھری محبت کی سزا اسے پہلے زخمی کر کے اور اب جان سے مار کر دی گئی تھی۔
فیض محمد اور فخر کے چہرے بھی دھواں ہو رہے تھے۔

ہم فوراً وہاں سے اٹھے اور گاڑی میں بیٹھ کر کھاریاں کی جانب روانہ ہو گئے۔ ٹی وی سے نشر ہونے والی نیوز میں اس اسپتال کا بھی بتایا گیا تھا جہاں لاشیں رکھی گئی تھیں۔ فیض محمد ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ بیس پچیس منٹ بعد ہم اس اسپتال کے سامنے موجود تھے۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور اب وہ شناخت کے لیے مردہ خانے میں رکھی تھیں۔
مردہ خانے میں جا کر اپنے کسی پیارے کو ڈھونڈنا، اس کے چہرے سے چادر سرکانا کتنا دشوار ہوتا ہے، یہ کچھ وہی جانتے ہیں جن کو ایسے کٹھن وقت سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہم نے بھی مردہ خانے میں جا کر لاشیں دیکھیں۔ خدا ہر کسی کی نگاہ کو ایسے مناظر سے محفوظ رکھے۔ گولیوں کی باڑ نے بچے کے چہرے کے ایک حصے کے پرخچے اُڑا دیے تھے۔ پھر بھی وہ پہچانا جا رہا تھا۔ وہ ذیشان نہیں تھا، عورت بھی خاکستری بالوں والی ایک مقامی عورت تھی، دونوں کسی وراثتی جھگڑے کی بھینٹ چڑھے تھے۔ ہماری غیر معمولی تشویش میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی۔ لیکن مجموعی طور پر صورتِ حال اب بھی نہایت مخدوش تھی۔ خورسنہ اور ذیشان کی طرف سے کوئی بھی بری خبر آ سکتی تھی۔
پھر میرا دھیان سجاول، رضوان اور تاجور کی طرف چلا گیا۔ کسی نہ کسی طور وہ بھی انیق ہی کی طرح میرے ساتھیوں میں شامل تھے...... اس کے علاوہ کچھ اور لوگ تھے جو پاکستان میں نہیں تھے۔ جیسے قسطینا، کمانڈر فارس جان اور زینب ابراہیم وغیرہ۔ قسطینا کا نام تو میں نے ہاناوانی کی زبانی خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ اگر سجاول نے اپنے ہاتھوں سے رائے زل کا سر کاٹا تھا تو قسطینا وہ دلیر لڑکی تھی جس نے نیوسٹی کے اندر گھس کر رائے زل کی شکست کی بنیاد رکھی تھی۔ ہاناوانی اسے کیسے بھول سکتی تھی۔
ہم لالہ موسیٰ واپس آ گئے۔ میں نے فیض محمد کو تو سجاول اور خورسنہ کی رہائش گاہ پر واپس بھیج دیا اور خود فخر کے ساتھ ایک مقامی ہوٹل میں چلا گیا۔ ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی کے اندر بیٹھ کر میں نے سب سے پہلے رضوان ٹی کو فون کیا اور اس سے کہا کہ اس کے لیے خطرات موجود ہیں، وہ چوکس رہے، میں نے اسے یونس کے حوالے سے بھی الرٹ کیا۔ اس کے بعد میں نے سجاول کو کال ملائی۔ سجاول اپنے تین ساتھیوں سمیت مقامی پولیس کی کسٹڈی میں تھا۔ اب ایک بااثر شخصیت کی وجہ سے سجاول کو رحیم یار خان کے تھانے سے رہائی مل چکی تھی اور وہ طوفان کی رفتار سے لالہ موسیٰ کی طرف آ رہا تھا۔ اسے بھی وہی خدشات لاحق تھے جو

ہمیں تھے۔ یعنی یونس کیوں لالہ موسیٰ پہنچا تھا اور خورسنہ اور اس کے بچے کو اپنے ساتھ کیوں لے گیا تھا؟ سجاول سے میری آخری ملاقات بھوگلا کے ہوٹل میں ہی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ باناوانی کے خلاف غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اب اس غم و غصے میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ وجہ عیاں تھی۔ باناوانی نے حملہ کر کے نہ صرف اس کے ساتھیوں کی جان لی تھی بلکہ یونس کو اغوا بھی کیا تھا...... اب وہی یونس تھا جو پُراسرار طور پر لالہ موسیٰ میں سجاول کی خفیہ رہائش گاہ پر پہنچا تھا اور وہاں سے خورسنہ اور بچے کو لے اُڑا تھا۔

وہ فون پر دہاڑا۔ ''شاہ زیب! یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ ابھی انیق کی موت کا غم ہی چین نہیں لینے دے رہا، اب اگر خورسنہ یا ذیشان کے ساتھ کچھ ہو گیا تو میں زندہ جلا دوں گا اس عورت کو اور اس کے اگلے پچھلوں کو...... میں نسلیں ختم کر دوں گا اُن کی۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا سجاول، کیا پتا، یونس نے جو کچھ کیا ہے، اس کے پیچھے کوئی اور وجہ ہو۔''

''یہ تو دل کو تسلی دینے والی باتیں ہیں۔'' وہ مہیب لہجے میں بولا۔ ''وہ خورسنہ اور بچے کو نو بجے کا لے کر نکلا ہوا ہے اور اب اس بات کو چودہ گھنٹے ہو چکے ہیں۔ وہ واپس نہیں آیا۔ نہ اس نے کوئی خبر دی ہے، کوئی رابطہ کیا ہے......''
سجاول کی آواز دکھ کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

مجھے باقر پر ترس آ رہا تھا۔ میں نے سجاول کو یہ نہیں بتایا کہ میں نے کل رات باقر کو کیا ہدایت کی تھی اور اس نے کس طرح غفلت کا مظاہرہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر یہ بات سجاول کے کانوں میں پڑ گئی تو وہ طیش کی حالت میں اسے شوٹ کر دے گا۔

میں نے کہا۔ ''سجاول! دشمن جتنا خطرناک ہے، اس سے کہیں زیادہ عیار ہے۔ تمہیں ٹھنڈے دل دماغ سے کام لینا ہوگا۔ میں اور فخر بھی یہاں لالہ موسیٰ میں ہی موجود ہیں۔ تم آؤ...... مل بیٹھ کر کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خورسنہ اور ذیشان کے ذریعے وہ لوگ ہم پر کوئی پریشر ڈالنا چاہتے ہوں۔ ایسی صورت میں ان کی طرف سے رابطہ ہو سکتا ہے اور کوئی مطالبہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ تم، باقر اور فیض وغیرہ اپنے موبائل آن رکھو۔''

سجاول قریباً دس بجے ہمارے پاس لالہ موسیٰ پہنچ گیا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور چہرے کی ایک سائڈ ورم زدہ تھی۔ وہ آگ بگولا تھا۔ اس کی آنکھوں میں

الاؤ روشن تھے۔ اس نے کہا۔ ''میں اپنی ساری زندگی میں اس طرح کی دشمنی کا شکار نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ بدمعاش عورت کیا کر رہی ہے ہمارے ساتھ۔ ہم نے کالا علم کرنے والی عورتوں اور جادوگرنیوں کے بارے میں بس سنا تھا...... اب یہ بدذات جیتی جاگتی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے...... میں اسے زندہ جلا دوں گا...... ایسی بُری موت ماروں گا کہ دنیا دیکھے گی۔''

میں نے کہا۔ ''سجاول! بُری موت تو ہم ماریں گے مگر پہلے ہمیں ان کو بچانا ہوگا جو ہمارے اپنے ہیں اور اس کے قبضے میں ہیں۔''

سجاول نے وہیں بیٹھے بیٹھے دھڑا دھڑ کوئی ایک درجن فون کالز کیں اور اپنی ساری ڈوریاں حرکت میں لے آیا۔ اس کے درجنوں کارندے لالہ موسیٰ اور گرد و نواح میں پھیل گئے۔ آس پاس کے شہروں میں بھی اس کے جو ساتھی موجود تھے، وہ اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگے۔ پولیس میں سجاول کے جو ''خفیہ ہمدرد'' تھے وہ بھی یونس اور باناوانی کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ باناوانی اور اس کے ساتھیوں نے رحیم یار خان میں جو دو گاڑیاں استعمال کی تھیں ان کی نمبر پلیٹیں جعلی نکلی تھیں تاہم ان گاڑیوں کے رنگ اور ماڈلز وغیرہ کے ذریعے انہیں ہر جگہ ڈھونڈا جا رہا تھا۔ یونس کی پہچان اس کی سفید سوزوکی تھی۔ پھر ہم خود بھی دو تین گاڑیوں پر اس تلاش میں نکل کھڑے ہوئے...... اگلے چوبیس گھنٹے بڑے پریشان کن اور بھاگ دوڑ والے تھے۔ یونس، خورسنہ اور بچے کو ڈھونڈنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا جا رہا تھا مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

فخر اور میں فیض محمد کے ساتھ ٹویوٹا 8 ماڈل میں سوار تھے اور یونس کے آبائی گاؤں کا ایک ناکام چکر لگا کر ابھی ابھی لالہ موسیٰ واپس پہنچے تھے۔ فیض کو سجاول کے پاس چھوڑ کر ہم ہوٹل میں واپس آ گئے۔ خاصی تھکاوٹ ہو گئی تھی۔ فخر بے دم سا ہو کر صوفے پر لیٹ گیا، بولا۔ ''اگر خورسنہ اور بچے کو یرغمال بنایا گیا ہے تو پھر اب تک سجاول کو کوئی فون کال آ جانا چاہیے تھی۔''

''یہی بات زیادہ تشویش والی ہے کہ کسی کو کوئی ایسی کال نہیں آئی۔''

فخر نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ...... دونوں زندہ نہیں ہیں۔''

ایک دم میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ''فخر! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سجاول کچھ چھپا رہا ہو۔''

''کیا مطلب؟'' فخر بھی چونک گیا۔
''وہ کچھ چپ چپ لگ رہا تھا۔ ہم نے دو تین منٹ بات کی پر وہ بس ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا ہے...... کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی نے اس سے رابطہ کیا ہو اور وہ اس بات کو اپنے تک رکھ رہا ہو۔''
فخر بولا۔ ''میں تو اسے زیادہ جانتا نہیں ہوں۔ تم پرانے یار ہو۔ اس کے رویے کے بارے میں تم ہی بہتر بتا سکتے ہو۔''
میرا شک پختہ ہونے لگا تھا۔ میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پتا نہیں کیوں بار بار ذہن میں یہ شک شدت سے سر ابھارنے لگا کہ سجاول کچھ چھپا رہا ہے۔ کل شام تک اس کا رویہ کچھ اور تھا، اب وہ کچھ گول مول سی باتیں کر رہا تھا۔
میں نے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی دفعہ رابطہ نہیں ہوا مگر دوسری مرتبہ اس نے کال ریسیو کر لی۔ شراب تو وہ پہلے ہی پیتا تھا مگر اب حالات کی سختی نے اسے نشے میں ڈبو رکھا تھا۔ پہلے اس کی عزیزہ قتل ہوئی اور اس کی بھتیجی کو سرِعام بے لباس کر دیا گیا، پھر انیق کی جان گئی اور یہ جان سجاول نے خود اپنے ہاتھوں سے لی اور اب اس کی محبوب ہستی (جس نے اسے زندگی کا اور پیار کا مطلب سمجھایا تھا) اپنے بچے سمیت کسی بہت بڑی مصیبت کا شکار ہو چکی تھی۔
''سجاول کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''گھر واپس جا رہا ہوں۔''
''کہاں گئے تھے؟''
''ایک بندے سے ملنے نکلا ہوا تھا۔''
آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ لالہ موسیٰ کی کسی بارونق سڑک سے گزر رہا ہے اور گاڑی میں سوار ہے۔
''کوئی نئی خبر؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں، ابھی کوئی نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا اور فون بند کر دیا۔
فون بند ہوا ہی تھا کہ باقر کی کال آ گئی۔ وہ اس وقت جہلم شہر میں تھا اور اپنے سردار سجاول کی ہدایات کے مطابق خورسند اور یونس وغیرہ کی تلاش میں لگا ہوا تھا۔ وہ صبح سے دو بار مجھے فون کر چکا تھا۔ وہ اندر سے بے حد ڈرا ہوا تھا۔ اب بھی اس کی گفتگو کا موضوع وہی تھا۔ چھوٹتے ہی بولا۔
''وقاصے بھائی! میں تیرا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ یہ میری زندگی و موت کا سوال ہے۔ اگر سردار کو بھنک بھی پڑ گئی کہ تم نے مجھے یونس کے بارے میں خبردار کیا تھا، لیکن میں نے......''
''یار! تم نے پھر وہی فلم چلا دی ہے۔'' میں نے بیزار ہو کر اس کی بات کاٹی۔ ''تمہیں کہا ہے ناں، میں کچھ نہیں کہوں گا...... اب اسٹامپ پیپر لکھنے سے تو میں رہا۔'' میں نے فون بند کر دیا۔
تھوڑی دیر بعد پھر اس کا فون آ گیا۔ اس بار اس نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کی اور مجھے بتایا کہ اسے ایک چھوٹا سا کھوج ملا ہے۔ اس کے اور یونس کے ایک مشترکہ دوست سے رابطہ ہوا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس نے یونس کو دیکھا ہے۔''
''کہاں؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔
''لالہ موسیٰ کی طرح یہاں جہلم میں بھی یونس کا ایک پیٹرول پمپ ہے۔ کل وہ اپنی سفید رنگ کی گاڑی میں پیٹرول پمپ سے نکل رہا تھا جس دوست نے اسے دیکھا وہ بس میں سوار تھا اس لیے رک نہیں سکا۔ اب میں اسی دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔''
''ٹھیک ہے باقر! مجھے جلدی اس کے بارے میں بتاؤ بلکہ اگر کہو تو میں ابھی تمہارے پاس پہنچ جاتا ہوں۔''
''میں پہلے اس بندے سے مل لوں، پھر تمہیں فون کرتا ہوں۔''
''باقرے! جو غلطی تم کر چکے ہو، اس کا کفارہ اسی طرح ہوگا کہ اب کچھ کر کے دکھاؤ۔'' میں نے اس کو تحریک دی۔

......ٹھیک ایک گھنٹے بعد باقر کی طرف سے اطلاع آ گئی۔ لیکن یہ اطلاع باقر کی طرف سے نہیں، کسی اور کی طرف سے تھی، اور اس میں باقر کی موت کی اطلاع دی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے اس کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ اطلاع فیض محمد کے ذریعے ہی مجھ تک پہنچی۔ فیض محمد کی باتوں سے پتا چلا کہ باقر اپنے اور یونس کے مشترکہ دوست کے ساتھ شاید یونس تک پہنچ گیا تھا مگر یونس نے اسے مار ڈالا ہے اور اس کے دوست کا ''ریپ'' کر دیا ہے۔ یہ دوست دراصل ایک لڑکی تھی۔ باقر نے مجھ سے ڈھکے چھپے انداز میں بات کی تھی۔ باقر اس نرگس نامی لڑکی کے ساتھ یونس تک پہنچا تھا۔ یونس نے اس کے سینے پر پے در پے خنجر کے کئی وار کیے تھے اور موقع پر ہی ختم کر دیا تھا۔ اس نے نرگس کا ریپ کیا تھا اور ادھ موا چھوڑ کر غائب ہو گیا تھا۔
یہ خبر اپنے ساتھ شدید حیرت اور سنسنی لے کر آئی تھی۔ باقر نے فقط ایک گھنٹا پہلے مجھ سے بات کی تھی۔ وہ اپنی غلطی

کے سبب سردار سجاول سے ڈرا ہوا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ موت کسی اور شکل میں اس کے بالکل قریب پہنچ چکی ہے۔ اسپتال میں نیم بے ہوش لڑکی نے جو بیان دیا تھا اس کے بعد اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ یونس پمپ والا اب اسی خوفناک ''ٹرانس'' میں ہے جس میں اس سے پہلے انیق تھا۔ مخصوص دواؤں اور غیر معمولی ٹینشن کے زیرِ اثر وہ ہانا داوانی کے خطرناک ہرکارے کا روپ دھار چکا تھا۔

میں نے فیض محمد سے پوچھا۔ ''لڑکی نے اور کیا کہا ہے؟''

''سردار ابھی تھوڑی دیر پہلے پھر گاڑی پر کہیں نکلا ہے، ویسے میرا خیال ہے کہ ابھی تک اسے باقر والی خبر نہیں ملی ہے۔''

''اسے ابھی یہ خبر دینا بھی نہیں، وہ پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہے۔ میں آدھے گھنٹے میں خود وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

باقر کا سفاکانہ قتل اور لڑکی کا ''ریپ'' بڑے تشویش ناک واقعات تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ خورسنہ اور اس کے بچے کے ساتھ بھی برے سے برا ہو سکتا ہے۔ حالات نہایت تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ وہ عورت ایک آفت کی طرح یہاں آئی تھی اور نہایت سنگین وار کر رہی تھی۔ اس کی وحشت اور نفرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا تھا کہ اس نے میری ''قبر'' کے کتبے تک کے پرخچے اُڑا دیے تھے۔ اگر میرا چچا زاد ولید یا چچا حفیظ اس کے ہتھے چڑھ جاتے تو نہ جانے ان کا کیا حشر ہوتا۔

میرا دھیان ایک بار پھر رضوان، پہلوان حشمت اور تاجور وغیرہ کی طرف جانے لگا۔ ہانا داوانی میرے اور تاجور کے ''گہرے تعلق'' کو اچھی طرح جانتی تھی۔ میرے حوالے سے اس کی بے پایاں نفرت تاجور پر بھی حملہ آور ہو سکتی تھی۔ بہرحال تاجور کے حوالے سے مجھے کچھ تسلی بھی تھی۔ وہ اسلام آباد کے ایک ہائی سیکیورٹی علاقے میں اونچی دیواروں والے ایک محل نما گھر میں تھی۔ وہاں تک رسائی آسان نہیں تھی۔

میں فخر کے ساتھ سجاول کی رہائش گاہ تک پہنچا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ سجاول ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے اس سے ٹیلی فونک رابطہ کیا۔ بیل جاتی رہی مگر کال اٹینڈ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سجاول کا فون ہی بند ہو گیا۔ وہ پتا نہیں، کیا کرتا پھر رہا تھا۔ فخر نے کہا۔ ''شاہ زیب! تمہاری بات میں وزن ہے، اب مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ سجاول کوئی بات چھپا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خورسنہ اور ذیشان کو اغوا کرنے والوں نے سجاول سے کوئی رابطہ کیا ہو۔''

''بالکل ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسے باور کرایا گیا ہو کہ وہ کسی دوسرے کو اس معاملے میں ''انوالو'' نہیں کرے گا۔ ورنہ خورسنہ اور بچے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ ظاہر نہیں کرتا مگر خورسنہ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی جان اور عزت کے لیے چھوٹے سے چھوٹا خطرہ مول نہیں لے گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ...... وہ خود کو ہانا داوانی کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟''

''یقیناً سوچ سکتا ہے یا پھر تنِ تنہا کوئی ایسی کارروائی کر سکتا ہے جو اسے اور خورسنہ کو شدید خطرے میں ڈال دے۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟''

''فی الحال تو اس سے رابطہ ہونا چاہیے یا اسے یہاں واپس آنا چاہیے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں شاہ زیب کہ اسے باقر کی موت کی خبر مل گئی ہو اور مزید ڈسٹرب ہو گیا ہو۔ ایسی حالت میں اس سے کوئی بڑی غلطی ہو سکتی ہے۔''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''وہ ایک بڑے ڈکیت گینگ کا سردار ہے فخری! دنیا کا بہت سرد گرم دیکھا ہوا ہے اس نے...... کسی فاش حماقت کی توقع تو اس سے نہیں کی جا سکتی مگر اس کا شدید غصہ ضرور ایک تشویش ناک بات ہے۔''

ہم رات آخری پہر تک سجاول کے فون یا اس کی آمد کا انتظار کرتے رہے مگر یہ دونوں کام نہیں ہو سکے۔ سجاول کے حوالے سے اب ہماری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

سجاول کے جس فون کا انتظار تھا، وہ اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ آیا اور میرے ہی نمبر پر آیا۔ پتا نہیں کہ وہ کہاں سے بول رہا تھا اس نے بڑی عجلت میں اور فیصلہ کن لہجے میں مجھ سے بس ایک بات کہی۔ وہ بولا۔ ''شاہ زیب! میں بالکل خیریت سے ہوں لیکن فی الحال بار بار تم سے رابطہ نہیں کر سکتا۔ میں اس مسئلے کو اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اور لگتا ہے کہ میں کر لوں گا۔''

''خورسنہ اور بچے کا کچھ پتا چلا؟''

''سمجھو کہ چل گیا ہے۔ وہ اب تک خیریت سے ہیں لیکن میں اس بارے میں تمہیں زیادہ بتا نہیں سکتا۔ تم لوگ

تسلی سے رہو۔ فی الحال مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہوئی تو بتادوں گا۔'' اس کے لہجے کی تہ میں پریشانی اور عجلت صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سجاول، ایک طرف مجھے دوست بھی کہتے ہو اور دوسری طرف......''

''دیکھو شاہی، یہ ان باتوں کا وقت نہیں۔'' سجاول نے تیزی سے میری بات کاٹی۔

''میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اس وقت میرے بیوی بچے کے لیے کیا زیادہ بہتر ہے۔ اب ہوسکتا ہے کہ ایک دو دن کے لیے تمہیں میرا یہ نمبر بند ملے۔ میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں اس لیے پھر بات کریں گے۔'' اس کے ساتھ ہی سجاول نے کال ختم کردی۔

میں اور فخر، سجاول کی اس ہنگامی کال پر غور کرنے لگے۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا بندہ تھا۔ اس کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر آمادہ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ایک پیدائشی جنگجو تھا۔ کسی قدیم لڑاکا قبیلے کا خون اس کی رگوں میں دوڑتا تھا اور اس خون کی یورش اب اسے نجانے کس سمت بہا کر لے جارہی تھی۔

فخر نے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ سجاول نے خود کو باناوانی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا ہو؟''

''اس اسٹیج پر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اگر ایسا ہوگیا تو پھر وہ ضرور اسے اپنے ٹرانس میں جکڑے گی اور خطرناک طریقے سے استعمال کرے گی۔ عین ممکن ہے کہ وہ سجاول کو قسطینا، فارس اور زینب ابراہیم وغیرہ کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ وہ ایک جنونی عورت ہے۔ جاماجی میں سجاول نے اس کے بیٹے کا گلا اپنے ہاتھوں سے کاٹا تھا۔ اب یہ اس عورت کے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی کہ سجاول اپنے ہاتھوں سے اپنے ساتھیوں کی جان لے۔ لیکن...... ابھی ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ عین ممکن ہے کہ سجاول کے ذہن میں کوئی پلان ہو، وہ جس پر اکیلے عمل کرنا چاہ رہا ہو۔''

فخر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چلو، اتنی تسلی تو ہوئی کہ خورسنہ اور بچہ ابھی تک کسی نقصان سے محفوظ ہیں۔''

''یونس کے بارے میں میری تفتیش بڑھ گئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سوچنے والی بات ہے کہ اگر انیق جیسا مضبوط نوجوان، باناوانی کے جال میں اس بری طرح جکڑا جاسکتا ہے تو یونس کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو اس سے کوئی بھی کام لے سکتی ہے۔ مجھے زیادہ خطرہ، ڈاکٹر کرنل احرار، رضوان، پہلوان حشمت اور تاجور وغیرہ کی طرف سے ہے۔ باناوانی انہیں میرے قریبی ساتھیوں کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان سب کو اس خطرے کا احساس ہونا چاہیے۔''

''یہ احساس ہمارے سوا اور کون دلائے گا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ سب سے پہلے میں نے پہلوان حشمت راہی سے رابطہ کیا۔ وہ ابھی تک راولپنڈی میں قیام پذیر تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ فوراً سے پہلے میرے پاس لالہ موسیٰ پہنچ جائے۔ میں نے اسے یونس کے بارے میں بھی خبردار کیا۔ اس کے بعد میں نے طویل فاصلے کی اوورسیز کال کی اور جاماجی میں قسطینا یا ابراہیم سے رابطہ کرنا چاہا۔ تاہم یہ کوشش کامیاب نہیں ہوسکی۔ میں نے کرنل احرار سے رابطہ کیا۔ وہ اس وقت انڈیا میں تھے۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں ساری صورتِ حال بتائی اور محتاط رہنے کا کہا۔ میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ اپنے طور پر جاماجی میں قسطینا اور ابراہیم وغیرہ سے رابطہ کریں اور انہیں بتائیں کہ باناوانی اپنے بدقماش بیٹے رائے زل کے انتقام کے لیے کمربستہ ہے اور جنونی ہورہی ہے۔

میری ہدایت کے مطابق پہلوان حشمت شام تک لالہ موسیٰ کے اس ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ انیق کی موت کا غم اس کے ہمیشہ مسکراتے چہرے کو مستقل طور پر ڈھانپے ہوئے تھا۔ وہ اس پوٹلی کو اپنے ساتھ ساتھ لیے پھر رہا تھا جس میں تاجور کے زیورات تھے۔ پہلوان کو بھی یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ یہ وہی جیولری ہے جو میں نے تاجور کے لیے خریدی تھی۔ اس نے صاف لفظوں میں مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ ان زیورات کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ یہ تاجور بیٹی کے ہیں۔ وہی ان کو پہنے گی، چاہے کسی بھی شکل میں پہنے۔ اس نے انہیں بیچنے سے بھی انکار کردیا تھا۔

اسی رات دس بجے کے لگ بھگ مجھے رضوان کا ایک فون آیا اور اس نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یوں لگا کہ ہمارا ہر بدترین خدشہ حقیقت کا روپ دھار رہا ہے۔ رضوان نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! مجھے لگتا ہے کہ یونس یہاں آس پاس موجود ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ''مسجد میں عشا کی نماز کے بعد آج مولانا حبیب اللہ کا درس تھا۔ کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ مسجد کے سامنے سڑک پر دونوں طرف کافی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے مسجد کی اوپری منزل سے جہلم کی نمبر پلیٹ والی ایک

گاڑی دیکھی۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی یونس کو اس گاڑی میں دیکھ چکا ہوں۔ میرا چونکنا لازمی تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ گاڑی کے قریب ہی مجھے یونس بھی نظر آیا۔ فاصلہ کافی تھا۔ سڑک پر زیادہ روشنی بھی نہیں تھی مگر مجھے نوے فیصد یقین تھا کہ وہ یونس ہی ہے، میں مسجد کی چھت پر گیا۔ وہاں سے اپنا پستول لیا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ تب تک وہ گاڑی ریورس ہو کر بڑی سڑک کی طرف نکل گئی۔''

''گاڑی کا نمبر کچھ یاد ہے تمہیں؟''

''جہلم کا نمبر تھا۔ پہلے دو ہندسے تین اور سات تھے......''

میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ یہ وہی 86 ماڈل ٹویوٹا تھی جو لالہ موسیٰ کے قریب یونس کے پیٹرول پمپ پر کھڑی رہتی تھی۔ یعنی اب اس نے سفید سوزوکی چھوڑ دی تھی۔

میں نے کہا۔ ''رضوان! ایک دم چوکس ہو جاؤ۔ یہ وہی تھا۔ یہ اسی کی گاڑی تھی وہ بے حد خطرناک ہے۔ وہ قریباً چوبیس گھنٹے پہلے یہاں جہلم میں باقر چھوٹے کو بے دردی سے قتل کر چکا ہے اور اس کی دوست لڑکی کو خراب کر کے، تیسری منزل سے دھکا دے چکا ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ انیق کی طرح وہ بھی اپنے ہوش حواس میں نہیں ہے۔''

باقر کی موت کی خبر سن کر رضوان کو دھچکا لگا۔ تاہم وہ باہمت لہجے میں بولا۔ ''آپ بے فکر رہیں جی۔ میں اپنی حفاظت کر لوں گا۔ لیکن...... مجھے یہ پتا نہیں کہ اگر یونس سے آمنا سامنا ہو گیا تو مجھے کس حد تک جانا ہے۔ میرا مطلب ہے اگر فائر وغیرہ کی نوبت آ گئی تو؟''

''اگر کوئی زیادہ بری سچویشن ہو جائے تو اس کی ٹانگوں پر گولی مار سکتے ہو۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انیق کی طرح وہ بھی شکاری نہیں، شکار ہے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ تم چوکس رہو گے تو یہاں تک شاید نوبت نہ پہنچے۔ خود کو مسجد کے اندر ہی رکھو اور ارد گرد کے افراد سے باخبر رہو۔''

میں نے رضوان کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہم ابھی لالہ موسیٰ سے روانہ ہو کر اس کے پاس لاہور پہنچ رہے ہیں۔

☆☆☆

ہم صبح چھ بجے کے قریب لاہور میں تھے۔ گوٹھ موراناں کے زمیندار نے جو کار ہمیں استعمال کے لیے دی تھی، وہ ابھی ہمارے پاس ہی تھی، وہ دریا دل بندہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم جب تک چاہیں گاڑی استعمال کر سکتے ہیں۔

فخر اور پہلوان حشمت بھی میرے ساتھ ہی لاہور آئے تھے۔ پہلوان حشمت کی حیثیت مولانا حبیب کے مرید کی سی تھی۔ وہ واراہیوں کی خصلت کو جانتا تھا، اس لیے مولانا کی خیریت کے حوالے سے ہر وقت فکر مند رہتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مولانا کی حفاظت کے لیے ایک لمحے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ سکتا ہے۔

مولانا حبیب اللہ صبح کی نماز اور دیگر اعمال کے بعد کچھ دیر کے لیے سو جاتے تھے۔ وہ اس وقت بھی آرام فرما رہے تھے۔ ہم نے رضوان سے دس پندرہ منٹ کی ملاقات کی اور پھر مسجد کے قریب ہی واقع بازار کے ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ اس چھوٹے سے ہوٹل میں، میں ایک دفعہ پہلے بھی قیام کر چکا تھا۔ دوسری منزل سے مسجد کے سامنے چوراہا اور مسجد کے برآمدے وغیرہ دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے تین بیڈ کا ایک ہی کمرا لے لیا۔

پہلوان حشمت اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ ایک بار یہاں آیا ہے تو دوبارہ بھی آوے گا اور زیادہ چانس اس بات کا ہے کہ رات کو آوے گا۔ شروع رات میں مجھے ویسے بھی آج کل کم نیند آوت ہے۔ اگر تم کہو تو میں یہاں گیلری میں بیٹھ کر مسجد کے دروازے پر نظر رکھ لوں گا۔''

''لیکن اگر ہم یونس کو پکڑ بھی لیں تو وہ ہمیں ہاناوانی تک پہنچا سکے گا؟'' فخر نے سوال اٹھایا۔

میں نے کہا۔ ''تم جمع خاطر رکھو۔ اول تو اُسے پکڑنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ آنے کے بجائے خود ہی اپنی جان لینا بہتر سمجھے۔ لیکن اگر وہ ہماری گرفت میں آ گیا تو کم از کم یہ تو ہو گا کہ فوری طور پر رضوان کے لیے خطرہ ٹل جائے گا۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دو چار دن میں ہمارے لیے فائدہ مند ثابت ہو جائے۔''

''کیا مطلب؟'' پہلوان نے پوچھا۔

''جو دوائیں اس پر استعمال کی گئی ہوں گی، ان کا اثر کمزور پڑ جائے گا پھر ہاناوانی کی ٹیمپٹیشن بھی جب ''ری نیو'' نہیں ہو گی تو وہ ٹرانس سے باہر نکلنا شروع ہو جائے گا۔ یوں اس کی اپنی جان بھی بچ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں ہاناوانی کا کوئی سراغ بھی دے سکے۔''

ہوٹل میں رہتے ہوئے، رات تک ہم نے بھی مسجد اور اس کے ارد گرد کڑی نظر رکھی۔ کوئی مشکوک شخص یا گاڑی وغیرہ نوٹ نہیں ہوئی۔ سجاول کی اطلاع کے مطابق اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ بس ایک بار رفیق محمد سے رابطہ ہوا، اس نے بھی یہی اطلاع دی کہ سردار کا ابھی کچھ پتا نہیں، اس

کا کہنا ہے کہ جب ضرورت ہوگی وہ خود ہی ساتھیوں سے رابطہ کرے گا۔ فیض محمد اپنے ساتھی باقر کی موت پر ملول تھا۔ اس نے ایک اور بُری خبر دی اور وہ یہ کہ جس گجراتی لڑکی کو یونس نے تیسری منزل سے دھکا دیا تھا، وہ اسپتال میں دم توڑ گئی ہے۔

ہاناوانی ایک ناگن کی طرح لوگوں کو ڈس رہی تھی اور انہی بستیوں، انہی گلی کوچوں میں کہیں موجود تھی۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے مگر اس نے خود سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے دشمنوں کی جان نہیں لے گی، وہ ہمارے ہی ذریعے ہمیں مارنا چاہتی تھی۔

اس رات کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ مولانا حبیب اللہ سے میری مختصر ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور میرے سکونِ قلب کے لیے دعا کی۔ انہوں نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ ہجر و فراق میں رہنے کے بجائے میں کوئی اچھی، نیک لڑکی دیکھ کر نکاح کر لوں، انہیں کیا معلوم تھا کہ جس نے مجھے ہجر و فراق میں مبتلا کیا ہے، وہ ان کا اپنا خون ہے، ان کی بھانجی ہے۔ غیب کا علم اللہ کے سوا اور کس کو ہے۔ بزرگ و عالی مقام مولانا حبیب اللہ کو بھی نہیں تھا۔

یہ اگلی رات کا واقعہ ہے۔ یہ نو ساڑھے نو کا وقت تھا۔ پہلوان حشمت اپنی کوئی دوا لینے کے لیے قریبی میڈیکل اسٹور پر گیا تھا۔ وہ ہانپتا کانپتا ہوا واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ابھی یونس والی گاڑی مسجد کی عقبی سڑک پر دیکھی ہے۔ لگتا ہے کہ وہ آس پاس موجود ہے۔

''آپ کو یقین ہے کہ یہ وہی گاڑی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک سو ایک فیصد۔ کلیجی رنگ کی یہ کار میں نے خود بھی دیکھی ہوئی ہے۔ اب تو میں نے نمبر بھی پڑھا ہے۔ میں ٹھیک سے شکل نا ہیں دیکھ سکا ہوں لیکن میں جانت ہوں یہ یونس ہی تھا۔ وہ گول چکر سے ہو کر مارکیٹ کی طرف نکل گیا ہے۔''

پہلوان کی اطلاع کو نظرانداز کرنا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ میں فوراً ہوٹل سے نکلا اور مسجد میں رضوان کے پاس پہنچ گیا۔ آنے سے پہلے میں نے فخر اور پہلوان سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہوٹل میں ہی رہیں لیکن بالکونی سے اردگرد پر پوری نظر رکھیں۔

میں مسجد کے صحن سے گزر کر اس پورشن میں پہنچا جہاں مولانا کا حجرہ تھا اور حجرے کے ساتھ وہ دو تین کمرے تھے جن میں دینی کتابیں رکھی تھیں اور کوئی خاص مہمان آجاتا تو اس کی رہائش کا انتظام بھی تھا۔ ابھی کچھ لوگ مولانا سے ملاقات کر کے گئے تھے۔ رضوان ایک خادم کی حیثیت سے مصروف تھا۔ چائے کے برتن وغیرہ حجرے سے لے کر نکل رہا تھا، مجھے دیکھ کر ٹھٹکا۔ ''کیا ہوا شاہ زیب صاحب! خیریت تو ہے؟''

''ہے بھی اور نہیں بھی۔ مولانا کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈی جی خاں سے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے، ان کے ساتھ پاس والی مسجد میں گئے ہیں لیکن..... آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔''

''برتن رکھ کر آؤ، پھر بتاتا ہوں۔''

وہ دو منٹ میں واپس آگیا۔ میں اور وہ ایک برآمدے میں ستون کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ابھی اکّا دکّا نمازی مسجد کے صحن میں دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''رضوان مجھے لگتا ہے کہ تم اتنی احتیاط نہیں کر رہے، جتنی کرنی چاہیے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم موٹر بائیک پر کہیں سے آئے ہو۔''

''ان مہمانوں کے لیے چائے کا سامان لینے گیا تھا۔''

''پستول کہاں ہے تمہارا؟''

اس نے نیفے کے اوپر سے اپنی قمیص کو چھوا اور بتایا کہ پستول اس کے پاس ہے۔

میں نے کہا۔ ''یونس تمہارے آس پاس ہے۔ وہ کسی بھی وقت تمہارے سامنے آسکتا ہے۔ کسی نمازی کے بھیس میں منہ سر لپیٹ کر اندر داخل ہو سکتا ہے یا پھر اردگرد کی کسی سڑک پر تمہیں نشانہ بنا سکتا ہے۔''

''میں بھی اب تر نوالہ نہیں ہوں جناب۔'' وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ہموار داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ وہ کہیں نظر آئے اور ہم اُسے پکڑ سکیں۔''

''لیکن ہم اس کو ایزی نہیں لے سکتے رضوان۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اکیلا ہو۔ اس کے اردگرد ہاناوانی کے کارندے بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہر قدم احتیاط سے اٹھانا ہوگا۔ تم پوری طرح الرٹ ہو جاؤ، آج کی رات اہم ہے۔''

ہم تھوڑی دیر تک اس حوالے سے گفتگو کرتے رہے۔ اچانک رضوان ایک طرف دیکھ کر چونکا۔ کوئی بغلی دروازے سے اندر آیا تھا اور مسجد کے رہائشی حصے کی طرف

بڑھا تھا۔ رضوان کے چہرے کا رنگ بدلا اور پھر میرا بھی بدل گیا۔ یہ ایک برقع پوش لڑکی تھی جس کا گہرا براؤن شولڈر بیگ اس کے سیاہ برقع کا ہم رنگ ہی محسوس ہوتا تھا۔ میرا دل پکار کر بولا کہ یہ کوئی اور نہیں تاجور ہے۔ میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں۔ تاجور اسی طرح ایک دفعہ پہلے بھی نہایت خاموشی سے یہاں آئی تھی اور اپنے ماموں مولانا حبیب سے ملاقات کر چکی تھی۔ (اس وقت برقع کا رنگ اور اس کی تراش مختلف تھی)

میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں یہاں رضوان سے گفتگو کرتے ہوئے اسے یوں اپنے سامنے دیکھ لوں گا۔ وہ تو اسلام آباد میں اپنے سسرال میں تھی (دارج داراب چند دن پہلے اسے زبردستی میکے سے اپنے ساتھ لے گیا تھا) میں نے سوالیہ نظروں سے رضوان کی طرف دیکھا، وہ بھی حیرت کے شدید ریلے میں تھا۔ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''یہ تاجور صاحبہ ہی لگتی ہیں۔''

مجھے رضوان کی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سرتاپا برقع میں تھی مگر اس کے شانوں کی بناوٹ...... اس کی قامت اس کی چال سب کچھ گواہی دے رہا تھا کہ وہ تاجور ہی ہے۔ اس کے ساتھ میرا کچھ ایسا ناتا تھا کہ ہزاروں کے ہجوم میں اس کے سراپا کی ایک جھلک دیکھ کر میں اسے پہچان سکتا تھا کہ یہ تاجور ہے۔

رضوان نے سرگوشی کی۔ ''مجھے لگتا ہے جی، کہ یہ آج پھر مولانا سے ملنے آئی ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... تم انہیں بٹھاؤ اور بتاؤ کہ مولانا ابھی تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں۔''

رضوان۔ حجرے کی جانب چلا گیا۔ میں وہیں برآمدے میں بیٹھا اپنی سرپٹ دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ ایک خطرناک وقت میں ایک خطرناک جگہ پر آگئی تھی۔ یہ بات اب ظاہر تھی کہ ہانا وائی کچھ لوگوں کو بے دردی سے قتل کرنے کا پلان بنا چکی ہے...... اور یہ عین ممکن تھا کہ اس کی ہٹ لسٹ میں تاجور بھی شامل ہو۔ میری بے چینی ایک دم عروج پر پہنچ گئی۔ اس سے پہلے میں تاجور کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دارج داراب کی اونچی چار دیواری میں محفوظ ہے۔ اس کے اردگرد ہر وقت مسلح محافظ ہوتے ہیں لیکن آج وہ جس طرح اچانک یہاں نظر آئی تھی، میرے سارے اندیشے توانا ہو کر سانپوں کی طرح پھنکارنے لگے تھے۔

چند منٹ بعد رضوان نے واپس آ کر بتایا کہ وہ تاجور کو مولانا کے کمرے میں بٹھا آیا ہے۔ ''وہ کیا کہہ رہی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''پوچھ رہی تھیں کہ مولانا کتنی دیر میں آجائیں گے۔ میں نے کہا، زیادہ دور تو نہیں گئے۔ کچھ مہمان تھے ان کو دوسری مسجد میں چھوڑنے گئے ہیں، آدھ پون گھنٹے تک آجائیں گے۔ کہہ رہی تھیں کہ میں مولانا کو فون کر کے پوچھ لوں۔ میں نے انہیں بتایا ہے کہ مولانا فون یہیں پر بھول گئے ہیں۔''

تاجور، رضوان کو اچھی طرح جانتی تھی، وہ بھی تاجور کو جانتا پہچانتا تھا لیکن وہ جس طرح برقع میں لپٹی لپٹائی یہاں آئی تھی۔ اگر میں نے اسے پچھلی دفعہ بتایا نہ ہوتا کہ یہ تاجور ہے تو اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو پاتی۔

مسجد میں اب بھی اِکّا دُکّا لوگ آ جا رہے تھے۔ مین دروازے کے سامنے دو تین بھکارنیں بھی موجود تھیں۔ میں نے رضوان سے کہا کہ وہ درمیان والا دروازہ بند کر دے۔ یہ درمیان والا دروازہ ایک جنگلے کی صورت میں تھا اور مسجد کو رہائشی پورشن اور حجرے سے علیحدہ کرتا تھا۔ رضوان نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میں اٹھا اور رضوان کے ساتھ سیدھا، مولانا کے حجرے پر پہنچ گیا۔ رضوان باہر ہی کھڑا رہا، میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ سکڑی سمٹی ہوئی سی قالین پر بیٹھی تھی اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ میں ننگے پاؤں چلتا اس کے سامنے پہنچا۔ نقاب میں سے فقط اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ وہی دلنشیں آنکھیں جن کی دلکشی سیدھی دل میں اترتی تھی اور جسم و جاں کو جکڑ لیتی تھی لیکن فی الوقت ان آنکھوں میں صرف ہراس نظر آ رہا تھا۔ یہ ہراس اس لیے تھا کہ میں ایک بار پھر بالکل غیر متوقع طور پر اس کے سامنے موجود تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے نقاب کو تھوڑا سا مزید اوپر چڑھایا اور کچھ مزید سٹ گئی۔

میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ ''تم سات پردوں میں بھی چھپو تاجور لیکن میری نگاہوں سے چھپ نہیں سکتی ہو۔ تم جانتی نہیں ہو کہ تم بغیر کسی سیکیورٹی کے یہاں آ کر کتنی بڑی بے وقوفی کر رہی ہو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ڈبڈبائی آنکھوں سے میری جانب دیکھتی رہی۔

''یہاں بہت خطرہ ہے۔ چلو اٹھو۔ آؤ میرے ساتھ میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی۔ پتا نہیں کہ میرے اندر

اتنی جرأت کہاں سے آئی کہ میں نے اسے کلائی سے پکڑا اور اٹھا کر ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔ یہ وہی کمرا تھا جس میں دیوار گیر الماریوں کے اندر کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ یہاں ایک دفعہ پہلے بھی میری اور تاجور کی ملاقات ہو چکی تھی۔

میں نے اسے صاف ستھری چٹائی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میرا چھونا اسے بہت ناگوار گزرا تھا مگر وہ منہ سے کچھ بولی نہیں تھی جو ہاتھ میں نے پکڑا تھا وہ اس نے اپنے سیاہ برقع کے اندر چھپا لیا تھا جیسے اس ہاتھ کو اور اس کلائی کو مجھ سے بہت دور کر دینا چاہتی ہو۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو تم برقع کا اسٹائل اور رنگ وغیرہ بدل کر آئی ہو لیکن اس کے باوجود تمہیں پہچاننا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ تم جانتی نہیں ہو کہ تمہارے اردگرد حالات کتنے خراب ہیں اور یقیناً مولانا کو بھی اس کی خبر نہیں ہے...... تمہیں انیق کے بارے میں پتا چلا ہے یا نہیں؟''

اس کا سر بے ساختہ جھک گیا اور آنکھوں سے دو موتی جھڑ کر برقع میں جذب ہو گئے۔ وہ اشک بار آواز میں بولی۔ ''مجھے اتنا پتا چلا ہے کہ وہ قبائلی علاقے میں تھا، وہاں سجاول اور اس کے درمیان لڑائی ہوئی......''

''کیوں لڑائی ہوئی؟ یہ پتا نہیں؟''

''ان میں جھگڑا چل رہا تھا۔ انیق نے شاید سجاول کی کسی رشتے دار کو مار دیا تھا......''

''نہ صرف رشتے دار کو مار دیا تھا بلکہ اس کی بھتیجی کو سرِعام رسوا کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ سب وہی سلسلہ ہے تاجور جو میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں، تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ انیق اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا کسی اور کے کہنے پر کر رہا تھا۔ وہ ہر وقت تیز نشلی دواؤں کے اثر میں بھی ہوتا تھا۔ اس نے راولپنڈی میں میرے بارے میں بھی تم سے جو کچھ کہا وہ اسی اثر میں کہا۔ اس بدبخت عورت کی وجہ سے سیف کے بارے میں تم سے جھوٹ بولا، مجھے اس کا قاتل بنایا، اور تمہیں مجھ سے دور کیا۔ اب تو سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جانا چاہیے۔''

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی پھر بہت دھیمی آواز میں بولی۔ ''جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ پلیز...... آپ بھول جائیں ان باتوں کو۔''

''ہم ان باتوں کو بھول جائیں گے لیکن یہ ہمیں نہیں بھولیں گی۔ اب یہاں اس مسجد کی صورتِ حال ہی دیکھ لو۔ یہ خطرناک کیوں ہو رہی ہے؟ اس لیے کہ پہلے جو حالت انیق کی تھی وہ اب سجاول کے ایک ساتھی کی ہے۔ یہ وہی یونس ہے...... یونس پمپ والا جس نے لالہ موسیٰ میں مجھے موٹر سائیکل دی تھی اور میں نے تمہیں تمہارے والد تک پہنچایا تھا۔ اب سجاول کا وہ سب سے قریبی ساتھی اس کا دشمن بنا ہوا ہے۔ وہ خورسنہ اور اس کے بچے کو اغوا کر چکا ہے۔ سجاول کے ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے...... میرے اندازے کے مطابق کئی لوگ اس کی ''ہٹ لسٹ'' پر ہیں۔ وہ یہاں مسجد کے آس پاس رضوان ٹی کی تاک میں گھوم رہا ہے...... کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے...... بلکہ...... کسی وقت مجھے تمہاری طرف سے بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے ایک پاؤں پر سے برقع سرک گیا تھا۔ مہندی لگے سفید پاؤں میں چاندی کی پازیب نظر آ رہی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے نہایت قیمتی نیلم لگے ہوئے تھے۔ پازیب کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ سجاوٹ کے طور پر دو ڈھائی انچ لمبی ایک نقرئی زنجیر بھی تھی۔ کہنے کو تو یہ آرائشی زنجیر پازیب کی ڈیزائننگ کا حصہ تھی، لیکن درحقیقت یہ علامت تھی اس غلامی اور محکومیت کی جو دارج جیسے لوگ کمزور عورت پر روا رکھتے ہیں۔ میں نے ملازمہ فردوس کی زبانی سنا تھا کہ دارج کی والدہ نے اپنی بہو (تاجور) کو قیمتی گہنوں سے لاد دیا ہے۔ شاید عمرانیات کے کچھ ماہر ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ان بھاری بھرکم گہنوں کے ڈانڈے تاریخ کے اس دور سے جا ملتے ہیں جب عورتوں کو اپنے بس میں رکھنے کے لیے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں۔

وہ مجھ سے نظریں چرا کر بولی۔ ''میں تو باہر نکلتی ہی نہیں ہوں۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ لاہور آئی ہوئی تھی اس لیے چند منٹ کے لیے ماموں جان سے ملنے چلی آئی۔''

''لاہور کس سلسلے میں آئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کا علاج ہو رہا ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ ''ان'' سے تاجور کی مراد دارج دارا ب ہی تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی، وہی ہوا جس کا اندیشہ ہم پچھلے 48 گھنٹے سے محسوس کر رہے تھے۔ مسجد کے عین سامنے چوراہے کی طرف سے اوپر تلے تین فائر سنائی دیے۔ پھر مسجد کے گیٹ کی طرف سے بھی پمپ ایکشن کی آواز آئی۔ یہ فائر یقیناً گارڈ نے کیا تھا۔ میں نے قمیص کے نیچے سے اپنا بریٹا پسٹل نکال لیا...... لیکن میری سمجھ میں نہیں

آیا کہ باہر جاؤں یا یہیں تاجور کے پاس رہوں۔ وہ بے طرح خوف زدہ ہوگئی تھی اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسی اثنا میں مجھے چھت کی طرف سے رضوان کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ کسی کو للکار رہا تھا۔ پھر اوپر تلے چار پانچ گولیاں چلیں۔ اب اس میں شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ آس پاس منڈلاتے یونس نے بالآخر رضوان کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اتنی تسلی ضرور تھی کہ فخر اور پہلوان حشمت بھی چوکس ہیں اور وہ رضوان کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

فائرنگ ایک دم تھم گئی اور پھر سڑک کی طرف سے لوگوں اور راہ گیروں کا شور سنائی دینے لگا۔ میں رضوان کی طرف سے فکرمند تھا۔ یہ فکرمندی جلد ہی ختم ہوگئی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے رضوان کی آواز پہچان کر دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ ہانپی آواز میں بولا۔ ''یہ یونس تھا...... مارا گیا ہے اس کا ایک ساتھی......خود بھاگ گیا ہے۔''

''مرا کون ہے؟ اور مر ہی گیا ہے یا زخمی ہے؟''

''مر گیا ہے جی۔ بیکری کے سامنے لاش پڑی ہے۔ شکل سے میں نہیں جانتا۔ کوئی کرائے کا ٹٹو ہی لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اسے فخر صاحب نے ہوٹل کی بالکونی سے فائر مارا ہے، اور ٹھیک مارا ہے، نہیں تو اس نے نقصان کرنا تھا، مشین پسٹل تھا اس کے پاس۔''

باہر سے کوئی رضوان کو آوازیں دے رہا تھا۔ ''ابھی آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور باہر کی طرف لپک گیا۔

میں نے سکڑی سمٹی تاجور کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ٹھیک کہا تھا ناں میں نے۔ یہاں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ تم نے غلطی کی یہاں آکر...... اب دیکھنا دو چار منٹ میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔ مسجد کو بھی گھیر لیں گے وہ لوگ۔ پھر تمہارا یہ برقع تمہاری شناخت نہیں چھپا سکے گا۔''

وہ خوف زدہ ہوکر بولی۔ ''مجھے کسی طرح یہاں سے نکال دیں۔''

میں نے چند لمحے سوچا۔ پھر اپنا پستول دوبارہ قمیص کے نیچے لگایا اور بغلی دروازے سے گزار کر تاجور کو ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔

یہاں ایک تنگ سی راہداری تھی جس کا اختتام مسجد سے باہر ایک بغلی گلی میں ہوتا تھا، یہ ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے خوف زدہ نظروں سے چوراہے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ کسی نے ہم دونوں کی طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ ہم تیس چالیس قدم چل کر اس ہوٹل کی طرف گئے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ گاڑی جو ہمارے زیرِاستعمال تھی، باہر ہی کھڑی تھی۔ اس کی چابی میری جیب میں تھی۔ گاڑی کھول کر اس کے اندر بیٹھنے میں ہمیں چند سیکنڈ ہی لگے۔ یہی وقت تھا جب پولیس موبائلز کے سائرن سنائی دینے لگے۔ میں نے دیکھا گاڑی سے پندرہ بیس قدم کی دوری پر پہلوان حشمت موجود تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی شور مچاتا ہوا گاڑی کی طرف لپکے گا۔ لیکن پھر نیم تاریکی کے باوجود اس نے مجھے پہچان لیا اور اسے اطمینان ہوگیا کہ گاڑی چوری نہیں ہو رہی۔ تاہم اس کے چہرے پر شدید حیرت بدستور موجود رہی۔ یقیناً یہ حیرت برقع پوش تاجور کے حوالے سے تھی۔ میں نے گاڑی کو نوے کے زاویے پر موڑا اور تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا بڑی سڑک پر آگیا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔

''فی الحال تو یہاں سے دور جا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''پلیز، مجھے جلدی سے گھر پہنچا دیں۔ میں زیادہ دیر باہر نہیں رہ سکتی۔ اسپتال سے کسی بھی وقت خالہ جان کا فون آسکتا ہے۔'' خالہ جان سے اس کی مراد اپنی ساس ہی تھی شاید وہ اپنے بیٹے کے پاس اسپتال میں تھی۔

تاجور سے چند باتیں کرنے کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ میں نے ڈیڑھ دو کلومیٹر دور آکر گاڑی ایک مارکیٹ کی نیم روشن پارکنگ میں گاڑیوں کے درمیان روک دی۔ وہ جیسے پہلے ہی جانتی تھی کہ میں راستے میں کہیں گاڑی روک دوں گا، اس لیے خاموش بیٹھی رہی۔ یہ وسیع وعریض پارکنگ کافی پُرسکون تھی۔ پارکنگ والا ہمیں ٹوکن تھما کر واپس چلا گیا۔ اس نے بے قراری سے اپنی بیش قیمت رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی اور بولی۔ ''دس بج گئے ہیں۔ بہت دیر ہو جائے گی، پلیز مجھے چھوڑ آئیں۔''

میں نے کہا۔ ''اپنے ماموں جان کے پاس بھی تو تم نے آدھ پون گھنٹا بیٹھنا ہی تھا۔''

وہ کچھ بولی نہیں بس کسمسا کر رہ گئی۔ ہمارے درمیان کچھ دیر، مسجد کے سامنے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بات ہوئی پھر میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں

کہا۔ ''تاجور! میں نے سنا ہے کہ دارج تمہیں زبردستی میکے سے اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ دین محمد صاحب سے بھی سخت بدتمیزی کررہا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں شاہ زیب! میں خوش ہوں۔ چھوٹی موٹی باتیں تو گھروں میں ہوتی رہتی ہیں اور انہوں نے کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر میں نہیں جانا چاہتی تو بتادوں...... اور''

''اور تم گنگ سی ہوگئی ہوگی۔ تمہیں اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی ہوگی کہ تم انکار کرسکو۔ تم سرتاپا اس شخص کے خوف میں جکڑی جاچکی ہو۔''

''میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ ایسا کچھ نہیں ہے شاہ زیب۔'' وہ زور دے کر بولی۔ ''اور دیکھیں پچھلی دفعہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی اس معاملے میں مجھ سے بات نہیں کریں گے۔ کبھی میری راہ میں نہیں آئیں گے۔''

''اب بھی میں تمہاری راہ میں نہیں آیا ہوں۔ تم خود آئی ہو ایک ایسی راہ پر جہاں تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب سوچو اگر میں وہاں پر نہ ہوتا اور تمہیں نکال کر یہاں نہ لے آتا تو شدید امکان تھا کہ تم اس وقت پولیس کی تحویل میں ہوتیں۔ یقیناً تمہارا یہ برقع بھی کسی کام نہ آتا۔ پولیس کو پتا چلتا کہ داراب خاندان کی نوبیاہتا بہو یوں بھیس بدل کر اپنے ماموں سے ملنے آئی ہے، تو یہ خبر کہاں تک پہنچتی اور میڈیا اسے کس طرح اچھالتا۔''

''مم...... میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے افسوس ہورہا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ پلیز، اب آپ بھی مجھے اس غلطی کی سزا نہ دیں۔ مجھے جلد از جلد گھر چھوڑ آئیں۔ وہ اسپتال میں ہیں۔ کسی بھی وقت پی ٹی سی ایل پر مجھے فون کر سکتے ہیں۔''

''اسلام آباد چھوڑ کر وہ یہاں لاہور کے اسپتال میں کیوں آگیا ہے؟''

''مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں ہے۔ ان کے علاج کے لیے باہر کے ملک سے ہڈیوں کا کوئی بڑا ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ اس کے کہنے پر انہیں لاہور کے ایک پرائیویٹ کلینک میں لایا گیا ہے۔ یہ کلینک پاکستان اور آسٹریا کے ڈاکٹرمل کر چلاتے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟''

''بڑے ڈاکٹر صاحب نے پرسوں بہت امید دلائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دو دن میں ان کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک چھوٹا سا آپریشن کیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ بڑے آپریشن کی ضرورت نہ پڑے اور وہ ٹھیک ہوجائیں۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی وہ ٹھیک نہیں اور اس نے تمہارا یہ حال کررکھا ہے۔ سوچو جب وہ ٹھیک ہوجائے گا تو کیا سلوک کرے گا تمہارے ساتھ۔ اس کا تکبر تمہیں ایک چیونٹی کی طرح روند کر رکھ دے گا اور یہی کچھ تمہارے گھر والوں کے ساتھ ہوگا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ اسی طرح بستر پر لیٹا رہے۔''

''ایسا مت کہیں، جو کچھ بھی ہے۔ اب وہ میرے شوہر ہیں۔ میرا جینا مرنا ان کے ساتھ ہے۔''

''جینے کی بات تو نہ کرو، مرنے کی کرو۔ وہ مار ڈالے گا تمہیں۔ تمہیں تازہ ہوا کی ایک ایک سانس کو ترسا دے گا۔''

''وہ...... وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ میرے بغیر چند گھنٹے بھی نہیں گزارتے۔ بس...... ان کا مزاج اور طرح کا ہے۔''

''یہ وہی پیار ہے جو ہم قربان کرنے والے بکرے سے کرتے ہیں۔ اس کے ناز نخرے بھی اٹھا لیتے ہیں مگر ساتھ ساتھ چھری بھی تیز ہورہی ہوتی ہے اور جو پیار وہ تم سے کرتا ہے اس کی ایک نشانی تمہاری یہ کپکپی اور تمہارا یہ پسینا بھی ہے۔ تم بار بار گھڑی دیکھ رہی ہو اور خوف زدہ ہو کہ اگر اسے تمہاری جسارت کا پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔ کس طرح کی قیامت ٹوٹے گی تم پر...... واہ بہت خوب...... بڑا انوکھا قسم کا رومانس ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بھرائی آواز میں بولی۔ ''شاہ زیب! آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں...... اور میرا خیال ذہن سے نکال دیں۔ اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ میں کسی وقت دوبارہ اپنی مرضی سے آپ کی طرف پلٹ سکتی ہوں...... تو ایسا نہیں ہوگا۔ خدانخواستہ وہ ساری عمر بھی بستر پر رہتے ہیں تو میں ان سے دور نہیں جاؤں گی۔''

''کیا شوہر پرستی ہے...... کیا وفاداری ہے...... کیا محبت ہے لیکن محبت تو آنکھوں میں نظر آیا کرتی ہے تاجور بی بی۔ تمہاری آنکھوں میں مجھے دہشت اور خوف کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسی ڈری ہوئی عورت کا انتظار میں کیوں کروں گا؟ میں اس عورت کو نہیں جانتا جس لڑکی کو میں جانتا تھا وہ کوئی اور تھی۔ میں اُس سے پیار کرتا ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک کرتا رہوں گا۔''

میں نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔ دھچکا لگنے سے وہ ساری جیولری جھنجھنا اٹھی جو اس کی کلائیوں اور گلے

وغیرہ میں موجود تھی مگر برقع کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ بس عجیب دکھی نظروں سے میری طرف دیکھ کر رہ گئی۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر پھر اس نے رخ پھیر لیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ایک ایمبولینس ہمیں اوورٹیک کرتے ہوئے گزر گئی۔ کیا پتا تھا کہ اس میں اسی شخص کی لاش ہو جو تھوڑی دیر قبل مسجد کے سامنے چوراہے میں مارا گیا تھا۔ مسجد میں پیش آنے والے واقعات میری نگاہوں میں گھومنے لگے، یقیناً تاجور کی آنکھوں میں بھی گھوم رہے ہوں گے۔ وہ خاموش تھی مگر اس کے جسم کا انگ انگ یہ کہہ رہا تھا کہ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی ہے۔

اسی دوران میں تاجور کے فون پر کال کے سگنل آئے۔ اس نے اسکرین دیکھی اور پھر کچھ دیر شدید تذبذب میں رہنے کے بعد کال ریسیو کر لی۔ دوسری طرف سے جو بھاری بھرکم آواز سنائی دی، میں نے اسے مدھم ہونے کے باوجود پہچان لیا، اور اس کے ساتھ ہی جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ دارج کی آواز تھی۔ دارج داراب جس میں ایک خودسر رئیس زادے کی تمام تر خصوصیات موجود تھیں، اس نے تاجور سے پوچھا تھا۔ ''کہاں ہو؟''

''مم...... میں یہیں پر ہوں۔ آپ...... کہاں ہیں؟''

''میں گھر پہنچ چکا ہوں...... لیکن تم مجھے یہاں کہیں نظر نہیں آرہی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تم کسی سڑک پر ہو۔''

''میں...... دراصل...... مجھے بہت درد ہو رہا تھا دانت میں...... آپ کی امی تو آپ کے پاس اسپتال گئی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ڈاکٹر کو دکھانے خود ہی یہاں سامنے مارکیٹ میں چلی آئی۔'' تاجور کی آواز بری طرح کانپ رہی تھی۔

''تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں۔ اکیلی چلی آئیں۔ کسی کو بتایا تک نہیں۔'' دارج دہاڑا۔

''مم...... میں نے کہاں ہے ناں کہ میں نے کسی کو پریشان کرنا ٹھیک نہیں سمجھا۔ میں برقع پہن کر نکلی ہوں۔ کسی کو پتا نہیں چلا۔''

وہ چلایا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم واقعی اپنے ہوش میں نہیں ہو، یہ طریقہ ہے گھر سے نکلنے کا۔ رات کا ٹائم ہے اور منہ اٹھا کر نکل گئی ہو...... اور وہ بھی اکیلی؟...... مر گئے تھے نوکر اور باقی سارے لوگ؟ کہاں ہو اس وقت تم؟''

''میں ٹیکسی میں ہوں...... بس پہنچ رہی ہوں دس منٹ میں۔''

وہ دانت پیس کر بولا۔ ''پہنچو...... پہنچو...... پوچھتا ہوں تم سے۔'' اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

تاجور نے برقع کے پلو سے چہرے سے پسینا پونچھا اور حواس باختہ لہجے میں بولی۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا۔ وہ گھر آگئے ہیں۔ ان کی امی بھی آگئی ہیں۔ شاید عارضی طور پر چھٹی مل گئی ہے انہیں۔ میں نے غلطی کی نکل کر......'' خوف کی شدت سے اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ وہ تمہارا شوہر ہے اور تمہارے بقول تم سے محبت بھی کرتا ہے تو پھر اسے تم پر بھروسا ہونا چاہیے۔''

''وہ بھروسا کرتے ہیں مگر......'' وہ گڑبڑا کر خاموش ہو گئی۔

وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں تھی۔ اس کے چہرے کا بس تھوڑا سا حصہ ہی نظر آرہا تھا اور اس پر پسینے کی نمی تھی، اس کے سینے کا زیروبم بھی اس کی بے کلی کی چغلی کھا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہو گی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے منہ سے بے ساختہ ایک جھوٹ نکل گیا تھا اس نے کہا تھا کہ وہ ڈاکٹر کو دانت دکھانے قریبی مارکیٹ میں آئی ہے۔ اگر دارج تفتیش پر اتر آتا تو چند منٹ میں یہ جھوٹ آشکار ہو سکتا تھا۔

تین چار منٹ کی کوشش کے بعد اس نے خود کو قدرے سنبھالا اور دھیمی آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اپنی آواز کا کھوکھلا پن شاید خود اسے بھی محسوس ہوا ہو گا۔

اس کے بعد اس نے اور کچھ نہیں کہا، سوائے اس کے کہ ایک دوبار مجھے یہ بتایا کہ مجھے کس طرف مڑنا ہے۔ ہم نیو مسلم ٹاؤن کے علاقے میں تھے۔ ایک جگہ اس نے مجھے گاڑی روکنے کا کہا۔ ''کون سی کوٹھی ہے؟'' میں نے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔

''ساتھ والی لین میں...... لیکن میں یہیں اترنا چاہتی ہوں۔ ایک منٹ کا راستہ ہے۔ مم...... میں پیدل جاتی ہوں۔''

وہ اتر گئی، اس کی پریشانی اس بات سے عیاں تھی کہ وہ اپنا موبائل وہیں نشست پر چھوڑ گئی۔ چند قدم آگے گئی تھی کہ میں نے اسے آواز دی۔ ''تمہارا موبائل۔''

وہ جیسے لڑکھڑا کر واپس پلٹی اور میرے ہاتھ سے موبائل لے کر پھر آگے بڑھ گئی۔

یہ وہ آن بان والی، طرح دار تاجور تھی جو چاند گڑھی کی گلیوں میں ایک روشن لکیر کی طرح چمکتی تھی اور جدھر سے گزرتی تھی، لوگوں کی نگاہوں سے پیار اور اپنائیت سمیٹتی چلی جاتی تھی۔ وہ چوہدری دین محمد کی وہ ہر دلعزیز لختِ جگر تھی جس کو قدرت نے خاص قسم کی دلکشی اور ذہانت سے مالا مال کیا تھا۔ آج وہ ایک ''زبردست'' کے پنجۂ ستم میں تھی اور جیسے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی۔

اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کہا تھا کہ وہ جس طرح کی زندگی بھی جی رہی ہے، یہ اس کی اپنی زندگی ہے، میں اس میں مداخلت نہ کروں...... یہ بات کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں التجا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے گہری سانس لی۔ وہ اب نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور یوٹرن لے کر واپس چل دیا لیکن میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں شاہ زیب تھا، اور میں نے زندگی میں یہی سیکھا تھا کہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر اسے تنہا نہیں چھوڑنا۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، اس نے میرے سینے کو شق کر ڈالا ہوا تھا۔ میرے دل و دماغ میں ایک زلزلہ برپا تھا۔ یوٹرن لے کر میں نے گاڑی کو ایک درمیانی لین پر روکا اور اتر کر پیدل اس سمت بڑھا جدھر تاجور گئی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد مجھے سڑک کے درمیان ایک بیریئر نظر آیا...... اور پھر وہ عظیم الشان کوٹھی بھی نظر آ گئی جس میں تاجور داخل ہو رہی تھی۔ ایک سیکیورٹی گارڈ مؤدب انداز میں اس کے عقب میں تھا۔

میں آگے نہیں جا سکتا تھا اور واپس جانے کو بھی ہرگز دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسی دوران میں مجھے ایک کورے کار عظیم الشان کوٹھی کے مین گیٹ سے باہر نکلتی نظر آئی۔ بانس کا بیریئر ہٹایا گیا اور چھوٹی سی گاڑی دھیمی رفتار سے چلتی میری طرف بڑھنے لگی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس میں صرف ایک شخص موجود تھا۔ میں تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر ''موڑ'' کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ گاڑی قریب پہنچی تو میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ گاڑی میں تیس پینتیس سال کا ایک جواں سال شخص موجود تھا۔ وہ کلین شیوڈ تھا اور پینٹ قمیص پہن رکھی تھی۔ گاڑی کی اسکرین پر مبشرا اسپتال کا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس شخص کا تعلق کسی طور میڈیکل کے پروفیشن سے ہے۔

اس نے کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے اتارا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی 2008ء ماڈل کار کی طرف اشارہ کیا اور پریشان صورت بنا کر کہا۔ ''میری گاڑی خراب ہو گئی ہے، اگر آپ مجھے کسی آٹو ورکشاپ تک پہنچا دیں تو میں مکینک کی مدد حاصل کر لوں گا۔''

وہ چند لمحے تذبذب میں رہا پھر خرابیٔ قسمت کی بنا پر اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں شکریہ ادا کر کے اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''جو بھی قریبی ورکشاپ ہے بس مجھے وہاں ڈراپ کر دیجیے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بار پھر مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ ''یہاں کس کے ہاں آئے ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''رحیم بیگ صاحب، ساتھ والے بلاک میں رہتے ہیں۔'' میں نے یونہی اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ پوچھتا میں نے کہا۔ ''اور آپ؟''

''میں یہاں ملازم ہوں، داراب ہاؤس میں۔''

''آپ تو مجھے ڈاکٹر لگے تھے۔''

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''نہیں، ڈاکٹر تو نہیں...... لیکن کام ڈاکٹر سے ملتا جلتا ہی ہے۔ داراب ہاؤس میں ایک مریض ہیں، ان کے لیے ''میڈیکل اٹینڈنٹ'' کے طور پر کام کرتا ہوں۔''

مجھے مزید کریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ وہ جس مریض کی بات کر رہا ہے، وہ یقیناً دارج ہی ہے۔ اس کا نصف زیریں حصہ بیکار تھا اور اسے اپنی ضروریات کے لیے ہر وقت ایک مددگار کی ضرورت رہتی تھی۔

میرے ذہن میں خیالات تیزی سے پنپ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہیں آپ؟''

اسے میری دخل در معقولات اچھی نہیں لگ رہی تھی تو شاید بُری بھی نہیں لگ رہی تھی، بولا۔ ''میرے والد سیڑھیوں سے پھسل گئے ہیں۔ اسپتال میں ہیں۔ انہیں دیکھنے جا رہا ہوں۔ اللہ کرے انہیں زیادہ چوٹیں نہ آئی ہوں۔''

میں نے بریٹا پسٹل نکالا اور اس شخص کی پسلیوں سے لگا دیا۔ اس نے چونک کر پستول کی طرف دیکھا پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کی توجہ سڑک کی طرف سے مکمل طور پر ہٹ گئی تھی، گاڑی لہرا گئی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو سہارا دیا ورنہ وہ فٹ پاتھ پر چڑھ جاتی۔

''گھبراؤ نہیں...... نقصان نہیں پہنچاؤں گا لیکن اگر شور مچاؤ گے تو فائر کرنے میں بھی دیر نہیں کروں گا۔''

میرے لب و لہجے نے اسے سکتہ زدہ کر دیا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ایک چلڈرن پارک کا جنگلا نظر آرہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ میں پارک کے سامنے کھلی جگہ بھی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''گاڑی وہاں روک دو۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس کے جسم میں نمودار ہونے والی کپکپی میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ وحشت زدہ آواز میں بولا۔ ''میرے پاس صرف دو ڈھائی ہزار روپیا اور موبائل ہے تم چاہو تو لے سکتے ہو۔''

''اور گاڑی بھی تو تمہاری ہوگی۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''یہ اسپتال کی ہے...... لے جانا چاہو تو لے جا سکتے ہو...... مگر...... وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''مگر کیا؟ یہ بھی بتا دو۔''

وہ میری طرف دیکھ کر گویا ہوا۔ ''داراب فیملی کا نوکر ہوں۔ تمہیں پتا ہوگا یہ معمولی لوگ نہیں ہیں۔ تمہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اگر نقدی اور موبائل لے جانا ہے تو لے جاؤ، میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔''

میں نے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، یہ چیزیں اپنے پاس ہی رکھو اور گاڑی بھی رکھو، لیکن جو کچھ میں پوچھوں گا تمہیں بتانا پڑے گا اور جو کچھ کہوں گا وہ ماننا پڑے گا، ورنہ یہ دارابی شرابی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اگر کچھ بگاڑ بھی لیا تو تمہیں اس سے کیا فائدہ؟ تم تو اس سے پہلے ہی قبر میں اتر چکے ہو گے۔'' میں نے پستول اس کی بائیں پسلیوں میں چبھویا۔

اس نے اردگرد دیکھا۔ اب رات کے قریباً گیارہ بج چکے تھے۔ لوگ اپنی وسیع کوٹھیوں میں بند تھے۔ چلڈرن پارک بھی تقریباً خالی ہی نظر آرہا تھا۔ رات زیادہ نہیں ہوئی تھی لہٰذا گارڈز وغیرہ ایزی موڈ میں تھے۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''تم چاہتے کیا ہو مجھ سے؟''

''سوال مت پوچھو، صرف جواب دو۔'' میں نے خطرناک لہجہ اختیار کیا۔ ''شادی شدہ ہو؟''

''ہاں، دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

''تمہارا والد کس اسپتال میں ہے؟''

''داراب فیملی کا ہی ایک ٹرسٹی اسپتال ہے، جیل روڈ کے قریب۔''

''اگر تمہارے والد کو زیادہ چوٹیں آگئی ہوں اور تم اس کی تیمارداری کی وجہ سے واپس ڈیوٹی پر نہ آسکو...... تو پھر کیا ہوگا؟''

''ہم...... مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہی ہے۔ انہیں کافی چوٹیں آئی ہیں۔ میرا ایک پھوپھی زاد بھائی زید ہے۔ وہ بھی میڈیکل اٹینڈنٹ ہے۔ آج کل شیخوپورہ میں ہے۔ مجھے اس کو بلانا پڑے گا، چند دن کے لیے۔''

میں نے ذرا توقف کر کے پوچھا۔ ''تمہارے اس بھائی کو داراب فیملی کے لوگ جانتے ہیں؟''

''نہیں...... اس سے پہلے کبھی کوئی ایسا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ لل...... لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''پھر سوال۔ تمہیں کہا ہے ناں باسٹرڈ! تمہیں صرف جواب دینے ہوں گے۔'' میں نے پستول کا بیرل پھر اس کی پسلیوں میں چبھویا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سر کے بالوں کو جکڑ لیا۔ اسے مزید دباؤ میں لانے کے لیے یہ گرم مزاجی ضروری تھی۔

وہ اب باقاعدہ لرز رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس میں جھلاہٹ آمیز طیش بھی نمودار ہو رہا تھا، وہ بولا۔ ''دیکھو...... تم مجھ سے بدمعاشی کی زبان میں بات کر رہے ہو لیکن ایک بات دماغ میں رکھو، تم سے بڑے بڑے بدمعاش بھی اس شہر میں موجود ہیں۔ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں ایک بندے سے تمہاری صرف سلام دعا کرا دیتا ہوں۔ اس کے بعد بھی اگر تم مجھ سے زبردستی کرنا چاہو گے تو پھر کر لینا......''

''اوہو...... تو اب دھمکیاں بھی دو گے...... چلو ٹھیک ہے...... کون سارانی خاں کا سالا ہے، جو تمہارے کہنے پر مجھ کو شرفِ ملاقات بخشے گا۔'' میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارے ہی ''قبیلے'' کا ہے...... تم جانتے ہو گے اس کو...... داؤد بھاؤ۔''

مجھے واقعی شاک لگا۔ بہرحال میں نے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کسی نقلی داؤد بھاؤ سے تو یارانہ نہیں لگا بیٹھے ہو۔ اتنے جوگے مجھے لگتے نہیں ہو تم۔''

''میں نے پورے چار سال تک داؤد بھاؤ کے بیمار والد کی دیکھ بھال کی ہے۔ ہم...... میری بہت قدر کرتے ہیں وہ۔''

صورتِ حال دلچسپ ہو رہی تھی۔ میں نے نشست سے ٹیک لگائی اور پستول کا دباؤ اس کی پسلیوں پر تھوڑا سا کم

کردیا۔ ''اگر تم نے داؤد بھاؤ کا نام لے ہی لیا ہے تو پھر ذرا ثبوت بھی فراہم کردو، لیکن کوئی اور بات نہیں کرو گے ان سے...... صرف اور صرف سلام دعا کراؤ گے اور یاد رکھنا میں داؤد صاحب کی آواز پہچانتا ہوں۔''

اس کی شدید گھبراہٹ میں اب کمی واقع ہونا شروع ہوگئی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا سیل فون نکالا اور ایک نمبر تلاش کرکے اسے پریس کیا۔ بیل جاتی رہی لیکن کال اٹینڈ نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر کوشش کی۔ اس مرتبہ چار پانچ سیکنڈ بعد کال اٹینڈ ہوگئی۔ داؤد بھاؤ کی بھاری بھرکم آواز گاڑی کے مختصر خلا میں گونجی۔ ''ہیلو۔''

میں سعید بول رہا ہوں داؤد بھاؤ۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''...... ہاں سعید! خیریت تو ہے، اس وقت فون کررہے ہو؟''

''جی، بالکل خیریت ہے۔ تکلیف دینے پر معافی چاہتا ہوں۔ دراصل میرا ایک دوست آپ کی آواز سننے کا بڑا شوقین تھا۔ ہوسکے تو دو سیکنڈ اس سے بات کرلیں۔''

اس نے فون میری طرف بڑھایا۔ ''سلام داؤد بھاؤ۔'' میں نے کہا۔

''وعلیکم السلام...... کیا نام ہے بھئی تمہارا اور سعید سے کیسے دوستی ہے؟'' داؤد بھاؤ نے خانہ پری کے لیے کہا۔

''نام تو آپ میرا اچھی طرح جانتے ہیں، اور سعید سے دوستی نہیں دشمنی ہے۔ اس وقت میں نے اپنا بریٹا پسٹل اس کی پسلیوں سے لگایا ہوا ہے، کیا سمجھے آپ؟''

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے سعید کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ گفتگو ایسا رخ اختیار کرے گی اور میں شہر لاہور کے ایسے خطرناک و دبنگ شخص سے اس طرح بات کروں گا۔

دوسری طرف داؤد بھی حیران تھا لیکن اس کی ذہانت و فطانت بھی شاید کام دکھا رہی تھی۔ میں چونکہ اپنی اصل آواز میں بول رہا تھا اس لیے وہ چونک گیا تھا۔ شاید بریٹا پسٹل کے حوالے نے بھی اسے کچھ چونکایا ہو۔ ''کون بات کررہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے گاڑی کی چابی نکال کر سعید کو دھمکانے والے انداز میں دیکھا اور گاڑی سے نکل آیا، تاہم پستول بدستور میرے ہاتھ میں رہا اور رخ بھی سعید کی جانب ہی تھا۔ گاڑی کے شیشے بند تھے۔ میں نے باہر کھڑے ہوکر دھیمی آواز میں کہا۔ ''داؤد بھاؤ، مجھے لگ رہا ہے آپ نے آواز پہچان لی ہے۔''

''شاہ زیب ہو تم؟'' بھاؤ سرسراتی آواز میں بولے۔

''آپ کے اس بہی خواہ سعید سے بس اتفاقیہ ملاقات ہوگئی ہے لیکن اس ملاقات سے مجھے بہت فائدہ ہوسکتا ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا شاہی! مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ سعید کھوکھر کہاں ملا ہے تمہیں...... اور اب کیا معاملہ ہے؟''

میں نے بھاؤ کو الف سے ے تک سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ تاجور کی مشکلیں بڑھتی جارہی ہیں، میں اس کے گھر میں داخل ہونا چاہ رہا ہوں۔ یہ سعید اس سلسلے میں میری مدد کرسکتا ہے۔ میں نے داؤد بھاؤ کو یہ بھی بتایا کہ سعید کا والد اسپتال میں ہے اور وہ اپنے کسی پھوپی زاد کو اپنی جگہ داراب ہاؤس میں بھیجنے والا ہے۔

اب سب کچھ داؤد بھاؤ کے پلّے پڑگیا تھا۔ میں نے داؤد بھاؤ سے درخواست کی کہ وہ سعید کو میری مدد پر آمادہ کرے اور اسے یقین دلائے کہ اس سلسلے میں ہم اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ اس حوالے سے اس سے بھاری بھرکم انعام کی بات بھی کردی جائے۔

داؤد بھاؤ نے مجھ سے چند سوال پوچھے، اس کے بعد فون سعید کو دینے کے لیے کہا۔ (میں نے داؤد بھاؤ سے کہہ دیا تھا کہ وہ سعید کو میرا نام وقاص ہی بتائیں)

داؤد بھاؤ نے قریباً پندرہ منٹ تک سعید سے بات کی۔ اس دوران میں، میں گاڑی سے باہر ہی ٹہلتا رہا۔ علاقے کے دو گارڈ زادھر اُدھر گھومتے رہے اور ہمیں شک کی نظروں سے دیکھتے رہے مگر کسی نے قریب آنے کی زحمت نہیں کی۔ داؤد بھاؤ سے بات ختم کرنے کے بعد سعید نے فون مجھے تھما دیا۔ داؤد بھاؤ بولے۔ ''میں نے اسے ''ایگری'' کرلیا ہے مگر اس کو اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا بھی تو خطرہ ہے۔ اس کی سائڈ محفوظ کرنے کے لیے ہم یہ کریں گے کہ جب اس کا پھوپی زاد اس کی جگہ ڈیوٹی دینے کے لیے داراب ہاؤس پہنچنے کے لیے روانہ ہوگا تو اس کے ''کڈنیپ'' کا ڈراما کردیں گے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ کسی وقت پول کھل بھی جائے تو سعید پر الزام نہ آسکے۔''

''ہاں، سعید کے بھائی کا نام چاند کھوکھر ہے۔ سعید

اسے اعتماد میں لے لے گا۔ چاند کھوکھر ہمارے پاس رہے گا تم اس کی جگہ داراب ہاؤس پہنچ جانا۔ سعید تم سے فون پر رابطہ بھی رکھے گا۔ یہ رابطہ تم دونوں ٹیکسٹ میسج کے ذریعے کر لینا۔ اسپتالوں میں ویسے بھی وائس کال کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ہاں ایک پرابلم ہوسکتی ہے۔ داراب ہاؤس میں جانے کے لیے چاند کھوکھر کا شناختی کارڈ دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی تصویر تمہارے لیے مسئلہ نہ کرے؟''

''اتنا رسک تو پھر لینا ہی پڑے گا بھاؤ۔'' میں نے کہا۔

ہم نے وہیں کھڑے کھڑے ضروری جزئیات طے کیں اور پھر داؤد بھاؤ نے اس سعید نامی میڈیکل اٹینڈنٹ سے چند جملوں کے تبادلے کے بعد کال ختم کردی۔

سعید پریشان تو نظر آتا تھا لیکن یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ داؤد بھاؤ نے اس کے اہم خدشات دور کردیے ہیں اور اب وہ آمادہ ہے۔ اس کی اس آمادگی میں شاید بھاری انعام و اکرام کے وعدے نے بھی کردار ادا کیا ہو۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا بڑی تیزی سے ہوا۔ شیخوپورہ سے نکل کر لاہور آنے والا چاند کھوکھر داراب ہاؤس میں جانے کے بجائے سیدھا داؤد بھاؤ کے زیرزمین ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ واقعی اغوا ہوگیا ہے۔ داؤد بھاؤ کے ٹھکانے پر میں نے چاند سے اس کے بارے میں پورا بائیوڈیٹا معلوم کرلیا اور ذہن نشین بھی کرلیا۔ اس کی ڈیوٹی کے بارے میں بھی اہم نکات میں نے اپنے حافظے میں بٹھا لیے۔ اس کا قد کاٹھ مجھ سے ملتا جلتا ہی تھا۔ تصویر بھی بہت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ کام چل سکتا تھا۔ ایک فرق یہ تھا کہ وہ کلین شیوڈ تھا اور میری فی الوقت چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ مونچھوں سے نجات حاصل کرنے میں مجھے دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ چاند کا لباس پہن کر اور اس کے شناختی کاغذات جیب میں ڈالنے کے بعد میں داراب ہاؤس میں گھسنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میرے پاس وہی سعید کھوکھر والی کورے کار تھی۔

☆☆☆

اب میں داراب ہاؤس کے اندر تھا۔ داراب ہاؤس میں داخلے کے وقت میرے لیے سب سے اہم خطرہ ٹل گیا تھا۔ یعنی سروس کارڈ پر موجود تصویر اور میرے چہرے میں فرق محسوس نہیں کیا جاسکا تھا۔ یہ دوپہر بارہ بجے کا وقت تھا۔ جونہی میں داراب ہاؤس کے وسیع پورچ میں رکا، دو ملازم مجھے ریسیو کرنے کے لیے موجود تھے۔ وہ مجھے سیدھا دارج کے کمرے میں لے گئے۔ یہ کمرا اپنی مثال آپ تھا۔ آرائش و آسائش کی ہر چیز یہاں موجود تھی۔ اٹلی کا بنا ہوا بیش قیمت بیڈ، امپورٹڈ فرنیچر، ایرانی قالین اور بیش قیمت پردے۔ دارج نے دن کے وقت بھی سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کے قریب ہی بلوری تپائی پر گرین ٹی کا کپ رکھا تھا اور کچھ دوائیں بھی نظر آرہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میری آمد سے تھوڑی دیر پہلے تاجور بھی یہاں موجود رہی ہوگی۔

دارج کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا مگر ٹانگیں اور پاؤں کمزور اور زرد دکھائی دیتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا بالائی دھڑ اپنی ساری آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے اور نچلا دھڑ بیماری جھیل رہا ہے...... بنجر پڑا ہے۔

مجھے دیکھ کر وہ پھنکارا۔ ''کہاں مر گئے تھے، تمہیں بتایا نہیں تھا سعید نے کہ دس بجے تک یہاں پہنچنا ہے؟''

''سوری سر! میں نے بڑی کوشش کی مگر ہڑتال کی وجہ سے راستے بلاک تھے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔''

ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ یہ معافی قبول نہیں کرے گا اور مجھ پر برس پڑے گا لیکن پھر اس نے خود پر ضبط کیا اور سرخ چہرے کے ساتھ بولا۔ ''چلو، جلدی کرو، مجھے چینج کی ضرورت ہے...... اور مساج بھی کرنا ہے۔''

''اوکے سر۔'' میں نے مستعدی سے کہا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

یہ کافی ناخوشگوار کام تھا لیکن میں ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ دارج ٹوائلٹ نہیں جاسکتا تھا اس کو ''ڈائپر'' استعمال کرائے جارہے تھے۔ دن میں کم از کم تین بار تو یہ ڈائپرز تبدیل کرنے ہوتے تھے۔ میں نے کمرے کو اندر سے بولٹ کیا۔ دارج کا گندا ڈائپر اتار کر مخصوص ڈسٹ بن میں پھینکا۔ کاٹن کو ایک محلول میں ڈپ کر کے اس کے جسم کو صاف کیا اور نیا ڈائپر لگا دیا۔ ایک دو جگہ مجھ سے تھوڑی سی غلطی بھی ہوئی اور دارج کی ڈانٹ میرے کانوں سے ٹکرائی مگر میں پوری توجہ کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا۔ ڈائپر لگانے کے بعد میں نے اسے کروٹ کے بل ہونے میں مدد دی اور پھر اس کی کمر کی مالش شروع کردی۔ ایسی مالش ان لوگوں کے لیے ضروری ہوتی ہے جو بیماری کی وجہ سے بہت زیادہ بیٹھتے ہیں یا لیٹے رہتے ہیں۔ دارج کا بالائی جسم چربی دار تھا اور بیماری کے باوجود اس بالائی جسم میں خون کی فراوانی اور آرام و آسائش کی چمک دمک محسوس ہوتی تھی۔

خود سے بیٹھ جانا بھی دارج کے لیے کوئی ایسا آسان

کام نہیں تھا۔ اس کے لیے ایک اور ملازم کی ضرورت پڑتی تھی۔ مالش کے بعد میں نے اسے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگوائی۔ وہ بیماری کے باوجود سگریٹ پھونکنے میں مصروف ہو گیا۔ سامنے بڑے سائز کی ایل سی ڈی پر کوئی سیاسی ٹاک شو ہو رہا تھا مگر آواز بند تھی۔ نیچے پٹی چل رہی تھی۔ اس پٹی میں دو تین فقرے کی ایک نیوز سجاول کے حوالے سے بھی گزری...... چند دن پہلے رحیم یار خان میں سجاول اور اس کے ساتھیوں پر جو پُراسرار حملہ ہوا تھا یہ نیوز اس کے بارے میں تھی۔ کسی نامعلوم عورت اور اس کے ساتھیوں کا ذکر تھا جنہوں نے سجاول کے دو بندوں کو قتل کیا اور سجاول کو ''اغوا'' کرنے کی کوشش کی۔

دارج نے بھی یہ خبر دیکھی۔ لمبے بالوں والا ایک شخص ہر وقت سائے کی طرح دارج کے ساتھ رہتا تھا۔ اب بھی وہ نیم دراز دارج کے سرہانے کھڑا تھا۔ دارج نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آدم خان! یہ سجاول وہی ڈکیت ہے ناں، سیالکوٹ کے علاقے کا؟''

''جی سر، یہ وہی ہے۔'' آدم خان نامی اس گرانڈیل شخص نے ادب سے جواب دیا۔

دارج منہ میں کچھ بڑبڑایا اور پھر چینل بدل دیا۔ پتا نہیں کہ وہ سجاول کو کتنا جانتا تھا اور کب سے جانتا تھا لیکن یہ بات اسے ہرگز معلوم نہیں تھی کہ اگر آج وہ آدھے بے جان دھڑ کے ساتھ بستر پر پڑا ہے تو اسی سیالکوٹی کی وجہ سے ہے۔ یہ سجاول ہی تھا جس نے چند ماہ پہلے تاجور کا نکاح رکوانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کوشش میں کامیاب تو نہیں ہوا تھا مگر دارج کو بستر پر ضرور لے آیا تھا۔ اس نے دارج کی گاڑی کو ٹکر ماری تھی اور اس کی ریڑھ کو ایک یادگار سلامی دے ڈالی تھی۔

دارج کی سگریٹ نوشی کا دھواں بیڈ روم میں بکھر رہا تھا لیکن اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ دارج کی دائیں جانب سائیڈ ٹیبل پر سرخ رنگ کا ایک بٹن تھا۔ مجھے سعید کھوکھر نے بتایا تھا کہ یہ بٹن صرف اٹینڈنٹ کے لیے مخصوص ہے۔ دوسرے ملازمین کے لیے ایک سفید بٹن تھا۔ دارج نے بٹن دبایا۔ لاہور کے کسی بہترین پارلر کی پری پیکر ملازمہ اندر داخل ہوئی اور بڑے ادب اور سنجیدگی کے ساتھ دارج کی شیو کرنے میں مصروف ہو گئی۔ دارج نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بتایا کہ فی الحال میں جا سکتا ہوں۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ میرے لیے جو کمرا مخصوص تھا وہ دارج کے عظیم الشان بیڈ روم کے بالکل ساتھ واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹے سائز کا مگر پُرآسائش روم تھا۔ یہاں فون اور انٹرنیٹ کی سہولت تھی۔ ایک الماری میں کچھ ادویات وغیرہ بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں وقتاً فوقتاً کوئی سینئر ڈاکٹر بھی آ کر بیٹھتا ہو گا۔ میں نے نیٹ آن کیا اور یہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ یہاں میری ڈیوٹی کی باریکیاں کیا ہیں۔

میری ڈیوٹی چوبیس گھنٹے کی تھی لیکن رات دس بجے سے صبح سات بجے تک ایزی ٹائم تھا۔ اس وقت میں اپنے اسسٹنٹ کو ذمے داری سونپ کر آرام کر سکتا تھا، تاہم ضرورت کے وقت مجھے طلب بھی کیا جا سکتا تھا۔ میری ڈیوٹی فزیو کی بھی تھی۔

مجھے دو اسسٹنٹ مہیا کیے گئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ایک سینئر ڈاکٹر دن کے وقت اور ایک رات کو یہاں داراب ہاؤس میں موجود رہتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ''آرتھوپیڈک اسپتال'' میں دارج کے کچھ ٹیسٹ ہوئے ہیں جن کی رپورٹ ایک ہفتے بعد آنی ہے اس لیے اسے عارضی طور پر رہائش گاہ پر بھیج دیا گیا ہے۔

میں تو داراب ہاؤس میں داخل ہو گیا تھا مگر میرے زیرِ استعمال ٹویوٹا گاڑی ابھی تک وہیں کھڑی تھی جہاں میں نے سعید کھوکھر سے لفٹ مانگی تھی اور پھر اسے اپنے ڈھب پر کیا تھا۔ وہ گاڑی مشکوک ٹھہر کر کوئی مشکل پیدا کر سکتی تھی۔ میں نے فخر کو فون کیا لیکن رابطہ نہیں ہو سکا۔ میں نے پہلوان حشمت سے کال ملائی۔ پہلوان اور فخر ابھی تک وہیں مسجد کے سامنے والے چھوٹے سے ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔

میں نے پہلوان کو فون کیا۔ اس کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شاہ زیب! تمہاری کچھ سمجھ ناہیں آوت ہے۔ ایک دم کہاں غائب ہو گئے تھے، اور وہ برقع والی لڑکی کون تھی؟''

''کیوں کیا ہوا؟ لڑکی کا کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''یار! اس لڑکی کی وجہ سے تو بڑا پھڈا ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ شک پڑ گیا تھا، پتا نہیں کیوں پڑ گیا لیکن بس پڑ گیا۔''

''کیسا شک؟''

''اس وقت مجھے ایسا لگا کہ شاید وہ برقع والی لڑکی تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جاوت ہے۔ میں نے سمجھا کہ ہو سکت ہے برقع میں لڑکی کے بجائے کوئی بندہ ہو اور اس نے پستول وغیرہ پکڑ رکھا ہو۔ وہ کہوت ہیں ناں کہ آنکھ اوجھل پتا نہیں کیا کیا اوجھل۔ اسی چکر میں آج دوپہر ہم سے ایک

غلطی بھی ہوگئی...... بلکہ اسے غلطا کہنا چاہیے۔ میں نے مسجد کے پیچھے والے بازار میں ایک برقع پوش لڑکی کو دیکھا۔ میں اس کی طرف گیا اور بے ساختہ ہی اس کا ٹیٹوا پکڑ لیا۔ اس نے وہ شور مچایا کہ اللہ کی پناہ۔ اصل میں برقع کا رنگ اور لڑکی کا قد کاٹھ سب کچھ تمہارے والی لڑکی سے ملتا تھا۔“

”پھر آپ کی تو پٹائی ہوگئی ہوگی؟“

”خیر ایسا بھی ناہیں۔ پٹائی الٹا اسی لڑکی کی ہوئی۔ وہ چور نکلی۔ اس کے برقع سے تین جوڑے جوتوں کے نکل آئے جو اس نے سامنے مسجد سے اٹھائے تھے۔ ہم نے سوچا کہ یہ تو ہمارے اسی مشہور شعر والی بات ہوگئی۔ ہم نے یونہی اپنی آستین کو جھاڑا تھا...... آستین میں سے سانپ گر پڑا جو بہت بھارا تھا۔ ہمارا پنجابی میں وزنی کو کہوت ہیں۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آوت ہے ناں؟“

پہلوان حسبِ عادت بڑی تیز رفتاری سے بولتا چلا جارہا تھا پھر ایک دم اس کی گفتگو کو بریک لگی، وہ بولا۔ ”لیکن تم بتاؤ بھئی! کہاں غائب ہو۔ تمہارا فون بھی متواتر بند جارہا تھا۔ فخر تمہیں کال کر کر کے ہلکان ہوگیا ہے۔“

”لیکن اب تو خود اس کا فون بند ہے۔“

”یہی تو ہلکان کا مطلب ہووت ہے۔ تمہیں فون کر کر کے شاید اس کی بیٹری اللہ بیلی ہوگئی ہے۔ ٹھہرو میں اس سے تمہاری بات کراوت ہوں۔“

چند ہی لمحے بعد فخر کی آواز فون پر سنائی دے گئی۔ وہ بھی فائرنگ والے واقعے کے بعد سے میری گمشدگی پر پریشان تھا۔ فائرنگ میں جو بندہ ہلاک ہوا، اسے فخر کی گولی ہی لگی تھی مگر کسی کے علم میں یہ بات ہرگز نہیں آئی تھی کہ تابڑ توڑ فائرنگ کے دوران میں جو گولی اس بندے کو لگی، وہ سامنے والے ہوٹل کی بالکونی سے چلائی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پہلوان حشمت اور فخر ابھی تک اطمینان سے اسی ہوٹل میں موجود تھے۔

میں نے مختصر الفاظ میں فخر کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا...... اور اسے بتایا کہ میں داراب ہاؤس میں موجود ہوں۔ اس کے بعد میں نے اسے گاڑی کے بارے میں بتایا اور تاکید کی کہ وہ احتیاط کے ساتھ گاڑی کو اس جگہ سے ہٹالے۔ اسے کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد میں نے کال ختم کردی۔

داراب ہاؤس کی چار دیواری میں مجھے ابھی تک تاجور نظر نہیں آئی تھی لیکن وہ ارد گرد ہی کہیں موجود تھی۔ ڈری سہمی ہوئی اسی فضا میں کہیں سانس لے رہی تھی۔ اس گھر میں مجھے پہلا دھچکا اسی وقت لگ گیا اور یہ کافی سخت تھا...... رات ساڑھے نو کے لگ بھگ میرے کمرے میں بزر گونجا اور سرخ بلب نے اسپارکنگ کی۔ میں ٹی وی آف کر کے تیزی سے دارج کے کمرے کی طرف بڑھا۔ حسب ضابطہ دو بار ”ناک“ کر کے میں اندر داخل ہوگیا۔ یہ دیکھ کر جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں کہ تاجور کمرے میں موجود تھی۔ اس نے لمبے سلکی بال ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی صورت باندھے ہوئے تھے۔ جڑاؤ طلائی زیورات اس کے سراپا پر کثرت سے جھلملاتے تھے مگر اس وقت صرف چوڑیاں اور جھمکے ہی جھلک رہے تھے۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں دارج پر جھکی ہوئی تھی...... اور ٹشو پیپر کے ساتھ اس کے گھٹنے پر سے کچھ صاف کر رہی تھی۔ دارج کا چہرہ غصے سے انگارا ہو رہا تھا لیکن وہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔ قریب ہی شیشے کی تپائی پر ایک پلیٹ میں دودھ کا نصف گلاس رکھا ہوا تھا۔ کچھ دودھ پلیٹ میں بھی چھلکا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ دارج کو دودھ کا گلاس دیتے ہوئے، تاجور سے کچھ دودھ چھلک گیا ہے اور دارج کے کپڑوں پر گرا ہے۔

”آپ جائیں۔“ دارج ڈری سہمی تاجور سے مخاطب ہو کر بولا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر مڑی اور یہی وقت تھا کہ جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت نمودار ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ جیسے لڑکھڑا سی گئی تھی۔ غنیمت تھا کہ اس کا رخ دارج کی طرف نہیں تھا ورنہ وہ ضرور بُری طرح چونک جاتا۔ تاجور کے ہاتھ بے ساختہ اٹھے اور اس نے اپنے سر کو آنچل سے ڈھک لیا۔

”یہ مجھے دے دیں بیگم صاحبہ۔“ میں نے ٹشو پیپرز اس کے ہاتھ سے لے لیے۔

وہ میرے قریب سے اپنے جسم کو چراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں نے ٹشو پیپرز ائرٹائٹ ڈسٹ بن میں پھینکے۔ دارج کی رعب دار آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”میرا ٹراؤزر تبدیل کرو۔“

وہ سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ میں نے اس کا ٹراؤزر تبدیل کیا۔ ظاہر ہے کہ میں ایسے کاموں کا تجربہ نہیں رکھتا تھا، تاہم میں نے پوری کوشش کی اور دارج کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کو سکون بخش گولی کی ضرورت تھی۔ میں نے پانی کے ساتھ اسے گولی فراہم کردی اور پھر اس کے حکم پر باہر آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے یہاں داراب ہاؤس کے اندر دیکھ کر تاجور کے سینے میں طوفان برپا ہوگیا ہوگا۔ وہ تو

قریباً 24 گھنٹے پہلے مجھے داراب ہاؤس کی اونچی دیواروں سے باہر ایک سڑک پر خدا حافظ کہہ چکی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں یہاں دارج داراب کے اتنا قریب پایا جاؤں گا۔

میں اپنے مخصوص کمرے میں واپس آ گیا اور ایک بار پھر ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔ خبروں میں ایک چھوٹی سی خبر مسجد کے سامنے ہونے والی فائرنگ کے حوالے سے بھی تھی۔ وہاں مارے جانے والے حملہ آور کا پوسٹ مارٹم وغیرہ ہو چکا تھا۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ حملہ دراصل کس پر کیا گیا تھا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ شاید پہلے کی طرح مولانا حبیب اللہ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ صرف ہم جانتے تھے کہ یہ کوشش مولانا حبیب پر نہیں ان کے خدمت گار رضوان ئی پر تھی۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دارج داراب کے بیڈ روم کی جانب سے لڑائی جھگڑے کی مدھم آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ دراصل دارج کی ہی آواز تھی جو گرج برس رہا تھا۔ ایسی ہی آواز مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے بھی سنائی دی تھی۔ بڑے گھروں میں جب صاحب اور بیگم میں ٹین شین ہوتی ہے تو اس کا علم قریبی گھریلو ملازموں کو بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں موجود ملازمین کے تاثرات مجھے مسلسل یہ بتا رہے تھے کہ صاحب جی اپنی بیگم سے جھگڑ رہے ہیں...... یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ میں سلیپر پہن کر خاموشی سے باہر آیا اور بیڈ روم کے عظیم الشان ساگوانی دروازے تک پہنچا۔ اندر سے ابھرنے والی دارج کی دہاڑیں اب نمایاں ہو گئی تھیں۔ کچھ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر کچھ آ بھی رہے تھے۔ وہ تاجور کو لتاڑ رہا تھا۔ اس کی جنونی آواز بیڈ روم میں گونجی۔ ”بکواس کرتی ہو تم۔ اگر تمہیں میری عزت کا اتنا پاس ہوتا تو اس مولوی ماموں سے ملنے کیوں جاتیں جس نے ہر جگہ ہمارے رشتے کی مخالفت کی...... مجھ میں اور میرے خاندان میں ہر طرح کے کیڑے نکالے۔ وہ مولوی نہیں مکار ڈرامے باز ہے۔ چندے کی رقمیں ڈکارنے والا نوسرباز ہے۔ وہ تو اس قابل ہے کہ اسے اسی علاقے کے تھانے میں الٹا لٹکایا جائے......“ دارج کی آواز سے انگارے برس رہے تھے۔

تاجور کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اپنے پیارے ماموں کی اتنی سخت توہین پر بھی وہ یکسر خاموش تھی۔

”اب منہ میں گھنگنیاں کیوں ڈالی ہوئی ہیں۔ بولتی کیوں نہیں ہو؟“ اس کی زہریلی آواز کمرے میں گونجی۔

اس مرتبہ بھی تاجور کی آواز سنائی نہیں دی۔ یا شاید وہ اتنی دھیمی آواز میں بولی تھی کہ آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ میں حیران تھا، ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے جب میں دارج کے کمرے میں تھا دارج نے ہمارے سامنے تاجور کو ”آپ“ کہہ کر بلایا تھا اور اسے کمرے سے باہر جانے کو کہا تھا۔ اب وہ اسی تاجور سے تو تڑاق کر رہا تھا اور انتہائی بدتمیزی سے بات کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد صورتِ حال مزید بگڑ گئی۔ شاید وہ تاجور کے خاموش رہنے پر مزید بھڑک گیا تھا۔ اس کا لہجہ سخت سے سخت اور بلند سے بلند ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی تاجور کو پیٹنا شروع کر دے گا۔

میں نے شائستگی سے دو بار دروازے پر دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر ساگوانی دروازے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اسے کھولنے والا خود دارج داراب ہی تھا۔ وہ اپنی جدید الیکٹرانک وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا پارا مزید چڑھ گیا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ پھنکارا۔

میں نے حیرت کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے بلایا تھا سر، ابھی بزر بجا ہے۔“

”کیا بکواس ہے؟ کس نے بجایا ہے بزر؟ کسی نے نہیں بجایا۔“

”لیکن...... معافی چاہتا ہوں...... بزر بجا ہے سر...... یا پھر...... شاید سرکٹ میں کوئی خرابی ہے۔ ویری سوری سر...... آپ ذرا بٹن کو دیکھ لیجیے گا۔ میں بزر کو چیک کرتا ہوں۔“

دارج نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھ کر دروازہ دھماکے سے بند کر دیا۔ میں واپس نہیں گیا۔ دروازے کے آس پاس ہی منڈلاتا رہا۔ اندر سے دارج کی آواز تو اب بھی آ رہی تھی مگر صورتِ حال قدرے بہتر محسوس ہوتی تھی۔ شاید میری مداخلت سے دارج کے غیظ و غضب کا ٹیمپو ٹوٹ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد خاموشی ہو گئی اور میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

رات کا زیادہ تر حصہ میں نے جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ اپنے پُرشکوہ سسرال میں تاجور کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔ مگر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات بھی شاملِ حال تھی۔ اب میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن رہا تھا۔ سینے میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ وہ ایک خوشنما چڑیا جیسی تھی لیکن

ظالم عقاب کی گرفت میں تھی۔ اس عقاب کی اپنی ٹانگیں بھی ایک بیماری کے جال میں جکڑی ہوئی تھیں، اس کے باوجود وہ چڑیا پر ستم ڈھا رہا تھا۔

پھر خیالات کا دھارا سجاول اور اس کے حالات کی طرف مڑ گیا۔ سجاول اور اس کے بیوی بچے کا خیال ہر لحظہ میرے دماغ میں چمٹا ہوا تھا۔ میں کئی بار کوشش کر چکا تھا مگر سجاول کی وارننگ کے مطابق اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ میں نے فیض سے رابطہ کیا۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ سردار کا ابھی تک کچھ پتا نہیں ہے۔ خورسنہ اور بچے کی تلاش اب تک بے سود ہی ثابت ہوئی تھی۔ ہاں یونس پمپ والا ابھی تک حرکت میں تھا۔ باقر کے قتل اور اس کی فرینڈ کے ریپ کے بعد اسے لاہور کے ایک گنجان علاقے میں دیکھا گیا تھا مگر اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا تھا۔

مجھے قسطینا، فارس اور زینب وغیرہ کی طرف سے بھی مسلسل فکر لاحق تھی۔ ہاناوانی ایک خونخوار اور جنونی عورت کے روپ میں سامنے آئی تھی۔ وہ ہر اس شخص کو اذیت ناک موت دینے کا ارادہ رکھتی تھی جو کسی بھی طور اس کے بیٹے رائے زل کے قتل میں ملوث تھا۔ قسطینا وغیرہ کو جان سے مارنے کا ارادہ اس نے میرے سامنے ظاہر کیا تھا اور میں نے اس کے الفاظ اپنے کانوں سے سنے تھے۔ میرے اسپائی کیمرے کی وہ وڈیو ضائع ہو چکی تھی...... کیمرا ابھی تک بحال نہیں ہوا تھا، تاہم فارغ وقت میں، میں نے خود ہی اس کے ساتھ تھوڑی بہت کوشش کی تھی۔ اس کوشش کا اتنا نتیجہ تو ضرور نکلا تھا کہ کیمرا ''آڈیو'' ریکارڈ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

قسطینا، زینب اور ابراہیم وغیرہ سے میں خود رابطہ نہیں کر سکتا تھا (ان کے لیے میں اس دارفانی سے ''کوچ'' کر چکا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اب میرا یہ ''اسٹیٹس'' برقرار ہی رہے) میں نے قسطینا سے رابطہ کرنے اور اسے خطرے سے آگاہ کرنے کی ذمے داری فخر کو سونپ رکھی تھی۔ اس کی طرف سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں تھی۔ میں نے اسے بھی فون کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''تمہاری عمر یقیناً ایک ہزار سال سے زیادہ ہو گی۔ یہ خاکسار تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔''

''خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے، تم ایک خطرناک جگہ پر گھسے بیٹھے ہو۔ تمہاری خیریت کو نیک مطلوب ''چاہنا'' عین حسب حال ہے۔''

''ابھی تو خیریت سے ہوں۔ تم بتاؤ، جاماجی میں کوئی رابطہ ہوا؟''

''یہی اچھی خبر سنانے کے لیے تو میں بے کل تھا لیکن اس کے ساتھ ایک تھوڑی سی بُری خبر بھی ہے۔ رواج کے مطابق تو مجھے تم سے استفسار کرنا چاہیے کہ پہلے اچھی خبر سناؤں یا بُری، لیکن اس سے وقت کا زیاں ہو گا...... اچھی خبر یہ ہے کہ ابھی آدھ گھنٹا پہلے جاماجی میں قسطینا صاحبہ سے میرا رابطہ ہو گیا ہے۔ تمہارے دوست کی حیثیت سے میں نے قسطینا صاحبہ کو ہاناوانی والے خطرے سے آگاہ کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ بدبخت یہاں پاکستان میں انیق کی جان سے کھیل چکی ہے۔''

''دوسری خبر کیا ہے؟'' میں نے بے تاب ہو کر

چھپرا

سردار گمبھیر سنگھ اماں اور بیوی کا سارا زیور بیچ کر کسی نہ کسی طرح یورپ پہنچ گئے۔ آدمی محنتی تھے۔ خوب ترقی کرتے چلے گئے اور چند ہی برسوں میں مال دار ہو گئے۔ پندرہ برس بعد گھر کا خیال آیا۔ ان کا گاؤں ایک چوڑی ندی کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ لوگ کشتیوں پر یا تیر کر ندی کا چوڑا پاٹ عبور کرتے تھے۔ سردار جی نے اپنی جیب خاص سے ندی پر پُل بنوا دیا اور اس کے مکمل ہوتے ہی یورپ لوٹ گئے۔ دو برس بعد بیوی کی محبت نے پھر زور مارا تو دوبارہ لوٹے۔ پورے گاؤں کے باسی ان کی اور ان کے بنوائے ہوئے پُل کی خوب تعریفیں کر رہے تھے۔ سردار جی پورے جلوس کے ساتھ وہاں پہنچے تو پُل نیا نکور کھڑا تھا جیسے کسی نے اسے استعمال ہی نہ کیا ہو۔ سردار جی نے لوگوں سے پوچھا کہ وہ پُل کیوں استعمال نہیں کرتے تو جواب ملا کہ پہلے تپتی دھوپ میں تیر کر ندی پار کرتے تھے۔ اب چھپرا بنا ہوا ہے تو اس کے ٹھنڈے سائے میں تیر کر بہت آرام سے دوسرے کنارے پر نکل جاتے ہیں۔

واہ کینٹ سے سوڈی سنگھ کا جواب

پوچھا۔ ''زینب اور ابراہیم تو خیریت سے ہیں؟''

''ہاں وہ خیریت سے ہیں...... لیکن قسطینا صاحبہ کی زبانی پتا چلا ہے کہ ہاناوانی نے وہاں بھی ایک سخت وار کیا ہے...... اپنے محترم بھائی حاذق ذکری کی جان لے لی ہے۔ محترم بزرگ حاذق ذکری کی لاش جاماجی شہر سے باہر ایک پہاڑی کھوہ سے ملی ہے۔ ان کا پیٹ چاک کر کے انہیں کئی گھنٹے تک تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور انہوں نے اسی حالت میں دم توڑ دیا۔''

میں نے نہایت دکھ کے عالم میں یہ خبر سنی اور سر پکڑ لیا۔

فخر بولا۔ ''مزید دکھ کی بات یہ ہے کہ جناب حاذق ذکری کو کسی اور نے نہیں آپ لوگوں کے ہی ایک قریبی ساتھی باذان احمد نے قتل کیا ہے۔ قسطینا صاحبہ کا کہنا ہے کہ یقیناً وہ بھی اسی انوکھے ٹرانس میں تھا جو ہاناوانی کی نسبت سے مشہور ہے۔''

میں نے طویل سرد آہ بھری۔ اگر یہ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا تو پھر یہ بہت بڑے غم کی بات تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے محترم حاذق ذکری کا نورانی چہرہ گھوم گیا اور ان کی اس طلسماتی گفتگو کی بازگشت بھی سنائی دی جو سننے والے کے دل و دماغ میں آگہی کی نئی راہیں کھولتی تھی۔ مجھے ان سے اپنی آخری ملاقات یاد آئی۔ یہ ملاقات جاماجی میں ہوئی تھی۔ وقتِ رخصت انہوں نے مجھے ایک سربمہر خط دیا تھا اور کہا تھا کہ میں پاکستان جا کر اسے ضرور پڑھوں۔ اب اسے میری غفلت کہا جائے یا بے تحاشا مصروفیت کہ میں وہ خط پڑھ ہی نہیں سکا تھا۔ وہ شاید ابھی تک سکھیرا گاؤں میں چوہدری دین محمد کے ڈیرے پر کسی طاقِ نسیاں میں رکھا تھا یا شاید گم ہی ہو چکا تھا۔ محترم حاذق ذکری کے لیے میرا دل درد سے بھر گیا۔ وہ بہت بڑے پیش گو بھی تھے لیکن وہ اپنی موت کو نہ دیکھ سکے یا پھر شاید ان کی بہن ہاناوانی کی شیطانی قوت ان کی روحانی توانائی سے زیادہ زورآور ثابت ہوئی تھی......؟ پھر مجھے باذان کا خیال آیا۔ جاماجی میں ہمارے تہلکہ خیز قیام کے دوران میں باذان نے دل و جان سے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب اس نے ہماری خاطر سنگین ترین خطرات مول لیے تھے۔ اب وہی عزیز ساتھی باذان، محترم ذکری کا قاتل ٹھہرا تھا۔ مجھے وہ مناظر اب بھی اچھی طرح یاد تھے جب جاماجی کے ہزارہا لوگ دیوانہ وار ڈی پیلس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مقامی لوگوں کا جوش و جذبہ بڑھانے میں باذان احمد نے جو کردار ادا کیا، یادگار تھا۔

فخر کی آواز نے مجھے میرے خیال سے چونکایا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''جاماجی اور نیوسٹی میں ہاناوانی کے حوالے سے سخت ہراس پایا جاتا ہے۔ کئی سچی جھوٹی کہانیاں مشہور ہو گئی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ چاند کے بغیر راتوں میں نیوسٹی کے سارے قبرستانوں کی ساری قبریں کھل جاتی ہیں۔ ان میں سے مردے باہر نکلتے ہیں۔ ہاناوانی ان سے خطاب کرتی ہے اور وہ سب، جنگ میں مرنے والوں کے لیے انتقام، انتقام کی آوازیں بلند کرتے ہیں۔''

''اس طرح کے حالات میں اس طرح کی بے سروپا باتیں اور مبالغہ آرائیاں تو گردش میں آ ہی جاتی ہیں لیکن مجھے ایک بات حقیقت لگتی ہے...... اور وہ یہ کہ ہاناوانی نے کوئی بڑی قسم کھا رکھی ہے۔ وہ رائے زل کی موت کا سبب بننے والے کسی شخص کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارے گی۔ وہ انہیں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں سے مروانا چاہتی ہے۔''

''یہ تم نے درست کہا ہے۔ قسطینا صاحبہ نے بھی یہی بات کہی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ہاناوانی نے اپنی کھلی قبر میں بیٹھ کر کئی دنوں تک کوئی چلہ کاٹا ہے پھر اسی قبر میں بیٹھ کر کسی فدائی لڑکی کے خون سے غسل کیا ہے اور اپنے درجنوں قریبی ساتھیوں کے سامنے یہ قسم کھائی ہے کہ رائے زل کے قاتل اپنی موت کا سامان خود کریں گے...... اور عبرت کا نشان بنیں گے۔''

''زینب یا ابراہیم سے کوئی رابطہ ہوا؟''

''نہیں شاہ زیب! لیکن قسطینا صاحبہ نے یقین دلایا ہے کہ وہ میرے سارے سارے خدشات ان دونوں تک بھی پہنچائیں گی اور ان کی سیکیورٹی کے اضافی انتظامات کیے جائیں گے۔ وہ دونوں بالکل خیریت سے ہیں لیکن تمہاری ''موت'' کے حوالے سے دکھی ہیں۔ اس حوالے سے قسطینا صاحبہ بھی بہت غم زدہ تھیں۔ دیر تک اس بارے میں بات کرتی رہیں...... اور ان حالات کے بارے میں پوچھتی رہیں جن میں ٹیکساری گینگ پاکستان پہنچا اور تمہاری ''موت'' کا سبب بنا۔ لگتا ہے کہ وہ بہت عقیدت رکھتی تھیں تم سے۔ وہ تمہاری ''قبر شریف'' پر بھی آنے کا ارادہ رکھتی تھیں مگر میں نے انہیں یہاں کا واقعہ سنایا اور بتایا کہ اس قبر کے اردگرد بھی ہاناوانی کسی آسیب کی طرح منڈلا رہی ہے۔ فی الحال وہ اپنے ارادے کو ملتوی رکھیں۔''

''تاجور کا ذکر ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، تاجور کا ذکر بھی ہوا۔ وہ اس بات پر خوش ہیں

کہ اس کی شادی ایک اعلیٰ وارفع خاندان میں ہوگئی ہے لیکن انہیں یہ پتا نہیں کہ اس شادی کے نتائج کیا نکل رہے ہیں...... انہیں انیق کی موت کی خبر بھی مل چکی تھی مگر ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔ وہ انیق کے لیے بہت دکھ محسوس کررہی تھیں۔ جب میں نے انہیں وضاحت سے بتایا کہ انیق کی موت کیسے اور کن حالات میں ہوئی تو ان کے دکھ اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہانا دانی وہاں پہنچ چکی ہے تو پھر ہر اس شخص کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے جس کا تعلق کسی بھی صورت میں شاہ زیب اور سجاول سے رہا ہے...... ان میں تاجور بھی شامل ہے۔''

میں نے فخر سے کہا کہ وہ قسطینا سے مسلسل رابطہ رکھے اور وہاں کے حالات سے خصوصاً زینب اور ابراہیم کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرے۔ زینب وہ یتیم لڑکی تھی جس کے سر پر میں نے ہاتھ رکھا تھا اور جس کی حفاظت کی قسم کھائی تھی۔ میں اس کی طرف سے ہر وقت باخبر رہنا چاہتا تھا۔ فخر سے بات ختم ہوئی تو انیق کی یاد ایک بار پھر دل و دماغ پر شدت سے حملہ آور ہوگئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آنے لگیں۔ اور پھر اس کی وہ بےلوث محبت جو وہ مجھ سے رکھتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ''میری موت'' کا صدمہ اس کے لیے ایک کوہِ گراں کی طرح تھا مجھے گورکن اللہ دتا کی بات پھر یاد آئی اور سینے میں دکھ کی لہر اٹھی۔ اس کی بات سے ثابت ہوا تھا کہ وہ ''میری قبر'' پر آتا تھا اور دیر تک بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی یادوں میں کھویا کھویا میں سوگیا۔

......اگلے روز مجھے موقع مل گیا۔ میں صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ دارج داراب کا ڈائپر وغیرہ بدلنے کے لیے اس کے کمرے میں گیا تو وہ بیڈ سے ٹیک لگائے انگلش اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کا کمرا خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا اور سامنے دیوار پر ایک بہت بڑی ایل سی ڈی پر کوئی کیٹ واک دکھائی جارہی تھی۔ دارج کا ڈائپر بدلنے کے دوران میں ہی میں نے اپنا منی کیمرا ایک نہایت محفوظ جگہ پر چپکا دیا۔ اس کیمرے کا رزلٹ مجھے رات گیارہ بجے کے قریب ملنا شروع ہوگیا۔ میاں بیوی میں جو شدید تنی تھی، وہ آج بھی رنگ دکھا رہی تھی۔ دارج داراب اور تاجور بیڈروم میں اکیلے تھے۔ وہ کسی چڑچڑے وکیل کی طرح تاجور پر جرح کرتا چلا جارہا تھا۔

میرا کیمرا مجھے صرف آڈیو دے رہا تھا تاہم یہ خاصی واضح تھی۔ دارج نے جلتے لہجے میں کہا۔ ''میں پھر وہی بات کہوں گا۔ جو کچھ تم بتارہی ہو، وہ کسی صورت ماننے کے لائق نہیں۔ شاہ زیب ایک مدت سے تمہارا عاشق تھا۔ تمہارے پیچھے لگ کر لاہور سے چاند گڑھی اور چاند گڑھی سے وہاں ملنگی ڈیرے پہنچا۔ وہاں تم دونوں کئی راتوں تک ایک ہی جگہ ایک کمرے میں سوتے رہے۔ سوتے رہے یا نہیں؟''

''لیکن دارج...... میں آپ کو کتنی بار بتا چکی ہوں......''

''بکواس مت کرو۔ جتنا پوچھ رہا ہوں، اتنا ہی جواب دو۔ تم ایک کمرے میں اکٹھے سوتے رہے یا نہیں؟'' وہ گرجا۔

''ہاں۔'' وہ سسک کر بولی۔

''ایک کمرا، بند دروازہ...... اندھیرا۔ عاشق اور محبوب کا ساتھ۔ نہ کوئی چھوٹا بڑا روکنے ٹوکنے والا۔ اب بتاؤ میں کیسے مان لوں کہ اس، اللہ کے نیک پرہیزگار بندے نے تمہیں معاف کردیا ہوگا اور کوئی جسمانی تعلق نہیں بنایا ہوگا تجھ سے۔''

''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں دارج۔ آپ مجھے کہیں بھی لے جاکر کسی بھی طرح کا حلف لے لیں، ایسا کچھ نہیں ہوا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''بہت خوب۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تمہارے ان حلف ناموں پر قربان ہونے کو دل چاہتا ہے۔ وہ ایک انٹرنیشنل غنڈا تھا۔ اس کی راتیں نائٹ کلبوں اور یورپ کے بدنام ترین PUBS میں گزرتی تھیں۔ خوب صورت عورتیں اس کی کمزوری تھیں۔ جو بھی اس کے قریب آئی، اس نے آکٹوپس کی طرح اسے جکڑ لیا ہوگا...... بس صرف ایک تم تھیں...... ہاں صرف تم تھیں جس کو اس نے اپنی بہن بنا کے رکھا۔ تمہارے ساتھ بس دور دور سے محبت کی۔ یہی بات ہے ناں؟ بتاؤ یہی بات ہے ناں؟''

میرے موبائل کے ریسیور پر تاجور کی سسکی سنائی دی۔ غالباً دارج نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔ وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے جو غلطی بھی ہوئی، وہ بتائی ہے۔ بس ایک دو راتیں ایسی آگئیں جب......''

''جب تم پالتو چیتوں کی آوازوں سے ڈر گئیں اور اس کی بانہوں میں گھس گئیں؟'' اس نے زہرناک انداز میں تاجور کا فقرہ مکمل کیا اور اس کے بالوں کو شدت سے کھینچا۔ وہ سسک کر بولی۔ ''پلیز میرے بال چھوڑ دیں، مجھے درد ہورہا ہے۔''

''تو پھر جو ہوا سچ سچ بتاؤ ایک ایک لفظ بتاؤ مجھے۔''

دارج نے دانت پیسے۔

''مم...... میں نے آپ کے سامنے کتنی بڑی قسم کھائی ہے وہاں کچھ نہیں ہوا ملنگی ڈیرے پر۔''

''ملنگی ڈیرے پر نہیں ہوا ہوگا تو پھر اس ڈکیت سجاول سیالکوٹی کے اڈے پر ہوا ہوگا۔ وہاں بھی تو تم اس عورت باز کے ساتھ اکیلی تھیں۔ پوری طرح اس کے قبضے میں تھیں۔ کیا وہاں تمہارے حسن نے اور تمہارے اس قاتل جسم نے اس پر بجلیاں نہیں گرائی ہوں گی۔ کوئی لڑکی ایک رات اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے باہر رہ آئے تو اس پر یقین نہیں کیا جاتا۔ تم تو کئی ہفتے وہاں اس کے بس میں رہی ہو۔ وہ تمہیں اس وقت تمہارے گھر چھوڑ کر آیا جب اس نے تمہیں پوری طرح روند لیا۔ اپنی ہر حسرت پوری کر لی، بولو ایسا ہوا کہ نہیں؟''

اس نے ایک بار پھر کسی طرح تاجور کو تکلیف دی۔ وہ کراہ اٹھی۔ وہ پھنکارا۔ ''مجھے تمہاری ہائے وائے نہیں چاہیے۔ مجھے میری بات کا جواب دو۔''

''میں سچ کہتی ہوں دارج! خدا کے لیے میری بات کا یقین کریں۔ وہ بالکل اور طرح کا تھا...... آ...... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایک دو بار خود مجھے بھی ڈر لگا تھا کہ کچھ ہو نہ جائے...... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تب تک اس نے شراب پینا بھی چھوڑ دی تھی۔ وہ قریب ہو کر بھی مجھ سے دور ہوتا تھا۔ ایک فاصلہ رکھتا تھا میرے اور اپنے درمیان۔ میں سچ کہتی ہوں۔ آپ میری بات پر کیوں یقین نہیں کرتے۔''

''کوئی نہیں کرے گا...... جس طرح تیرا یہ حسن لشکارے مارتا ہے اور جس طرح تیری یہ کمینی ادائیں ہوش اڑاتی ہیں، پتھر کا مرد بھی ہو تو موم کی طرح پگھلنا شروع ہو جائے اور وہ بدمعاش تو تھا ہی سرتاپا آگ۔ پورے تین مہینے ہوگئے ہیں مجھے تم سے یہ باتیں پوچھتے ہوئے...... تین سال بھی گزر جائیں گے تو تیری جان نہیں چھوٹے گی۔ چھوٹے گی اسی صورت میں جب سچ بولے گی۔''

چند لمحے خاموشی رہی، بس تاجور کی سہمی ہوئی گہری سانسیں سنائی دیتی رہیں تب وہ پھر جنونی انداز میں بولا۔ ''چل بتا، پہلی بار تیرا جسمانی تعلق کب بنا شاہ زیب سے۔ چاند گڑھی میں، ملنگی ڈیرے میں یا سجاول کے اڈے پر؟ چل آج تجھے یہ رعایت دیتا ہوں۔ ایک واقعے کے بارے میں بھی بتا دے گی تو باقی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

وہ سہمے ہوئے انداز میں منمنائی۔ آڈیو ریسیور میں کچھ سنائی نہیں دیا۔ پھر شاید اس بدبخت نے اسے کسی چیز سے ضربیں لگائیں۔ چٹاخ چٹاخ کی آواز صاف سنائی دی، وہ رونے لگی۔ میرا جسم ایک بپھرے ہوئے طوفان کی زد میں تھا۔ وہ، جس کو کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسے مار رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جی میں آئی کہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جاؤں۔ اگر میں ایسا کرتا تو یقیناً اگلے چند سیکنڈ میں دارج کی خونچکاں لاش اس کے بستر پر پڑی نظر آتی۔ میں شاید اس منحوس کو دیکھ کر خود کو سنبھال نہ سکتا اور اس کو موقع پر ہی مار ڈالتا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟ سب سے اہم سوال تو تاجور کا ہی تھا۔ وہ ابھی تک شاید سیف کے سلسلے میں بھی مجھے پوری طرح معاف نہیں کر سکی تھی، کیا وہ اپنے شوہر کے لیے مجھے معاف کر دیتی؟ میں اسی اُدھیڑبُن میں تھا کہ وقتی طور پر تاجور کی جان چھڑانے کا خیال ذہن میں آیا۔

میں نے بیڈ روم کے دروازے پر دو بار مخصوص دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ لیکن تاجور پر دارج کا گرجنا برسنا ختم ہوگیا۔ میں نے دوبارہ ''ناک'' کیا۔ اس مرتبہ وہ اندر سے چنگھاڑا۔ ''کون ہے؟''

''جی سر! آپ نے مجھے بلایا تھا۔'' میں نے دروازے سے منہ لگا کر ذرا بلند آواز میں کہا۔

وہ ایک موٹی گالی دے کر چلّایا۔ ''کس نے بلایا ہے تجھ کو، کب بلایا ہے؟''

چند سیکنڈ بعد دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور ادھ کھلے دروازے سے مجھے دارج کی شکل نظر آئی۔ اس نے گہرے رنگ کا ریشمی سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا، وہ اپنی جدید الیکٹرانک وہیل چیئر پر تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ہویدا تھی۔ ''کس نے بلایا ہے تمہیں۔ کیوں آئے ہو؟'' وہ دہاڑا۔ اگر وہ کھڑا ہو سکتا تو یقیناً اٹھ کر میرا گریبان پکڑ لیتا۔

''مم...... معافی چاہتا ہوں سر! آپ نے بزر بجایا ہے۔''

''کس نے بزر بجایا ہے...... کس حرام زادے نے بجایا ہے۔ اور تم......'' اس نے پھر ایک تگڑی گالی بکی اور طیش کے عالم میں اپنا سلیپر اتار کر مجھے مارا۔ وہ میرے کندھے سے ٹکراتا ہوا، کوریڈور میں جا گرا۔

''آدم خاں...... آدم خاں۔'' وہ گرجا۔ وہ اپنے اسی ''باڈی گارڈ کم مشیر'' کو پکار رہا تھا جو ہمہ وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن رات کے اس پہر شاید وہ بھی قریب موجود نہیں تھا۔

وہ غضب ناک انداز میں بولا۔ ''اٹھا کر لاؤ اسے...... اٹھا کر لاؤ۔'' اس کا اشارہ اپنے سلیپر کی طرف تھا۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور راہداری میں سے سلیپر لا کر اس کے پاؤں کے پاس وہیل چیئر کی ''فٹ پلیٹ'' پر رکھا۔ اس نے میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور زور زور سے آگے پیچھے جھلایا۔ تب دھکا دے کر دور ہٹا دیا۔ بیماری کے باوجود اس کے بالائی جسم میں کسی بھینسے کی سی طاقت تھی۔

اسی اثنا میں چراغ کا جن آدم خاں بھی آن حاضر ہوا۔ دارج اسے دیکھ کر گرجا۔ ''وہ کہاں مر گیا ہے سعید کھوکھر؟ اپنی جگہ یہ کس چغد کو بھیج دیا ہے اُس نے...... اِس کو ابھی جوتے مار کر نکال دو یہاں سے۔''

میں نے کہا۔ ''سر! ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتا ہوں۔ میرا قصور نہیں دراصل کال سسٹم میں کوئی فالٹ ہے۔ شاید ''شارٹ سرکٹ'' سے بزر خود بخود بج اٹھتا ہے، یا ارتھ کا کوئی مسئلہ ہے۔'' میں نے مدد طلب نظروں سے آدم خاں کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''میرے سرکار! میرا خیال ہے کہ لائن میں کوئی گڑبڑ ہے۔ پہلے بھی ایک دو دفعہ ایسا ہوا ہے لیکن اس میں بھی اس بے وقوف کا قصور ہے۔ اسے ٹھیک کرانا چاہیے تھا اسے۔''

''سوری سر! میں نے کل الیکٹریشن کو بلانے کی کوشش کی تھی مگر رابطہ نہیں ہوا۔'' میں نے مصلحت آمیز جھوٹ بولا۔

اس سے پہلے کہ دارج پھر گرجتا، آدم خاں جلدی سے بولا۔ ''سرکار! میں ابھی بلاتا ہوں الیکٹریشن کو۔ پانچ منٹ میں ''بیل'' درست کراتا ہوں۔'' آدم خاں میری مدد پر آمادہ نظر آتا تھا۔

میری حمایت پر آدم خاں کو بھی ایک دو سخت باتیں سننا پڑیں مگر دارج کا غصہ کسی حد تک کم ضرور ہو گیا۔

ادھ کھلے دروازے میں سے نائٹ بلب کی مدھم نیلگوں روشنی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، مگر تاجور اسی مدھم روشنی میں کہیں موجود تھی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، سب جان رہی تھی، میں ایک ادنیٰ ملازم کی طرح اس کے شوہر کی خدمت کرتا تھا، اس کا مساج کرتا تھا، اس کے گندے ڈائپر بدلتا تھا اور اس کی گالیاں، جھڑکیاں بھی سن رہا تھا۔ یہ سب میں کیوں کر رہا تھا، کوئی اور جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، وہ تو جانتی تھی۔

میں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ الیکٹریشن آدھمکتا میں نے بزر کے ''کونیکٹر'' سے چھیڑ چھاڑ کی اور اسے واقعی گڑبڑ کر دیا۔

رات کافی گزر چکی تھی اس کے باوجود الیکٹریشن بھی حاضر ہو گیا اور اپنی چیکنگ وغیرہ کرنے لگا۔ اس ساری صورتِ حال سے یہ فائدہ تو ضرور ہو گیا تھا کہ دارج کے غیظ و غضب کا ٹیمپو ٹوٹ گیا تھا اور اب اس کے بیڈروم کی طرف سے کسی طرح کی کوئی پریشان کن آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ بے حد تکلیف دہ رات دن تھے۔ خورسنہ اور اس کے بچے کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ ان پر کیا بیتی ہے۔ میرا دھیان بار بار حاذق ذکری کی موت کی طرف بھی چلا جاتا تھا۔ ابھی انیق کی جدائی والا صدمہ ہی کم نہیں ہوا تھا کہ یہ دوسری دلدوز خبر سننے کو مل گئی تھی۔

...... اگلے روز صبح سویرے مجھے غسل کرنے میں دارج کی مدد کرنا تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں اس کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ تاجور سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ملازمہ کے بجائے وہ خود ناشتے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر لا رہی تھی۔ بس دو لمحوں کے لیے اس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ملیں۔ ان دو لمحوں میں ہی اس کی نگاہوں نے خاموشی کی زبان میں کئی شکوے مجھ سے کر ڈالے۔

آپ کیوں موجود ہیں یہاں؟

کیوں میری اذیتوں میں اضافہ کر رہے ہیں؟

کیوں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں اور اپنی توہین کروا رہے ہیں؟

اس سب سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں، آپ کو نہ مجھے۔ ہاں کچھ بہت بُرا ضرور ہو سکتا ہے۔ وہ آگے بڑھ گئی اور میں اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ ایک آرتھوپیڈک ڈاکٹر بھی آیا ہوا تھا اور ناشتے کے بعد دارج کا عمومی معائنہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''پتا نہیں کیوں، تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا ہے۔ خاص طور سے تمہاری آنکھیں اور تمہاری ٹھوڑی وغیرہ۔''

''شکلوں سے شکلیں ملتی ہیں جی۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔ ''ویسے کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ دارج بھی مجھے اُلجھن زدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ جیسے میری صورت کے حوالے سے اپنی یادداشت کو کریدتا ہو)

آرتھوپیڈک ڈاکٹر مجھ سے سعید کھوکھر کے والد کا حال احوال پوچھنے لگا۔ وہ میری کارکردگی سے زیادہ مطمئن

نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ سعید جلد از جلد اپنی ڈیوٹی پر واپس آجائے۔ ڈاکٹر نے یہ بھی بتایا کہ دارج صاحب کے ٹھیک ہونے کے چانس کافی روشن ہیں۔ وہ بولا۔ ''دارج صاحب کے اندر ٹھیک ہونے کی شدید خواہش ہے، اور ارادے کی پختگی پائی جاتی ہے...... اور جب مریض میں یہ چیزیں موجود ہوں تو اس کی صحت یابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔''

میں نے اپنے آپ میں سوچا...... ایسے شخص کی صحت یابی کی خواہش کیسے کی جا سکتی ہے؟ اس کی مکمل صحت یابی سے نجانے کتنے لوگوں کی تکلیف اور مصیبت منسلک تھی...... اور تاجور ان میں سرفہرست تھی۔ میں زیادہ دیر ڈاکٹر کے پاس نہیں ٹھہرا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں میری ڈیوٹی کے حوالے سے ٹیکنیکل باتیں نہ شروع کر دے۔

میرا منی کیمرا 'زخمی' تھا اور ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ پھر بھی آواز کی حد تک تو وہ اب بھی میرا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ بدستور دارج کے عظیم الشان بیڈ روم میں ایک مستعد جاسوس کی طرح موجود تھا۔ اس سہ پہر میں نے ایک اور تکلیف دہ منظر دیکھا۔ میرا گزر داراب ہاؤس کے استقبالیہ کمرے کی طرف سے ہوا تو میں نے وہاں چوہدری دین محمد اور ان کی بیوی یعنی تاجور کی والدہ کو بیٹھے پایا۔ ساتھ میں تاجور کا چھوٹا بھائی اسفند بھی تھا۔ میرا چہرہ تبدیل تھا مگر وقاص کی حیثیت سے تو وہ مجھے پہچان ہی سکتے تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہیں پائے تھے۔ میں ایک چوکور ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہ استقبالیہ کمرے میں یوں بیٹھے تھے جیسے دو سائل کسی اعلیٰ افسر کے دفتر کے سامنے بیٹھے اپنی باریابی کا انتظار کر رہے ہوں (چوہدری دین محمد کے ساتھ ان کا پرانا ملازم خدا بخش بھی ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اب سکھیرا میں دین محمد صاحب کی نقل مکانی کوئی راز نہیں رہی تھی۔ لہٰذا چاند گڑھی والے ایک دو ملازم بھی ان کے پاس آ گئے تھے)

یقیناً دونوں میاں بیوی اپنی بیٹی سے ملنے آئے تھے۔ گاؤں سے اس کے لیے کچھ سوغاتیں اور پھل وغیرہ لائے ہوں گے۔ لیکن انہیں شاید ذلیل کرنے کے لیے یہاں بٹھا دیا گیا تھا۔ کس قدر افسوس کا مقام تھا۔ وہ دارج کے ساس سسر تھے۔ تاجور ان کے جگر کا ٹکڑا تھی اور انہوں نے اسے پال پوس کر دارج کے حوالے کیا تھا۔ اب وہ اپنے جگر کے اس ٹکڑے سے ملنے کے لیے یوں انتظار گاہ میں بیٹھے سوکھ رہے تھے۔ مجھے چوہدری دین محمد پر غصہ آیا اور ان کے لیے دکھ بھی محسوس ہوا۔ یہی دین محمد صاحب تھے جو اپنی بات پر اڑ گئے تھے اور برادری کی مخالفت مول لے کر بھی اپنی مرضی کر کے رہے تھے۔ اب اس مرضی میں خوف کتنا تھا اور مرضی کتنی تھی، یہ تو وہی بتا سکتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ پانچ دس منٹ بعد وہ دونوں، اسفند سمیت تین ہٹے کٹے گارڈز کی نگرانی میں اندرونی حصے کی طرف چلے گئے۔ ان کے ساتھ آنے والا ملازم خدا بخش وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اسے وہیں پر کولڈ ڈرنک تھما دیا گیا تھا۔ وہ جو اٹیچی کیس اور ٹوکری وغیرہ اٹھا کر لایا تھا وہ اب داراب ہاؤس کے گارڈز نے اٹھالی تھیں۔

دین محمد اُن کی بیوی اور اسفند بمشکل آدھ گھنٹا ہی اندر رہے ہوں گے۔ یقیناً ان کی یہ مختصر ملاقات تاجور کے ساتھ ہی تھی۔ ان کا داماد دارج اس وقت وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے کزن شکیل داراب کے ساتھ گھر کے دوسرے حصے میں تھا۔ شاید کوئی سیاسی میٹنگ وغیرہ ہو رہی ہو۔

☆☆☆

رات کو ایک بار پھر میرے زخمی لیکن ''ہونہار'' کیمرے نے مجھے حالات کی ایک مختصر سی تصویر دکھائی۔ یہ تصویر صرف آواز کی صورت میں تھی۔ آج تاجور کے شوہر نامدار کا مزاج قدرے بہتر محسوس ہوتا تھا۔ وہ بیماری کے باوجود سگریٹ نوشی سے مکمل پرہیز نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی سگریٹ نوشی کی بات ہو رہی تھی۔ تاجور نے سہی آواز میں کہا۔ ''آج پھر آپ زیادہ سگریٹ پی رہے ہیں۔''

''ہاں واقعی مجھے سگریٹ نہیں پینا چاہیے...... زہر پی لینا چاہیے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

کچھ دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر اس کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''جن شوہروں کو ایسی بیویاں مل جاتی ہیں، ان کا ''زہر پینا'' ہی بنتا ہے۔''

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''میں اب تھک گئی ہوں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ میں آپ کو اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکتی...... دیکھیں میں نے آپ کے کتنے سوالوں کے جواب دیے ہیں، آپ میرے صرف ایک سوال کا جواب ہی دے دیں۔ اگر آپ میرے بارے میں ایسے خیال رکھتے تھے تو پھر...... مجھے کیوں لائے اس گھر میں؟ کیوں اتنا زور دے کر اپنایا مجھ کو؟''

''اندھا ہو گیا تھا میں۔ دیوانہ ہو گیا تھا۔ میری حرام زادی عقل نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔'' وہ پھنکارا پھر توقف کر کے بولا۔ ''اس وقت مجھے بس ہلکا سا شک تھا...... کہ شاید کوئی چھوٹا موٹا افیئر چلا تھا تمہارا...... لیکن اب تو تمہاری ''عشق

معشوقیوں'' کے دفتر کھل گئے ہیں میرے سامنے۔ وہ سرکاری سانڈ تو عیش عشرت کر کے ''قبر'' میں جا سویا اور مجھے چھوڑ گیا آگ میں جلنے کے لیے۔'' اس نے کوئی چیز پھینک کر توڑ دی۔ چھناکے کی آواز سنائی دی اور خاموشی چھا گئی۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، ایک بھونڈی بکواس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ بات ماننے والی ہرگز نہیں تھی کہ شادی سے پہلے اسے تاجور کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ سارے نہیں تو کافی حالات جانتا تھا لیکن تاجور کی دلکشی اور خوب صورتی کی چکاچوند نے اسے جنونی کر رکھا تھا۔ وہ صرف اور صرف اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر وہ اپنی دبنگ ماں کے سامنے بھی ڈٹ گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ جیسی بھی ہے وہ اسے اپنانا چاہتا ہے...... میں نے کان اپنے موبائل سے لگا رکھا تھا...... بیڈ روم کے حالات خراب ہو رہے تھے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ایک بار پھر جا کر دروازے پر دستک دوں اور دارج سے کہوں کہ بزر بجا ہے۔ یقیناً اس کا پارا ساتویں آسمان سے ٹکرا جاتا...... مگر تاجور کی مصیبت ٹلنے کا امکان تو پیدا ہو جاتا۔

مجھے ایک بار پھر تاجور کی درد آمیز سسکی سنائی دی۔ غالباً دارج نے پھر اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔ وہ بڑے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''اچھا...... میرے پچھلے ہفتے والے سوال کا جواب تو عنایت فرما دو...... اتنے بڑے انگلش رسالے کی اتنی بڑی ایڈیٹر تم تک پہنچی کیسے؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں دارج۔'' وہ کراہی۔ ''وہ لوگ خود ہمارے گھر آئے تھے، میں خود تو ان کے پاس نہیں گئی تھی...... مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ انہوں نے میرے بارے میں کہیں کچھ پڑھا تھا۔''

''میسنی مت بنو...... سب پتا ہے تمہیں۔ یہ بھی پتا ہے کہ کیا پڑھا تھا...... اور کہاں پڑھا تھا۔ بس بتانا نہیں چاہتی ہو۔''

''اگر پتا ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔'' وہ نفرت سے پھنکارا۔

''پلیز، میرے بال چھوڑ دیں۔ درد ہو رہا ہے۔''

''تو پھر بتاؤ۔''

کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ شاید تاجور اپنے آنسو پونچھ رہی تھی اور خود کو کمپوز کر رہی تھی۔

میں حیران تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس رسالے اور ایڈیٹر کی بات ہو رہی ہے۔ ابھی تک میں نے اس طرح کا کوئی ذکر نہیں سنا تھا۔

چند سیکنڈ بعد تاجور کی آواز موبائل کے اسپیکر پر ابھری۔ ''آپ جانتے ہیں جب میں ملنگی ڈیرے پر تھی، وہاں کسی مائیکل نام کے انگریز نے مجھے دیکھا تھا۔ مجھے بتائے بغیر میری تصویریں اتاری تھیں اور کہیں پر چھاپی بھی تھیں۔ انہی تصویروں کو دیکھ کر اس انگریزی رسالے کی ''مالکن'' پاکستان آئی اور پھر ہمارے گاؤں سکھیرا تک پہنچی تھی۔''

''وہ لوگ کیا چاہتے تھے؟''

''وہ کسی اشتہار میں میری تصویر دینا چاہتے تھے...... جس میں، میں بہت سے بچوں کے ساتھ کسی خاص اسپتال کے سامنے کھڑی ہوں، یہ بچوں کے خون کی بیماری، کے بارے میں کوئی اشتہار تھا۔ مجھے اس بارے میں زیادہ پتا نہیں۔ ان لوگوں نے اباجی اور چھوٹے ماموں سے ہی زیادہ بات کی تھی۔''

''اور اس کے لیے وہ تمہیں اور تمہاری فیملی کو انگلینڈ لے جانا چاہتے تھے۔ ڈھیر سارے پاؤنڈوں کی پیشکش بھی کر رہے تھے۔ تم ان کے ساتھ انگلینڈ کیوں نہیں گئیں؟''

''مم...... مجھے یہ سب کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا...... اور میرے بڑے بھی ایسا نہیں چاہتے تھے۔''

''بکواس بند کرو۔ ہمیشہ کی طرح جھوٹ بول رہی ہو۔ اصل بات چھپا رہی ہو...... اصل بات یہ ہے کہ تمہاری ''عاشقی'' تمہارے اندر پھڑ پھڑا رہی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شکیل اور اس کی بیگم تمہیں اپنے ساتھ جاماجی لے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے...... تاکہ تم وہاں جا کر اپنے خبیث عاشق کی جان بچا سکو...... اسے راضی کر سکو کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دے اور اپنے مفرور ساتھیوں کے بارے میں بتا کر تشدد اور ہلاکت سے بچ جائے، میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں ناں؟''

دوسری طرف خاموشی رہی، تاجور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دارج بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اب تم یہ فرماؤ گی کہ تم شکیل اور اس کی بیگم کو انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے میگزین ایڈیٹر کی بات ماننے کے بجائے شکیل اور اس کی بیگم کے ساتھ برونائی اور پھر جاماجی جا پہنچیں...... جہاں اپنے اس حسن پرست عاشق شاہ زیب کو بچاتے بچاتے تمہاری اپنی عزت لٹنے کے قوی امکان پیدا ہو گئے۔ یہی کہو گی ناں؟''

وہ منمنائی۔ ''یہ سچ ہے دارج! شکیل صاحب اور ان کی بیگم مجھے جلد از جلد جاماجی پہنچانا چاہتے تھے......''

''یہ بھی سفید جھوٹ ہے...... بکواس ہے۔'' وہ اتنی زور سے دہاڑا کہ اس کی آواز کی دھیمی سی گونج مجھے بیڈروم سے براہِ راست بھی سنائی دی۔ اسپیکر پر اس کی زہر آلود آواز ابھری۔ ''شکیل بھائی نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جاماجی میں شاہ زیب کے حالات سن کر تمہاری حالت بری ہو گئی تھی۔ شکیل بھائی سے زیادہ تم خود جاماجی جانے کے لیے بے تاب ہو گئی تھیں...... اپنے عاشق کی مصیبت کے بارے میں جان کر تمہارا دل چاہتا تھا کہ تمہارے پنکھ لگ جائیں اور تم اُڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤ۔ دو تین روز بعد جب یہ ایڈیٹر والا معاملہ سامنے آیا تو شکیل بھائی نے خود تم سے اور تمہارے گھر والوں سے کہا تھا کہ یہ ایک بڑی پیشکش ہے، وہ لوگ اپنے میگزین کے لیے بس چند تصویریں اتارنا چاہتے ہیں۔ اگر جاماجی کا پروگرام چار دن لیٹ ہو بھی جائے تو کوئی بات نہیں...... لیکن...... تمہارے اندر کی تڑپ تمہیں اُڑا کر سیدھا اپنے عاشق کی گود میں لے گئی۔ واہ...... کیا کیا قربانیاں دی ہیں تم نے اس حرصی، عورت باز کے لیے...... وٹ اے ریلیشن...... وٹ اے ریلیشن۔'' وہ جنونی انداز میں گرجا، اس نے شاید ایک بار پھر تاجور کے بال مٹھی میں جکڑے تھے اور اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔

ایک زوردار کھٹکا سنائی دیا، جیسے کوئی بھاری چیز فرش پر گری ہو۔ مجھے یہ شک بھی ہوا کہ شاید تاجور چلائی ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کمرے میں موجود بزر بج اٹھا اور سرخ روشنی اسپارک کرنے لگی۔ میں تیزی سے نکلا اور لپکتا ہوا دارج کے بیڈروم تک پہنچا۔ دستک دینے کی نوبت نہیں آئی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا۔ تاجور کی ہراساں صورت دکھائی دی۔ اس کے حسین بال، اس وقت کسی پرندے کے گھونسلے کا سا منظر پیش کر رہے تھے۔ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور پکار کر بولی۔ ''وہ گر گئے ہیں۔''

میں اندر نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں پہنچا۔ دارج اوندھے منہ قالین پر گرا ہوا تھا۔ وہیل چیئر بھی اس پر الٹی ہوئی تھی۔ وہ سیدھا ہونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہیل چیئر کا کوئی بٹن دب گیا تھا اور اس کے پہیے مسلسل الٹ سمت میں حرکت کر رہے تھے۔ میں نے پہیے روک کر چیئر کو سیدھا کیا پھر تاجور کے ساتھ مل کر دارج کو بمشکل اٹھایا۔ اس کے منہ سے خون رس رہا تھا۔ اس کی کمزور ٹانگیں توری کی طرح لٹک رہی تھیں مگر بالائی جسم بھاری تھا۔ اسے بستر پر نیم دراز کرنے میں کافی دشواری پیش آئی۔ اسی دوران میں چراغ کا جن آدم خاں بھی ادھ کھلے دروازے پر ''ناک'' کر کے اندر آ گیا۔

''کیا ہوا میرے سرکار؟'' وہ سکہ بند غلاموں کے انداز میں بولا۔

دارج نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا کہ بچ بچاؤ ہو گیا ہے پھر اس نے ہم دونوں کو باہر چلے جانے کے لیے کہا۔ تاجور اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی اور پریشانی کے عالم میں اپنے پلّو سے اس کے ہونٹوں سے رسنے والا خون پونچھ رہی تھی۔

''ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں سرکار؟'' آدم خاں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ خشک لہجے میں بولا اور ایک بار پھر ہاتھ کے اشارے سے ہمیں باہر جانے کے لیے کہا۔

ہم باہر نکل آئے، دروازہ پھر سے لاک ہو گیا...... چند منٹ بعد میں پھر اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے موبائل پر منی کیمرے کی ''اپلی کیشن'' آن کی۔ اب کمرے میں سے جو آوازیں آ رہی تھیں وہ بہت دھیمی تھیں۔ گرنے اور چوٹ کھانے کے بعد، غالباً دارج کا آتشیں غیظ و غضب عارضی طور پر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ تاجور ایک خدمت گار کی طرح اس کے ارد گرد موجود تھی۔

کچھ دیر پہلے میں نے اپنے منی کیمرے کے ذریعے جو گفتگو سنی تھی وہ دماغ میں ہلچل مچا رہی تھی۔ قریباً ایک سال بعد آج مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ جب تاجور مجھے امریکی قسائی لونگ کے چنگل سے نکالنے کے لیے جاماجی پہنچی تھی تو اس میں اس کی اپنی مرضی اور شدید خواہش بھی شامل تھی۔ ایک سیدھی سادی، عام دیہاتی لڑکی ہونے کے باوجود اس نے غیر مانوس لوگوں کے ساتھ غیر ملک کا سفر کیا تھا اور خود کو شدید ترین خطرات میں ڈالا تھا...... ہاں وہ کرتی تھی پیار...... پیار کے بغیر اس طرح کی ہمتیں انسان کے اندر پیدا ہو ہی نہیں سکتیں، میرا دل درد سے بھر گیا......

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے



قصوروار

ناصر ملک

والدین کی بچوں سے چاہت... اور رشتے... ان رشتوں کا شمار قریب تر رشتوں میں ہوتا ہے... ان قربتوں میں صرف محبت اور چاہت کی گنجائش ہوتی ہے... مگر کچھ قریبی رشتے اس قدر گھناؤنے ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا... ایسی ہی عمر بھر کی رفاقتوں اور رشتوں کی بُنت... جس کی ہر گرہ میں صرف نفرت... اور بے تعلقی بَنی ہوئی تھی...

نفرت وانتقام کے خمیر میں گندھی لہورنگ کہانی کے نت نئے موڑ......

اونچے ٹیلے پر بیٹھے شکیل کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اُفق میں ڈوبتے سرخی مائل سورج پر جمی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے جو گالوں پر سے ہوتے ہوئے سوتی کالر پر خاموشی سے جذب ہو رہے تھے۔ وہ غیر محسوس انداز میں سسک رہا تھا اور خالی الذہنی کی سی کیفیت میں دونوں مٹھیوں میں ریت بھر کر آہستہ آہستہ زمین پر گرا رہا تھا۔ آج اُس کی پندرھویں سالگرہ تھی جو شدید نوعیت کے اضمحلال میں گزر چکی تھی۔ ایک سوتیلی ماں کے سوا اُس کا دُنیا میں کوئی غم خوار نہیں تھا۔ اُس نے دو پونڈ کا کیک گزشتہ دن بنوا کر فریج میں رکھ چھوڑا تھا جسے آج دونوں ماں بیٹے کو مل کر کاٹنا تھا اور ہر سال کی طرح ''ہپی برتھ ڈے'' کا نعرہ لگانا تھا۔

ہمیشہ ایسا ہوتا تھا کہ ماں بیٹا کسی خوشی کو گھیر گھار کر اپنے قریب لاتے تھے مگر خوشی اُن کے ہاتھوں سے خشک ریت کی طرح سرک جاتی۔ بجائے خوشی کے کوئی نیا دُکھ، کوئی سانحہ یا گھریلو اُلجھاوا اِس شدت سے سر اُٹھاتا کہ اُنہیں وہ چھوٹی سی خوشی یاد تک نہ رہتی۔

آج بھی وہ ماں بیٹا ہار گئے تھے اور روایت سرخرو ٹھہری۔

شکیل کے باپ، اعظم خان نے پانی کی ٹھنڈی بوتل نکالنے کے لیے فریج کھولا تو اُسے فریج کی دوسری جالی پر قرینے سے رکھا ہوا خوب صورت چاکلیٹ کیک دکھائی دیا۔ وہ فریج کا دروازہ تھام کر حلق کے بل چلّایا۔ ''یہ کیک کہاں سے آیا ہے؟''

شکیل کا چھوٹا بھائی عدیل منہ بنا کر بولا۔ ''ابو! یہ امی جان لائی تھیں شکیل کی سالگرہ کے لیے!''

اُس نے 'سالگرہ' پر خصوصی زور دیا تھا۔

شکیل اپنی الماری سے کچھ نکالنے میں مصروف تھا۔ چونک کر پلٹا۔ باپ کے ہاتھ میں کیک دیکھا تو گھبرا سا گیا اور اُس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔

اعظم خان اپنی عادت کے مطابق طنزیہ انداز میں ہنسا اور بھاری آواز میں بولا۔ ''اچھا..... تو سالگرہ پارٹی منائی جارہی ہے..... واہ! اوئے صفو! ذرا اِدھر تو آ.....''

شکیل کی ماں، صفیہ بیگم جسے اعظم خان 'صفو' کہہ کر پکارتا تھا، کچن سے نکلی اور کمرے کے دروازے میں آ کر کھڑی ہوگئی۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''جی!''

''مجھے کہتی ہو کہ گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا، اِدھر عیاشیوں کا یہ عالم ہے۔ ہیں؟'' اعظم خان نے کیک کو بے رحمی سے ہوا میں لہراتے ہوئے غرا کر کہا۔ ''تم نے اس لونڈے کی برتھ ڈے کے لیے کوئی تحفہ شوفا بھی خرید کر کہیں چھپا رکھا ہوگا۔ وہ کدھر ہے؟''

صفیہ بیگم کا رنگ اُڑ گیا۔ منت آمیز لہجے میں بولی۔ ''یہ شکیل نے اپنے جیب خرچ سے بنوایا ہے۔ اس بے چارے نے ایک مہینے میں یہ رقم جمع کی تھی۔''

اِس کے ساتھ ہی وہ محتاط انداز میں اعظم خان کی طرف بڑھی۔ اُس کے ہاتھ سے کیک لینا ہی چاہتی تھی کہ اُس نے کمالِ بے دردی سے اپنا ہاتھ لہرایا اور کیک کو دیوار پر دے مارا۔ کریم اور چاکلیٹ سے بنا ہوا رنگ برنگے پھولوں والا کیک دیوار پر چپک گیا اور گتے کا گول ٹکڑا جو کیک کے نیچے رکھا ہوا تھا، دیوار سے رگڑ کھاتا ہوا فرش پر جا گرا۔

صفیہ بیگم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''یہ آپ نے کیا غضب کر دیا؟''

وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ محض غیظ تھا، غضب کا مظاہرہ ابھی باقی تھا۔ اعظم خان نے اپنے پہلو سے نکل کر دیوار کی طرف دیوانہ وار جاتی ہوئی صفیہ کے بال پکڑ لیے۔

وہ جھٹکا کھا کر مڑی تو اعظم خان کا سخت اور کھردرا ہاتھ طمانچہ بن کر اُس کے دائیں گال پر پڑا۔ وہ کراہ کر فرش پر ڈھے گئی۔ اعظم خان کے ہاتھ سے بالوں کی چٹیا چھوٹ گئی اور وہ مغلظات بکتا ہوا اُس پر دیوانہ وار پل پڑا۔ پے در پے لگنے والے ظالمانہ ٹھڈوں نے چند لمحوں میں ہی صفیہ بیگم کو اَدھ موا کر دیا۔

شکیل الماری کا دروازہ تھامے سُن کھڑا تھا۔ اُس کی پھٹی پھٹی نظروں میں دہشت اور خوف کی پرچھائیاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ ماں کے حلق سے نکلتی چیخیں اور کراہیں تھمیں تو اُسے جیسے ہوش آ گیا۔ وہ لپک کر قریب آیا اور ماں کے بے ہوش وجود پر سایہ فگن ہوگیا۔ اُس کے وجود نے ماں کے مارگزیدہ وجود کو چھپا لیا تو باپ کے طوفانی ٹھڈوں کا رُخ اُس کی جانب ہوگیا۔

اعظم خان معرکہ سرانجام دے کر فاتحانہ انداز میں گالیاں دیتا ہوا کمرے سے نکل گیا تو شکیل کو ہوش آیا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر فی الفور اُٹھ نہیں پایا۔ سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ عدیل خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا جبکہ چھ ماہ کی گڑیا چوبی ہنکوڑے میں پڑی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ کونے میں بیٹھی اسما منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھلے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

شکیل کی آنکھوں کے سامنے کوندا سا لپکا اور وہ بدن کی پوری قوت بروئے کار لاتے ہوئے ایک جھٹکے سے اُٹھ کر اسما کی طرف دوڑا۔ خوف اور دہشت کے مارے اسما کی حالت غیر ہو جاتی اور اُس کی سانس رُک جاتی تھی۔ اس کی سانس رکتے ہی چند لمحوں میں اس کے ہونٹ اور گال نیلگوں ہونے لگتے تھے۔ اس کی جان پر بن جایا کرتی تھی۔ تب بھی یہی کچھ ہونے والا تھا۔

شکیل نے ہذیانی انداز میں اسما کو ہلایا جلایا مگر وہ بے جان انداز میں چارپائی پر کمر کے بل گر گئی۔ شکیل بجلی کی سی مستعدی سے پلٹا اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا باہر بھاگا۔ چند لمحوں میں ہی وہ پانی کا بھرا ہوا جگ اُٹھا لایا اور اسما کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا اور اُس کے ننھے ننھے گالوں پر ہولے ہولے ہاتھ بھی مارنے لگا۔ وہ چند منٹ شاید صدیوں کی طوالت اور زہرناکی اپنے اندر سموئے ہوئے تھے کہ اُن سے نبرد آزما شکیل ادھ موا ہو گیا تب کہیں جا کر اسما کی سانسیں بحال ہوئیں۔ سنبھلی تو ماں اور بھائی کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

صفیہ بیگم ابھی تک فرش پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ اُس کا حقیقی بیٹا عدیل، اُس پر ایک نگاہِ بے تاثر ڈال کر کمرے سے اور پھر گھر سے نکل چکا تھا۔ ماں کراہی تو سوتیلا بیٹا بے

چین ہو کر اُس کی طرف دوڑا۔ سہارا دے کر کھڑا کیا، پھر چارپائی پر بٹھا کر فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لایا اور کھول کر اُس کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''ماں! مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اِس جنونی شخص کی گردن کاٹ کر رکھ دوں۔''

صفیہ بیگم نے جلدی سے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ اُس کے لبوں پر رکھ دیا۔ ''ایسے نہیں کہتے بیٹا! میرے نصیبوں میں یہی کچھ لکھا ہے۔''

ماں بیٹا ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے۔ اچانک ماں نے کمرے میں نظر دوڑاتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔ ''عدیل کہاں گیا؟''

شکیل کے چہرے پر ایک ثانیے کو نفرت انگیز تاثرات ہویدا ہوئے، بولا۔ ''وہ بے غیرت اپنے باپ کے پہلو میں جا کر بیٹھا گپیں ہانک رہا ہوگا۔''

صفیہ بیگم کے سینے سے ایک ہوک نکلی۔ عجیب نظروں سے شکیل کو دیکھا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ 'سگا بیٹا ماں کو اِس حال میں دیکھ کر خوش ہوتا ہے، سوتیلا میری خاطر مرنے مارنے کو آجاتا ہے...... یا خدا! یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ میرے کسی جرم کی سزا ہے یا کسی نامعلوم نیکی کا اجر ہے؟'

ایسے ہی وقت میں پانچ سالہ اَسما ماں سے لپٹ گئی اور گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔ شکیل ماں کو چھوڑ کر گڑیا کے پنگوڑے کی طرف بڑھا اور اس کے منہ سے فیڈر لگانے لگا۔ گڑیا باپ کی دہاڑیں اور ماں کی بلند و بالا چیخیں سن کر جاگ گئی تھی اور ڈر کر رونے لگی تھی۔

ایسے وقت میں شکیل کی نگاہ غیر ارادی طور پر دیوار پر چپکے ہوئے کیک پر پڑی۔ وہ اُٹھا اور نیم مردہ قدموں سے چلتا ہوا دیوار کے پاس گیا۔ اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کریم اور چاکلیٹ سے لتھڑی ہوئی دیوار پر ماری۔ انگلی بھی لتھڑ گئی۔ پلٹ کر ماں کے قریب آیا۔ اُس کے منہ میں انگلی ڈال کر بولا۔ ''ہپی برتھ ڈے ٹو می......''

اُس کی آواز دُکھ اور مایوسی کی شدت سے پہلے ہی مرتعش تھی، پھر بھرا گئی اور وہ سسک سسک کر رونے لگا۔

ماں کی تواتر سے بہتی ہوئی آنکھیں خشک ہوگئیں۔ اشک تھم گئے۔ سفید کریم اور میرون چاکلیٹ سے لتھڑی ہوئی انگلی کو چوستے ہوئے جواباً کراہی۔ ''ہپی برتھ ڈے ٹو یو...... میرے بیٹے!''

شکیل پھر دیوار تک گیا۔ انگلی پر مسلا ہوا کیک اُٹھا کر کبھی اسما کے منہ میں ڈالتا، کبھی اپنے اور کبھی اپنی ماں کے...... تھک گیا تو نڈھال شانوں کا بوجھ اُٹھائے کمرے سے نکل کر بازار چلا گیا۔

سر جھکائے بے مقصد، بے منزل گلی گلی چلتا گیا، آوارہ گھومتا رہا اور پھر جب دل کے بوجھ کی شدت میں کچھ کمی واقع ہوئی تو اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر واقع اِس اونچے ٹیلے پر آ کر بیٹھ گیا جہاں وہ اپنے اضمحلال اور کرب کو جھیل سکتا تھا۔

☆☆☆

شکیل نے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کیا تھا اور اب کالج میں داخلے کا خواہاں تھا مگر حسبِ توقع باپ نے درشتی سے فیصلہ صادر کر دیا۔ ''بس! جتنا پڑھنا تھا، پڑھ لیا۔ اَب کوئی کام کرو۔ میرے پاس فالتو پیسے نہیں ہیں کہ تم لوگوں پر لٹاتا پھروں۔''

صفیہ بیگم نے بیٹے کی حمایت میں بولنا چاہا تو شکیل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اعظم خان نے ماں بیٹے کے مابین ہونے والی کنایہ بازی کو دیکھ لیا اور خون آشام نظروں سے دیکھتا ہوا ڈیرے کی طرف چلا گیا۔

اُس نے گھر سے ملحقہ بڑی سی حویلی میں دو کمرے، باتھ روم اور برآمدہ بنوا رکھا تھا جسے وہ 'ڈیرے' کا نام دیتا تھا۔ اُس کے یار دوست ہر شام یہاں اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ یہیں جوئے کی چوکی جمتی تھی جس کے دوران وقفے وقفے سے شراب کے دور چلا کرتے تھے۔ شکیل اِس ڈیرے اور ڈیرے پر جمنے والی محفلوں کو گھر کی تباہی کا ذمّے دار ٹھہراتا تھا۔ اُسے اپنی وراثتی جائداد کی کوڑیوں کے بھاؤ نیلامی بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ روز بہ روز کروڑوں کی جائداد شراب اور جوئے کی نذر ہوتی جارہی تھی۔ اُس کا باپ اعظم خان، اپنی چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ کمالِ چالاکی سے اُس نے اپنی بہنوں کو جائداد میں حصہ نہ لینے پر آمادہ کر لیا تھا اور تمام جائداد اپنے نام منتقل کروالی تھی۔ کروڑوں کی اراضی اُس کے اللّوں تللّوں پر خرچ ہوجاتی تھی اور شکیل ماسوائے کڑھنے اور سر پیٹنے کے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

مزید غضب...... یہ تھا کہ شکیل کا سوتیلا چھوٹا بھائی، عدیل بھی باپ کے بے جا التفات کے باعث نہ صرف اُس کا ہمراز بن گیا تھا بلکہ وہ بھائی اور ماں کی کھلے عام مخالفت بھی کرنے لگا تھا۔ باپ کی ہمہ وقت حمایت کی وجہ سے شکیل اُسے غلط راستے پر چلنے سے روک دینے کی جرأت بھی نہیں رکھتا تھا۔

وہ صحن میں آ بیٹھا۔ ماں اُس کی فرمائش پر چائے بنانے لگی۔ ایسے میں ڈیرے کی طرف سے کار کے انجن کی گھرگھراتی آواز سنائی دی۔ اعظم خان کہیں جا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح دل کو یک گونہ اطمینان ملا کیونکہ اِس وقت اعظم خان کے جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ شب بھر گھر نہیں لوٹے گا۔ ایسے موقعوں پر عدیل کو اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ شکیل چائے پی کر گھر سے نکلا اور اپنی عادت کے مطابق سر جھکائے گھومتا رہا۔ اُس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ کوئی غم گسار نہیں تھا۔ ایک مسلسل شرمندگی اور ندامت اُسے دُنیا سے دور رکھتی تھی۔ اُس کا باپ بد ہی نہیں، بدنام بھی تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا، اُس کے باپ کا تذکرہ چھڑ جاتا اور وہ دانت پیس کر، سر جھکا کر اُس محفل سے اُٹھ جاتا تھا۔ اب تو یہ عالم تھا کہ بند زبانیں بھی اُس سے ہم کلام ہونے لگتی تھیں۔

''تمہارے باپ نے نجانے کتنے گھر اُجاڑ دیے ہیں۔''

اَن گنت جملے تھے جو ہتھوڑوں کی طرح اُس کی سماعت شکنی کرتے تھے مگر اُس کے پاس جواباً کچھ بھی تو نہیں تھا جو کہنے والے کے منہ پر مارتا اور سرخرو ہو جاتا۔

شام کے گہرے دھندلکے میں گھر پہنچا تو اُس پر یاسیت اور دُکھ کی دبیز تہ جمی تھی۔ آج تو گھر بھی ویران سا لگنے لگا تھا۔ بے حس سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شام تک اُسے بخار ہو گیا۔ دو دِنوں سے برائے نام کھایا پیا تھا۔ بے آرامی سوا تھی۔ دِل ہر وقت باپ اور بھائی کی طرف سے دُکھتا رہتا تھا۔ ایسے میں صحت دِگرگوں ہونی ہی تھی۔

چند نوالے کھانے کے نام پر لیے اس کے بعد ہاتھ رُک گیا۔ دیکھا، ماں کے چلتے ہاتھوں میں بھی سستی اُتری ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ ماں کا جسم بھی حدت پکڑ چکا ہے۔

شکیل بھاگ کر محلے کے اتائی ڈاکٹر مقصود کے پاس گیا۔ پیراسیٹا مول کی گولیاں اُٹھا لایا۔ دو گولیاں ماں کو کھلائیں، دو خود کھائیں اور معمول کے کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ثریا کا دودھ تیار کیا۔ اسما کو کھانا کھلایا اور پھر لیٹ گیا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ تھکا دینے والی رات کمرے میں اُتر آئی۔ ایسے میں اچانک اُس کی آنکھ کسی ناگوار آواز کے سبب کھل گئی۔ کوئی صحن میں موجود تھا جو اُبکائیاں لے رہا تھا۔ وہ چارپائی سے اُتر کر دروازے میں کھڑا ہو کر جھانکنے لگا۔ دیکھا کہ عدیل پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھے صحن میں دُہرا ہوا کھڑا تھا۔ شکیل نے اُس تک پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ یہ دیکھ کر اُس کے اوسان خطا ہو گئے کہ جہاں عدیل کھڑا تھا، وہاں کا فرش قے سے لتھڑا ہوا تھا اور تیز، ناگوار مگر شناسا بُو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے میں پھر کریہہ آواز کے ساتھ عدیل نے بھرپور قے کر دی۔ بدبُو کا ایک بھبکا سا اُٹھا اور قریب تھا کہ وہ تیورا کر گر جاتا مگر شکیل نے اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اُس کا لباس لیس دار الائش سے تر ہو گیا مگر اُسے کوئی پروا نہیں تھی۔

عدیل کو سہارا دیے وہ باتھ روم تک لے گیا، نیچے بٹھا کر اُس کی پشت کو تھپکنے لگا۔ اُسے حلق میں اُنگلی مار کر بار بار قے کرنے پر آمادہ کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد عدیل کی ہمت جواب دے گئی اور وہ نیم مردہ آواز میں بولا۔ ''میرا پیٹ دُکھتا ہے...... ہائے! آگ سی بھری ہوئی ہے......''

شکیل نے بڑی مشکل سے اُس کا لباس اُتروایا، ہاتھ منہ دھلوایا اور کمرے سے اُس کے لیے صاف لباس اُٹھا لایا۔ اُس نے ماں کو جگانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اُسے علم تھا کہ عدیل کی یہ حالتِ زار دیکھ کر اُس سے برداشت نہیں ہو گا اور اسے عدیل کے ساتھ ساتھ ماں کو بھی سنبھالنا پڑ جائے گا۔

معدے کی غلاظت کم ہوئی تو عدیل تھوڑا سنبھل گیا۔ بھائی کا سہارا لیے کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ چند ہی لمحوں میں اُس کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔

شکیل نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار کی حدت بھانپ کر گھبرا گیا۔ وہ اُس کے سرہانے بیٹھ کر سر دبانے لگا۔ گیارہ بجے کے قریب عدیل کے بخار نے شدت پکڑ لی۔ اُس نے تھرمامیٹر لگا کر چیک کیا تو پارہ ایک سو تین پر تھا۔ اُس نے بے چارگی کے عالم میں ماں کو جگایا۔ بادلِ ناخواستہ ماں کو بتانا پڑا کہ اُس نے پھر زیادہ مقدار میں شراب پی لی تھی۔ صفیہ بیگم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

بھاگ کر دودھ گرم کر لائی۔ عدیل کو جگا کر دوا دی اور دودھ پلا دیا۔ پھر اُسے سبز قہوہ بنا کر پلایا۔ گھریلو ٹوٹکے آزمائے مگر بارہ کے قریب بخار نے ننھے سے جسم کو بھٹی بنا دیا۔ وہ گھبرا کر شکیل کی مدد سے پٹیاں بھگو بھگو کر پیشانی اور بازوؤں پر رکھنے لگی۔ اُسے اپنی بیماری بھول گئی، بیٹے کی تندرستی کے لیے ساری رات چکراتی رہی۔ کبھی روتی، کبھی اُس کا سر گود میں رکھ کر دبانے لگتی۔ بھاگ بھاگ کر پٹیاں بھگوتی اور اُس کا بدن ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں جت جاتی۔ شکیل ڈاکٹر لانے کے لیے بھاگ نکلا۔

ڈیڑھ بجے کے قریب اُس کا بخار ایک سو چار کا ہندسہ عبور کرنے لگا تو وہ گھبرا کر اونچی اونچی آواز میں رونے

لگی۔

مامتا نے سمجھایا" لگی! رونے سے بیٹے کے بخار میں کمی واقع نہیں ہوگی۔ اُٹھ اور کوئی تدبیر کر۔ اعظم خان گھر میں ہوتا تو بیٹے کو لے کر کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا۔ وہ نہیں ہے تو تم اعظم خان بن کر بیٹے کی بیماری پر باپ کا پیار نچھاور کرو۔"

وہ بھاگ کر گلی میں آئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ شکیل دکھائی نہیں دیا۔ پھر ہمسائے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ارشد ڈینٹر بنیان پہنے باہر نکلا۔ اُسے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ گھبرا کر پوچھنے لگا" کیا بات ہے بھابی؟"

اُس نے عدیل کے بارے میں بتایا اور استدعا کی کہ اُس کے ساتھ اسپتال تک چلے۔

اُس نے تسلی دیتے ہوئے دردمندانہ لہجے میں کہا "بھابی! تم عدیل کے پاس جاؤ۔ میں موٹر سائیکل نکال کر لاتا ہوں۔"

وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں آئی۔ عدیل کی گردن ایک طرف ڈھلکی دیکھ کر دل تھام کر اُس کی طرف دوڑی۔ جسم جھٹکے لے رہا تھا۔ اُس کے قریب پہنچنے تک جھٹکے بند ہوگئے اور سانس رُک گئی۔

عدیل کے بے جان وجود کو ہلایا جلایا مگر کوئی حرکت نہ ہوئی۔ دل پر ہاتھ رکھا، دھڑکن محسوس نہیں ہوئی۔ نبض پر ہاتھ رکھا، نبض نہیں ملی تو چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھانے لگی۔ دماغ نے سمجھا دیا کہ اُس کا بیٹا اُس کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے نکل چکا ہے۔ دِل ماننے پر تیار نہیں تھا۔ دوسری چارپائی پر رکھے ہوئے پانی کے جگ کو اٹھانے کے لیے دوڑی۔ پائے سے اُلجھ کر زمین پر منہ کے بل جا گری۔ ایک دانت ٹوٹ کر گر گیا، ہونٹ پھٹ گیا مگر اُسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اُٹھی اور پانی کا جگ اُٹھا کر عدیل کے سر پر انڈیل دیا۔

دو تین سال پہلے ٹی وی پر تنفس کو مصنوعی طور پر بحال کرنے کا طریقہ بتلایا گیا تھا۔ اُسے بھول گیا تھا مگر اُس کی مامتا کو یاد رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے دیوانوں کی طرح عدیل کا جبڑا کھول کر پوری قوت سے پھونک مارنے لگی۔ ..... پھونک کر کھینچنا بھی پڑتی ہے۔ سانس اندر کی طرف کھینچا تو اپنے منہ سے نکلتا ہوا خون معدے میں چلا گیا۔ اُسے کوئی پروا نہیں تھی۔ سانس دیتی جاتی تھی اور زور زور سے اُس کے سینے کو جھنجھوڑتی جاتی تھی۔ پھر اچانک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے عدیل کے خاموش دل نے دھڑکنا شروع کر دیا ہو۔ اُس کے رگ وپے میں نئی توانائی بھر گئی۔

وہ اپنے کام میں اِتنی مگن تھی کہ اُسے گھر میں گھس آنے والے ہمسائیوں کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ تین چار عورتیں اور اتنی ہی تعداد میں مرد کمرے میں داخل ہو کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شکیل محلے کے اَتائی ڈاکٹر کو لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اپنے آلات تھامے شکیل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو اندر کا نقشہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔

پھر اچانک صفیہ بیگم پر خدا مہربان ہو گیا۔ اُس نے جن سانسوں کو قبض کیا تھا، اُنہیں مامتا کے جنون کو دیکھ کر لوٹانے لگا۔ پہلے دِل دھڑکا، پھر سانس بحال ہوئی اور آخر میں نبض نے دھیمے سے پھڑکنا شروع کر دیا۔ وہ ایک ٹک اُس کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔ ساکت پتلیوں میں حرکت پیدا ہوئی اور چند لمحوں بعد عدیل نے پلکیں جھپکنا شروع کر دیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ نقاہت سے نیلگوں ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔" امی!"

مامتا جیت گئی، موت ہار گئی۔ وہ چارپائی کے بازو پر دونوں ہاتھ ٹکائے جھکی کھڑی تھی۔ بیٹے نے اُسے پکارا تو وہ بے جان سی ہو کر پیچھے کی جانب گر گئی۔ سر دیوار سے ٹکرایا مگر اُسے تکلیف نہیں ہوئی۔ آنکھیں کھولے چارپائی... کی پائنتی کے ساتھ لگ کر کھڑے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ بیٹا گردن موڑے اُسے پکار رہا تھا مگر وہ سن نہیں رہی تھی۔

ایسے میں ارشد ڈینٹر اور ڈاکٹر مقصود عورتوں کو ہٹا کر اُس کے قریب آئے۔ ہلا جلا کر دیکھا۔ پانی منگوا کر لبوں سے لگایا۔ خون، پسینہ اور پانی ایک ہو گئے۔ وہ غٹا غٹ پانی پی رہی تھی۔

اُس کی طرف سے بے فکر ہو کر شکیل اور ڈاکٹر مقصود نے عدیل کی خبر لی۔ اُس کا بخار اُتر چکا تھا۔ خالی خالی نظروں سے اپنی ماں اور اطراف میں کھڑی محلے دار عورتوں کو دیکھنے لگا۔ وہ اَبھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر مقصود نے اُسے سرکاری اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ بولا۔" جب تک اِس کا معدہ صاف نہیں ہوگا، یہ خطرے میں رہے گا۔"

ایک عورت کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر شکیل نے ارشد ڈینٹر کی مدد سے عدیل کو اُٹھایا اور موٹر سائیکل پر لاد کر اسپتال کا رُخ کیا۔ ڈاکٹر مقصود بھی از راہِ ہمدردی اپنی موٹر سائیکل پر اُن کے ہمراہ چلا آیا۔

☆☆☆

شراب پینے کے سبب بے ہوش ہونے والے عدیل کو طبی امداد دینے کے ساتھ ساتھ میڈیکل آفیسر نے پولیس

کو بلوا لیا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ شبانہ ڈیوٹی پر موجود اہل کار، واحد بخش کانسٹیبل کے ساتھ چند دن قبل کسی معاملے میں اعظم خان کا معمولی جھگڑا ہوا تھا جسے کانسٹیبل نے اپنی اَنا کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ اعظم خان کا... کم سن بیٹا شراب پینے کا مرتکب ہوا ہے تو اُس نے کمالِ چالاکی سے میڈیکل آفیسر سے رپورٹ حاصل کر لی اور سورج نکلنے سے قبل ہی ڈیوٹی پر موجود افسر اکرام اللہ اور تھانہ محرر کو راز دار بنا کر ایف آئی آر چاک کر دی۔ اعظم خان جب صبح دم اسپتال پہنچا تو بیٹے کی خرابی صحت کے ساتھ ساتھ واحد بخش سے نبرد آزمائی کا مرحلہ بھی درپیش تھا۔ اُس نے ساز باز کرنے کی بہتیری کوشش کی مگر واحد بخش اور اکرام اللہ نے اپنا دامن نہ تھمایا۔

شکر تھا کہ عدیل بتدریج روبہ صحت ہو رہا تھا۔ اعظم خان کا تمام تر اشتعال اخراج کا بہانہ مانگ رہا تھا۔ ایسے میں جب اُسے پتا چلا کہ شکیل اور ارشد ڈینٹر عدیل کو نشے کی حالت میں اُٹھا کر اسپتال لائے تھے تو وہ شکیل پر پھٹ پڑا۔ یہ جرم ناقابلِ معافی تھا۔

اُس نے آؤ دیکھا، نہ تاؤ، گردن سے پکڑ کر اسپتال کی گیلری میں ہی شکیل کو بے دردی سے گھسیٹنے لگا۔ اسپتال میں ابھی عملہ حاضر نہیں ہوا تھا، اِس لیے صرف ارشد ڈینٹر ہی تھا جو شکیل کو اعظم خان کے ہاتھوں بچانے کا تردد کر رہا تھا۔ اعظم خان نے نہایت ظالمانہ انداز میں چند ہی لمحوں میں شکیل کی درگت بنا کر رکھ دی۔ شکیل خاموشی سے تب تک سہتا رہا، جب تک اُس کی ہمت نے جواب نہیں دیا تھا، پھر چیختا چلاتا ہوا اسپتال کے لان کو چیرتا ہوا عقبی دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

گھر پہنچا تو اِس حالتِ زار میں دیکھ کر صفیہ بیگم بُری طرح گھبرا گئی۔ دھیان عدیل کی طرف گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''عدیل تو ٹھیک ہے ناں؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ آنکھوں میں اُتری نمی کو ہاتھ کی پشت سے پونچھا اور بولا۔ ''وہ بالکل ٹھیک ہے، ہوش میں ہے پر اُس جنونی کو دورہ پڑ گیا ہے۔''

ماں سمجھ گئی کہ اُس کا اشارہ اعظم خان کی طرف تھا۔ بولی۔ ''کیا وہاں کوئی بھی تمہیں اُس سے بچانے والا نہیں تھا؟...... ہائے! ظالم نے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا میرے لعل کو...... ہائے ربا! اُس وحشی کے ہاتھ کیوں نہیں توڑ دیتا......''

وہ بیٹے کے وجود کو سہلاتی رہی اور جسم کو دھنک کر رکھنے والے کو کوستی رہی مگر دل کو چین نہیں آتا تھا۔ ایک بیٹا اسپتال میں پڑا تھا۔ دوسرا بمشکل اپنے پیروں پر چلتا ہوا گود میں آن گرا تھا۔ اُس کی اپنی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ ٹوٹا ہوا دانت درد کر رہا تھا۔ ایک گال سوجن پکڑ گیا تھا۔ بولتی تھی تو مسوڑھے کو تکلیف ہوتی تھی۔ آنکھیں سوئے آسماں شکوہ کناں انداز میں ٹھہری ہوئی تھیں۔

ایسے میں اسما بھی آنکھیں ملتی ہوئی وہاں آ گئی۔ بھائی کے نیل زدہ جسم اور روتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر رونے لگی۔ اُسے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی کہ اُس کے بھائی کو کس نے مارا پیٹا تھا۔

صفیہ بیگم مٹی کے ڈھیلے کو گرم کرنے کے بعد سوتی کپڑے میں لپیٹ کر شکیل کی ٹکور کرنے لگی۔ اسما اُس سے باتیں کرنے لگی۔ ایسے میں ڈیرے کی طرف سے کھٹارا کار کے انجن کی آواز سنائی دی۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تینوں کے دِل اندیشے اور خوف سے بھر گئے۔ پھر کچھ ہونے والا تھا۔

اعظم خان صحن میں داخل ہوتے ہی چلّایا۔ ''عدیل ڈیرے پر لیٹا ہوا ہے۔ اُس کے لیے دودھ میں دیسی گھی ڈال کر گرم کر دو۔''

اچانک اُس کی نگاہ شکیل پر پڑی۔ شکیل کی خاطر مدارت پر اُس کا خون پھر بھر گیا اور اُس کا ہاتھ چپل اُتارنے کے لیے مچل گیا۔ اِس سے پہلے کہ تینوں سنبھلتے، اعظم خان نے اپنی بھاری نوروزی چپل سے اُنہیں پچھاڑ ڈالا۔ اسما بھی بچ نہ پائی اور ایک ہی وار میں زمین بوس ہو گئی۔

شکیل نے جونہی اسما کو دروازے کی دہلیز میں گرتے دیکھا تو ایک ذرا تھم گیا۔ یوں لگا جیسے اُس کے مار گزیدہ بدن پر پڑنے والی چوٹیں تکلیف سے عاری ہو گئی ہوں یا اُس کے بدن میں تکلیف کو محسوس کرنے والی حس آنِ واحد میں ختم ہو گئی ہو۔ اعظم خان نے اپنے سامنے سینہ سپر کھڑے بیٹے کو دیکھا تو اُس کا غصہ فزوں تر ہو گیا، دہاڑا۔ ''تمہاری یہ مجال کہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالو...... میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔''

اِس کے ساتھ ہی اُس کے منہ سے مغلظات کی قے برآمد ہو گئی۔ شکیل کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں اُس گھڑی خوف یا دہشت کا پرچھائیں نہیں تھی بلکہ کچھ ایسا تاثر موجود تھا جسے کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا تھا۔

اُس نے باپ کے اُٹھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا، بولا۔

''بس کر ابا! بہت ہو گیا۔''

اعظم خان بھڑک کر پیچھے ہٹا، پھر بڑھا اور ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر اُس پر سانڈ کی طرح پل پڑا۔ طمانچے، مُکے، ٹھڈے...... وہ پاگلوں کی طرح شکیل کو پیٹ رہا تھا۔

پھر ایک زوردار دھکا کھا کر شکیل دیوار سے جا ٹکرایا۔ سر کا عقبی حصہ پوری قوت سے دیوار سے ٹکرایا اور وہ دیوار پر خون کی ڈراؤنی لکیر کھینچتا ہوا زمین پر بے جان انداز میں گر گیا۔ صفیہ بیگم اور اسما پہلے ہی ہوش کھو چکی تھیں۔ اُن پر ایک غصیلی نگاہ ڈال کر اعظم خان گالیاں دیتا ہوا ڈیرے کی طرف چلا گیا تھا۔

کوئی نصف گھنٹے بعد شکیل کو ہوش آیا۔ سر اور گردن کا عقبی حصہ خون سے تر تھا۔ اُس نے سر پر ہاتھ پھیرا جہاں تکلیف محسوس ہو رہی تھی، وہاں سے خون رس رہا تھا۔ بدقت تمام اُٹھا مگر لڑکھڑا کر خونی لکیر والی دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ نگاہیں کسی شے پر ٹھہر نہیں رہی تھیں۔ ایسے میں اچانک اُس کی نظر دہلیز پر آڑی ترچھی پڑی اسما پر پڑ گئی۔ وہ اپنی تکلیف بھول گیا اور ڈگمگاتے قدموں سے اُس کی طرف بڑھا۔ ایک ذرا اطمینان ہوا کہ اُس کی سانسیں چل رہی تھیں۔

گڑیا رو رو کر تھک گئی تھی، خاموش ہو گئی تھی مگر اُسے دیکھ کر پھر رونے لگی۔ پانی کے جگ کے پاس ہی اُس کا فیڈر پڑا تھا۔ اُس نے دونوں چیزیں اُٹھائیں، گڑیا کے منہ میں فیڈر دیا اور پلٹ کر اسما کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کی حرکات بجا طور پر غیر اختیاری اور خودکار محسوس ہو رہی تھیں۔ اسما کے منہ پر چھینٹے مارے، اُس نے آنکھیں پٹپٹائیں تو شکیل کا دھیان فوری طور پر ماں کی طرف چلا گیا جو اوندھے منہ کچے فرش پر گری پڑی تھی۔

ماں ہوش میں آ گئی تو وہ یکبارگی چکرا سا گیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر گھٹنوں کے بل ڈھے گیا۔ اُس کی قوتِ مزاحمت تمام ہو چکی تھی۔

صفیہ بیگم شاید ٹھیک ہی کہا کرتی تھی کہ اُس کی قسمت ہی ظالم تھی۔ ہوش میں آتے ہی، پوری طرح سنبھلنے سے پیشتر اپنے شکستہ بدن کے ساتھ خون سے لتھڑے ہوئے بیٹے کو سنبھالنا پڑا تھا۔ پے در پے درپیش آنے والے سانحات اور شوہر کی بے راہ روی نے اُسے اندرونی طور پر کمزور کر دیا تھا ورنہ وہ کم حوصلہ عورت نہیں تھی۔ عدیل آنکھوں کے سامنے نہیں تھا۔ دل کہتا تھا کہ وہ جہاں بھی تھا، بخیریت تھا۔ شکیل آنکھوں کے سامنے تھے، رُلا رہا تھا۔ اُس نے اسما کی مدد سے بدقت تمام شکیل کو گھسیٹ کر چارپائی پر ڈالا اور اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی۔ اُسے بخوبی اندازہ تھا کہ جب تک اُس کے سر کی چوٹ کا علاج نہ کیا گیا اور مرہم پٹی نہ کی گئی، اُس کی کوششیں بارآور ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔

اسما کو اُس کا دھیان رکھنے کا کہہ کر ڈگمگاتی ہوئی گھر سے نکلی۔ ڈاکٹر مقصود نے اپنا کلینک گھر کی بیٹھک میں بنا رکھا تھا۔ اُسے جا کر شکیل کی حالت کی خبر دی۔ وہ فوری طور پر مرہم پٹی کا سامان اور کچھ ادویات ہینڈ بیگ میں رکھ کر ہمراہ چلا آیا۔ اُس نے اپنے تمام تر ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے سر کے بال کاٹ کر ٹانکے لگانے کی جگہ بنائی، جلد کو سن کرنے والا انجکشن لگایا، ٹانکے لگائے اور دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ اسٹیچنگ کے بعد شکیل کو ہوش آ گیا اور خالی خالی نگاہوں سے کمرے کی چھت کو گھورنے لگا۔

صفیہ بیگم کو دوا کھانے اور شکیل کو کھلانے کے بارے ہدایات دینے کے بعد ڈاکٹر مقصود گھر سے نکل آیا۔ گلی کے عین وسط میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا۔ ”لوگ ہمیں اَتائی کہتے ہیں مگر جو حقیقت میں اَتا ہے، اُسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اُس کی رسّی خدا بھی ڈھیلی چھوڑ کر کئی معصوموں کو کڑے امتحان میں ڈال دیتا ہے۔ ایک شخص کی بدمعاشی اور بے راہ روی نے گھر کے تمام افراد کا جینا حرام کر رکھا ہے...... کاش! اعظم خان کو موت آ جائے...... ایسے زہریلے سائے سے تو یتیمی کی کڑی دھوپ بھلی ہوتی ہے۔“

☆☆☆

صفیہ بیگم کا دن گدھے کی طرح کام کرنے میں اور رات سوچوں کے جہنم کدے میں گزرتی تھی۔ وہ اپنے والدین کے اُس فیصلے کو کوستی رہتی تھی جس فیصلے پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے وہ اعظم خان کی دہکائی ہوئی دوزخ میں دلہن بن کر آئی تھی۔ اعظم خان کی پہلی بیوی اُس کے مظالم سہتی سہتی زندگی ہار گئی تھی۔ شکیل اُس وقت آٹھ سال کا تھا۔ صفیہ بیگم نے اعظم خان کے گھر میں قدم رکھتے ہی شکیل کو حقیقی مامتا سے نواز دیا تھا۔ شکیل نے بھی اُسے کبھی اپنی سوتیلی ماں نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی صفیہ بیگم کے بطن سے جنم لینے والے بچوں کو سوتیلا سمجھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اعظم خان کی بربریت پر وہ ماں کا غم گسار ثابت ہوتا تھا۔ اُسے عدیل کا رویّہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کڑھتا رہتا تھا اور عدیل کو باپ سے دور رکھنے کے لیے ترکیبیں لڑاتا رہتا تھا۔ انہی ترکیبوں اور کوششوں نے عدیل کو اُس سے متنفر کر دیا تھا۔

ڈیرے کا ماحول کسی بھی لحاظ سے اچھا نہیں تھا۔ اعظم خان ہر وقت عدیل کو اپنے ساتھ چمٹائے رکھتا تھا اور اُسے

اپنے ہمراہ ڈیرے پر ہی سُلایا کرتا تھا۔ بُری صحبت میں ہر وقت اُٹھنے بیٹھنے والے اعظم خان کی تمام تر عادات عدیل میں منتقل ہو رہی تھیں اور یہی بات شکیل کے لیے تکلیف دہ تھی۔

اُس نے اپنی سگی ماں کو اعظم خان کے ہاتھوں سسک سسک کر مرتے دیکھا تھا۔ دوسری ماں کا حشر بھی اُس کے سامنے تھا۔ شہر بھر میں پھیلی ہوئی رُسوائی بھی ناگوارِ خاطر تھی۔ ایسے میں عدیل کا باپ کے نقشِ قدم پر چلنا زندگی بھر کا روگ بنتا دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے بچپن اور پھر لڑکپن کا گزر رہا دورانیہ بڑا بھیانک اور اندوہ ناک تھا۔ شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا تھا جس میں اُسے بے دردی سے زدوکوب نہ کیا گیا ہو۔ اُس کے سامنے ماں اور اسما کو جوتوں اور ٹھڈوں سے بارہا زمین بوس کیا گیا تھا۔ باپ کا رویہ اُس کی سمجھ سے بالاتر ہی رہا تھا۔

رات جب سبھی سونے لگے تو ماں تھکی تھکی، مضمحل اور نڈھال دکھائی دیتی تھی۔ شکیل کے استفسار پر اُس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا اور گڑیا کو بغل میں دبا کر منہ سر لپیٹ کر سوگئی۔ اسما بھی شکیل کے استخوانی بازو پر سر رکھے ننھے ننھے خراٹے لینے لگی۔ کمرے میں اگر کوئی جاگ رہا تھا تو وہ شکیل تھا جو ایک تواتر کے ساتھ اِس جہنم کدے سے بھاگ نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کسی بھی فیکٹری میں ملازمت کرسکتا تھا۔ محنت مزدوری کرکے اپنی زندگی گزار سکتا تھا۔

اور نہیں تو اپنی بڑی پھوپی کے ہاں جاکر رہ سکتا تھا جو اُس سے بہت پیار کرتی تھی۔ وہاں اعظم خان کی دال نہیں گلتی تھی۔ پھوپا مزاج کے بہت سخت تھے اور انہیں اعظم خان ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ مگر...... مگر اُس کی ہر تان اِس نکتے پر آکر ٹوٹ جاتی تھی کہ اُس کے بھاگ جانے کے بعد ماں اور اسما کا کیا انجام ہوگا؟ وہ تو بہ مشکل ایک ماہ زندہ رہیں گی، پھر اُس کی حقیقی ماں کی طرح درگور ہوجائیں گی۔

کافی دیر گزر گئی۔ دروازے کے اوپر دیوار سے لٹکتے ہوئے وال کلاک نے گیارہ بجنے کا اعلان کیا تو صحن میں کسی کے قدموں کی چاپ اُبھری۔ وہ یکبارگی ڈر گیا۔ کوئی چور ڈاکو بھی ہوسکتا تھا۔ چاپ دروازے پر آکر رُک گئی۔ شکیل نے سانس روک لی۔ اُسے خوف کے بھیانک حصار سے اعظم خان کی بھاری آواز اور دستک نے نکالا۔ وہ صفیہ بیگم کو دروازہ کھولنے کا حکم دے رہا تھا۔ شکیل نے اُٹھنا چاہا، ایسے میں صفیہ بیگم کو چارپائی سے اُترتے دیکھ کر تھم گیا اور نیم وا آنکھوں سے نیلے بلب کی روشنی میں دیکھنے لگا۔ صفیہ بیگم نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اُسے اعظم خان نے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ دونوں کے درمیان نہ سمجھ میں آنے والی تکرار سن کر شکیل کو اندازہ ہوا کہ اعظم خان اسے کھینچ کر برابر کے کمرے میں لے گیا تھا۔

شکیل نے کروٹ بدلی۔ دل میں خوف بیٹھا ہوا تھا۔ یہ سُجھائی نہیں دیا کہ میاں بیوی کی خلوت میں اولاد کی جھانکا تانکی مکروہ عمل ہے۔ یہ سُجھائی دیا کہ اُس کی مظلوم ماں پھر خونی بھیڑیے کے پنجے میں جکڑی گئی ہے۔ وہ اُسے علیٰحدہ کمرے میں بند کرکے مار پیٹ رہا ہوگا۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ اُس کا گلا گھونٹ دیتا یا گولی مار کر ہمیشہ کے لیے خاموش کرادیتا۔ اُس نے بڑی آہستگی اور احتیاط سے اسما کے سر کے نیچے سے اپنا بازو نکالا اور ننگے پاؤں کمرے سے نکل کر بند دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا جس کے پار، اُس کے اندازے کے مطابق اعظم خان اُس کی ماں کو زدوکوب کر رہا تھا۔ دروازے کو بند دیکھ کر اُس کے شک کو تقویت ملی اور اُس نے کوئی آواز پیدا کیے بغیر جھک کر ایک انگشت بھر کی جھری پر آنکھ لگادی۔ باہر اندھیرا تھا۔ اندر سو واٹ کے بلب کی تیز روشنی تھی۔ منظر ٹی وی کی روشن اسکرین کی طرح صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اُس کی گردن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ باپ کی وحشت سامانیاں اور ماں کی گریہ زاری نے اُس کے اوسان خطا کردیے۔ اعظم خان کا دکھائی دینے والا رُوپ اُس کے لیے اجنبی تھا۔ وہ ظالم تو تھا ہی، اتنا ظالم بھی ہوسکتا تھا، شکیل نے کبھی سوچا نہیں تھا۔

شکیل گھٹنوں کے بل زمین پر گر سا گیا۔ بدن کی سکت جواب دے گئی۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی اور منظر دھندلانے لگا۔ اُسے بس یہی یاد رہا کہ اُس کی ماں کا بدن لاتوں، تھپڑوں اور ٹھڈوں سے چھلنی ہوچکا تھا۔ اُس نے دانت بھینچے تو مٹھیاں بھی سختی سے بھنچ گئیں۔ یکبارگی وہ پوری قوت سے چلایا۔ اُس نے اپنے باپ کو گالی دی تھی اور پوری قوت سے دروازے پر دوہتھڑ مارا تھا۔ اُس کے بعد اُسے کچھ یاد نہیں رہا تھا کہ اعظم خان کیسے بھوکے بھیڑیے کی طرح دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا اور اُس نے کتنی بے دردی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چوبی تختے سے اُس کی پٹائی کی تھی کیونکہ وہ اپنے ہوش میں نہیں رہا تھا۔

اُسے جب ہوش آیا تو وہ اپنی چارپائی کے قریب فرش پر پڑا تھا اور صفیہ بیگم نے اُس کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا

تھا۔ منظر اپنی مفہومیت سمیت اُس پر آشکار ہوا تو اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''وہ کتّا کہاں گیا ہے؟''

اُس نے اپنے باپ کو کتّا کہا تھا۔ صفیہ بیگم نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

سسک کر بولی۔ ''نہیں بیٹے! باپ کو ایسے نہیں کہتے۔''

اُس کے تن بدن میں نفرت کی آگ سلگ اُٹھی۔ کراہا۔ ''نہیں ماں! وہ میرا باپ نہیں ہے۔ وہ تو انسان کہلانے کے لائق بھی نہیں ہے۔ میں اُسے جان سے مار دوں گا۔''

صفیہ بیگم رو رہی تھی۔ اپنی آنکھیں پونچھنے کے بجائے دوپٹے سے اُس کا چہرہ پونچھ رہی تھی اور شکست خوردہ آواز میں اُسے خاموش رہنے کی استدعا کررہی تھی۔ بتا رہی تھی کہ اُس نے ہی کمرے میں جھانکنے کی غلطی کی تھی ورنہ یہ ظلم تو وہ شادی کے پہلے دن سے ہی بھگتتی چلی آئی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے مرحوم والدین اور بہن بھائیوں کو کوستی جارہی تھی جنہوں نے اُسے بیاہنے کے بعد آج تک پلٹ کر خبر تک نہیں لی تھی۔ کسی نے یہ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ کس حال میں زندگی کے ماہ وسال گزار رہی ہے۔

شکیل نے پوچھا۔ ''ماں! میں فرش پر کیوں پڑا ہوں؟''

''میں بڑی مشکل سے تمہیں یہاں تک کھینچ کر لائی تھی۔ تمہیں اُٹھا کر چارپائی پر ڈالنے کی ہمت نہیں تھی، اِس لیے تمہیں یہیں لٹا دیا اور خود بیٹھ گئی۔''

''ماں! ایک بات کہوں؟'' شکیل کے لہجے میں بے حد مایوسی اور لاچاری رچی ہوئی تھی۔

''کہو بیٹا!'' صفیہ بیگم کا دل کٹ کررہ گیا۔

''اس وحشی سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے کیا؟''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''ماں! یہاں سے بھاگ جائیں۔ دور...... کسی ایسی جگہ پر جہاں کی خبر بھی یہاں تک نہ پہنچ پائے۔ میں اب مزید کچھ بھی برداشت نہیں کرسکتا۔'' وہ بولا۔

ماں کے لب سل گئے۔ آنکھیں سرد ہوگئیں۔ بیٹا وہ سوال کررہا تھا جس کا جواب وہ خود برسوں سے ڈھونڈتی چلی آئی تھی۔ ''سوائے اللہ سے مدد مانگنے کے کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بہت ظالم ہے۔ ہم نے گھر سے باہر قدم نکالا تو ہمیں جان سے مار ڈالے گا۔''

ویزا

''میں کل دس دن کے لیے چین جارہا ہوں۔''

''کیا ویزا آسانی سے مل گیا؟''

''ویزا کی کیا ضرورت ہے؟''

''مجھے ڈر ہے کہ تم ویزا کے بغیر چین میں داخل نہیں ہوسکو گے۔''

''ارے نہیں بھائی... میں تین دفعہ چین جا چکا ہوں۔ وہاں کسی نے مجھ سے ویزا کارڈ طلب نہیں کیا... سب امریکن ایکسپریس کا کریڈٹ کارڈ خاموشی سے قبول کر لیتے ہیں۔''

شیر گل خان، لنڈی کوتل

وہ کٹیلے لہجے میں بولا۔ ''تو کیا ہم اَب زندہ ہیں؟''

ماں نے لاجواب ہوکر کھلے دروازے کے باہر اپنی اُجلی چادر پھیلاتی ہوئی صبح کو دیکھا۔

زندگی میں صبح کے اَن گنت چہرے دیکھے تھے۔ بے شمار اُجالوں کی جھلک دیکھی تھی۔ تبھی اِس صبح کے دامن میں اپنے لیے کوئی نوید، کوئی اچھی خبر، کوئی دلاسا نہ پاکر سسکنے لگی۔

پھر اُس نے اپنے دوپٹے کا پلّو پھیلا دیا۔ اوپر کی جانب نظریں جما کر یاس بھرے لہجے میں بولی۔ ''ربّا! اِن معصوموں پر تو کچھ رحم کر...... میں تو اپنے کسی گناہ کی سزا بھگت رہی ہوں مگر اِن معصوموں نے تو دُنیا کا کچھ نہیں بگاڑا...... ربّا! ان پر رحم کر، یا اِن بے چاروں کو اپنے پاس بلا لے......''

دُعا کی قبولیت کی گھڑی دبے پاؤں آتی ہے اور بنا کچھ بتائے واپس چلی جاتی ہے۔ صفیہ کو بھی اُس کے آنے اور چلے جانے کی خبر نہیں ہوئی۔

ابھی شکیل سو رہا تھا اور صفیہ دن چڑھے اسیا کو ناشتا کرا رہی تھی جب ہمسائی ثریا بانو مستعار لیا ہوا گھی کا کپ لوٹانے آئی تو اُس نے بتایا۔ ''آئے ہائے! غضب ہوگیا صفوبی! کچھ سنا تم نے؟''

اُس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا، بولی۔ ''خدا خیر کرے۔ کیا ہوا؟''

''پچھلی گلی میں ایک بچے کا قتل ہوگیا ہے!'' ثریا بانو

کا ہاتھ بھی چھاتی پر جا ٹکا اور آنکھیں دفورِ کرب سے چھلک پڑیں۔ صفو کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گھی کا کپ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔

وہ تفصیل پوچھنا چاہتی تھی مگر عین اسی وقت اعظم خان طوفانی رفتار سے گھر میں داخل ہوا۔ وہ بھاگتا ہوا گھر کے مرکزی کمرے میں گھسا۔ چند لمحوں بعد کمرے سے نکلا تو اُس نے ہاتھ میں بڑے نوٹوں کی گڈی پکڑی ہوئی تھی۔ صفیہ بیگم کے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی وہ جس طرح اُڑتا ہوا آیا تھا، ویسے ہی گھر سے نکلتا چلا گیا۔

صفیہ بیگم کے دل سے نکلا۔ ''یا اللہ! خیر ہو۔''

ثریا بانو جاتے جاتے بولی۔ ''پر خیر لگتی نہیں ہے۔''

☆☆☆

شکیل جاگا تو دوپہر ہونے چلی تھی۔ صفیہ بیگم نے اُس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھ دی۔ وہ سر جھکائے لقمے توڑنے لگا۔ صفیہ بیگم نے اُسے پچھلی گلی میں رہنے والی تہمینہ بیگم کے کم سن بیٹے طاہر کے اندوہ ناک قتل کی تفصیل سنانا شروع کر دی۔

اُس نے بتایا۔ ''رات کو کسی پہر میں کوئی شخص تہمینہ کے گھر گھس آیا۔ اُس نے تہمینہ بیگم کے پاس سوئے ہوئے طاہر کو اُٹھایا اور دوسرے کمرے کے باتھ روم میں لے جا کر گولی مار کر قتل کر دیا۔ اُس بے چاری کو پتا تک نہیں چلا۔ جب وہ جاگی تو اُس نے طاہر کو بیڈ پر نہ دیکھ کر گھر میں تلاش کیا۔ جب اُس نے باتھ روم میں اپنے بیٹے کی لاش دیکھی تو پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی صحن میں نکل آئی۔ محلے والے اکٹھے ہو گئے اور پولیس آ گئی۔ بے چارہ طاہر! کتنا سوہنا اور لاڈلا بیٹا تھا تہمینہ کا...... ہائے! اکلوتا بھی تو تھا۔ نجانے کس درندے نے اُسے قتل کر دیا۔ معصوم بچے کو؟ اُس سے بھلا کسی کو کیا دشمنی تھی؟''

وہ چونکا۔ طاہر کا سراپا آنکھوں میں گھوم گیا۔ چند لمحوں تک تو یقین نہیں آیا۔ جب ماں نے یقین دلا دیا تو وہ دکھ سے بولا۔ ''آنٹی تہمینہ کہاں ہے؟''

''ثریا بتا رہی تھی کہ اُسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے جایا گیا ہے۔''

''اور طاہر کا باپ؟''

''وہ کل فیصل آباد گیا ہوا تھا، مال لینے، رات وہیں رُک گیا تھا۔ آج صبح گھر پہنچا تو قیامت برپا دیکھی۔ اب وہ گم صم بیٹھا ہے، نہ کچھ بولتا ہے، نہ روتا ہے اور نہ ہی کھاتا پیتا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو اُس گھر سے ایک جنازہ اور نکلے گا۔'' ماں کے لہجے سے دُکھ کا گہرا اور شکست خوردگی کا غیر معمولی تاثر مترشح تھا۔

شکیل نے کھانا کھا لیا تو صفیہ بیگم نے برتن سمیٹ لیے۔ وہ چپل پہن کر گھر سے نکل آیا۔ اُس کا رُخ طاہر کے گھر کی طرف تھا جو اِسی محلے کی دوسری گلی میں واقع تھا۔

وہاں لوگوں کی بھیڑ ابھی تک دکھائی دیتی تھی۔ شام تک وہ اِسی چکر میں گھومتا پھرتا رہا۔ جب گھر پہنچا تو ماں سے اعظم خان کے بارے میں استفسار کیا۔ ماں نے بتایا کہ وہ صبح دم ہنگامی حالت میں گھر آیا تھا اور پیسے اُٹھا کر کچھ بتائے بغیر نکل گیا تھا۔ تب سے اَب تک نہ تو وہ لوٹا تھا اور نہ ہی اُس نے فون پر رابطہ کیا تھا۔

شکیل نے گھر میں پڑے ہوئے موبائل فون سے باپ کا نمبر ملایا۔ فون 'پاورڈ آف' تھا۔ وقفے وقفے سے اُس نے کئی مرتبہ کال ملانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ اس نے عدیل سے باپ کے بارے پوچھا۔ عدیل کو بھی اُس کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔

وہ رات دیر تک جاگتا رہا۔ اُس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ طاہر کے بہیمانہ قتل میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اُس کا باپ ملوث تھا مگر اُس نے گھر میں یا گھر سے باہر کسی سے بھی اپنے شک کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ کوئی مہینہ بھر پہلے ...... محلے کے ایک نوجوان نے رات کو دس بجے کے قریب اعظم خان کو تہمینہ کے گھر چپکے سے داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے شکیل کو بتایا تو اس نے کندھے اچکا کر بات آئی گئی کر دی۔ اس کا باپ اس سے پہلے بھی محلے کے دو چار گھر برباد کر چکا تھا۔ اب اس نے خوب رُو تہمینہ کو تاڑ لیا تھا تو یہ اس کی سرشت کے مطابق ہی تھا۔

اِس قتل کے غمناک واقعے کے دس دن بعد تک اُس کا شک یقین میں بدل گیا کیونکہ ایک طرف تو قاتل کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا تھا اور دوسری طرف اعظم خان نے اِس دوران گھر میں کسی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے یا تو زمین نگل گئی تھی یا آسمان نے اُچک لیا تھا۔

مزید دس دن گزر گئے۔ طاہر کے قاتل کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ طاہر کو اندوہ ناک موت کا شکار ہوتے ہوئے تہمینہ بیگم سمیت کسی نے بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے بھی قاتل کے بارے میں کوئی ایسا مضبوط کلیو نہیں دیا تھا جو اُس کی گرفتاری کا سبب بنتا مگر اردگرد کی سنی سنائی باتوں کو مدِنظر رکھ کر شکیل، طاہر کے قتل کے معمے کو سلجھا چکا تھا۔

اعظم خان کے غیاب نے گھر کی فضا کو یک لخت پُرسکون اور آئیڈیل بنا دیا تھا۔ عدیل اپنے بھائی اور ماں کی بات سننے اور عمل کرنے لگا تھا۔ ڈیرا بند ہو چکا تھا۔ وہ ایک فرد ہی ہر فساد کی جڑ تھا، چلا گیا تو زندگی پُرسکون ہوگئی۔ ایسے میں طاہر کے قتل کی پھانس شکیل کو ساری رات جگائے رکھتی۔ اس کانٹے کو بھی وہ نکال پھینکنا چاہتا تھا۔

اُس نے اپنے طور پر تھانے کے انچارج کا سیل نمبر حاصل کیا۔ فرضی نام بتا کر موبائل شاپ سے ایک نیا فون حاصل کیا اور نصف شب کو اُس نئے نمبر سے اُس نے ایس ایچ او سے رابطہ کیا۔ اُس نے خود ارادی طور پر اپنی آواز قدرے بھاری رکھی، بولا۔ ''سر! میں ایک نہایت اہم اور حساس مسئلے پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کے پاس وقت ہے؟''

انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔ ''آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟''

شکیل کے لہجے میں کمالِ اعتماد بھر گیا، بولا۔ ''سر! یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ آپ مجھے کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔''

انسپکٹر جاوید، چند دِن قبل ہی اِس تھانے میں تعینات ہوا تھا۔ جوان العمر انسپکٹر جاوید اُ بھی کر گزرنے کا جنون دل میں رکھتا تھا۔ اُس نے شکیل سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں بالکل فری ہوں۔ آپ کھل کر بات کر سکتے ہیں۔''

شکیل نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو کھولا اور بھرائی ہوئی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔ ''سر! میں ایک ماہ قبل محلہ اکبر پورہ کے ایک گھر میں ہونے والے بہیمانہ قتل کے سلسلے میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ قتل ہونے والے بدنصیب بچے کا نام طاہر تھا جو پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ اُس کے باپ کو کاروباری سلسلے میں کبھی نہ کبھی رات باہر گزارنا پڑتی تھی۔ یہ واردات ایسی ہی ایک سیاہ رات میں ہوئی تھی۔''

انسپکٹر جاوید نے کچھ کہنا چاہا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں سر! آپ پہلے میری بات کو توجہ سے سنیں، پھر اِس پر بحث کریں۔ پلیز!...... پولیس نے قاتل کے تعین کے سلسلے میں محض طاہر کی ماں تہمینہ بیگم کے بیان پر اکتفا کیا تھا۔ کسی اہلکار نے یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ اکیلے گھر میں ماں کے پہلو میں سوئے ہوئے بچے کو کوئی کیسے اُٹھا سکتا ہے؟ بچہ بھی وہ جو دس سال یا زیادہ عمر کا ہو اور خاصا صحت مند بھی ہو...... یہ بھی نہیں سوچا گیا کہ موسم سرما میں ہر کوئی کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سوتا ہے۔ قاتل بند کمرے میں کیسے داخل ہوگیا؟...... تہمینہ بیگم کے پہلو میں سے بچے کو اُچک لیا گیا اور دوسرے اٹیچڈ کمرے کے باتھ روم میں لے جا کر گولی ماری گئی اور اُس کی آنکھ ہی نہیں کھلی؟ سر! یہ کیسے ممکن ہے؟...... ماں تو بچے کی سانسوں کی رفتار میں واقع ہونے والے تغیر پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی ہے۔ وہ کیسی ماں تھی؟...... سر! قتل دُشمنی اور نفرت کی انتہا کہلاتا ہے۔ طاہر سے کسی کو ایسی دُشمنی نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر کوئی دُشمن تھا بھی تو وہ تہمینہ یا اس کے شوہر کا تھا جس کے بارے میں دونوں میاں بیوی ضرور جانتے ہوں گے۔ ایک اور اہم بات...... جب یہ سارا کھیل تہمینہ کی خوابیدگی میں سرانجام پا گیا تو وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ قتل کرنے والا ایک شخص تھا، وہ زیادہ بھی تو ہوسکتے ہیں۔ میرا دِل یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے کہ تہمینہ بیگم کو اپنے بیٹے کے قاتل کا علم نہیں ہے۔ آپ براہِ کرم اپنی تفتیش کا ازسرِنو آغاز اُسی سے کریں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بہت جلد قاتل تک پہنچ جائیں گے۔''

کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر ختم ہوگئی تھی۔ وہ سانس لے کر بولا۔ ''سر! کیا آپ میری بات سن رہے ہیں؟''

انسپکٹر جاوید نے طویل سانس حلق میں اُتاری اور بولا۔ ''آپ کے خیال میں بچے کا قاتل کون ہوسکتا ہے؟''

وہ بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تہمینہ بیگم ہی اپنے بچے کی قاتلہ ہے یا اس کو بخوبی علم ہے کہ وہ کون ہے؟''

''اُسے اپنے اکلوتے بیٹے کو قتل کرنے کی یا بچے کے ظالم قاتل کو بچانے کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟'' انسپکٹر نے تیز لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے یا تم کوئی گیم کھیل رہے ہو۔''

''سر! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ رات گزار رہی ہو اور طاہر جاگ گیا ہو؟ دُنیا میں سب کچھ ممکن ہوتا ہے سر جی! پلیز آپ......''

''مجھے ڈکٹیٹ مت کرو۔ جو کچھ جانتے ہو، وہ بیان کرو، بس!'' انسپکٹر جاوید کا لہجہ قدرے سخت ہوگیا۔ ''تم ایک شریف گھرانے کی باپردہ عورت، جس بے چاری کا اکلوتا بیٹا قتل کر دیا ہے، پر بہتان تراشی کر رہے ہو؟''

''سر! مجھے اپنے لفظوں کی سنگینی کا بخوبی علم ہے۔ آپ جو بھی کہہ لیں، میں اپنے مؤقف پر قائم ہوں۔'' شکیل نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تم سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟''

''سر! ہماری ملاقات نہیں ہوسکتی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''نہ ہی آپ مجھے ڈھونڈ سکتے ہیں کیونکہ میں چند دنوں

کے لیے اس شہر میں گیا تھا جہاں یہ قتل ہوا تھا۔ میں نے اپنے محسوسات آپ کو بتا دیے ہیں۔ اب آپ جانیں، آپ کا کام جانے...... گڈ بائی!''

اُس نے کال منقطع کرتے ہی فون بند کیا اور 'سم' نکال دی۔

اُس کا کام ہو چکا تھا اس لیے اب اسے سنبھال کر رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے جلتی ہوئی دیا سلائیوں کی لو میں سم کو جلا دیا۔

اُس کی کوشش بارآور ثابت ہوئی تھی، یہ خبر اُسے صبح دم ہی مل گئی۔ پولیس دن چڑھنے سے پیشتر ہی تہمینہ بیگم اور اُس کے نڈھال شوہر علی محمد بزاز کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔ شام تک پورے شہر میں ہاہا کار مچ گئی تھی کہ تہمینہ نے نہ صرف قاتل کا نام پولیس کو بتا دیا تھا بلکہ اپنی معاونت کا اقرار بھی کرلیا تھا۔

شکیل کی توقع کے عین مطابق طاہر کا قاتل اُس کا باپ اعظم خان ہی تھا۔ وہ اپنی ہوس کی شیطانی آگ سرد کرنے کے لیے تہمینہ بیگم کی خلوت پر حملہ آور ہوتا تھا۔ اس رات بھی علی محمد کی غیر موجودگی میں وہ تہمینہ بیگم کے ساتھ دادِ عیش وصول کر رہا تھا جب طاہر اچانک دروازہ کھول کر کمرے میں آ گیا۔ اس نے اپنی ماں کو ایک اجنبی کے ساتھ حالتِ غیر میں دیکھا تو چیخنے چلّانے لگا اور اپنے باپ کو بتانے کی دھمکیاں دینے لگا۔ تہمینہ نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئی جس پر اعظم خان نے اُسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

پولیس نے شکیل اور اُس کی ماں کو گرفتار کرلیا اور اعظم خان کے بارے میں باز پُرس کی۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ جھڑکیاں سنتے رہے، رشتے داروں کے نام و پتے بتاتے رہے اور لوگوں کی طنز بار نظروں کا سامنا کرتے رہے۔

دو تین دِنوں بعد محلے کے معززین کی دخل اندازی پر اُنہیں تھانے سے اُٹھا دیا گیا۔ اُسی شام کو خبر ملی کہ اعظم خان کی گرفتاری عمل میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

مسلسل کرب اور تشدد میں گزری زندگی کی سفا کی کا ردِعمل تھا کہ شکیل کو اپنے باپ کو جیل میں پہنچا کر قلبی سکون میسر آیا تھا۔ اُس نے باپ کی عیاشیوں سے بچی ہوئی جائیداد کو سنبھالا اور چھوٹے پیمانے پر کاروبار شروع کر دیا۔ اُس کی لگن، محنت اور دیانت داری نے چند ماہ میں ہی نہ صرف معاشرے میں گھرانے کا کھویا ہوا وقار بحال کر دیا بلکہ گھر کو جنت نما بنا دیا تھا۔ اسما تندرست ہو گئی تھی۔ ماں پُرسکون تھی۔ عدیل دل لگا کر پڑھنے لگا تھا اور اُس نے بے راہ روی اور آوارگی ختم کر دی تھی۔ وہ ماں اور بھائی کی دل و جان سے عزت کرنے لگا تھا۔

اعظم خان اور تہمینہ کے خلاف پولیس نے کیس اتنی محنت اور مشاقی سے تیار کیا تھا کہ ہر کوئی یہ کہتا کہ دونوں کو سزائے موت ہو جائے گی۔ اگر سزائے موت سے بچ گئے، تب عمر قید تو کہیں نہیں گئی مگر اعظم خان کے جواری اور شرابی دوستوں نے اعظم خان کے ایما پر کیس کے مدعی، مقتول طاہر کے باپ کو مٹھی میں کرلیا اور اُسے یہ باور کرا دیا کہ اب اگر دونوں پھانسی کے پھندے پر جھول بھی جائیں تو اُس کا طاہر دنیا میں نہیں آ سکتا۔ وہ اعظم خان پر چار حرف بھیجے اور اپنی بیوی کو جیل سے نکالے۔ خدا اور بیٹے سے نواز دے گا۔

اُن کی شبانہ روز محنت رنگ لائی اور دونوں شہر بھر کی ملامتیں سمیٹنے کے لیے ایک سال کی جیل یاترا کے بعد رہا ہو گئے۔ شکیل کے لیے وہ دن بڑا بھیانک اور تلخ تھا جس دن اُس نے یہ خبر سنی تھی۔ اُس کی محنت اکارت گئی تھی اور وحشی شخص پھر باپ بن کر اُس کے سر پر سوار ہونے کے لیے جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اُس کے اندیشے بے محل ثابت نہیں ہوئے کیونکہ اعظم خان کے گھر میں قدم رکھتے ہی ڈیرا آباد ہو گیا۔ جواری اور شرابی یار جشن منانے کے لیے آن اکٹھے ہو گئے تھے۔ شکیل نے جب دکان سے واپسی پر پُررونق ڈیرے کی طرف دیکھا تو دل کٹ کر رہ گیا۔ تب تو اُس کی حالت بالکل ہی غیر ہو گئی جب اُس نے عدیل کو پانی کی ٹھنڈی بوتلیں اُٹھائے ڈیرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

چند ہی دِنوں میں عدیل بھائی کی اُنگلی چھوڑ کر ڈیرے کا ہو کر رہ گیا۔ ماں کی دو مرتبہ پٹائی ہو گئی۔ اپنی قمیص کے اگلے پلّو پر سالن گرانے کے جرم میں اسما کو زوردار تھپڑ لگا جس کے باعث اُس کے کان کا پردہ پھٹ گیا اور خون کا فوارا بہہ نکلا۔ دو دِن اسپتال میں گزارنا پڑے، تب کہیں خون رُکا۔ وہ بے چاری زندگی بھر کے لیے ایک کان کی قوتِ سماعت گنوا بیٹھی تھی۔ اعظم خان پہلے سے کہیں ہتھ چھٹ، غصہ ور اور وحشی ہو کر آیا تھا۔ طویل اور کٹھن مسافت کے بعد محض ایک سال کا پُرسکون پڑاؤ پھر حسرت بن کر نظروں کے سامنے معلق ہو گیا تھا۔

وہ رات بھی بڑی تاریک اور سفاک تھی جس رات شکیل کام سے لوٹا تھا۔ آج وہ قدرے دیر سے گھر آیا تھا۔

اُس نے چولھے پر بیٹھی روٹیاں پکاتی ہوئی ماں کو زار و قطار روتے دیکھا۔ اُس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ مستفسر ہوا۔ ''کیا ہوا ماں؟ ایسے کیوں رو رہی ہو؟''

ماں نے ہچکیوں کے درمیان اُسے بتایا کہ گڑیا کو نہلانے کے سبب ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ نمونیا ہو گیا تھا۔ شام کو اعظم خان اور وہ اُسے لے کر اسپتال گئے تھے۔ ڈاکٹر نے علاج و معالجہ کے بعد اُنہیں گھر روانہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ بچوں کے بارے میں ذرہ بھر احتیاط نہیں کرتے۔ آپ کی غفلت کی وجہ سے بچوں کو نمونیا ہو جاتا ہے۔ اگر اسے آج نہلایا نہ جاتا تو اِسے چیسٹ انفیکشن نہ ہوتی۔ احتیاط کیا کریں ناں!''

ڈاکٹر کی اِس بات نے اعظم خان کا پارا چڑھا دیا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، کلینک کے سامنے، کھلی سڑک پر صفیہ بیگم کو جوتوں اور تھپڑوں سے ادھ موا کر دیا۔ جب لوگ اکٹھے ہو گئے تو اُس نے سڑک پر لوٹ پوٹ ہوتی صفیہ کو گھسیٹ کر کھٹارا گاڑی میں ڈالا اور گھر لے آیا۔ صفیہ بیگم تب سے اَب تک سسک رہی تھی۔

شکیل کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پانی بھرا گلاس کپکپانے لگا۔ اُس نے پانی پیے بغیر گلاس نیچے رکھ دیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ماں! بس..... آج اِس کہانی کو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا چاہیے۔ اس کہانی کو ہمیشہ کے لیے..... قیامت تک کے لیے..... ماں! بہت ہو گئی!''

چونکہ یہ بات اُس نے کئی مرتبہ ماں کے سامنے کہی تھی، اِس لیے اُس نے خاص اہمیت نہیں دی۔ وہ اُٹھا، کمرے میں گیا اور پھر تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اُس کے ہاتھ میں تیز اور چمکدار پھل والی کلہاڑی دبی ہوئی تھی۔ اُس نے قصداً ڈیرے پر جانے کے لیے گلی کا چکر کاٹا تھا۔

اعظم خان ڈیرے پر موجود تھا کیونکہ اُس کی گاڑی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں بڑے کمرے میں داخل ہوا۔ عدیل دکھائی نہیں دیا۔ کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ اُس نے دروازے کو دھکیلا..... اعظم خان کو دیوار کی سمت والی چارپائی پر لیٹا پایا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ شکیل نے قریب جا کر بڑی آہستگی سے لحاف پیٹ تک سرکا دیا۔ ایسے ہی وقت میں اُسے پتا چلا کہ گڑیا باپ کے بازو پر سر رکھے سو رہی تھی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور اُس نے دونوں ہاتھوں کی پوری طاقت کلہاڑی پر صرف کرتے ہوئے اعظم خان کی پیشانی پر وار کر دیا۔

کلہاڑی کا پھل ایک انچ تک پیشانی میں گھس گیا۔

شکیل نے کلہاڑی کو کھینچنا چاہا مگر اس کا پھل پھنس گیا تھا۔ دو چار مرتبہ کی اندھا دھند کوشش سے کلہاڑی کا پھل باہر نکلا۔ اعظم خان ایک ذرا تڑپا مگر شکیل کی وحشت کے سامنے وہ زیادہ مزاحمت نہ کر سکا کیونکہ شکیل نے چند سیکنڈ میں ہی سر سے لے کر چھاتی تک اُسے کاٹ کر رکھ دیا۔ اُس نے اوپر تلے کوئی چالیس پچاس وار کر ڈالے تھے۔ شراب کے نشے میں دھت اعظم خان کو تڑپنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ اور تو اور..... گڑیا کی نیند کا استغراق تک نہیں ٹوٹا تھا۔

قیامت کا جھونکا آیا، سب کچھ خاکستر کرتا ہوا دبے پاؤں لوٹ گیا۔ شکیل کے جسم کی تمام تر توانائی نچڑ گئی تھی اور وہ کلہاڑی کے دستے پر پیشانی ٹکا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لہو سے تر باپ کو دیکھتا رہا پھر اُٹھ کر قہقہے لگانے لگا۔ وہ بجا طور پر اپنے ہوش میں نہیں تھا۔

پھر کمرے کی انتہا تک ٹہلتا گیا، ہنستا گیا پھر لاش کی طرف پلٹا۔ گڑیا کو اُٹھایا، کندھے پر ڈالا اور کلہاڑی لہراتا ہوا درمیانی دروازہ عبور کر کے ماں کے پاس پہنچ گیا۔

عجیب کرب سے معمور لہجے میں بولا۔ ''ماں! میں نے کہانی ختم کر دی ہے..... لے! اپنی گڑیا کو سنبھال لے، اِس پر سے گندہ خون صاف کر لے اور..... مجھے آخری بار دیکھ لے۔ میں گنہ گار ہوں۔ باپ کا قاتل ہوں۔ مجھے نہ تو دنیا معاف کرے گی نہ ملک کا قانون۔ مگر خدا کے لیے تم مجھے معاف کر دینا کیونکہ تم جانتی ہو کہ میں قصوروار نہیں ہوں۔ میں نے جو کیا، مجبوری کے عالم میں کیا۔ میں تھانے جا رہا ہوں، پیش ہو کر اپنا جرم قبول کر لوں گا۔ خدا حافظ!''

ماں نے پلٹ کر شکیل کو دیکھا۔ وہ اور گڑیا خون سے تر تھے۔ اُس کے حلق سے ایک دردناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ گڑیا پر جھپٹ پڑی۔ اُسے پہلی نظر میں یہ شک گزرا تھا کہ گڑیا مر چکی ہے مگر جب اُسے بالکل ٹھیک حالت میں دیکھا تو فوراً شکیل کی طرف مڑی۔

بیٹھی بیٹھی آواز میں بولی۔ ''یہ خون کس کا ہے؟''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا بلکہ ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے سیاہ پڑتے لبوں پر مچلی۔ اُس نے کلہاڑی کو کندھے پر ڈالا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے گھر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

صفیہ بیگم ہونقوں کی طرح دیدے پھاڑے اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو اچانک سلب کر لیا گیا تھا۔

گریگ کے منہ سے ایک اور زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

”تم بالکل بےکار شخص ہو بریڈلی۔“

”مجھے ایسے بُلانا بند کرو۔“ بریڈلی چلّایا۔

”تو کیا ایسا کرنے سے سچ بدل جائے گا۔“ گریگ نے آنکھیں گھمائیں۔

بریڈلی کا غصے سے بُرا حال تھا۔ اس نے گریگ کی ڈیسک پر رکھے ہوئے چھوٹے سے مگر ایک وزنی مجسمے پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”بس بہت ہوگیا۔ تم کتنے عرصے سے میرا مذاق اڑا رہے ہو، میری بےعزتی کرتے رہے۔ میں اب اور برداشت نہیں کروں گا۔ اگر تم نے مجھے دوبارہ بےکار کہا تو قسم خدا کی میں تمہارا خون کردوں گا۔“

گریگ غصے سے اپنی کرسی سے اٹھا اور بولا۔ ”میں نے بھی تمہیں بہت برداشت کرلیا۔ کتنی بار جب میں نے تم پر انحصار کیا کسی کام کے لیے تو مجھے اس کام میں ہمیشہ ناکامی ہی ملی ہے۔ میں جتنی بار چاہوں تمہیں بےکار ہی بُلاؤں گا۔“

بریڈلی کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھ مجسمے کی جانب بڑھا دیے۔ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس نے وہ بھاری مجسمہ گریگ کے سر پر دے مارا۔

رفاقت و قربت کا چونکا دینے والا انجام مختصر مگر دلچسپ کتھا۔۔۔

زندگی کا وہ لمحہ جب انسان، ایک متاعِ عزیز سے محروم ہو جائے، نہایت کرب آمیز ہوتا ہے... ان لمحوں کا مختصر قصہ جب دوستی... دشمنی میں ڈھل رہی تھی...

بیکار

محمد سجاول خان



گریگ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور اس کی نظریں اپنے پارٹنر کے چہرے پر جم گئیں۔ خون کی ایک لکیر اس کے سر سے بہتی ہوئی اس کے چہرے پر آرہی تھی۔ پھر وہ ایک بے جان پتھر کی طرح فرش پر گر گیا۔

بریڈلی کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ اس نے اپنے سامنے پڑی لاش کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک سکتے کی کیفیت میں تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے آلۂ قتل کی جانب نظر دوڑائی۔ اس نے ایک جھرجھری سے لی اور مجسمہ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ جیسے ہی زمین سے ٹکرایا اس سے ہونے والی جھنکار نے بریڈلی کو سکتے سے باہر نکالا اور حقیقت کی دنیا میں لے آیا۔

وہ پیچھے کی جانب کھنچتا چلا گیا اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ ''اے خدا! یہ مجھ سے کیا ہوگیا۔ میں نے اس کا قتل کر دیا۔'' وہ ڈیسک کے پیچھے پڑی گریگ کی کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کی نظریں لاش پر جمی ہوئی تھیں۔

''یہ میں نے کیا کر دیا؟'' وہ بڑبڑایا۔ اس کے دماغ میں بہت سے خیالات گردش کر رہے تھے۔ ''گریگ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ میں بے کار آدمی ہوں۔ ایک بدھو اور ناکام انسان ہو جیسا وہ ہمیشہ کہتا تھا۔'' اس نے سوچا۔

اس نے اپنی آنکھیں بھینچی اور بڑبڑایا۔ ''میں ایک قاتل ہوں۔''

اس کے جسم میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اسے جسم میں سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ نہ صرف اس نے اپنے پارٹنر بلکہ اپنے ایک اچھے دوست کو بھی کھو دیا تھا۔ ایک غلط بات یہ بھی کہ یہ قتل اس نے اپنے ہی آفس میں کام کے دوران کر دیا تھا۔۔۔ دبے پاؤں وہ دروازے کی جانب بڑھا، یہ تسلی کی کہ دروازہ لاک ہے۔ اس نے آس پاس نظریں دوڑائیں اور باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ ''میں زیادہ دور نہیں بھاگ سکوں گا۔ ہر کسی کو پتا چل جائے گا کہ یہ قتل میں نے کیا تھا۔''

''میں جیل نہیں جاؤں گا بالکل نہیں۔'' وہ تڑپ اٹھا۔

''مجھے جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' اس نے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔

اس کا خوف اسے جرم چھپانے کے لیے متحرک رکھے ہوئے تھا۔ وہ بڑبڑایا۔ ''آئی ایم سوری گریگ۔''

اس نے آنکھیں بند کیں اور ایک گہری سانس لی۔ ''میں تمہاری وجہ سے تو جیل بالکل نہیں جاؤں گا بالکل بھی نہیں۔''

لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ وہ گریگ کی ڈیسک پر پہنچا اور دائیں دراز کھولی۔ اندر ایک پستول پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اسے گریگ کی وہ ہنسی یاد آگئی اور ساتھ ہی اس کی بات بھی۔ بریڈلی کو یاد تھا جب وہ کہتا میں بھی ایک پستول خریدنا چاہتا ہوں۔ تو گریگ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ ''تم میں اتنی ہمت کہاں کہ پستول چلا سکو۔ اگر کوئی تمہارے گھر میں گھس آئے اور تمہاری جان کو خطرہ بھی ہو تو پھر بھی تم اسے چلا نہیں سکو گے۔''

پستول کو چھوتے ہی اس کے جسم میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ ''بس یہاں پر تم سے غلطی ہوگئی۔'' اس کی نظریں پستول پر جمی ہوئی تھیں۔ ''تم میرے بارے میں غلط تھے، بالکل غلط۔'' اس نے ایک گہری سانس لی اور پستول پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ہاتھوں میں تول کر اس نے پستول کا وزن محسوس کیا۔

وہ سیدھا چلتا ہوا گریگ کی لاش کے قریب آیا اور اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ''بس یہی ایک راستہ ہے۔''

اس نے آخری بار اپنے دوست پر نظر دوڑائی اور اپنے ثبوت مٹاتے ہوئے بولا۔ ''اسی طرح میں تم پر اور ہر کسی پر یہ ثابت کر دوں گا کہ میں ایک بے کار شخص نہیں ہوں۔'' اور پھر اس نے ٹریگر دبا دیا۔

☆☆☆

اطلاع ملتے ہی پولیس موقع پر پہنچ چکی تھی۔ فرانزک عملہ اپنے کام میں مشغول تھا۔ چیف نے کئی بار گریگ کا معائنہ کیا...... اب وہ پھر جھک کر گریگ کے سر کا جائزہ لے رہا تھا پھر وہ اس کیس پر مقرر ڈیٹیکٹو کی جانب بڑھا۔

گریگ کو دیکھ کر اس نے افسوس سے سر ہلایا اور گویا ہوا۔ ''اس کی موت فوراً ہی واقع ہوگئی تھی۔''

ڈیٹیکٹو نے سر ہلایا اور بولا۔ ''یہاں پر کام کرنے والوں نے گولی چلنے کی آواز سنی لیکن کوئی بھی نہیں جانتا کہ اصل میں یہاں پر ہوا کیا تھا۔''

''اچھا...... ویسے... واضح طور پر لگتا ہے کہ اس نے خود اپنے ہاتھ سے ٹریگر دبایا ہے۔ دیکھو ابھی بھی پستول اس کے ہاتھ میں ہی ہے۔'' اس نے دوبارہ گریگ کے سر کا معائنہ کیا۔

''لیکن اس کے ساتھ جو یہاں پر موجود تھا، وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔ اسے شدید صدمہ پہنچا ہے اور اسے اب اسپتال لے گئے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت ہوش میں آجائے گا...... وہ جب بھی ہوش میں آئے تم اس سے سوال وجواب کر سکتے ہو۔ شاید وہ جانتا ہو کہ اس کے پارٹنر نے کیوں خودکشی کی؟''

اوٹ

شاکر لطیف

مجرم کی شاطرانہ چالوں کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں... سنسنی... خوف اور دہشت پھیلا دینے والی کہانی کا آغاز و انداز... قاتل سفاک تھا... خون آشام درندہ تھا... جسے صرف انسانی خون کی بھینٹ چاہیے تھی... ہر لمحہ خوف و دہشت میں مبتلا کر دینے والی سنسنی خیز پُرانتقام تحریر...

ایک پولیس آفیسر کو خطرناک دوراہے پر لاکھڑا کر دینے والی وارداتوں کا قصہ



سارجنٹ بٹلر جیسے ہی شیرف کے آفس میں داخل ہوا، شیف نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انٹرکام پر اپنے پی اے کو ہدایات جاری کیں کہ اسے کسی کی آمد پر ڈسٹرب نہ کرے اور ملاقاتی کو انتظار کرنے کا کہے۔ انٹرکام کریڈل پر رکھ کر وہ دوبارہ سارجنٹ بٹلر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ تاہم کچھ بولنے کے بجائے اسے ایسی نظروں سے گھورنے لگا جیسے اپنی نگاہوں سے اس کا ایکسرے کرنا مقصود ہو۔ سارجنٹ اچھی طرح جانتا تھا کہ شیرف کے آفس میں اس کی طلبی کیوں ہوئی ہے اور شیف اسے کیوں گھور رہا ہے۔ تاہم وہ بھی دانستہ کچھ بولنے سے گریز کرتے ہوئے شیف کے بولنے کا منتظر رہا۔ اسے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں شیرف کے لب ہلے۔

''سارجنٹ بٹلر! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ پورے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ میڈیا کی جانب سے بھی ایک طوفان برپا ہو چکا ہے جس چینل کو بھی دیکھو، وہ پولیس کی کارکردگی کو تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے۔ اعلیٰ حکام کی طرف سے مجھ سے بھی سخت باز پرس ہوئی ہے۔ آخر تمہاری پولیس کیا کر رہی ہے۔ شہر میں تین افراد قتل ہو چکے ہیں جبکہ تم ابھی تک قاتل کے بارے میں کوئی معمولی سا کلیو حاصل کرنے میں بھی ناکام رہے ہو۔''

''سر، ہم کام کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہی ہمیں قاتل کے بارے میں کلیو مل جائے گا اور ہم اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' سارجنٹ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''سارجنٹ تمہاری یہ باتیں میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہاری باتوں میں کہاں تک صداقت ہے۔ تاہم اگر موجودہ حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہارے پاس بھی کہنے کو کچھ نہیں ہے۔'' شیرف کے لہجے میں تلخی عود آئی۔

''ایسی بات نہیں ہے سر۔'' سارجنٹ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم ابھی تک قاتل کے بارے میں کوئی واضح کلیو حاصل نہیں کر سکے مگر ہم اس کی نفسیات سے کافی حد تک واقف ہو چکے ہیں۔ اب تک کی تفتیش سے یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ یہ کسی ایسے جنونی شخص کا کام ہے جو آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی ایسے مذہب سے وابستہ ہے جس میں انسانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے تاکہ دیوتاؤں کو خوش کیا جا سکے۔ بظاہر یہ مضحکہ خیز سی بات ہے مگر اس معاملے میں حقیقت ہے۔''

''تو کیا تم بھی اپنے ماتحت گیری کی اس رائے سے متفق ہو کہ یہ واقعی کسی ایسے شخص کا کارنامہ ہو سکتا ہے جو دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے انسانوں کی بھینٹ دیتا ہو۔'' شیرف نے متذبذب لہجے میں کہا۔

''بادی النظر میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ گیری نے اپنی تفتیش کا درست رخ متعین کیا ہے۔'' سارجنٹ نے پُرخیال لہجے میں جواب دیا۔ ''ہر مرنے والے شخص کے سینے پر خنجر کی نوک سے ایک اجنبی زبان میں کچھ لکھا جاتا ہے۔ حیرت کی بات تھی کہ تینوں وارداتوں میں ایسا کیا گیا، تحریر اور لکھنے کے انداز میں رتی بھر بھی فرق نہیں، اسی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ کسی ایک ہی شخص کا کارنامہ ہے۔ اس اجنبی تحریر کو ایکسپرٹ سے پڑھایا گیا تو پتا چلا کہ یہ افریقہ کے وحشی قبائل کی قدیم زبان ہے اور یہ وحشی قبائل دیوتاؤں کو خوش کرنے اور ان سے فوائد حاصل کرنے کے لیے انسانوں کی بھینٹ دیتے وقت یہ تحریر مرنے والے کے سینے پر کندہ کرتے تھے۔ ان تینوں مرڈرز میں بھی بالکل وہی قدیم طریقہ کار اپنایا گیا ہے۔''

''میرے خیال میں قاتل نے یہ سب پولیس کو ڈاج دینے یا الجھانے کے لیے کیا ہے۔'' شیرف نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''آج کے ترقی یافتہ دور میں ایسے توہمات کی بھلا کیا گنجائش؟''

''سر توہمات کی گنجائش ہر دور میں موجود رہتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی دور میں توہم پرستی کا زہر پوری قوم میں پھیل چکا ہوتا ہے اور کسی دور میں محض چند افراد اس کا شکار ہوتے ہیں۔ ہمارا واسطہ بھی ان چند افراد میں سے کسی ایک سے ہے۔ ایسے افراد کا اپنے مذہب یا عقیدے کے بارے میں گمان بڑا مضبوط ہوتا ہے۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ انہیں توہم پرست یا جاہل کہنے والے بے وقوف ہیں اور ایک دن دنیا بھی ان کے عقیدے پر یقین کرلے گی۔'' سارجنٹ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ہمیں قاتل کی گرفتاری سے سروکار ہونا چاہیے۔ اس کے توہم پرستانہ عقائد سے نہیں۔ ہمارے لیے یہ بات سب سے اہم ہے کہ اس وقت ہر طرف پولیس کی ناکامی کے چرچے ہیں۔ بعض اخبارات میں تجزیہ کاروں نے یہاں تک رائے دی ہے کہ یہ کیس پولیس سے لے کر کسی اور ایجنسی کے سپرد کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ پولیس کی توہین ہوگی۔'' شیرف نے متفکر لہجے میں کہا۔

''سر، آپ مجھ پر بھروسا رکھیں۔ میں جلد ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔'' سارجنٹ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہاری باتوں پر ایک بار پھر بھروسا کر لیتا ہوں۔'' شیرف نے تھکی لہجے میں سر ہلایا۔ ''ویسے یہ حقیقت ہے کہ تمہاری کارکردگی نے مجھے خاصا مایوس کیا ہے۔ تمہارا سابقہ ریکارڈ بہت شاندار ہے اور میں نے تمہارے ریکارڈ کی وجہ سے ہی یہ کیس تمہارے سپرد کیا تھا مگر یہاں تمہاری کارکردگی تمہارے سابقہ ریکارڈ کے بالکل برعکس جا رہی ہے۔''

''مجھے بس کچھ وقت درکار ہے۔'' سارجنٹ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا ماتحت گیری کچھ ایسے نکات پر کام کر رہا ہے جن کی مدد سے ہم قاتل تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''اوکے، تم جا سکتے ہو۔'' شیرف نے میز پر رکھی ایک

فائل اٹھا کر کھولتے ہوئے کہا تو سارجنٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر شیرف کو پولیس کے مخصوص انداز میں سیلیوٹ کرتا ہوا اس کے دفتر سے باہر نکل آیا۔ ویسے مذہبی جنونیت کی کہانی کو میڈیا میں بھی اچھالا جا رہا ہے۔ دفتر سے نکلتے ہوئے شیرف کے جملے اس کے کانوں میں پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے آفس کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر اس وقت شکنوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا اور چہرے سے بھی صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ذہنی طور پر خاصا الجھا ہوا ہے۔

سارجنٹ بٹلر کا تعلق لاس اینجلس پولیس سے تھا۔ وہ لاس اینجلس پولیس میں ایک قابل اور ذہین پولیس آفیسر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس کا ریکارڈ بھی بہت شاندار تھا۔ تاہم موجودہ صورتِ حال پہلی بار اس کے ریکارڈ کو داغ دار کر رہی تھی۔ لاس اینجلس میں قتل کی تین وارداتوں نے پورے شہر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اموات کے تسلسل اور لاشوں کے سینے پر لکھی جانے والی تحریر سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ شہر میں کوئی سیریل کلر سرگرم ہو چکا ہے۔ زبانوں کے ماہرین نے لاشوں کے سینوں پر کندہ تحریر پڑھ لی تھی۔ بقولِ ماہرین یہ زبان افریقہ کے قدیم وحشی قبائل میں بولی جاتی تھی جو دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے انسانوں کی بھینٹ دیا کرتے تھے۔ قتل کرتے وقت انسان کے عین دل پر خنجر مارا جاتا تھا جس سے وہ چند لمحوں میں ہی ہلاک ہو جاتا تھا۔ لاس اینجلس میں ہونے والے تینوں قتل میں بھی خنجر کا استعمال کیا گیا تھا۔ خنجر کو دستے تک مقتول کے سینے میں پیوست کر دیا جاتا تھا اور پھر اسی حالت میں رہنے دیا جاتا..... خنجر کے دستے پر بھی افریقی زبان میں تحریر لکھی ہوئی ملتی تھی جو بالکل وہی تھی جو لاشوں کے سینوں پر کندہ کی جاتی تھی۔ تاہم خنجر پر سے کسی قسم کے فنگر پرنٹس نہیں مل سکے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل ربڑ کے دستانے استعمال کرتا تھا۔

بظاہر وہی طریقۂ کار اپنایا گیا تھا جو انسانوں کی بھینٹ لیتے وقت قدیم وحشی قبائل اپناتے تھے مگر شیرف کا خیال تھا کہ ایسا محض پولیس کو الجھانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ بہر حال بات جو بھی تھی سارجنٹ بٹلر کی ذمے داری تھی کہ وہ قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچائے۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے سب سے ذہین افسر گیری کی ڈیوٹی بھی لگا رکھی تھی۔

آفس کے پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کر کے وہ جیسے ہی اپنے آفس کی کرسی پر براجمان ہوا، اس نے گیری کو طلب کر لیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ گیری کی تفتیش میں کوئی پیش رفت ہوئی ہے یا نہیں؟ آج شیرف کے دفتر میں ہونے والی ملاقات سے اسے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اب شہر میں ہونے والے ان تینوں مرڈرز کے پیچھے موجود شخصیت کا سراغ نہ لگایا گیا تو اس کی جلد ہی متوقع ترقی کے امکانات بھی معدوم ہو جائیں گے۔ پروگریس دکھانا اب بہت ضروری ہو گیا تھا۔ گیری تقریباً پچیس سال کا ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ اس کی فراخ پیشانی اور آنکھوں کی چمک اس کی ذہانت کا پتا دیتی تھیں۔ سارجنٹ ذاتی طور پر بھی گیری کا مداح تھا۔ کیونکہ گیری نے کچھ ایسے الجھے ہوئے کیس بھی حل کر لیے تھے جنہیں حل کرنے میں خود سارجنٹ بھی بُری طرح ناکام ہوا تھا۔ وہ تنگ نظر یا کم ظرف انسان نہیں تھا۔ اس لیے سب کے سامنے گیری کی تعریف کرنے میں کوئی حسد یا قباحت محسوس نہیں کرتا تھا۔ گیری کی صلاحیتوں کا اعتراف سارجنٹ کے ساتھ ساتھ شیرف کو بھی تھا۔

گیری آفس میں داخل ہوا تو سارجنٹ نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے فوراً ہی کیس کی تفتیش کے بارے میں سوال داغا۔

''سر، میری تفتیش ابھی جاری ہے۔ تاہم میں پُر یقین ہوں کہ جلد ہی قاتل کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔'' گیری نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آج شیرف کے آفس میں دوسری بار میری طلبی ہوئی ہے۔'' سارجنٹ نے کہا۔ ''شیرف کا کہنا ہے کہ اعلیٰ حکام کی طرف سے قاتل کو جلد از جلد گرفتار کرنے کے لیے خاصا دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ میڈیا کا پریشر الگ سے ہے۔ شیرف تمہاری اس تفتیش سے بھی خاصا غیر مطمئن ہے کہ یہ کام کسی ایسے مذہبی جنونی کا ہے جو دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انسانوں کی بھینٹ دے رہا ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور اور خاص کر امریکا جیسی ریاست میں یہ بات خاصی مضحکہ خیز لگتی ہے۔''

''آپ کی بات کافی حد تک ٹھیک ہے۔'' گیری نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''مگر اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ امریکا جیسی ریاست میں بھی مذہبی جنونیوں اور جاہلوں کی کمی نہیں ہے۔ میری معلومات کے مطابق اگرچہ اس طرح سے انسانوں کی بھینٹ دینے کا رواج قدیم افریقی قبائل میں تھا اور اب افریقی قبائل میں ایسے رواج معدوم ہو چکے ہیں۔ تاہم کچھ قبائل ڈھکے چھپے انداز میں آج بھی ان قدیم رسومات کی پیروی کر رہے ہیں۔ بس سب کچھ دنیا سے چھپا کر کیا جاتا ہے۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ آج بھی دنیا میں

انسانوں کو دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے اور آج بھی ایسی سوچ رکھنے والے افراد موجود ہیں؟'' سارجنٹ نے حیرت سے استفسار کیا۔

''سر، اس بات کو بالکل خارج از امکان بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' گیری نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''قتل کی ان تینوں وارداتوں میں قاتل نے خنجر کا استعمال کیا ہے۔ وہ خنجر کو لاش کے دل میں پیوست چھوڑ کر چلا جاتا ہے مگر اس سے پہلے کسی دوسرے خنجر یا نکیلی شے سے مقتول کے سینے پر قدیم افریقی زبان سے تحریر کندہ کرنا نہیں بھولتا۔ اسے کسی قسم کا خوف لاحق نہیں ہوتا۔ ورنہ کسی کو مارنے کے بعد قاتل کی پہلی ترجیح جائے واردات سے فرار ہونا ہی ہوتی ہے مگر تینوں افراد کے قتل میں یہ بات مشترک ہے کہ قاتل نے انہیں مارنے کے بعد ان کے سینوں پر اطمینان سے بیٹھ کر تحریر بھی کندہ کی۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے میرے اس شبہے کو تقویت ملتی ہے کہ ہمارا واسطہ کسی ایسے مذہبی جنونی سے ہے جو آج بھی انسانوں کو دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھانے جیسی قدیم رسومات کی پیروی کر رہا ہے۔''

''مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ قاتل نے محض پولیس کو الجھانے کے لیے مذہبی جنونیت کی آڑ لے رکھی ہو اور اس کی ان تینوں مقتولین کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی یا عداوت ہو۔'' سارجنٹ نے رائے پیش کی۔

''اس امکان کو بھی یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ قاتل قوم پرستی اور مذہبی جنونیت کی اوٹ لے کر اپنی کسی پرانی دشمنی کا حساب چکتا کر رہا ہو۔'' گیری اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سلسلے میں بھی معلومات حاصل کر رہا ہوں۔ تاہم فی الحال تینوں مقتولین کا آپس میں کوئی تعلق ثابت نہیں ہو سکا۔ ویسے بظاہر نظر نہیں آتا کہ ان تینوں کا آپس میں کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ خاص کر ہیرسن سے۔ کیونکہ وہ ایک منشیات فروش تھا۔ منشیات فروشی کے علاوہ اس کے اور بھی دھندے تھے۔ پیسے کی خاطر وہ گھناؤنا سے گھناؤنا کام کرنے کو بھی تیار رہتا تھا۔ باقی دونوں افراد کا تعلق جرائم کی دنیا سے نہیں تھا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور اور دوسرا بینک میں ملازم تھا۔ اگر ان تینوں کے قتل کے طریقۂ کار میں مماثلت نہ پائی جاتی تو شاید ہم ان مرڈرز کو کسی ایک قاتل کے کھاتے میں بھی نہ ڈالتے۔ ہیرسن جرائم پیشہ شخص تھا اور اس کی کافی لوگوں سے دشمنی تھی۔ منشیات فروشوں کی آپس میں کاروباری رقابت عام سی بات ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر ایسے لوگ ایک دوسرے کی جان لینے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس لیے ہیرسن کی موت پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ بھی کسی کاروباری رقابت کے نتیجے میں مارا گیا ہے۔ تاہم تینوں مرڈرز کے طریقۂ کار میں سو فیصدی مماثلت نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ یہ کسی ایک ہی شخص کا کارنامہ ہے۔''

''ہوں۔'' گیری کے دلائل سننے کے بعد سارجنٹ نے ہنکارا بھرا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا اور پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''ابھی تک ہم اس پُراسرار قاتل کے بارے میں کوئی واضح کلیو تلاش نہیں کر پائے۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ مزید افراد کی جانیں لے گا یا نہیں؟ شیرف نے اس بات پر خاصا زور دیا ہے کہ قاتل کو فی الفور گرفتار کیا جائے اور پھر میڈیا بھی ان واقعات کو کافی اچھال رہا ہے۔ اگر شہر میں اس طرز کی مزید کوئی واردات ہوئی تو پولیس کی بہت بدنامی ہوگی۔ ممکن ہے یہ کیس پولیس سے لے کر کسی اور ایجنسی کے حوالے کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں بدنامی کے ساتھ ساتھ پولیس کا مورال بھی نیچے گر جائے گا۔''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' گیری مضبوط لہجے میں بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ ہم جلد ہی قاتل کو گرفتار کر لیں گے۔''

''تم نے اس کا سراغ لگانے کے لیے اگلا لائحہ عمل طے کر لیا ہے؟'' سارجنٹ نے پوچھا۔

''میرے خیال میں ایک نکتے پر کام کیا جا سکتا ہے اور میں اس سلسلے میں معلومات حاصل کر رہا ہوں۔'' گیری نے پُرخیال لہجے میں جواب دیا۔

''تم کون سے نکتے کی بات کر رہے ہو؟'' سارجنٹ نے چونک کر استفسار کیا۔

''سر! قاتل ہر مقتول کے دل پر خنجر سے وار کرتا ہے اور پھر خنجر اس کے دل میں ہی پیوست رہنے دیتا ہے۔ خنجر کا دستہ لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے اور اس پر بالکل ویسی ہی تحریر کندہ ہوتی ہے جیسی مقتولین کے سینے پر کندہ کی جاتی ہے۔ قدیم افریقی زبان والے یہ خنجر ریڈی میڈ نہیں ہیں... بلکہ انہیں خصوصی طور پر کہیں سے تیار کروایا گیا ہے۔ میں شہر میں ایسے افراد کو چیک کروں گا جو کسٹمر کی ڈیمانڈ پر خنجر کے دستوں پر ان کی من پسند تحریروں کو کندہ کرتے ہیں۔ عام طور پر لوگ خنجروں پر اپنے نام وغیرہ کندہ کرواتے ہیں۔ شکاری حضرات اپنے دوستوں وغیرہ کو تحائف دیتے وقت بھی ایسے خنجر تیار کرواتے ہیں جن پر وصول کنندہ کا نام درج ہو۔'' گیری نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہت طویل اور اکتا دینے والا کام ہے۔''

سارجنٹ نے غیر مطمئن لہجے میں کہا۔ ''اس طرح تو اس شہر کے ہزاروں افراد کو چیک کرنا پڑے گا۔ ان سے معلومات حاصل کرنا پڑیں گی اور پھر خنجروں پر تحریریں کندہ کرنا ان کا معمول کا کام ہے۔ انہیں اپنا ہر گاہک کہاں یاد رہتا ہوگا؟''

''مگر جس نے بھی یہ تحریر کندہ کی ہے، اسے یہ کسٹمر ضرور یاد رہ گیا ہوگا۔'' گیری پُرزور لہجے میں بولا۔ ''یہ انسانی نفسیات ہے کہ انسان اپنے معمولاتِ زندگی میں ہونے والے روٹین کے کام اور باتیں تو بھلا دیتا ہے مگر کچھ غیر معمولی اور انفرادی خصوصیات کی حامل باتیں اسے کبھی نہیں بھولتیں۔ خنجر پر کام کرنے والے اس شخص کو بھی انہی وجوہات کی بنا پر اپنے گاہک کا چہرہ یاد رہ گیا ہوگا۔ پہلی انفرادی خصوصیت تو وہ اجنبی زبان ہے جسے خنجر پر کندہ کیا گیا ہے اور دوسری یہ کہ اس عجیب وغریب زبان کو خنجر پر بڑی مہارت سے کندہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک باریک اور مشقت طلب کام ہے۔ کام کرنے والے نے اس کا منہ مانگا معاوضہ وصول کیا ہوگا۔ اس وجہ سے بھی اسے کسٹمر کی شکل یاد رہ گئی ہوگی۔ تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ قاتل نے یہ تحریر خنجر پر خود کندہ کی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ مقتولین کے سینوں پر کندہ کرتا ہے یا پھر اس نے تحریر کندہ کرانے کا کام کسی دوسرے شہر سے کروایا ہو۔ ایسی کسی بھی صورتِ حال میں مجھے اپنی تفتیش کا رخ نئے سرے سے متعین کرنا پڑے گا۔ بہرحال فوری طور پر تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے میرے ذہن میں یہی ایک نکتہ ہے۔ آج سے اس پر کام شروع ہوجائے گا۔''

''ٹھیک ہے جیسے تم مناسب سمجھو۔'' سارجنٹ نے مفاہمانہ لہجے میں کہا۔ ''مگر مجھے جلد از جلد کوئی قابلِ ذکر پروگریس چاہیے۔ کیونکہ میرے لیے شیرف کو جواب دہی مشکل ہوتی جارہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شیرف کو بھی اس کیس کے سوا کوئی اور کام نہیں رہ گیا۔''

''میں پوری کوشش کررہا ہوں سر، جلد ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔'' گیری نے اٹھتے ہوئے کہا تو سارجنٹ نے بس سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ گیری جاچکا تھا۔ تاہم اس کے جانے کے بعد بھی سارجنٹ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ آج شیرف سے ہونے والی ملاقات اور پھر گیری سے بات چیت نے اسے ذہنی طور پر خاصا الجھا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک فائل نکال لی۔ یہ فائل شہر میں ہونے والے مرڈرز پر ہی تیار کی گئی تھی۔ اس نے فائل کھول لی۔ پہلے صفحے پر ایک گنجے سر اور نیلی آنکھوں والے ہیرسن کی تصویر تھی۔ ساتھ ہی اس کے بارے میں حاصل ہونے والی چیدہ چیدہ معلومات بھی درج تھیں۔ ہیرسن ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ وہ قاتل کا سب سے پہلا شکار تھا۔ اسے اس کے فلیٹ میں ہی قتل کیا گیا تھا۔ پولیس نے اب تک جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق ہیرسن رات آٹھ بجے کے بعد اپنے فلیٹ کا دروازہ کھلا رکھتا تھا۔ کیونکہ اس وقت منشیات کے متلاشی اس کے فلیٹ کا رخ کرتے تھے۔ وہ ہر ایک کے لیے بار بار دروازہ کھول اور بند نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے دروازہ کھلا رکھنے کی بھی یہی وجہ تھی۔ وہ وقت اس کے کاروبار کا تھا۔ وہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو گراں قدر قیمت پر منشیات کی پڑیا دیتا اور فوراً ہی وہاں سے چلتا کردیتا تھا۔ وہ ایک بدنام زمانہ علاقے کا رہائشی تھا۔ اس پورے علاقے کو منشیات فروشی کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے پولیس بھی شاذونادر ہی اس جگہ کا رخ کرتی تھی۔ پولیس کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس رات روٹین کے برعکس اس کے فلیٹ کا دروازہ مقفل تھا۔ نشے کے کچھ عادی افراد نے سمجھا کہ وہ موجود نہیں ہے اس لیے موقع غنیمت جانتے ہوئے دروازہ توڑ کر اندر جا گھسے۔ ان کا خیال تھا کہ ہیرسن نے اپنے فلیٹ میں کافی مقدار میں منشیات چھپا رکھی ہوگی۔ نشے کی طلب سے ان کا جسم چور چور ہورہا تھا۔ اس لیے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونے جیسا اقدام کر بیٹھے مگر اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے ایک بھیانک نظارہ دیکھا۔ ہیرسن کی لاش زمین پر پڑی تھی۔ اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر ایک خنجر پیوست تھا۔ وہ سب نشے کی تلاش میں اس جانب آئے تھے۔ اس وقت ان کی سوچ کا محور صرف اور صرف ہیروئن کی ایک پڑیا تھا۔ ایسی حالت میں انسان کا ذہن بھی ٹھیک طرح کام نہیں کرتا مگر اس کے باوجود ان سب کو ہیرسن کو دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ اس کی موت واقع ہوچکی ہے۔ ہیرسن کی بے نور آنکھیں ان کے خیال کو تقویت دے رہی تھیں۔ وہ سب خوف زدہ ہوکر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تاہم انہی میں سے ایک نے پولیس کو اطلاع دی۔ اطلاع ملنے پر پولیس حرکت میں آگئی۔ عام طور پر پولیس والے اس بدنام علاقے کا رخ نہیں کرتے تھے مگر یہ قتل کا معاملہ تھا۔ اس لیے پولیس کی بھاری نفری نے جائے وقوع پر پہنچ کر شواہد اکٹھے کرنا شروع کردیے۔ ابتدائی تفتیش میں پولیس نے یہی رائے قائم کی کہ قاتل بھی ہیرسن کے پاس ہیروئن کے خریدار کی حیثیت میں آیا اور پھر موقع دیکھتے ہی اس پر خنجر سے وار کرڈالا۔ اس وقت ہیرسن کے سینے پر کندہ تحریر کو کوئی معنی نہیں پہنائے جاسکے تھے۔ فوری طور پر ہیرسن

کی موت کو منشیات فروشوں کی کسی آپسی دشمنی کا شاخسانہ ہی سمجھا گیا۔ اس علاقے میں پیشہ ورانہ رقابت پر قتل و غارت عام سی بات تھی۔

مگر پھر چند دن بعد ہی بالکل اسی طرز کا قتل ہوا تو پولیس کے سراغ رساں بری طرح چونک پڑے۔ انہیں پہلی بار گمان گزرا کے شہر میں کوئی سیریل کلر سرگرم ہو چکا ہے۔ اس بار مارٹن نامی ایک ٹیکسی ڈرائیور کو قتل کیا گیا تھا۔ اسے اس کی ٹیکسی کے اندر ہی موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ پکی سڑک سے کچھ دوری پر ایک میدانی علاقے میں اس کی لاش ٹیکسی کے اندر دریافت ہوئی تھی۔ تاہم لاش فرنٹ کے بجائے پچھلی سیٹ پر موجود تھی۔ سینے پر قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور دل کے مقام پر خنجر پیوست تھا۔ پولیس کے سراغ رساں ابھی تک یہی نتیجہ اخذ کر پائے تھے کہ قاتل نے ٹیکسی میں بطور مسافر سفر کیا تھا اور پھر ایک ویران مقام پر موقع دیکھتے ہی ہاتھ آگے بڑھا کر اوپر سے خنجر ڈرائیور کے دل میں اتار دیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی یہی ثابت ہوا تھا کہ مقتول کے دل پر وار اوپری جانب سے کیا گیا ہے۔ ہیرسن کے سینے میں خنجر بالکل سیدھا پیوست تھا جبکہ مارٹن کے دل میں اوپر سے نیچے کی جانب وار کیا گیا تھا۔ اس طرح وار کرنا شاید قاتل کی مجبوری بھی تھی کیونکہ پچھلی سیٹ پر براجمان ہو کر براہِ راست سیدھا وار کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ بہرحال ابھی تک پولیس یہی رائے قائم کر سکی تھی کہ قاتل نے مارٹن کو موت کے گھاٹ اتارا اور پھر اس کی لاش کو پچھلی نشست پر لٹا کر خود ٹیکسی ڈرائیو کرتا ہوا مین روڈ سے دور لے آیا۔ اس کے بعد کسی نکیلی شے سے مارٹن کے سینے پر وہی تحریر کندہ کی جیسی ہیرسن کے سینے پر کی تھی۔ پولیس کو ٹیکسی کے اندر سے بھی کوئی ایسا ثبوت نہیں مل سکا جس کی مدد سے قاتل تک پہنچا جا سکتا۔ ابھی لاس اینجلس پولیس ان دونوں مرڈرز کی تفتیش میں مصروف تھی کہ چند دن بعد ہی بالکل اسی نوعیت کا تیسرا واقعہ رونما ہو گیا۔ اس بار قاتل کا نشانہ ایک بینک ملازم بنا تھا۔ رابرٹ کی عمر لگ بھگ چالیس کے قریب تھی۔ تاہم چالیس سال کا ہونے کے باوجود وہ غیر شادی شدہ تھا۔ پولیس کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق رابرٹ نامی یہ شخص خاصا آزاد منش قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بھی خاصا مطمئن تھا۔ اس کے قریبی رفقا کے مطابق اس کا مستقبل قریب میں بھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کی جاب اچھی اور تنخواہ مناسب تھی۔ اسے کسی قسم کی مالی پریشانی کا سامنا نہیں تھا۔ اسے اس وقت قتل کیا گیا جب وہ تعطیل کے دن اپنے گھر میں موجود تھا۔ مکان کے دروازے کے علاوہ کچھ کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی حالت میں ملی تھیں جن کو دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا کہ غالباً قاتل کھڑکی کے راستے گھر میں داخل ہوا تھا۔ تاہم پولیس کا خیال تھا کہ قاتل دروازے کے راستے ہی اندر داخل ہوا تھا۔ رابرٹ کے ہمسایوں کے مطابق رابرٹ جب گھر میں موجود ہوتا تو اس کے گھر کا دروازہ اکثر کھلا رہتا تھا۔ اس بارے میں بھی قیاس کیا گیا تھا کہ یہ اس کی خود اعتمادی یا بے احتیاطی کا نتیجہ تھا۔ بہرحال اس کی اس بے پروا عادت نے اسے موت کے منہ میں دھکیلنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اگر وہ کھڑکیاں اور دروازے بند رکھتا تو قاتل کے لیے اس تک پہنچنا اتنا آسان نہ ہوتا۔

یکے بعد دیگرے قتل کی ان تین وارداتوں نے پولیس کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اب اس بات میں شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ یہ کسی سیریل کلر کا کام ہے۔

سارجنٹ بٹلر کو شیرف نے شروع سے ہی یہ کیس سونپ رکھا تھا اور سارجنٹ نے اپنے ڈپارٹمنٹ کے سب سے ذہین افسر گیری کو قاتل کا سراغ لگانے کا کام سونپا تھا۔ تاہم ابھی تک وہ بھی کوئی قابلِ ذکر کارکردگی نہیں دکھا سکا تھا۔

سارجنٹ بٹلر تقریباً پانچ بجے تک اپنے دفتری امور نمٹاتا رہا اور پھر گھر روانہ ہو گیا۔ آج اس نے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ڈنر باہر کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا اس لیے وہ معمول کے برعکس جلدی گھر روانہ ہو گیا تھا۔

اگلے دن جب وہ اپنے آفس پہنچا تو گیری کچھ نئی اور اہم معلومات کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ سارجنٹ بٹلر دفتر میں داخل ہوا تو گیری نے کھڑے ہو کر پولیس کے مخصوص انداز میں سیلوٹ کیا۔ سارجنٹ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے بھی سر کی جنبش سے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو گیری بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''سر، میرے پاس کچھ نئی معلومات ہیں۔'' گیری کا لہجہ خاصا پُرجوش تھا۔

''مجھے اس بات کا اندازہ تمہیں اپنے آفس میں انتظار کرتے دیکھ کر ہی ہو گیا ہے۔'' سارجنٹ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''سر، معلومات خاصی اہم ہیں۔ قتل ہونے والے تینوں افراد کے باہمی تعلق کے بارے میں کچھ نئے انکشافات سامنے آئے ہیں۔'' گیری نے کہا۔ ''ابھی تک ہمارا یہی خیال تھا کہ ہیرسن جیسے عادی جرائم پیشہ سے ٹیکسی ڈرائیور مارٹن اور بینک ملازم رابرٹ کا بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ رابرٹ اور مارٹن نے اپنی ساری زندگی قانون کا

احترام اور پاسداری کرتے ہوئے گزاری۔ ان کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں ہے جبکہ ہیرسن کا خمیر جرم کی دنیا میں پروان چڑھا۔ مگر ہیرسن کا رابرٹ اور مارٹن سے ماضی میں تعلق رہ چکا ہے۔ اگرچہ یہ تعلق کچھ وقت کے لیے ہی تھا۔ تاہم یہ تینوں ایک دوسرے کے لیے بالکل انجان نہیں تھے۔''

''کیا معلوم ہوا ہے؟ تفصیل سے بتاؤ۔'' سارجنٹ نے اس بار تحکمانہ لہجے میں کہا۔ شاید گیری کی تمہید سے اسے کوفت ہونے لگی تھی۔

''سر! تقریباً ایک سال پہلے ہیرسن نے ایک نوجوان لڑکے کو قتل کیا تھا۔ پولیس کو یقین تھا کہ اس نوجوان لڑکے کو ہیرسن نے ہی مارا ہے۔ اس سلسلے میں اسے گرفتار بھی کرلیا گیا مگر عدم ثبوت اور گواہان کی عدم دستیابی کی وجہ سے وہ عدالت سے بری ہوگیا۔ ہیرسن کے ہاتھوں مارے جانے والے لڑکے کی عمر تقریباً سولہ سترہ سال کے درمیان تھی اور وہ اس عمر میں ہی منشیات کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ ہیرسن کا پکا گاہک تھا۔ اس لیے ہیرسن اس کے ساتھ ادھار بھی کر لیتا تھا اور میری معلومات کے مطابق اس بار اس لڑکے نے کافی مقدار میں ادھار پر ہیروئن حاصل کر رکھی تھی۔ تاہم مقررہ وقت پر رقم کا ادا نہ کر پانا ہی وجۂ تنازع بنی اور ہیرسن نے اسے گولی مار کر قتل کر ڈالا۔''

''خاصی عجیب بات ہے۔'' سارجنٹ پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''ورنہ منشیات فروش کسی کے ساتھ ادھار پر لین دین نہیں کرتے۔ عام طور پر ہیروئن کا سودا نقد اور فوری رقم کی ادائیگی پر ہی ہوتا ہے۔ تمہاری معلومات ناقابلِ فہم لگتی ہیں۔ منشیات فروشوں کے پاس نقد رقم کے بہتیرے گاہک موجود ہوتے ہیں۔ وہ ایسی صورتِ حال میں کسی کو ادھار یا کریڈٹ پر ہیروئن کیوں فروخت کریں گے؟ اور پھر اس واقعے سے ٹیکسی ڈرائیور مارٹن اور بینک ملازم رابرٹ کا کیا تعلق تھا؟''

''عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔'' گیری نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ ''منشیات فروش اپنے مال کی نقد قیمت چاہتے ہیں اور نشے کی طلب میں بے حال نشئی ان کی یہ ڈیمانڈ پوری بھی کر دیتے ہیں مگر ممکن ہے ہیرسن کے پاس ہیروئن وافر مقدار میں موجود ہو اس لیے وہ اپنے روزانہ کے گاہکوں سے ادھار وغیرہ بھی کر لیتا ہو۔ میری معلومات کے مطابق ٹامی نامی وہ لڑکا بھی اس کا پرانا گاہک تھا۔ کبھی کبھی اسے ایڈوانس میں رقم بھی دے جاتا تھا۔ اس لیے ہیرسن نے اس پر اعتبار کرلیا۔ ٹامی نے کافی مقدار میں ہیروئن وصول کی تھی۔ اسے پندرہ دن کے اندر اندر رقم ادا کرنا تھی مگر اس نے ہیرسن کے پاس آنا ہی چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ ایک دن ہیرسن خود اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے ٹامی سے اپنی رقم کا تقاضا کیا۔ دونوں میں تکرار ہوئی جو جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی اور ہیرسن نے غصے میں آکر ٹامی کو گولی مار دی۔ ٹیکسی ڈرائیور مارٹن اور بینک ملازم رابرٹ نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ اس قتل کے عینی شاہد تھے مگر انہوں نے ہیرسن کے خوف سے پولیس کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کیا۔ چشم دید گواہ نہ ہونے کی وجہ سے ہی ہیرسن عدالت میں سزا سے بچ نکلا۔ اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے بری کر دیا گیا۔''

''امریکا جیسی ریاست میں ہر شہری قانون سے تعاون کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے اگر مارٹن اور رابرٹ نے واقعی میں اپنی گواہی چھپائی تھی تو پھر وہ ہیرسن سے بھی بڑے مجرم تھے مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تمہاری معلومات مصدقہ ہیں؟'' سارجنٹ نے پوچھا۔ ''رابرٹ اور مارٹن نے پولیس کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کیا۔ قانون کے ساتھ عدم تعاون بھی جرائم کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لیے ان دونوں نے اگر ہیرسن کے خلاف گواہی دینے سے انکار کیا تھا تو اس کے لیے کوئی معقول عذر بھی تراشا ہوگا۔''

''آپ کا خیال درست ہے۔'' گیری نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ان دونوں کا کہنا تھا کہ وہ موقعِ واردات سے کافی دور تھے۔ اس لیے انہوں نے قاتل کو سرے سے دیکھا ہی نہیں۔ تاہم گولی چلنے کی آواز سننے کا وہ دونوں اعتراف کرتے تھے۔ ان کا یہ بیان پولیس کے پاس موجود ہے۔ اس کے علاوہ میں نے کچھ معلومات اپنے ذرائع سے بھی حاصل کی ہیں۔ اس کے لیے میں نے مقتول ٹامی، رابرٹ اور مارٹن کے کچھ دوستوں سے ملاقاتیں کی ہیں۔ رابرٹ اور مارٹن کے کچھ قریبی دوستوں کا کہنا یہ ہے کہ ان دونوں نے یہ بات ان سے شیئر کی تھی کہ انہوں نے ہیرسن کو ٹامی کا قتل کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور وہ ہیرسن بطور ایک جرائم پیشہ شخص جانتے بھی ہیں۔ تاہم ہیرسن کے خوف کی وجہ سے انہوں نے پولیس کو سچی گواہی نہیں دی۔ ہیرسن انہیں بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس بارے میں رابرٹ اور مارٹن کی سوچ میں مکمل یکسانیت پائی جاتی تھی۔ وہ دونوں ہی بری طرح سے خوف زدہ تھے اور جان کے خوف سے مارٹن اور رابرٹ خاموش رہنے پر مجبور ہوگئے۔''

''تم نے کہا تھا کہ تم شہر میں ایسے افراد کے بارے

میں معلومات حاصل کر رہے ہو جو خنجر کے لکڑی سے بنے ہوئے دستوں پر کندہ کاری .... کرتے ہیں۔'' سارجنٹ نے ایک خیال کے تحت سوال کیا۔

''یہ کام ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو لکڑی پر کندہ کاری میں مہارت رکھتا ہو۔'' گیری نے جواب دیا۔ ''آپ کی بات ٹھیک تھی اس شہر میں ایسے افراد کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ میں نے کچھ افراد سے پوچھ گچھ کی ہے مگر کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوسکی۔ اس لیے میں نے فی الحال اس پر مزید کام ملتوی کر دیا ہے۔ ویسے بھی اب میرے پاس آگے بڑھنے کے لیے ایک واضح لائن آف ایکشن موجود ہے۔ مجھے شک ہے کہ ہیرسن، رابرٹ اور مارٹن کے قتل کا تعلق بھی ٹامی کے قتل سے ہی ہے۔ ان تینوں کو انتقاماً قتل کیا گیا ہے۔''

''گویا تم اپنا سابقہ اندازہ خود ہی مسترد کر رہے ہو کہ یہ کام کسی مذہبی جنونی کا ہے۔ ورنہ تمہارا اپنا ہی خیال تھا کہ کوئی جنونی دیوتاؤں کو انسانوں کی بھینٹ دینے کے لیے یہ کام کر رہا ہے۔ شیرف بھی تمہاری رائے سے متفق نہیں تھا۔''

''مجھے بھی اب ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے کہ میں اب تک غلط سمت میں جا رہا تھا۔ مقتولین کے سینوں پر وہ تحریر محض پولیس کو ڈاج دینے کے لیے ہی کندہ کی جاتی تھی۔ قاتل دانستہ ایسا کر رہا تھا تاکہ ہمیں غلط راہ پر ڈالا جاسکے۔ اس کی یہ چال کامیاب بھی رہی۔ مگر موجودہ حقائق سامنے آنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قاتل یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہا ہے۔ وہ کوئی مذہبی جنونی نہیں ہے بلکہ ایک بہترین پلانر ہے۔ مذہبی جنونیت کی تو اس نے محض اوٹ لے رکھی ہے۔''

''او کے، تو پھر تم بتاؤ تم نے تفتیش کا دائرۂ کار آگے بڑھانے کے لیے کیا لائحہ عمل طے کیا ہے؟'' سارجنٹ نے اس بار مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''سر، میرا خیال ہے کہ ان تینوں افراد کو انتقاماً قتل کیا گیا ہے۔ ہیرسن کو ٹامی کو مارنے کے بدلے میں قتل کیا گیا ہے جبکہ مارٹن اور رابرٹ کو گواہی چھپانے کی سزا کے طور پر مارا گیا ہے۔'' گیری نے پُرخیال لہجے میں جواب دیا۔

''ٹامی کو قتل ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہے؟'' سارجنٹ نے استفسار سے کیا۔

''ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔'' گیری نے جواب دیا۔

''ہونہہ۔'' سارجنٹ نے ہنکارا بھرا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا اور پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''اگر تمہاری یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ یہ تینوں قتل انتقاماً کیے گئے ہیں تو پھر بھی بہت کچھ وضاحت طلب ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قاتل کون ہے؟ اور پھر اس نے انتقام لینے کے لیے ایک سال تک انتظار کیوں کیا؟ یہ کام کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جسے ٹامی سے شدید دلی لگاؤ ہو۔ کیا تمہیں ٹامی کے کسی قریبی عزیز پر شک ہے ؟''

''ٹامی کا کوئی بہن بھائی نہیں اور اس کی ماں بھی دو ماہ پہلے انتقال کر چکی ہے۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے بہیمانہ قتل کے بعد خاصی دلبرداشتہ رہنے لگی تھی۔ اس کا نام فرگوسن ہے۔ میری معلومات کے مطابق فرگوسن بہت حساس اور زود رنج طبیعت کی مالک واقع ہوئی تھی۔ اس لیے بیٹے کی موت نے اسے نیم پاگل کر دیا تھا۔ وہ اکثر ٹامی کو یاد کر کے روتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کے ہمسائے اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی سنتے تھے۔ سب کو اس سے ہمدردی تھی مگر کوئی بھی اس کے غم کا مداوا یا ازالہ نہیں کر سکتا تھا۔ فرگوسن کا یہی دکھ آخر کار اس کی جان لے گیا۔''

''تو پھر وہ کون ہو سکتا ہے جس نے انتقاماً ان تینوں کو قتل کیا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم ایک بار پھر غلط راہ پر چل پڑے ہو۔'' سارجنٹ نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

''نہیں سر، میرا خیال ہے کہ اس بار میں ٹھیک جا رہا ہوں۔'' گیری نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ایک شخص ایسا ہے جو یہ کام کر سکتا ہے اور وہ ہے ٹامی کا باپ۔ فرگوسن کا شوہر۔ جس کا کردار ابھی بھی پردے کے پیچھے ہے۔''

''پردے کے پیچھے ہے، کیا مطلب؟'' سارجنٹ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور پھر میرے اس سوال کا بھی تم نے جواب نہیں دیا کہ اگر یہ تینوں افراد ٹامی کے سلسلے میں مارے گئے ہیں تو پھر قاتل نے ایک سال تک انتظار کیوں کیا؟''

''میں اسی طرف آ رہا تھا۔'' گیری مفاہمانہ لہجے میں بولا۔ ''قاتل نے ایک سال تک انتظار کیوں کیا تو اس بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب پولیس نے ہیرسن کو گرفتار کیا تو اسے امید ہوگی کہ ہیرسن کو قانون سزا دے گا مگر تقریباً چھ ماہ بعد ہی ہیرسن گواہان کے منحرف ہونے یا گواہی دینے سے انکار کے باعث بری ہو گیا تبھی اس کے ذہن میں انتقام لینے کا خیال آیا ہوگا۔''

''تم مفروضوں کے سہارے آگے بڑھ رہے ہو۔'' سارجنٹ مدبرانہ لہجے میں بولا۔ ''اگر تمہاری اس قیاس آرائی کو درست بھی مان لیا جائے کہ ان تینوں مرڈرز کے پیچھے ٹامی

کا باپ ہے تو پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ چھ ماہ تک خاموش کیوں بیٹھا رہا۔ اگر انسانی نفسیات کو مدِنظر رکھا جائے تو انتقامی جذبہ بڑا ہیجانی اور شدید ہوتا ہے اور اس جذبے سے مغلوب ہونے والے افراد اپنے جذبۂ انتقام کی فوری تسکین چاہتے ہیں۔ قاتل کو بھی ہیرسن کے بری ہوتے ہی اس پر حملہ آور ہونا چاہیے تھا مگر اس نے چھ ماہ کے انتظار کے بعد یہ قدم اٹھایا۔''

''میں نے اس پوائنٹ پر بھی غور کیا ہے۔'' گیری نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ ''اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارا واسطہ کسی عام قاتل سے نہیں ہے۔ جو وقتی جذبات کے دھارے میں بہہ کر کسی کو جان سے مار دے ...بلکہ ہمارا واسطہ ایک شاطر اور عیار قاتل سے ہے۔ قاتل ہیرسن، مارٹن اور رابرٹ کو قتل کرنے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی قانون کے شکنجے میں آنے سے بچانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے کئی ماہ تک خاموش رہ کر ان تینوں کے قتل کی باقاعدہ پلاننگ کی تھی۔ ہمیں غلط راہ پر ڈالنے کے لیے مذہبی جنونی کی آڑ... میں اپنا کام مکمل کیا۔ میرے خیال میں اگر فرگوسن کے خفیہ شوہر کو تلاش کر کے اس سے تفتیش کی جائے تو بہت سے چشم کشا انکشافات ہوں گے۔''

''فرگوسن کا خفیہ شوہر؟'' سارجنٹ کے لہجے میں الجھن تھی۔ شاید وہ گیری کی بات کا مطلب ہی نہیں سمجھ پایا تھا۔

''ہاں سر۔'' گیری نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''فرگوسن کے شوہر کو اس کے قریبی عزیزوں میں سے بھی کوئی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ فرگوسن کا بیٹا ٹامی بھی اپنے باپ کی شخصیت سے ناواقف تھا۔ اسے بس اتنا علم تھا کہ اس کا باپ اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہارٹ اٹیک کے باعث انتقال کر گیا تھا۔ فرگوسن کے عزیز بھی بس اتنا ہی جانتے ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی نے بھی ٹامی کے باپ کو نہیں دیکھا۔''

''تمہاری ہر بات میری الجھن میں اضافہ کر رہی ہے۔'' سارجنٹ نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک طرف تم کہہ رہے ہو کہ ان مرڈرز کے پیچھے ٹامی کا باپ ہے جبکہ دوسری طرف تم کہہ رہے ہو کہ وہ مر چکا ہے؟''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ واقعی مر چکا ہے۔ میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ یہ بات فرگوسن نے اپنے بیٹے اور رشتے داروں کو بتا رکھی تھی۔ فرگوسن ان دنوں کسی دوسرے شہر میں جاب کرتی تھی۔ اس نے وہیں ٹامی کے باپ سے شادی کی۔ جب وہ واپس لاس اینجلس آئی تو ٹامی اس کی گود میں تھا۔ اس

نے اپنے عزیزوں کو بس اتنا بتایا کہ اس نے اپنی ملازمت کے دوران ایک شخص سے شادی کرلی تھی جو بدقسمتی سے ٹامی کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہارٹ اٹیک کے باعث اس دنیا سے چل بسا۔ فرگوسن کے عزیزوں نے ٹامی کے باپ کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کی مگر فرگوسن نے اس سے زیادہ کچھ بتانے سے انکار کردیا۔ اس نے اپنے شوہر کا نام راک بتایا۔ جوکہ ایک فرضی نام تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ کسی کو اپنے شوہر کے بارے میں بتانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس ٹاپک پر ڈسکس کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کے پاس اپنے شوہر یا شادی کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے عزیزوں نے بھی اس سے اس موضوع پر بات کرنا ترک کر دی تھی۔''

''تو پھر تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ ٹامی کا باپ زندہ ہے۔ ایک فرگوسن ہی تھی جو اپنے شوہر کے بارے میں جانتی تھی اور وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔'' گیری کا جواب سن کر سارجنٹ نے غیر مطمئن لہجے میں کہا۔

''میں فرگوسن کی ایک ہمراز سہیلی سے مل چکا ہوں۔ اسی نے مجھے بتایا ہے کہ راک ایک فرضی نام ہے اور فرگوسن کا شوہر زندہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسی شہر میں رہتا ہے۔'' گیری نے جواب دیا۔

''کون ہے وہ؟ اور کہاں رہتا ہے۔'' سارجنٹ نے گہری نگاہوں سے گیری کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''اس بارے میں، میں ابھی تک اندھیرے میں ہوں۔'' گیری نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''تاہم میں پُریقین ہوں کہ جلد ہی اس تک پہنچ جاؤں گا۔ فرگوسن کی سہیلی بھی اس شخص کا نام نہیں جانتی۔ اگرچہ فرگوسن اس سے اپنی ہر بات شیئر کرلیتی تھی مگر اس معاملے میں اس نے اسے بھی بس اتنا ہی بتایا تھا کہ راک ایک فرضی نام ہے جو اس نے اپنے بیٹے اور رشتے داروں کو محض خانہ پری کے لیے بتا رکھا ہے۔ اس کا شوہر زندہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسی شہر میں رہتا ہے اور وہ اس سے کبھی کبھی خفیہ طور پر ملتی بھی ہے۔ اس کا شوہر پہلے سے شادی شدہ ہے اس لیے قانونی طور پر اس شادی کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہاں کے قوانین کے مطابق اسے جیل ہوسکتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان دونوں نے اس شادی کو خفیہ رکھا ہوا ہے۔ فرگوسن نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنے شوہر کا نام صیغۂ راز میں ہی رکھا اور یہ راز اپنے ساتھ قبر میں لے گئی۔''

''تمہاری باتوں میں اب مجھے بھی وزن محسوس ہونے لگا ہے۔ کیا تم نے اپنی اس تفتیش کی کوئی رپورٹ وغیرہ بنائی ہے۔'' سارجنٹ نے ایک خیال کے تحت سوال کیا۔ ''ہوسکتا ہے شیرف مجھ سے تمہاری اس ازسرِنو تفتیش کی رپورٹ طلب کرے۔''

''ابھی میں نے اپنی رائے صرف آپ سے شیئر کی ہے۔'' گیری نے مفاہمت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''ابھی بہت کچھ وضاحت طلب ہے۔ مجھے فرگوسن کے شوہر کا اصل نام تک معلوم نہیں۔ میں پہلے اس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی شیرف کے لیے مکمل اور جامع رپورٹ تیار کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ پہلے کی طرح اس بار بھی میری رائے غلط ثابت ہو جائے اور شیرف کے سامنے آپ کو اور مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔''

''اگر فرگوسن کی سہیلی درست کہہ رہی ہے تو پھر بھی فرگوسن کے شوہر کو تلاش کیسے کیا جائے؟'' سارجنٹ نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''میں اپنا اگلا لائحۂ عمل طے کر چکا ہوں۔'' گیری نے رسانیت سے جواب دیا۔ ''فرگوسن کی سہیلی سے مجھے ایک ایسی بات بھی معلوم ہوئی ہے جس سے میں اس شخص تک پہنچ سکتا ہوں۔''

''کون سی بات؟'' سارجنٹ نے متجسس لہجے میں سوال کیا۔

''فرگوسن کا شوہر ہر ماہ گھریلو اخراجات کی مد میں ایک معقول رقم اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کروادیتا تھا۔ اگر چیک کیا جائے کہ یہ رقم کس بینک اکاؤنٹ سے اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوتی تھی تو ہم اس شخص تک پہنچ جائیں گے۔ بینک سے اس اکاؤنٹ کے مالک کا ڈیٹا حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''

☆☆☆

اگلا دن پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے بہت تہلکہ خیز اور تشویش ناک ثابت ہوا۔ گیری کے قتل نے پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

سارجنٹ بٹلر کو گیری کے قتل کی اطلاع اس وقت دی گئی جب وہ صبح آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اسے گیری کے ساتھ کام کرنے والے نوجوان پولیس افسر ڈین نے فون پر گیری کے قتل کی اطلاع دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتادیا کہ گیری کو بھی بالکل اسی طرح قتل کیا گیا ہے جس طرح ہیرسن، رابرٹ اور مارٹن کو کیا گیا تھا۔ گیری اپنے گھر میں تنہا رہائش پذیر تھا۔ اس کے والدین اور بہن بھائی میامی

میں رہتے تھے۔ گیری کو اس کے گھر میں ہی قتل کیا گیا تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ پولیس افسر تھا مگر اس کے باوجود قاتل کا نشانہ بن گیا۔ گیری کے گھر کا دروازہ صبح کے وقت کھلا رہتا تھا اور اخبار والا اندر جا کر اسے اخبار دیتا تھا مگر آج جب وہ اندر داخل ہوا تو گیری کی لاش اس کی منتظر تھی۔ بٹلر اطلاع ملتے ہی گاڑی نکال کر گیری کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ جیسے ہی گیری کے قتل کے بارے میں میڈیا کو اطلاع ملے گی ایک کھلبلی مچ جائے گی۔ تینوں مرڈرز کا سراغ نہ لگانے کی وجہ سے پولیس کو پہلے ہی خاصی تنقید کا سامنا تھا اور اب تو پولیس کا ایک افسر بھی قتل ہو گیا تھا۔ سارجنٹ نے ڈرائیونگ کے دوران اپنی رسٹ واچ کا جائزہ لیا اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ گویا شیرف بھی اٹھ چکا ہوگا۔

شاید آج شیرف اسے اپنے دفتر بھی طلب کرے۔ آج اس کے بولنے بلکہ دہاڑنے کی آوازیں دفتر کے باہر بھی سنائی دیں گی۔ یہ سوچتے ہوئے سارجنٹ خود کو شیرف اور میڈیا کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ میڈیا سے تو پھر بھی دور رہا جا سکتا تھا مگر شیرف سے معافی ملنے کی امید نہیں تھی اور پھر اس سیریل کلر نے اس بار ایک پولیس افسر کو مار کر پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کو چیلنج دیا تھا۔ سارجنٹ جانتا تھا کہ آج میڈیا کے ہر چینل کا ایک ہی موضوع ہوگا اور وہ ہے پولیس کی صفر کارکردگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ آج اعلیٰ حکام کی جانب سے یہ کیس پولیس سے لے کر کسی اور کرائم ایجنسی کے حوالے کر دیا جاتا۔ شیرف پہلے بھی اس خدشے کا اظہار کر چکا تھا اور بقول اس کے اگر ایسا ہوا تو یہ پولیس کی سخت بے عزتی تصور ہوگی۔

اسے گیری کے گھر تک پہنچنے میں تقریباً بیس منٹ لگے۔ وہاں پولیس اہلکاروں کے ساتھ ساتھ دیگر افراد بھی کھڑے تھے جو یقیناً اس کے علاقے کے رہائشی تھے۔

سارجنٹ نے اپنی کار ایک جانب روکی اور پھر دروازہ کھول کر گیری کے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ پولیس والوں نے دیگر افراد کو ایک مخصوص حد سے آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ تاہم سارجنٹ کو دیکھتے ہی راستہ دے دیا گیا۔ اسی لمحے گھر کے دروازے سے پولیس افسر ڈین برآمد ہوا۔ اس نے سارجنٹ کو دیکھتے ہی سیلیوٹ کیا۔

''گیری کا قتل پورے شہر کو ہلا کر رکھ دے گا۔ پولیس کو جلد ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ قاتل نے اس بار براہِ راست پولیس کو چیلنج دیا ہے۔'' سارجنٹ، ڈین سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر ایسا تبھی ممکن ہے جب یہ کیس ہمارے پاس رہے گا۔'' ڈین نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' سارجنٹ نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''سر! اب سے کچھ دیر قبل مجھے شیرف نے براہِ راست کال کی تھی۔ اس کا کہنا ہے ہمارے پاس صرف دو دن کا وقت ہے۔ اگر اس دوران ہم نے قاتل کا سراغ لگا لیا تو ٹھیک ہے ورنہ اس کیس کی تفتیش پولیس سے لے کر کسی اور ایجنسی کے سپرد کر دی جائے گی۔ شیرف نے کہا تھا کہ میں یہ پیغام آپ تک بھی پہنچا دوں۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ اسے فون کرنے کی زحمت نہ کیجیے گا۔ دو دن میں کچھ کر سکتے ہیں تو کر لیجیے۔ بصورتِ دیگر کیس واپس لینے کے ساتھ ساتھ پولیس کی جانب سے میڈیا کے سامنے ناکامی کا باقاعدہ اعتراف بھی کیا جائے گا اور میڈیا کے سامنے ناکامی کا اعتراف آپ کو کرنا ہوگا۔''

''ایسا ہوا تو یہ ہماری بدقسمتی ہوگی۔'' سارجنٹ نے کہا۔ ''بہرحال دو دن کا وقت بھی ہمارے لیے اہمیت کا حامل ہونا چاہیے۔ گیری ہمارا ساتھی تھا۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم خود اس کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔ کیا اندر سے فنگر پرنٹس اٹھا لیے گئے ہیں؟''

''جی ہاں۔ فنگر پرنٹس ٹیم اپنا کام مکمل کر چکی ہے اور اب لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ ابھی تک ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس کی مدد سے قاتل تک رسائی حاصل ہو سکے۔ میں نے اہلِ علاقہ سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ تاہم کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ گیری کی موت کا حتمی وقت پوسٹ مارٹم رپورٹ ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگا مگر اس کی اکڑی ہوئی لاش دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسے مرے ہوئے تقریباً دس گھنٹے سے زائد کا وقت گزر چکا ہے۔'' ڈین نے پوری تفصیل سے اب تک کی صورتِ حال سے سارجنٹ کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس بات کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ گیری کی لاش کے آس پاس سے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملے گا جس سے قاتل کی تلاش میں مدد مل سکے۔'' سارجنٹ مدبرانہ لہجے میں بولا۔ ''قاتل بہت ہوشیار اور کائیاں شخص ہے۔ وہ اپنے پیچھے کوئی ایسا سراغ نہیں چھوڑتا جس سے اس کی گرفتاری میں مدد مل سکے۔ بہرحال آؤ ذرا گیری کی لاش کا معائنہ کر لیں۔''

''سر، آپ اندر تشریف لے جائیں۔ گیری میرا بہت پرانا ساتھی تھا۔ مجھ سے اس کی لاش کے پاس کھڑا نہیں ہوا جارہا۔ اس کی بے نور آنکھیں اور مردہ چہرہ دیکھ کر میری بڑی عجیب حالت ہوجاتی ہے۔ ایسا نہیں کہ میں نے پہلے انسانی لاشیں نہ دیکھی ہوں مگر گیری کے ساتھ کافی وقت گزرا تھا۔ شاید اس لیے اسے مردہ حالت میں دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہو پارہا۔'' ڈین نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں، پولیس کی نوکری میں ایسے واقعات سے سامنا ہوتا رہتا ہے۔'' سارجنٹ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے ربڑ کے دستانے نکال لیے۔ دستانے پہن کر اس نے ایک نظر ڈین کے چہرے پر ڈالی اور پھر گیری کے گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ اندر بھی پولیس کے چند اہلکار موجود تھے۔ ایک طرف فنگر پرنٹس ٹیم کے افراد کھڑے آپس میں بات چیت کررہے تھے۔ ڈین سارجنٹ بٹلر کو بتاچکا تھا کہ فنگر پرنٹس اٹھانے والی ٹیم اپنا کام مکمل کرچکی ہے۔ وہاں پہلے سے موجود پولیس اہلکار اسے دیکھتے ہی الرٹ ہوگئے تھے۔ انہوں نے سارجنٹ کے قریب آتے ہی پولیس کے مخصوص انداز میں سیلیوٹ کیا۔

ان کے پاس ہی فرش پر گیری کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ایک پولیس اہلکار لاش کے آس پاس چونے کی مدد سے نشانات لگارہا تھا کیونکہ اب لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنا تھا۔ سارجنٹ نے گیری کی لاش کا بغور جائزہ لیا۔ اس کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سینے پر کسی نکیلی شے سے وہی تحریر کندہ کی گئی تھی جو اس سے پہلے سارجنٹ، ہیرسن، مارٹن اور رابرٹ کے سینوں پر دیکھ چکا تھا۔ خنجر گیری کے سینے میں دستے تک پیوست تھا۔ دستے پر بھی وہی مخصوص تحریر کندہ تھی۔

سارجنٹ بٹلر کے ذہن میں ایک دن پہلے کا منظر گھوم گیا جب گیری نے اسے اس کیس کی تفتیش کے سلسلے میں ہونے والے کچھ نئے انکشافات کے متعلق بتایا تھا۔ گیری پُرامید تھا کہ وہ جلد ہی قاتل تک پہنچ جائے گا مگر اس سے پہلے وہ قاتل اس تک پہنچ گیا۔ قاتل کی تلاش میں سرگرداں گیری نے شاید یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ اگلا شکار وہ خود بننے والا ہے۔

گیری کی لاش کا جائزہ لیتے ہوئے سارجنٹ کے چہرے پر ہلکی سی افسردگی کے تاثرات عود کر آئے۔ وہ ایک پُرجوش نوجوان تھا۔ اپنے کام سے لگن رکھنے والا۔ اس کی صلاحیتوں کا اعتراف سارجنٹ کو بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ذہن وفطین گیری بہت آگے جائے گا مگر اب وہ اتنا آگے جاچکا تھا کہ اس کی واپسی ممکن ہی نہ رہی تھی۔ شاید اس کی زندگی اتنی ہی تھی۔ سارجنٹ کے چہرے پر افسردگی کے تاثرات گہرے ہوگئے۔

اسی لمحے گھر کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور ڈین عجلت میں اندر داخل ہوا۔ اس کے اس طرح اندر داخل ہونے پر دیگر پولیس اہلکار اور سارجنٹ نے چونک کر اسے دیکھا۔ سارجنٹ کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔

''سر، ایک بڑا عجیب اور تشویشناک واقعہ رونما ہوا ہے۔'' ڈین اندر داخل ہوتے ہی تیز لہجے میں بولا۔

''کیا ہوا؟'' سارجنٹ نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''سر، ابھی ابھی مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر سے فون آیا ہے۔ انہیں ڈیوڈ نام کے ایک نوجوان کی کال موصول ہوئی ہے۔ جس نے فون پر بتایا ہے کہ اب سے کچھ دیر قبل اس کے والد کو کسی نے مار ڈالا ہے۔ اس نوجوان کا کہنا ہے کہ یہ اسی مذہبی جنونی کا کام ہے جس کا آج کل اخبارات اور میڈیا میں بڑا چرچا ہے۔ اس کے والد کے دل پر خنجر سے وار کیا گیا ہے اور قمیص کھول کر سینے پر کچھ آڑھی ترچھی لکیریں بھی کھینچی گئی ہیں۔ اس نوجوان نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس سے پہلے ہونے والے قتل میں ایک مقتول کے سینے کی بڑی قریبی تصویر اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے باپ کے سینے پر بھی بالکل ویسی ہی تحریر کسی نوک دار شے سے کندہ کی گئی ہے۔ نوجوان نے بتایا ہے کہ اب سے کچھ دیر قبل وہ اپنے والد کو صحیح سلامت گھر چھوڑ کر بازار گیا تھا۔ اسی دوران قاتل نے اس کے باپ کو مار ڈالا۔ اسے بازار سے گھر واپس آتے زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہی لگے مگر جب وہ واپس آیا تو اس کا سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔''

''یعنی یہ قتل اب سے پندرہ بیس منٹ پہلے ہوا ہے۔ میں ابھی گیری کی لاش کا معائنہ کررہا تھا اور قاتل نے اس دوران ایک اور شخص کو مار ڈالا ہے۔'' سارجنٹ پُرخیال لہجے میں بولا۔

''جی بالکل۔'' ڈین نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔

''اس جنونی قاتل کی جنونیت اب عروج پر پہنچ چکی ہے۔ ورنہ آج سے پہلے اس نے ایک قتل کے بعد چند دن کا وقفہ ضرور لیا ہے۔''

سارجنٹ کے ساتھ ساتھ ڈین کی باتوں نے وہاں

موجود دیگر پولیس اہلکاروں کو بھی ششدر کر دیا تھا۔ وہ سب بھی حیرت سے ڈین کی باتیں سن رہے تھے۔ تاہم ان میں سے کچھ کے چہروں پر ہلکے سے خوف یا اضطراب کے تاثرات بھی موجود تھے۔ شاید اس بات نے انہیں دل ہی دل میں خوف زدہ کر دیا تھا کہ اس نادیدہ قاتل نے اب پولیس والوں کو بھی نشانہ بنانے کا آغاز کر دیا ہے۔ گیری کی لاش کی صورت میں ایک مثال ان کے سامنے تھی۔

''گیری کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے تمہارے ماتحت روانہ کر دیں گے اور یہاں باقی کا کام بھی سنبھال لیں گے، تم میرے ساتھ فوراً اس جگہ چلو جہاں یہ نیا واقعہ رونما ہوا ہے۔ میں باہر گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' سارجنٹ نے اپنے دستانے اتار کر کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا اور پھر ڈین کا جواب سنے بغیر باہر کی جانب بڑھ گیا۔

''کیا ڈیوڈ نامی اس نوجوان کے گھر کا ایڈریس معلوم ہے؟'' سارجنٹ نے کار آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی سر، میں نے ابھی ابھی پولیس ہیڈ کوارٹر فون کر کے معلوم کیا ہے۔ آپ درست سمت جا رہے ہیں۔'' ڈین نے بتایا۔ ''ویسے میں نے ایڈریس کے ساتھ ساتھ ڈیوڈ کا موبائل نمبر بھی معلوم کر لیا ہے۔''

''نمبر ملا کر ذرا موبائل فون مجھے دو، میں اس نوجوان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' سارجنٹ نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو ڈین نے اپنے کوٹ کی جیب سے موبائل فون نکال لیا۔ کچھ ہی دیر میں اس کا ڈیوڈ نامی نوجوان سے رابطہ ہو گیا۔ ڈین نے اس کی پولیس کو کی گئی کال کا حوالہ دیتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ اس کے ایک افسر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ڈین نے موبائل فون سارجنٹ کی جانب بڑھا دیا۔

سارجنٹ نے بائیں ہاتھ سے فون تھامتے ہوئے کان سے لگا لیا جبکہ دائیں ہاتھ سے ڈرائیونگ جاری رکھی۔ ''ہیلو مسٹر ڈیوڈ، آپ نے کچھ دیر قبل پولیس کو کال کر کے اپنے ڈیڈ کے قتل کے بارے میں بتایا تھا۔ ہم آپ کی طرف ہی آ رہے ہیں۔ ویسے پولیس کے اہلکار آپ کی رہائش گاہ پہنچ گئے ہوں گے؟''

''جی ہاں، پولیس کے کچھ افراد یہاں پہنچ چکے ہیں۔ وہ صورت حال کا جائزہ لے رہے ہیں۔'' ڈیوڈ نامی نوجوان کی مضطرب سی آواز سنائی دی۔

''کیا آپ مجھے تفصیل سے ساری بات بتانا پسند کریں گے؟'' سارجنٹ نے کہا۔

''جی ضرور۔'' دوسری طرف سے آواز سنائی دی اور پھر چند لمحوں کے لیے لائن پر خاموشی چھا گئی۔ شاید ڈیوڈ اپنے ذہن میں پورا واقعہ ازسرِنو ترتیب دے رہا تھا تاکہ سارجنٹ کو تفصیل سے ساری بات سے آگاہ کر سکے۔

''آج صبح میں نے اور ڈیڈ نے ایک ساتھ کافی پی تھی۔ ڈیڈ کے سگریٹ ختم ہو گئے تھے اور انہوں نے مجھے سگریٹ لینے بازار بھیجا تھا مگر جب میں واپس پہنچا تو میرا سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔ میرے ڈیڈی میری زندگی تھے مگر اسی مذہبی جنونی نے بڑی بے دردی سے میرے ڈیڈ کو قتل کر دیا۔'' بات کرتے ہوئے ڈیوڈ کی آواز رندھ گئی۔

''آپ جب واپس آئے تو آپ نے کیا دیکھا؟'' سارجنٹ نے سوال کیا۔

''میں جب واپس آیا تو گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک ہولناک منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے ڈیڈ زمین پر سیدھے لیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے سینے میں عین دل کے مقام پر ایک خنجر پیوست ہے۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے ہیں اور سینے پر کچھ آڑھی ترچھی خون آلود لکیریں بنی ہوئی ہیں۔ میرے ڈیڈ کے سینے پر اور خنجر کے دستے پر بنی لکیروں کے ڈیزائن میں کافی حد تک مماثلت تھی۔ مجھے اس وقت ایسا لگا جیسے میں اس تحریر سے واقف ہوں۔ ذہن پر زور دینے سے یاد آیا کہ اس قسم کی لکیروں والی تصویر میں اخبار میں دیکھ چکا ہوں۔ پچھلے دنوں شہر میں ہونے والے مرڈرز میں سے ایک مقتول کے سینے پر پیوست خنجر کی بڑی واضح اور بڑی تصویر اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ فوٹوگرافر نے تصویر میں خنجر کے دستے کو خصوصی طور پر فوکس کیا تھا۔ اسی لیے مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اس قسم کا خنجر کہاں دیکھا تھا اور یہ بات یاد آتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ اسی مذہبی جنونی کا کام ہے جس نے اس سے پہلے بھی تین افراد کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا تھا۔ اس سلسلے میں ایک پولیس افسر گیری کا خاصا تفصیلی انٹرویو بھی میری نظروں سے گزر چکا ہے۔''

''رات کے کسی پہر گیری کو بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ ہم اسی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے کا بندوبست کر رہے تھے کہ اسی دوران قاتل نے دوسرا شکار بھی کر لیا۔ قاتل نے آج تک اتنی جلدی کسی دوسرے فرد کو نشانہ نہیں بنایا۔ ہمارے لیے یہ بات اچنبھے کا باعث ہے۔ بہرحال میں آپ کے گھر کی جانب آ رہا ہوں۔ باقی باتیں وہاں آ کر ہوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ نے فون کاٹ کر اسے ڈین کے حوالے کر دیا۔

''وہ پُراسرار قاتل تمام حدیں پار کر چکا ہے۔ اب ہمیں فوری طور پر کچھ کرنا پڑے گا۔ آج ان دونوں واقعات کا علم جیسے ہی میڈیا کو ہو گا ایک طوفان مچ جائے گا۔'' سارجنٹ فکرمند لہجے میں بولا۔

''سر، شیرف نے ہمیں صرف دو دن کا وقت دیا ہے۔'' ڈین نے کہا۔

''دو دن بھی بہت ہیں۔ اب میں اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہوں۔ ورنہ اب تک میں نے تمام ذمے داریاں گیری کو سونپ رکھی تھیں۔'' سارجنٹ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''تو پھر آپ کو بھی محتاط رہنا ہوگا۔'' ڈین نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''گیری اس پُراسرار قاتل کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا مگر خود اس کا شکار بن گیا۔ قاتل کا اگلا ٹارگٹ آپ بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ اب آپ نے اس کیس کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ قاتل کا اگلا نشانہ میں ہو سکتا ہوں؟''

''قاتل نے گیری کو ہی کیوں نشانہ بنایا، وہ کسی دوسرے پولیس والے کو بھی اپنا نشانہ بنا سکتا تھا۔'' ڈین نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''موجودہ حالات و واقعات اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قاتل ان پولیس اہلکاروں کو جانتا ہے جو اس کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' ڈین متفکرانہ لہجے میں بولا۔

''تمہاری باتوں میں وزن ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ دوبارہ کسی پولیس والے کو نشانہ بنائے۔ ڈیوڈ نامی اس نوجوان کا باپ پولیس اہلکار نہیں تھا۔'' سارجنٹ نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

ڈین نے اس بار بس سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ تاہم سارجنٹ کی طرح اس کے چہرے پر بھی الجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس پُراسرار قاتل نے پوری لاس اینجلس پولیس کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ دوسرے افراد کے ساتھ ساتھ قانون کے محافظ کو بھی اپنا نشانہ بنا ڈالا تھا مگر اس کی شخصیت اب بھی پردے کی اوٹ میں چھپی ہوئی تھی۔ ابھی تک کوئی ایسا سراغ نہیں مل سکا تھا جس کی مدد سے تفتیش کو آگے بڑھایا جا سکتا۔

ڈیوڈ کا گھر گیری کے گھر سے خاصا دور واقع تھا۔ سارجنٹ کو ڈین کی راہنمائی میں وہاں تک پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگا۔ اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کے اہلکار پہلے سے وہاں موجود تھے۔

سارجنٹ نے اپنی گاڑی ایک سائڈ پر روکی پھر گاڑی سے اُتر کر ڈین کے ہمراہ ڈیوڈ کے گھر کی جانب بڑھ گیا جہاں کھڑے پولیس اہلکاروں نے اسے دیکھتے ہی راستہ دے دیا۔ وہ گھر خاصا وسیع وعریض اور کشادہ تھا۔

اندر تقریباً وہی منظر تھا جو سارجنٹ، گیری کے گھر میں دیکھ چکا تھا۔ کچھ پولیس اہلکار ڈرائنگ روم کی دیواروں اور دیگر اشیا پر مخصوص اسپرے کر رہے تھے۔ یہ مخصوص اسپرے فنگر پرنٹس اٹھانے کے لیے کیا جا رہا تھا۔ ایک طرف ایک بوڑھے شخص کی لاش پڑی ہوئی تھی جس کے آس پاس ایک پولیس اہلکار چونے سے نشانات لگا رہا تھا۔ سارجنٹ، ڈین کے ہمراہ لاش کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے قریب سے بغور مرنے والے شخص کا چہرہ دیکھا۔ وہ گنجے سر اور جھرّیوں زدہ چہرے والا ایک ساٹھ سے ستّر سالہ شخص تھا۔ دونوں کنپٹیوں کے اطراف میں سفید بالوں کی جھالر سی موجود تھی جبکہ سر کا درمیانی حصہ کسی انڈے کی طرح سفید تھا۔ اس کی جسامت دیکھتے ہی سارجنٹ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خاصا کمزور اور نحیف تھا۔ سینے میں دستے تک خنجر پیوست تھا جبکہ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سینے پر وہی افریقی زبان کندہ تھی جو اس سے پہلے قاتل دوسرے مقتولین کے سینوں پر کندہ کرتا رہا تھا۔ اس بوڑھے شخص کی بےنور آنکھیں ابھی بھی کھلی ہوئی تھیں اور چہرے پر مرتے وقت کے تاثرات گویا ثبت ہو چکے تھے۔ شدید ترین حیرت کے ساتھ ساتھ خوف کے تاثرات۔ شاید اس نے قاتل کو دیکھا تھا اور یہ تاثرات اسی وقت اس کے چہرے پر منجمد ہو گئے تھے۔

سارجنٹ لاش کا جائزہ لینے کے بعد ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔ ڈین بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ڈیوڈ نامی وہ نوجوان نظر نہیں آ رہا جس سے ہماری فون پر بات ہوئی تھی۔ گھر کے لان میں کھڑے ہوتے ہوئے سارجنٹ نے آس پاس کا جائزہ لیا۔

''میں پتا کرتا ہوں۔'' ڈین ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا جبکہ سارجنٹ وہیں کھڑا رہا۔ کچھ ہی دیر میں ڈین ایک نوجوان کے ساتھ واپس آ گیا۔

''معاف کیجیے گا۔ میں ڈرائنگ روم سے ملحق کمرے میں تھا۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ سارجنٹ نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بغور اس کی شخصیت کا جائزہ لیا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیوڈ کی عمر تیس سال سے کم ہی ہوگی۔ نیلی آنکھوں اور فراخ پیشانی والا یہ نوجوان

شکل سے ہی خاصا ذہین لگتا تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں خمار کے ڈورے تیر رہے تھے۔ بادی النظر میں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ڈرنکر تھا۔

''مجھے سارجنٹ بٹلر کہتے ہیں۔ فون پر میری آپ سے ہی بات ہوئی تھی۔'' بٹلر نے اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے مسٹر ڈین نے اندر آپ کا تعارف کروا دیا ہے۔'' نوجوان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سارجنٹ کو الجھن میں مبتلا کررہے تھے۔ اب سے کچھ دیر قبل اس کا باپ ایک دردناک موت کا شکار ہوا تھا مگر اس کے چہرے پر کسی خاص رنج و غم کے تاثرات موجود نہیں تھے اور جو تھے وہ بھی بٹلر کو بناوٹی سے محسوس ہوئے۔ دو ہی وجوہات ہوسکتی تھیں یا تو ڈیوڈ نامی یہ نوجوان خاصے مضبوط اعصاب کا مالک تھا یا پھر اسے اپنے والد کی موت کا کوئی خاص غم نہیں تھا۔

''مسٹر ڈیوڈ آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے آج صبح اپنے والد کے ہمراہ کافی پی تھی اور پھر سگریٹ لینے بازار چلے گئے اور جب آپ واپس آئے تو آپ کے ڈیڈ کو قتل کیا جاچکا تھا۔ کیا آپ اور آپ کے ڈیڈ کے علاوہ اس گھر میں اور کوئی نہیں رہتا؟'' سارجنٹ نے پوچھا۔

''جی میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے والد مسٹر پیٹر نے میری والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہیں کی اس لیے اس گھر میں صرف میں اور میرے ڈیڈ ہی رہائش پذیر تھے۔''

''آپ کا گھر تو خاصا بڑا ہے۔ کیا آپ کے ڈیڈ مسٹر پیٹر نے اتنے بڑے گھر میں کوئی ملازم وغیرہ بھی نہیں رکھا ہوا تھا؟'' سارجنٹ نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''میرے ڈیڈ کو بھیڑ بھاڑ اور شور شرابے سے نفرت تھی۔'' ڈیوڈ نے رسانیت سے جواب دیا۔ ''اس لیے انہوں نے اس گھر میں کبھی بھی ملازم وغیرہ نہیں رکھا۔ ان کے لیے ناشتے سے لے کر کھانا تیار کرنے کے فرائض میں خود ہی سرانجام دیتا تھا۔ گھر کی صفائی وغیرہ بھی میں ہی کرتا ہوں۔''

''آپ جب مسٹر پیٹر کو گھر چھوڑ کر بازار گئے تو وہاں آپ کو کتنی دیر لگی؟'' سارجنٹ نے پوچھا۔

''زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ اور کم سے کم دس منٹ۔'' ڈیوڈ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر قاتل آپ کے گھر میں داخل ہوکر ڈرائنگ روم تک کیسے پہنچا؟ اندر داخل ہونے کے لیے اتنا وقت تو خاصا کم ہے بلکہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو ناممکن ہے۔ آپ کے اس گھر کی دیواریں بہت بلند وبالا ہیں اور دیواروں پر حفاظتی نقطۂ نظر سے خاردار تاریں بھی لگی ہوئی ہیں۔''

''میں گھر کا مین گیٹ کھلا چھوڑ کر گیا تھا۔'' ڈیوڈ نے کھسیانے سے لہجے میں جواب دیا۔ ''میرے ڈیڈ جوڑوں کے درد میں مبتلا تھے۔ ان کے لیے بار بار ڈرائنگ روم سے مین گیٹ تک چل کر آنا اور دروازہ بند کرنا یا کھولنا کافی مشکل ثابت ہوتا تھا۔ اس لیے میں اکثر اوقات بازار جاتے وقت گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ جاتا تھا۔ تاہم اگر مجھے کہیں دور جانا ہوتا تو ڈیڈ گیٹ بند کرلیتے تھے۔''

''پھر تو آپ نے قاتل کو اپنے ڈیڈ تک رسائی کا خود ہی موقع دیا۔ اگرچہ نادانستگی یا انجانے میں ہی ایسا ہوا۔'' سارجنٹ نے بغور ڈیوڈ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کا ماتحت ڈین خاموشی سے پاس کھڑا تھا۔ اس نے دونوں کی گفتگو میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''یہ معمول کی بات تھی۔'' ڈیوڈ نے پُرزور لہجے میں جواب دیا۔ ''میں اکثر قریبی بازار جاتے وقت ایسا ہی کرتا تھا اور پھر کبھی کوئی غیر معمولی واقعہ بھی رونما نہیں ہوا تھا۔ ورنہ میں ضرور احتیاط کرتا۔ میرے بازار جانے پر کوئی میرے گھر میں گھس کر میرے ڈیڈ کو قتل کرڈالے گا یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میرا برسوں سے یہی معمول رہا ہے۔''

''ہمیں مسٹر پیٹر کی موت کا بے حد افسوس ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم جلد ہی قاتل کو تلاش کرلیں گے۔'' سارجنٹ نے ڈیوڈ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''مگر کب؟'' ڈیوڈ نے معترض لہجے میں کہا۔ ''اس جنونی قاتل نے آپ کے ایک پولیس افسر سمیت پانچ لوگوں کو جان سے مار ڈالا ہے مگر اب تک آپ گرفتار کرنا تو درکنار اس کا معمولی سا سراغ بھی نہیں لگا پائے۔ آپ کے مقتول افسر گیری نے تو میڈیا کو بریفنگ دیتے وقت بڑے بلند و بانگ دعوے کیے تھے کہ وہ قاتل کے قریب پہنچ چکا ہے مگر وہ تو خود ہی قاتل کا شکار بن گیا۔''

''ابھی تک آپ کا کوئی رشتے دار وغیرہ نظر نہیں آیا؟'' سارجنٹ نے ڈیوڈ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ابھی تک میں نے ماسوائے پولیس کے کسی اور کو مطلع ہی نہیں کیا۔'' ڈیوڈ نے رسان سے جواب دیا۔ ''جیسے ہی میرے ڈیڈ کے قتل کا عقدہ کھلے گا گھر میں تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ جائے گا۔ میں اور ڈیڈ بڑی

پُراطمینان اور پُرسکون زندگی بسر کر رہے تھے مگر اس جنونی قاتل نے ہماری خوشیوں کو اپنی جنونیت کی بھینٹ چڑھا دیا۔'' بات کرتے ہوئے ڈیوڈ کا لہجہ رندھ گیا۔

''آپ تسلی رکھیں۔'' سارجنٹ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب وہ قاتل زیادہ دیر تک ہم سے نہیں بچ پائے گا۔ فی الحال آپ آرام کریں اگر ضرورت پڑی تو آپ سے دوبارہ رابطہ کرلیا جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے سارجنٹ گھر کے مین گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ ڈین بھی اس کے ہمراہ تھا۔

سارجنٹ تقریباً دو گھنٹے مزید وہاں رکا رہا۔ تاہم اس نے ڈیوڈ سے دوبارہ ملاقات نہیں کی۔ اس نے یہ دو گھنٹے ڈیوڈ کے ہمسایوں وغیرہ سے ملاقاتوں میں صرف کیے۔ وہ یہ جاننے کے لیے کوشاں تھا کہ ڈیوڈ کے اپنے ڈیڈ مسٹر پیٹر سے تعلقات کیسے تھے اور اس بارے میں مصدقہ معلومات ہمسایوں سے ہی ملنے کے امکانات تھے۔

مسٹر پیٹر کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کردیا گیا جبکہ فنگر پرنٹس ٹیم بھی اپنا کام کافی حد تک مکمل کر چکی تھی۔ سارجنٹ نے مزید پوچھ گچھ کے لیے ڈین کو وہیں چھوڑا اور خود پولیس اسٹیشن روانہ ہوگیا۔ اس نے ڈین کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ اگر مقتول مسٹر پیٹر کا کوئی رشتے دار ان کے قتل کی اطلاع ملنے پر آئے تو ڈین اس سے بھی ڈیوڈ کے اس کے باپ کے ساتھ تعلقات کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے۔ آیا باپ بیٹے میں کشیدگی چل رہی تھی یا سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔

وہ دفتر پہنچ کر ابھی اپنی کرسی پر براجمان ہوا ہی تھا کہ اس کے دفتری فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''مبارک ہو، اس بار قاتل نے چند گھنٹوں کے وقفے کے بعد دو قتل کر ڈالے۔ پولیس کا ایک قابل پولیس افسر بھی مارا گیا۔ سارجنٹ تم نے اپنی کارکردگی سے ثابت کردیا ہے کہ تمہیں محکمے کی جانب سے میڈل ملنا چاہیے۔'' سارجنٹ نے جیسے ہی فون اٹھایا شیرف کے جملوں نے اس کے اندر ایک آگ سی لگادی۔

''سر، پولیس پوری کوشش کررہی ہے کہ اس قاتل تک پہنچ جائے۔'' سارجنٹ نے حتی الامکان خود پر قابو رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں جلد ہی آپ کو قاتل کی گرفتاری کی نوید سناؤں گا۔''

''یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے سارجنٹ۔'' شیرف نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''مجھ سے غلطی ہوگئی جو اس کیس کی تفتیش تم جیسے نااہل شخص کو سونپ دی۔ بہرحال اب مجھے اپنی اس غلطی کی تصحیح کرلینی چاہیے۔ میں اس کیس کی تفتیش پولیس سے لے کر کسی دوسری ایجنسی کے سپرد کررہا ہوں۔''

''مگر سر آپ نے ڈین سے فون پر کہا تھا کہ ہمارے پاس دو دن کا وقت ہے۔ آپ نے مجھے اس کیس کو حل کرنے کے لیے جو وقت دیا تھا وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔'' سارجنٹ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی دی ہوئی مہلت واپس لیتا ہوں۔'' شیرف کی غصیلی آواز سنائی دی۔ ''گیری مارا جاچکا ہے اور وقت پورا کرنے کے چکر میں کہیں تمہارا اپنا وقت ہی پورا نہ ہوجائے۔ میرے لیے یہ بات خاصی تشویش کا باعث ہے کہ اس قاتل نے اب قانون کے محافظوں کو بھی نشانہ بنانا شروع کردیا ہے۔ ویسے بھی اتنے دنوں میں تم کچھ نہیں کرسکے تو اب کون سا تیر مار لو گے؟ بہتر یہی ہے کہ لاس اینجلس پولیس اپنی شکست تسلیم کرے اور پیچھے ہٹ جائے۔ تمہارے لیے ایک اور خبر بھی ہے اور وہ یہ کہ اب اپنی ترقی کے خواب دیکھنا بھی چھوڑ دو بلکہ اس بات کا بھی غالب امکان ہے کہ تمہاری تنزلی کردی جائے۔ اس کیس میں تمہاری کارکردگی بہت مایوس کن رہی ہے۔ فی الحال تم آج رات تک اس کیس کے انچارج ہو۔ کل اس کیس کو کسی اور کرائم ایجنسی کے حوالے کرنے کا باقاعدہ نوٹیفکیشن جاری کردیا جائے گا۔'' شیرف نے اپنے آخری الفاظ تقریباً دھاڑتے ہوئے کہے اور اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کردیا۔

سارجنٹ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔ اس کے چہرے پر اسی وقت کبیدگی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ آج سے پہلے اس کی اتنی بے عزتی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ شیرف کے دوٹوک لہجے سے اسے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا فیصلہ قطعی اور آخری ہے، وہ اب اس کی مزید کوئی بات نہیں سنے گا۔

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس وقت اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کررہا تھا۔ وہ کافی دیر تک اسی حالت میں آنکھیں موندے بیٹھا رہا اور پھر یک لخت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور ڈین کا نمبر ملادیا۔

''ہیلو۔'' چند ثانیوں بعد ہی ڈین کی آواز ابھری۔

''ڈین کیا ڈیوڈ کے کسی رشتے دار سے ملاقات ہوئی ہے۔'' سارجنٹ نے اس کے فون اٹھاتے ہی سوال کیا۔

''سر، ابھی تک کوئی نہیں آیا۔ مجھے لگتا ہے کہ ڈیوڈ نے ابھی اپنے کسی عزیز کو مطلع ہی نہیں کیا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ رشتے داروں سے بھی وہی کچھ معلوم ہوگا جو ڈیوڈ کے ہمسایوں سے معلوم ہوا ہے کہ دونوں باپ بیٹے میں جائداد کا معاملہ لے کر کافی عرصے سے ناراضی چل رہی تھی۔ ڈیوڈ چاہتا تھا کہ اس کے ڈیڈ اپنی جائداد اب اس کے نام کر دیں مگر مسٹر پیٹر اس سے مسلسل انکاری تھے۔ ڈیوڈ کے پاس اپنے ڈیڈ کو قتل کرنے کی ایک معقول وجہ تھی۔ اگر وہ جنونی قاتل درمیان میں نہ کود پڑتا تو ہم ڈیوڈ پر شک کر سکتے تھے مگر اب ایسا نہیں ہے کیونکہ حالات و واقعات اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ یہ اسی قاتل کا کارنامہ ہے جس نے پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے۔ ویسے بھی باپ اور بیٹے کے درمیان جائداد کے تنازعے کو لے کر ناچاقی عام سی بات ہے۔ ایسے بہت کم واقعات ہمارے مشاہدے میں آئے ہیں جب کوئی اولاد اس حد تک گر جائے کہ جائداد کی خاطر اپنے باپ کو مار ڈالے۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ڈیوڈ کا مسٹر پیٹر کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور پھر مسٹر پیٹر کو بھی بالکل اسی انداز میں مارا گیا ہے جس انداز میں ہیریسن، مارٹن، رابرٹ اور ہمارے ساتھی گیری کو مارا گیا ہے۔ قتل کرنے کا یہ مخصوص انداز ثابت کرتا ہے کہ ہمیں ڈیوڈ پر شک نہیں کرنا چاہیے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' سارجنٹ نے ڈین کی وضاحت سن کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''اب پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے کے بعد ہی باقی معاملات دیکھیں گے۔ فی الحال تم بھی واپس آجاؤ اور ہاں ڈیوڈ کا سیل نمبر مجھے میسج کر دو۔ اپنی مزید تسلی کے لیے میں اس سے ایک ملاقات اور کرنا چاہتا ہوں۔''

''او کے سر میں اس کا سیل نمبر میسج کر دوں گا۔'' ڈین نے جواب دیا تو سارجنٹ نے بھی او کے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس نے دوبارہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس وقت اس کے چہرے پر تفکرات کے سائے منڈلا رہے تھے۔ سارجنٹ بٹلر لاس اینجلس پولیس میں ایک ذہین اور قابل افسر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ وہ سارجنٹ کے عہدے پر اپنی ذہانت اور قابلیت سے ہی پہنچا تھا اور جلد ہی اس کی ترقی ہونے والی تھی مگر موجودہ صورت حال نے اس کے شاندار ریکارڈ کو داغ دار کر ڈالا تھا۔ شیرف نے اسے واشگاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اب وہ اپنی ترقی کی امید نہ رکھے... بلکہ اس کی تنزلی کے امکانات موجود تھے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک اسی طرح نشست کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ پھر اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اس کے بیوی بچے ایک رشتے دار کے ہاں کسی تقریب میں شرکت کرنے گئے ہوئے تھے۔ اس لیے آج اس کے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ آج وہ خاصی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اسی لیے آفس سے بھی جلدی گھر واپس آگیا تھا۔ شاید ذہنی دباؤ کی وجہ سے اس پر تھکان طاری ہو گئی تھی۔

شام گزری اور رات شروع ہوئی تو سارجنٹ نے اپنا موبائل فون نکالا۔ ڈین نے اس کے کہنے کے مطابق ڈیوڈ کا نمبر میسج کر دیا تھا۔ وہ موبائل فون ہاتھ میں تھامے کچھ سوچتا رہا اور پھر اس نے ڈیوڈ کا نمبر ڈائل کر دیا۔

''ہیلو۔'' چند ثانیوں بعد ہی اس کی آواز سنائی دی۔

''مسٹر ڈیوڈ، میں سارجنٹ بٹلر بول رہا ہوں۔ میں ایک بار پھر آپ کے گھر کا جائزہ لینا چاہتا ہوں اور آپ سے کچھ سوالات بھی کرنا چاہتا ہوں مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اور میری ملاقات میں کوئی دوسرا موجود نہ ہو۔ کیا میں اس وقت آپ کے گھر آسکتا ہوں؟''

''اس وقت میرے گھر میں تو کوئی موجود نہیں۔ مگر بہتر تھا کہ آپ صبح آجاتے۔'' ڈیوڈ کے لہجے میں بیزاری کی جھلک نمایاں تھی۔ ''میں اس وقت آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''مسٹر ڈیوڈ۔'' سارجنٹ کے لہجے میں یک لخت سختی آگئی۔ ''میں آپ سے کسی ذاتی معاملے میں ملاقات نہیں کرنا چاہ رہا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ قتل کا معاملہ ہے۔ آپ کا جواب پولیس سے عدم تعاون کے زمرے میں لیا جائے گا۔''

''میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔'' اس بار ڈیوڈ کے لہجے میں نرمی تھی۔ ''آپ آنا چاہتے ہیں تو آجائیں۔ میں قانون سے ہر ممکن تعاون کروں گا۔ ویسے اگر آپ کو کچھ پوچھنا ہے تو فون پر بھی پوچھ سکتے ہیں۔''

''میں جائے وقوع کا ازسرنو معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت آپ کے گھر تعزیت کے لیے لوگ موجود ہوں گے۔'' سارجنٹ نے بھی اس بار نرم لہجے میں بات کی۔

''کچھ افراد آئے تھے۔ تعزیت کر کے واپس چلے گئے۔ رشتے داروں کی آمد کل سے شروع ہوگی۔ ویسے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم کے بعد مجھے اپنے والد کی ڈیڈ باڈی کب تک مل جائے گی؟ میں چاہتا ہوں کہ ان کی آخری رسومات وغیرہ جلد ادا کر دوں۔''

''میں اس بارے میں آپ کی کوئی مدد یا رہنمائی نہیں کر سکتا۔'' سارجنٹ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''مسٹر

پیٹر کی ڈیڈ باڈی کب واپس ملے گی۔ اس بات کا تعین پوسٹ مارٹم کرنے والا میڈیکل بورڈ ہی کر سکتا ہے۔ میں ایک گھنٹے سے پہلے آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کچن میں جا کر اپنے لیے ایک بار پھر کافی تیار کی اور پھر کافی پینے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد اپنے گھر کو لاک کر کے ڈیوڈ کے گھر روانہ ہو گیا۔ سڑک پر اس وقت گاڑیوں کا رش خاصا کم تھا اسی لیے وہ جلدی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اپنی کار ایک سائڈ پر کھڑی کی اور پھر نیچے اتر کر مسٹر پیٹر کے گھر کی بیل بجا دی۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل گیا۔ دروازہ ڈیوڈ نے خود ہی کھولا تھا۔ ''آیئے سارجنٹ۔'' اس نے کہا تو سارجنٹ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

''معاف کیجیے گا مسٹر ڈیوڈ، مجھے اس وقت آنا پڑا اور اصل میں آپ سے آپ کے والد بارے میں کچھ تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔''

''کوئی بات نہیں آپ آئیں ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ ڈرائنگ روم ابھی سیلڈ ہے۔ پولیس نے کچھ نشانات وغیرہ لگائے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھی ڈرائنگ روم کے کچھ حصوں سے فنگر پرنٹس اٹھانے کا کام باقی ہے۔ یہ کام کل کیا جائے گا اس لیے ڈرائنگ روم کو فی الحال بند رکھا جائے۔'' ڈیوڈ نے ڈرائنگ روم کی طرف نہ جانے کی وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' سارجنٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نا آپ کے والد کی لائبریری میں چل کر بیٹھا جائے۔ آپ کے ہمسایوں سے پوچھ گچھ کے دوران پتا چلا تھا کہ مسٹر پیٹر مطالعے کے بہت شوقین تھے اور انہوں نے گھر میں ایک ذاتی لائبریری بھی بنا رکھی تھی جہاں تقریباً ہر موضوع پر مبنی کتاب موجود ہے۔''

''آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ آیئے ہم لائبریری میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ڈیوڈ ایک جانب بڑھ گیا جبکہ سارجنٹ بھی سر ہلاتے ہوئے اس کے ہمراہ ہو لیا۔

مسٹر پیٹر کی لائبریری سارجنٹ کی توقع سے بھی زیادہ بڑی تھی۔ لائبریری دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مسٹر پیٹر نے اپنی زندگی میں مطالعے کے سوا کوئی دوسرا شوق ہی نہیں پالا تھا۔

ڈیوڈ نے اسے لائبریری میں رکھے ہوئے آرام دہ صوفے پر بٹھایا اور خود کافی بنانے کے لیے چلا گیا۔ اگرچہ سارجنٹ اپنے گھر سے دو کپ کافی پی کر آیا تھا۔ تاہم جب ڈیوڈ نے اس سے کافی کے بارے میں پوچھا تو اس نے انکار نہیں کیا۔

ڈیوڈ کے جاتے ہی سارجنٹ اٹھا اور دلچسپی سے ریک میں رکھی کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ مسٹر پیٹر کے ذوق کا قائل ہو گیا۔ لائبریری میں بعض نایاب کتب بھی موجود تھیں جو شاید اب عام مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھیں۔

اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ربر کے دستانے نکال کر پہنے اور پھر کچھ کتابوں کو ریک سے نکال کر باقاعدہ جائزہ لینے لگا۔

کچھ ہی دیر میں ڈیوڈ کافی بنا کر لایا تو سارجنٹ نے کتب دوبارہ ریک میں رکھ دیں۔ ڈیوڈ نے کافی کا کپ صوفے کے سامنے رکھی ٹیبل پر رکھ دیا اور خود بھی صوفے پر براجمان ہو گیا۔ سارجنٹ بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کا گہری نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ اس کے اس طرح گھورنے پر ڈیوڈ کو بے چینی محسوس ہونے لگی تاہم سارجنٹ اس کی بے چینی کو نظر انداز کرتے ہوئے مسلسل اسے گھورے جا رہا تھا۔

''ہاں تو سارجنٹ آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' کچھ دیر بعد ہی ڈیوڈ نے پوچھا شاید خاموشی کے وہ منجمد لمحے اس کی برداشت سے باہر ہو گئے تھے۔

''مجھے آپ کے والد کی لائبریری سے یہ کتاب ملی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ آپ کے ڈیڈ کو کہاں سے ملی؟'' سارجنٹ نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی کتاب نکال کر ڈیوڈ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

ڈیوڈ نے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھا اور پھر ہاتھ آگے بڑھا کر سارجنٹ کے ہاتھوں سے وہ چھوٹی سی کتاب لے لی۔ اس کا حجم عام کتابوں کے مقابلے میں خاصا کم تھا۔ ڈیوڈ حیرت بھرے انداز میں اس کتاب کو دیکھنے لگا۔

''یہ تو کسی اجنبی زبان میں ہے۔'' اس نے کتاب کھولتے ہوئے کہا۔ ''اس کی زبان تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تاہم اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ آڑھی ترچھی لکیریں بالکل ویسی ہی ہیں جیسی خنجر اور میرے ڈیڈ کے سینے پر کندہ کی گئی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ڈیڈ نے یہ کتاب کہاں سے حاصل کی تھی۔ ویسے بھی مجھے مطالعے کا زیادہ شوق نہیں ہے۔''

''یہ کتاب قدیم افریقی زبان میں لکھی گئی ہے۔'' سارجنٹ نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اس کتاب کو واپس لے لیا۔ کتاب واپس کرتے ہوئے ڈیوڈ کی نظر سارجنٹ کے ہاتھوں پر موجود ربڑ کے دستانوں پر پڑی تو لمحہ بھر کے لیے

اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات اُبھر آئے۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس جائے وقوعہ پر اس قسم کے دستانے پہن کر ہی تفتیش کا آغاز کرتی ہے۔ تاکہ ان کی انگلیوں کے نشانات کہیں ثبت نہ ہوں۔ مگر اس وقت سارجنٹ نے یہ دستانے کیوں پہن لیے تھے۔ فوری طور پر وہ اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔

''ہاں تو مسٹر ڈیوڈ پھر آپ نے اپنے ڈیڈ کو کیسے قتل کیا؟'' سارجنٹ نے کتاب اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

سارجنٹ کے الفاظ کا یہ حملہ ڈیوڈ کے لیے انتہائی اچانک اور غیر متوقع تھا۔ وہ صوفے سے اچھل کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ فٹ ہوں۔

''یہ کیا بکواس ہے سارجنٹ؟'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ ٹماٹر کی طرح لال ہو گیا تھا۔

''یہ بکواس نہیں، حقیقت ہے۔'' سارجنٹ بٹلر نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اپنے باپ کے قاتل تم ہی ہو۔ تمہارے ہمسایوں سے پوچھ گچھ کے دوران مجھے علم ہوا تھا کہ تمہارا جائداد کو لے کر اپنے باپ سے تنازع چل رہا تھا اور اس سلسلے میں کئی دفعہ تمہاری مسٹر پیٹر سے تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ تم نے جائداد حاصل کرنے کے لیے ہی یہ سارا ڈراما رچایا ہے۔ تمہارا خیال تھا کہ یہ قتل بھی اسی پُراسرار قاتل کے کھاتے میں چلا جائے گا جس نے شہر میں خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے۔ اس طرح تم قانون کی گرفت میں آنے سے محفوظ رہو گے اور جائداد حاصل کرنے میں تمہارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی تمہارے والد سے بھی نجات حاصل ہو جائے گی۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' ڈیوڈ کا لہجہ بدستور بپھرا ہوا تھا۔ ''میرے ڈیڈ کے سینے میں پیوست خنجر اور ان کے سینے پر کندہ تحریر یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ قتل اسی جنونی نے کیا ہے جسے گرفتار کرنے میں آپ لوگ ناکام رہے ہیں۔''

''تمہارے لیے اب بھاگنا ممکن نہیں رہا۔ تمہارے فرار کی ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔'' سارجنٹ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم سے کچھ غلطیاں اور بھی سرزد ہوئی ہیں۔ تمہارے ڈیڈ کے سینے پر جو خنجر پیوست ہے، اس کے دستے کی شکل ان خنجروں سے خاصی مختلف ہے جو اس سے پچھلی وارداتوں میں استعمال ہوئے تھے۔ اگر خنجر کے دستے اور مسٹر پیٹر کے سینے پر کندہ تحریر کو بغور دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تحریر میں مماثلت کے باوجود کافی جگہ فرق کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ پچھلی وارداتوں میں استعمال ہونے والے ایک خنجر کی بہت بڑی تصویر اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ تم نے اس تصویر کی کامیاب نقل کی ہے مگر سو فیصدی نقل کرنے میں ناکام رہے ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے اپنے والد کو راستے سے ہٹانے کے لیے اس پُراسرار قاتل کی اوٹ لی ہے۔ تمہیں یقین تھا کہ یہ قتل بھی اسی کے کھاتے میں چلا جائے گا۔ تمہاری یہ چال خاصی حد تک کامیاب بھی رہی ہے۔ فی الحال پولیس کو تم پر شک نہیں ہوا مگر مجھے پہلے دن سے ہی یقین تھا کہ یہ قتل تم نے کیا ہے۔''

''مگر یہ بات آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس مذہبی جنونی کا کام نہیں ہے۔'' ڈیوڈ نے پُرزور لہجے میں احتجاج کیا۔

''شہر میں ایسے کسی مذہبی جنونی کا وجود نہیں ہے۔'' سارجنٹ نے کھڑے ہو کر اپنی جیب سے ریوالور نکال کر ڈیوڈ پر تان لیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے تھے۔

''تمہارے ڈیڈ کے علاوہ اس طرز کے جتنے بھی مرڈرز ہوئے ہیں، وہ سب میں نے کیے ہیں۔ میں ہی وہ پُراسرار قاتل ہوں جسے لاس اینجلس پولیس تلاش کر رہی ہے۔ خنجر پر قدیم افریقی تحریر اور مقتولین کے سینوں پر بھی وہی تحریر کندہ کرنا میرا رچایا ہوا ایک کھیل تھا۔ میں نے پولیس کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں مذہبی جنونیت کی اوٹ میں کچھ لوگوں کو سزا دے رہا تھا۔ کچھ لوگوں سے حساب چکتا کر رہا تھا۔'' سارجنٹ بٹلر کا لہجہ بات کرتے ہوئے خاصا سرد ہو گیا تھا۔

ڈیوڈ کے حلق سے فوری طور پر کوئی بات نہ نکل سکی۔ اس پر یہ انکشاف کسی بم کی طرح گرا تھا کہ مسٹر پیٹر کے علاوہ شہر میں ہونے والے قتل ایک پولیس افسر کر رہا تھا۔

''میں مذہبی جنونیت کی اوٹ میں اپنا انتقام لے رہا تھا جبکہ تم نے جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے بھی وہی کھیل کھیلا۔ تم نے اپنے باپ کو مارتے وقت وہی طریقہ کار اختیار کیا جو میں کرتا تھا۔ تاہم کچھ جگہوں پر فرق باقی رہ گیا۔ ہم دونوں میں خاصی ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ تاہم جذبوں میں فرق ہے۔ تم نے لالچ کے جذبے کے تحت اپنے ہی باپ کو قتل کر ڈالا۔ جبکہ میں وہ بدنصیب باپ ہوں جس نے اپنے بیٹے کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ وہ بیٹا جسے میں بھی اپنا نام بھی نہ دے سکا۔ حتیٰ کہ کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں

کی کہ مبادا میرا راز نہ کھل جائے۔ امریکی قوانین میری راہ میں حائل ہو چکے تھے۔ میں نے برسوں پہلے فرگوسن نامی ایک عورت سے شادی کی تھی مگر کیونکہ میں پہلے سے شادی شدہ تھا۔ اس لیے سزا سے بچنے کے لیے اس شادی کو خفیہ رکھا۔ فرگوسن کے بطن سے میرا ایک بیٹا ٹامی پیدا ہوا۔ میں نے اس شادی کے تمام فرائض نبھائے بس ٹامی کو بیٹا نہ کہہ سکا تاہم فرگوسن کو باقاعدگی سے اخراجات بھجواتا رہا اور چھپ کر اس سے ملتا بھی رہا۔ برسوں تک سب کچھ اسی طرح چلتا رہا۔ ہماری شادی خفیہ ہی رہی۔ اس دوران میرا بیٹا ٹامی منشیات کی لت میں مبتلا ہو گیا مگر فرگوسن نے یہ بات مجھ سے چھپائے رکھی۔ مجھے اس کے منشیات کی لت میں مبتلا ہونے کا اس وقت پتا چلا جب وہ ہیرسن نامی ایک ہیروئن فروش کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ میں اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ ایک خوش وخرم زندگی بسر کر رہا تھا مگر فرگوسن بھی میری بیوی تھی اور ٹامی بھی میرا بیٹا تھا۔ اس کے اس بہیمانہ قتل کی اطلاع میرے لیے بڑی روح فرسا تھی۔ اسے تو آخری وقت تک اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اس کا باپ زندہ ہے۔ فرگوسن کی حالت مجھ سے بھی بدتر تھی۔ اس کا ایک ہی تو بیٹا تھا۔ میری تو پھر بھی پہلی بیوی سے اولاد موجود تھی مگر فرگوسن سے اس کے جینے کا سہارا ہی چھین لیا گیا تھا۔ اسے پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ میں چھپ کر اس سے ملتا اسے تسلیاں دیتا مگر ظاہر ہے وہ ایک ماں تھی اسے صبر کیسے آتا۔ پولیس نے ٹامی کے قتل کے جرم میں ہیرسن کو گرفتار کیا تو مجھے بھی اطمینان ہوا کہ میرے بیٹے کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔ اس کیس کا انچارج سارجنٹ جورڈی ایک سخت گیر اور فرض شناس پولیس افسر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ قاتل کیفرِ کردار کو پہنچ جائے گا مگر پھر چھ ماہ بعد مجھے ہیرسن کے بری ہونے کی خبر نے چونکا دیا۔ وہ عدالت سے عدم شواہد کی بنا پر بری ہو گیا تھا۔ میرے بیٹے کا قاتل چھوٹ گیا۔ یہ صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے خفیہ طور پر معلومات حاصل کیں تو علم ہوا کہ مارٹن نامی ایک ٹیکسی ڈرائیور اور رابرٹ نامی ایک بینک ملازم نے ہیرسن کو ٹامی کا قتل کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ اس واقعے کے عینی شاہد تھے مگر ہیرسن کے خوف سے انہوں نے پولیس کو درست گواہی نہ دی۔ میرے نزدیک وہ ہیرسن سے بھی بڑے مجرم تھے۔ اگر وہ پولیس کو درست بیان دے دیتے اور عدالت میں بھی اپنے اس بیان پر قائم رہتے تو ہیرسن کو سزا سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی تھی۔

”بہرحال میں خود بھی قانون کا محافظ تھا۔ ازخود قانون کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے خاموش ہو گیا اور پھر دو ماہ بعد میری بیوی فرگوسن بھی ٹامی کو یاد کرتے کرتے چل بسی۔ یہی وہ وقت تھا جب میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں ٹامی کی موت کا بدلہ لوں اور ساتھ ہی ساتھ مارٹن اور رابرٹ کو بھی گواہی نہ دینے کی سزا دوں۔ میں ایک نظریاتی آدمی تھا۔ تمام عمر قانون کی پاسداری کرتے ہوئے گزری تھی۔ قانون شکنی کا یہ فیصلہ میرے لیے آسان نہ تھا۔ کئی ماہ گومگو... اور تذبذب کے عالم میں گزرے۔ بالآخر میں نے ہیرسن، مارٹن اور رابرٹ کو مارنے کے لیے ایک پلان ترتیب دے ڈالا۔ میں نے ہیرسن کو مارتے وقت دانستہ وہاں ایسے شواہد چھوڑے جن کی بنا پر اس قتل کو کسی مذہبی جنونی کا کام سمجھا جائے۔ مارٹن اور رابرٹ کو مارتے وقت بھی میں نے یہی طریقۂ کار اختیار کیا۔ میری چال کامیاب رہی اور پولیس میری دکھائی گئی راہ پر چل پڑی۔ مگر پھر میرا ماتحت گیری میری مرحوم بیوی کی کسی ایسی سہیلی کو ٹریس کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جسے فرگوسن نے یہ بتا رکھا تھا کہ اس کا شوہر زندہ ہے۔ گیری نے ہیرسن، مارٹن اور رابرٹ کے آپسی تعلق کا سراغ بھی لگا لیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ ہیرسن نے ٹامی نامی ایک لڑکے کو قتل کیا تھا اور مارٹن اور رابرٹ نے عینی شاہد ہونے کے باوجود پولیس کو سچی گواہی نہیں دی تھی۔ گیری بالآخر اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ان مرڈرز کے پیچھے فرگوسن کے خفیہ شوہر کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ ایک وہی ہے جو اپنے بیٹے کا انتقام لینے کی خاطر اس حد تک جا سکتا تھا۔ گیری نے اپنی رائے مجھ سے شیئر کی اور اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں شیرف کو دینے کے لیے کوئی رپورٹ وغیرہ تیار کرتا میں نے اسے بھی مار ڈالا۔ اسے مارنا ضروری تھا۔ وہ درست راہ پر چل پڑا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ فرگوسن کے بینک اکاؤنٹ میں رقم کون بھجواتا رہا ہے۔ وہ مجھے بے نقاب کرنے کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ اس لیے اسے مارنا میری مجبوری تھی۔ ورنہ میں ذاتی طور پر اسے پسند کرتا تھا۔ وہ ایک ذہین اور قابل افسر تھا۔ اس کھیل میں وہ واحد شخص ہے جسے مارنے کا مجھے شدید دکھ ہے۔ وہ بہت تیز طرار آدمی تھا مگر میری خنجر زنی کی مہارت اس کی تیز طراری سے کہیں زیادہ تھی۔“

ڈیوڈ انگشت بدنداں چہرے اور ششدر نگاہوں سے سارجنٹ کی کہانی سن رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے بڑی شاطرانہ پلاننگ کی تھی مگر یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جس پُراسرار قاتل کی اوٹ لے کر اس نے اپنے باپ کو ختم کیا ہے، وہ سارجنٹ بھی ہو

سکتا ہے۔

''تو اب تم کیا کرنے والے ہو؟'' اس نے خوف زدہ نگاہوں سے سارجنٹ کے ہاتھوں میں موجود ریوالور کو دیکھا۔

''جانتے ہو جو کتاب میں نے تمہیں دکھائی ہے' وہ مجھے تمہارے والد کی لائبریری سے نہیں ملی، وہ میں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس کتاب پر میں تمہاری انگلیوں کے نشانات تو لے ہی چکا ہوں۔'' سارجنٹ کا لہجہ لحہ بہ لحہ بھیانک ہوتا جارہا تھا۔

''مجھے یہ سب کچھ بتانے کا مقصد کیا ہے۔ اگر تمہیں یقین ہے کہ میں نے اپنے والد کو مارا ہے تو مجھے گرفتار کرلو۔'' ڈیوڈ کے لہجے میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔

''مجھے اب تمہاری اوٹ میں چھپنا ہے ہمیشہ کے لیے۔'' سارجنٹ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ڈیوڈ نے متحیر لہجے میں کہا۔

''مطلب بڑا صاف اور واضح ہے۔ تم نے اپنے ڈیڈ کو راستے سے ہٹانے کے لیے جو کھیل کھیلا ہے' میں وہی کھیل تمہارے ساتھ کھیلوں گا۔ تم نے اپنے ڈیڈ کا قتل اس پُراسرار قاتل یعنی میرے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اب میں ہیرسن، رابرٹ، مارٹن اور گیری کا قتل تمہارے کھاتے میں ڈال دوں گا۔ میں اپنی رپورٹ میں لکھوں گا کہ شہر میں ہونے والے بہیمانہ قتل تم نے کیے ہیں۔ تم ہی وہ مذہبی جنونی ہو جس نے پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے۔ تم اپنی اس جنونیت میں اس حد تک گر گئے کہ تم نے اپنے سگے باپ کو بھی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ میں اپنی جیب میں موجود قدیم افریقی زبان پر مبنی کتاب کے بارے میں دعویٰ کروں گا کہ یہ تمہارے گھر سے برآمد ہوئی ہے۔ میں ایک پولیس والا ہوں میری بات پر یقین کرلیا جائے گا۔ اس طرح میری نوکری بھی بچ جائے گی اور جلد ہی ترقی بھی ہو جائے گی۔ میں ایک تیر سے کئی شکار کروں گا۔''

''میں سب کچھ سچ سچ اگل دوں گا۔'' ڈیوڈ ہذیانی انداز میں بولا۔ ''میڈیا اور پولیس کے دیگر سراغ رساں اتنی آسانی سے تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے۔''

''ممکن ہے فوری طور پر یقین نہ کیا جائے۔'' سارجنٹ پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''مگر چند ماہ تک جب اس طرز کا مزید کوئی قتل نہیں ہوگا تو سب کو میری رپورٹ پر یقین کرنا پڑے گا۔ رہ گئی تمہارے شور مچانے کی بات تو اس کی نوبت بھی آئے گی جب میں تمہیں زندہ چھوڑوں گا۔ تم نے میرا پورا پلان نہیں سنا۔ میں تمہارے ڈیڈ کے قتل کے بارے میں تم سے مشکوک ہو چکا تھا۔ تفتیش کے لیے اکیلا تمہارے گھر آیا۔ صوفے پر پڑی قدیم افریقی زبان پر مبنی یہ کتاب دیکھ کر اس بارے میں تم سے سوالات کیے۔ میرے تیکھے سوالات پر تم پر جنونیت کا دورہ سا پڑ گیا اور تم نے کوٹ کی جیب سے خنجر نکال کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ شاید تم مجھے بھی اپنی جنونیت کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے۔ حملہ اتنا اچانک تھا کہ مجھے اپنے دفاع میں گولی چلانی پڑی۔ عجلت اور بوکھلاہٹ میں۔ میں نے تمہاری ٹانگ کے بجائے سر میں گولی ماردی۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں نے مجبوری میں یہ قدم اٹھایا۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ نے اپنے ہاتھ میں موجود ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور ماتھے کے عین درمیان گولی کھا کر ڈیوڈ زمین پر جا گرا۔ سر میں لگنے والی گولی نے اسے تڑپنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ اس کی حیرت اور خوف سے کھلی آنکھیں یک لخت بے نور ہوگئیں۔

سارجنٹ اس کی لاش کے قریب آیا۔ وہ چند لمحوں تک عجیب سی نگاہوں سے ڈیوڈ کے مردہ چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہی کتاب نکال لی جو اس نے ڈیوڈ کو دکھائی تھی۔ اس نے وہ کتاب ڈیوڈ کی لاش کے پاس پھینک دی۔ اس کے بعد اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے لکڑی کے دستے والا ایک درمیانے سائز کا خنجر نکال لیا۔ یہ بالکل اسی طرز کا خنجر تھا۔ جو وہ ہیرسن، مارٹن، رابرٹ اور گیری کو مارتے وقت استعمال کر چکا تھا۔ وہ اپنے گھر سے پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اگرچہ اس نے ربر کے دستانے پہن رکھے تھے تاہم پھر بھی احتیاطاً جیب سے رومال نکال کر خنجر کو اچھی طرح صاف کیا اور پھر نیچے جھکتے ہوئے اسے ڈیوڈ کے ہاتھوں میں تھما کر اس کی مردہ مٹھی مضبوطی سے بند کردی۔ یہ سب کرنے کے بعد اس کے چہرے پر گہرے اطمینان کے تاثرات عود کر آئے تھے۔

''دنیا اب تمہیں ہی قاتل سمجھتی رہے گی۔ میں تمہاری اوٹ میں ہمیشہ کے لیے چھپ جاؤں گا۔'' سارجنٹ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر اپنا موبائل فون نکال لیا تاکہ پولیس کی نفری طلب کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں بتا سکے کہ بالآخر اس نے شہر میں خوف و ہراس پھیلانے والے اس جنونی اور پُراسرار قاتل کا سراغ لگا کر اسے ٹھکانے لگا دیا ہے۔

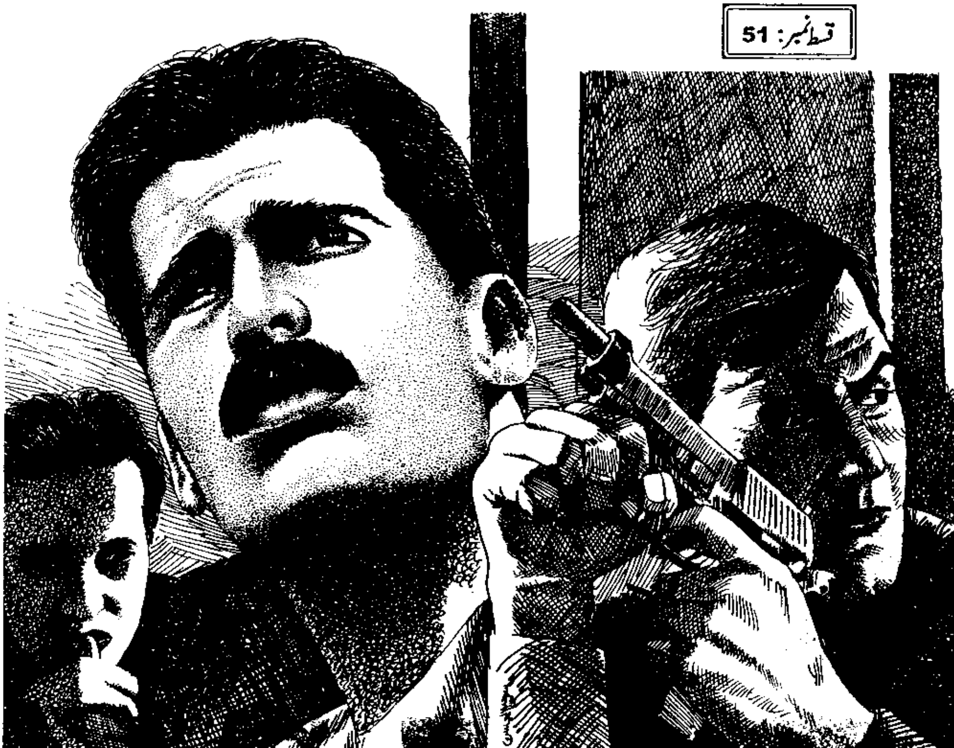
آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھادیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

قسط نمبر: 51



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کرواکر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔

ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو تلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو تلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام جھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو تلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔

وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو تلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو تلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔

ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پرفریبوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سانحے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانا ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپا کو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپا کو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسپا کو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسپا کو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ شہزی، روڈلف کے ساتھ کیٹ اور بروجیٹ کو زخمی کر کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین اسے مل جاتی ہے ...وہ دونوں شہزی کو مصر لے جانا چاہتے ہیں مگر شہزی راضی نہیں ہوتا۔ وہ ایک بار پھر کوبارا کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور بالآخر ایک طویل ساتھ کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ اب یاسمین کی ذمے داری شہزی کے سر تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''ی...... ی...... یہ بھی اُن کی...... ساتھی ہے......''
یاسمین کے کراہتے ہوئے نحیف و نزار سے الفاظ میری سماعتوں میں بم کی طرح پھٹے تھے۔ فطری ردِعمل کے طور پر کیمی کی طرف دیکھتے ہوئے میری آنکھیں لمحہ بھر کو حیرت سے پھیل گئیں۔

معاملہ خراب ہونے اور بھانڈا پھوٹ جانے پر کیمی کو میں نے بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آتے دیکھا۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر کسی خونخوار بلی کی طرح مجھ پر جھپٹا مارنا چاہا۔

خالی ہاتھ اٹھا کر وار کرنے کے اس مخصوص انداز میں مدِمقابل کو زہریلی سوئی کی ہلاکت خیزی کا نشانہ بنانے والا...... سے جی کو ہارا کا یہ آخری ''زہریلا'' ساتھی تھا۔ (تیسرا مسلح ساتھی ابھی چھپا ہوا تھ) پہلے والے نے بھی مجھ پر ابتدا میں اسی طرح وار کرنا چاہا تھا اور میری غیر معمولی محتاط روی اور چابک دستی کے سبب موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔

اسی سبب مجھے ایسے ''زہریلے'' ہرکارے سے نمٹنے کا بخوبی تجربہ تھا جس کا کیمی کو اندازہ تک نہ تھا۔

کیمی نے جیسے ہی مجھ پر یہ زہریلا وار کرنا چاہا، میں نے اپنی ٹانگ کو اس طرح حرکت دی کہ وہ میری جانب بڑھتے ہوئے رخ بدلنے پر مجبور ہو جائے۔ وہی ہوا، میری ٹانگ اس کے پہلو کو مخصوص انداز میں چھوئی تھی اور نتیجے میں کیمی کا نازک بدن میری جانب آتے آتے، کچھ اپنی جھونک میں بھی گھوم سا گیا۔ تب ہی میں نے انداز بہ سرعت دوسری حرکت کی، دو قدم آگے بڑھا، کیمی پشت کے بل میرے سینے پر آ لگی، میرے دائیں ہاتھ نے اس کی گردن کے گرد شکنجہ کسا، دوسرے ہاتھ نے اس کی وہ کلائی دبوچ لی، جس میں مبینہ طور پر زہریلی سوئی پوشیدہ تھی۔ تیسرا لمحہ کیمی کی روح کا قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کا ثابت ہوا۔

چونکہ اس نے بغیر آستینوں والی چست شرٹ پہن رکھی تھی، مجھے اس کے بائیں ہاتھ میں فقط ایک رسٹ واچ ہی بندھی ہوئی نظر آئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ زہریلی سوئی اس کے اندر کہیں پوشیدہ تھی بھی یا نہیں، تاہم اس کے حملہ کرنے کا انداز ایسا ہی تھا کہ وہ مجھے اس زہریلی سوئی کا نشانہ بنانا چاہتی ہو۔

بہرکیف اس کا بھی میں نے وہی حشر کیا تھا جو اُس کے پہلے والے ''زہریلے ساتھی'' کا کیا تھا۔

کیمی کی گردن کا منکا توڑتے ہی میں اس کی بھی لاش گھسیٹتے ہوئے دوسرے واش روم میں لے گیا۔

وہاں ایک دیوار سے کیمی کی لاش کو ٹکانے کے بعد میں نے اس کے دائیں ہاتھ کی رسٹ واچ کا جائزہ لیا، وہ بظاہر ایک فینسی اسٹائل کی بریسلیٹ رسٹ واچ تھی۔ جس کا ریپ (Wrap) غیر معمولی طور پر چوڑا تھا۔ اس کے بالکل نیچے سے جہاں ایک بٹن سے باندھا جاتا تھا، وہاں نظر پڑی تو اچانک ایک سرد سی لہر میرے وجود میں دوڑ گئی، وہاں ایک ڈیڑھ سے دو انچ تک کی سوئی باہر کو ابھری ہوئی تھی۔

اسے یقیناً حملہ کرتے وقت ایک مخصوص میکنزم کے ذریعے باہر نکال لیا گیا تھا مگر کیسے، میں نے نہایت احتیاط سے اسے کلائی سے کھول کر جائزہ لیا۔

ایسے اسپائی آلات سے میں بھی واقف تھا، جلد ہی مجھے ڈائل کے ساتھ ہی منسلک ایک باریک بٹن دکھائی دے گیا، اسے میں نے پش کیا تو سوئی اندر غائب ہو گئی۔ میں اس کی ٹیکنک سمجھ گیا، ایک مخصوص جھٹکا دینے سے یہ زہریلی سوئی اسی طرح اندر باہر متحرک ہوتی تھی۔

نہایت احتیاط سے میں نے اس کی گھڑی کلائی سے اتاری کہ کہیں اس میں چھپی ہوئی موت کا میں خود ہی بے دھیانی میں نہ شکار ہو جاؤں۔ ایک مخصوص انداز کے کھٹکے سے میں نے سوئی دوبارہ اندر کر دی تھی۔

بلاشبہ یہ ایک فوری طور پر کام آنے والا بڑا کارآمد ہتھیار تھا۔ اگرچہ اس کی حیرت انگیز کارکردگی عارضی سہی، کیونکہ اس میں مجھے کافی دنوں تک زہر ذخیرہ کرنے والی ایسی کوئی جگہ دکھائی نہیں دی تھی۔ ہاں! البتہ بہ غور جائزہ لینے سے یہی پتا لگتا تھا کہ اس کی صرف سوئی زہر میں بجھی ہوئی ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ اپنے لیے بھی بہت رسکی ہتھیار تھا، ذرا سی بے دھیانی یا غلطی، حملے کے دوران ہاتھ یا کلائی کا مڑ جانا، سوئی خود کو بھی چبھ سکتی تھی۔ اس زہریلے ہتھیار کو استعمال کرنے میں اچھی خاصی پریکٹس کا دخل تھا، میں نے کچھ سوچ کر دوبارہ کیمی کی لاش کی کلائی پر گھڑی لپیٹ دی اور تیزی سے باہر نکلا۔

اس سے میرے جسم کا ایک ایک اعضا ہی نہیں بلکہ...... ذہن بھی تیزی سے متحرک تھا۔ اسی تیزی کے انداز میں سوچتے ہوئے میں نے یاسمین کو دیکھا۔

وہ واش روم کی کونے والی دیوار سے اپنی پشت ٹکائے نڈھال سے انداز میں فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی تھی، اس کی حالت خاصی نازک تھی۔ کاسپا کو والے حملے کے بعد سے وہ بے چاری زخمی بھی تو خاصی ہوئی تھی۔

''تم ٹھیک ہو ناں...... یاسمین؟'' میں ایک دم اس کی جانب بڑھا۔

"مم...... میں ٹھیک ہوں۔" وہ ہولے سے کپکپاتی آواز میں بولی۔

"انہوں نے مجھے انجکشن کے ذریعے کسی ڈرگ کی ڈوز دے رکھی ہے۔ اس کا اثر چند گھنٹوں تک رہے گا۔"

"ان کا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟ تمہیں پتا ہے؟" میں نے فوراً کام کی بات پوچھی۔ کیونکہ اس وقت کوئی بھی واش روم میں آسکتا تھا اور میں اس سے پہلے یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

"وہ بھی اِدھر ہی کہیں ہے۔"

"عورت ہے، مرد ہے؟"

"مرد ہے، یہی ایک عورت تھی ان تینوں میں۔" یاسمین نے نحیف سی آواز میں جواب دیا۔

"تم فکر نہ کرو، میں سب سنبھال لوں گا۔ ہمیں اس وقت اسی خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی سیٹوں پر جا کے براجمان ہونا پڑے گا۔"

"مم...... میرے پاپا، ان کی قید میں ہیں۔" اس نے بتایا۔

"مجھے معلوم ہے سب...... کہا نا فکر نہ کرو، آؤ...... یہاں زیادہ دیر ٹکے رہنا اچھا نہیں۔" میری بات پر اس کے پژمردہ سے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرا اور پھر میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

دروازے سے ایک ذرا باہر جھانک کر میں نے جھولتے ہوئے دبیز پردے کو ہٹایا اور یاسمین کو لیے باہر آ گیا۔

طیارے کا ماحول خوابناک اور نیم تاریک تھا۔ مسافر سو رہے تھے۔ یہ خاموشی اور سناٹا میرے لیے سودمند تھا۔ میں نے یاسمین کو اس کی سیٹ پر بٹھا دیا اور خود پھرتی سے اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

سب کچھ ویسا ہی رہا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہی ٹھہرا ٹھہرا، پُرلطف و پُرسکون ماحول اور فضا خواب انگیز...... طیارہ اسی طرح آسمان کی تاریک وسعتوں میں محوِ پرواز تھا لیکن میں جانتا تھا، زیادہ دیر ایسا نہیں چلے گا۔ جلد یا بدیر طیارے کی یہ پُرسکون اور خواب انگیز فضا منتشر ہو جائے گی جب واش روم میں دو لاشوں کا پتا چلے گا۔ اس کے بعد ایک ہراس اور بے چینی سی پھیل جائے گی۔

طیارہ پہلے ہی فضائے بسیط کے ناقابلِ اعتبار خلاؤں کے رحم و کرم پر تھا۔ ایسے میں طیارے کے اندر دو لاشوں کا پایا جانا کسی خطرناک گڑبڑ کا ہی پتا دے سکتا تھا اور کیا خبر آگے کیا ہونے والا تھا۔

یہ دیگر مسافروں کے تاثرات تھے جبکہ میرے بھی کم و بیش اسی طرح کے خدشات تھے جن کی نوعیت تھوڑی مختلف سہی، کہ اگر ٹاپ فرسٹ کلاس کے سوئٹ میں فروکش سے جی کوہارا...... جیسے درندے کو اپنے دو ساتھیوں کی ہلاکت کا علم ہو گا تو کیسا طوفان بپا ہو سکتا تھا۔ ردِعمل میں وہ تو کوئی نہ کوئی ایسا فساد کھڑا کر سکتا تھا جس میں طیارے میں موجود مسافروں کی سلامتی داؤ پر لگ سکتی تھی۔ دوسرا خیال میرا یہ تھا کہ کوہارا اپنی اس شکست کو تسلیم کر کے چپ ہو کر بیٹھ رہے گا۔ لیکن اپنی شکست پر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنا اس کا شیوہ نہ تھا۔ وہ کوئی گل ضرور کھلا سکتا تھا اور یوں میرا اس پر نگاہ رکھنا ضروری تھا۔

"تو کیا پھر...... مجھے سے جی کوہارا کو بھی اسی وقت جہنم واصل کر دینا چاہیے؟"

ایک خوف ناک اور سفاک خیال میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں کلبلایا تھا لیکن کیا...... یہ اتنا ہی آسان تھا......؟

اس دوران...... میں یاسمین کی طرف بھی دیکھتا رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی اور کیمی کی سیٹیں اب خالی تھیں۔ ان دونوں کے مسافر (قاہرہ) مصر کی ٹکٹیں کٹوانے کے بعد اب "اوپر" کی ٹکٹیں کٹوا چکے تھے۔ دشمنوں سے بغیر کسی رعایت اور سفاکی سے نمٹنے کا چلن مجھے حالات نے سکھا دیا تھا۔

روڈلف کو بھی تو اسی بے رحمی سے ہلاک کیا گیا تھا۔ اس غریب کا خیال آتے ہی میرا اندر اداس ہو گیا، دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔

روڈلف سے مجھے بڑا سہارا تھا۔ اس کے بغیر میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ ممکن ہے یہ ایک فطری عمل ہو کہ ایک ساتھی کے ساتھ اس قدر انڈراسٹینڈنگ ہو چکی ہو اور پھر وہ اچانک بچھڑ جائے، ہمیشہ کے لیے تو اس طرح کی فیلنگس کا ہونا فطری امر ہوتا ہے، مگر اس میں بھی کوئی مبالغہ نہ تھا کہ روڈلف میری امریکا والی مہم میں کافی مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

ابھی تک یاسمین کے پاس کوہارا کا تیسرا ساتھی نہیں پہنچا تھا۔ مجھے اسی کی تلاش تھی۔ میں یاسمین کو اپنے ساتھ بھی رکھ سکتا تھا مگر ایسا میں نے دانستہ طور پر نہیں کیا تھا۔ یاسمین اگرچہ مجھے دیکھ کر خوش تھی۔ اس کے چہرے کی پژمردگی میں اب کمی آنے لگی تھی۔ وہ یوں بھی ایک بہادر لڑکی تھی لیکن پیش آمدہ، پے در پے خوفناک واقعات نے اسے ضرور نڈھال سا کر دیا تھا۔

اس بے چاری کے لیے سب سے بڑا سانحہ اس کے محبوب منگیتر حماد رضا...... کا بے دردی سے قتل تھا۔ اگرچہ میں نے کاسپا کو کو واصلِ جہنم کر کے نہ صرف اس کے منگیتر کا بلکہ

روڈلف کے قتل کا بھی انتقام لے لیا تھا۔

سفر ابھی پُراندیش لمحات سے جاری ہی تھا کہ اچانک میں نے یاسمین کی طرف ایک درمیانی مگر خوب گُٹھی ہوئی جسامت والے شخص کو بڑھتے دیکھا، وہ اس کی سیٹ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں یک لخت تیز ہوگئیں۔

میں آنکھیں سکیڑ کر بہ غور اس طرف تکے جارہا تھا۔ ابھی وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا، میں نے غور کیا، وہ یاسمین پر جھکا ہوا اس سے کچھ پوچھنے کے سے انداز میں باتیں کررہا تھا اور اس کا رویہ بھی خشک اور تحکمانہ سا محسوس ہوتا تھا۔

تب ہی میں نے یاسمین کو نفی میں سر ہلاتے دیکھا، وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا، جس پر اس کا دوسرا ساتھی تھوڑی دیر پہلے براجمان تھا، اب اس کی لاش واش روم میں پڑی تھی۔

وہ یقیناً اُن کا تیسرا ساتھی تھا اور اب یاسمین سے اپنے دوسرے ساتھی کے بارے میں پوچھ رہا تھا، اس کے بعد میں نے اسے اس سیٹ کی طرف بھی اشارہ کرکے یاسمین سے باتیں کرتے دیکھا، جہاں میں بیٹھی تھی۔

میں نے دیکھا...... یاسمین نے پھر نفی میں سر ہلایا تھا، مجھے کوہارا کا یہ تیسرا گماشتہ سخت فکر مند نظر آیا۔ وہ یاسمین کے ساتھ بیٹھا اس کے بالکل قریب منہ کیے ہلکے ہلکے لہجے میں ''پوچھ گچھ'' کررہا تھا۔

پھر ذرا ہی دیر بعد جب اس کی یاسمین سے یہ پوچھ تاچھ اختتام کو پہنچی تو میں نے اسے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھتے دیکھا، یقینی طور پر یاسمین نے اسے وہی بتایا تھا جس کے بتانے کی ہدایت میں نے اسے کی تھی۔

یاسمین کو سیٹ کی جانب سہارا دے کر لانے کے دوران میں نے اس کے کان میں کہہ دیا تھا کہ اگر ان کا تیسرا ہرکارہ، اس کے پاس آئے، جس کا قوی امکان تھا...... تو اسے یہی بتائے کہ وہ دونوں (ہرکارے) واش روم کی طرف گئے تھے، اپنا ہرگز نہ بتائے کہ وہ اسے لے کر گیا تھا۔ (ایک ہرکارہ)۔

تب ہی یکلخت میری سائیں سائیں کرتی کنپٹیاں دھڑکنیں لگیں۔ وہ تیسرا ہرکارہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور واش روم کی طرف بڑھا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔

اب کسی وقت بھی طیارے کے اندر زبردست ہنگامہ کھڑا ہونے والا تھا۔ اس کی نوعیت کچھ بھی ہوسکتی تھی۔

بہرکیف میں نے متوقع پیش آئند، مخدوش حالات سے نمٹنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کررکھا تھا۔

سے جی کوہارا ابھی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اس طیارے میں موجود تھا، جبکہ اس کا یہ تیسرا ہرکارہ، بقول اسی کے مسلح تھا۔ اس کے پاس گن تھی اور سے جی کوہارا کے پاس تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے گن دیکھی تھی۔

ایک خیال برق رفتاری کے ساتھ میرے ذہن میں آیا تھا کہ اسی وقت عملے کے کسی ذمے دار شخص کو اس کے بارے میں بتادوں۔ لیکن ابھی میں سمجھتا تھا کہ یہ قبل از وقت ہوتا، ممکن تھا اپنی اس ''کمزوری'' کے باعث کوہارا...... ایک طرح سے میرے دباؤ میں رہے گا۔ تاہم میں اس نکتے پر پیہم غور کیے جارہا تھا۔

تیسرے ہرکارے کو واش روم کی طرف بڑھتے دیکھتے ہی میں نے بھی پہلے فوراً اس کے پیچھے جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر خاموشی سے بیٹھا حالات کا منتظر رہا کہ ہوتا کیا ہے......؟

اس وقت طیارے کے تقریباً سب ہی مسافر اونگھ رہے تھے۔ سرِدست کسی کے بھی واش روم جانے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ تاہم اچانک کوئی بھی نیند سے بیدار ہوکر وہاں کا رخ کرسکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں طیارے کی انتظامیہ اور مسافروں کی نظروں میں آجاؤں۔

واش روم میری بیک پر تھا اسی لیے مجھے بار بار پیچھے گردن گھما کر دیکھنا پڑ رہا تھا۔

تیسرا ہرکارہ اپنے دونوں ساتھیوں کی ''تلاش'' میں واش روم میں قدم رکھ چکا تھا اور اسے گئے ہوئے پانچ سے دس منٹ ہوچکے تھے۔

میرا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات اس قیافے سے کوسوں دور تھی کہ اس مذکورہ ہرکارے کو اپنے دونوں ساتھیوں کا سراغ نہ ملا ہوگا۔ میں چشم تصور میں اسے پہلے دہشت زدہ اور پھر خار کھائے کُتے کی طرح غراتے ہوئے دیکھنے لگا، پھر اسے سوچتا ہوا پایا، کوئی بعید نہ تھا کہ وہ وہیں سے ہی اپنے گرو گھنٹال...... کو کسی خفیہ ڈیوائس پر رابطہ کرکے یہ ساری صورتِ حال بتا رہا ہو، تب ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

اگر ایسا ہی تھا تو کوہارا میری تلاش میں غضبناک بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا اپنے سوئٹ سے نکلے گا اور علی الاعلان طیارے میں چلا چلا کر بتائے گا کہ ان کا قاتل میرے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ اس کی کمزوری سے میں بھی واقف ہو چکا تھا۔ تو پھر...... اب کیا ہونے جارہا تھا......؟

یوں ایک ایک لمحہ مجھے ایک صدی کی طرح گزرتا محسوس ہورہا تھا۔

اس تیسرے ہرکارے کو گئے ہوئے بیس سے پچیس منٹ ہو چکے تھے۔ تب ہی اچانک میں نے سامنے ٹاپ فرسٹ کلاس کے دروازے سے کوہارا کو برآمد ہوتے دیکھا۔

میرا دل گھٹے گھٹے سینے میں جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا اور میں نے اپنا سر ذرا نیچے کو جھکا لیا، مگر اس طرح کہ اس پر نظر بھی رکھ سکوں۔ اب کیا ہونے والا تھا، اس کا بھید کھلنے لگا تھا۔

میں نے دیکھا وہ خاصا بپھرا ہوا لیکن کچھ پریشان اور بوکھلایا ہوا سا بھی تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری سیٹ کی طرف ہی لپکے گا لیکن وہ مجھے یکسر نظر انداز کرتا ہوا سیدھا واش روم کی جانب بڑھا تھا۔ میں نے گردن تھوڑی سی موڑی، وہ اندر جا چکا تھا۔ اس سے جیسے میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔

جی میں آئی کہ میں بھی واش روم کا رخ کروں..... تب ہی اچانک میرے ساتھ بیٹھا ہوا درمیانی عمر کا وہ یورپین آدمی غنودگی سے بیدار ہوا۔ اس کے بعد دو تین جماہیاں منہ پھاڑ کے خارج کیں اور اٹھ کر چل دیا واش روم کی طرف..... اس کے برابر کی دوسری سیٹ پر کوئی بوڑھی خاتون بیٹھی آنکھوں پر گدیاں لگائے گہری نیند میں مستغرق تھی۔

اب کیا ہونے لگا تھا.....؟ یہ تجسس میرے لیے سخت اعصاب شکن ثابت ہورہا تھا۔ کیا یہ واش روم کے اندر گھستے ہی شور مچانا شروع کردے گا؟ یا پھر وہاں اسے ''سب کچھ ٹھیک'' دکھایا جائے گا؟ کچھ تو ہوگا..... اس پردہ زنگاری کے پیچھے.....

اس آدمی کو گئے ہوئے بھی کچھ منٹ بیت گئے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر اس کے کچھ ہی سیکنڈوں ... بعد میں نے ..... اپنے ہم نشیں و ہم رکاب کو واش روم سے برآمد ہوتے دیکھا، اس کی صورت میں مجھے کسی قسم کی حواس باختگی یا خوف نظر نہ آیا۔ وہ اسی طرح سپڑ..... سپڑ چلتا ہوا آیا اور میں فوراً اپنی آنکھیں موند کر سوتا ہوا بن گیا۔ وہ اپنی سیٹ پر براجمان ہوتے ہی ''ڈھلک'' گیا۔ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی شاید.....

اب تک سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا مگر سب ٹھیک نہیں تھا۔ طیارے میں سوار پانچ سو پچھتر مسافروں..... میں سے یہ صرف میں جانتا تھا یا یاسمین، بعد میں کوہارا اور اس کا ہرکارہ.....

یکایک میرے ذہن میں ایک زبردست جھماکا ہوا۔ ہنگامے سے پہلے یہ اسرار بھری خاموشی درپردہ کوئی گل کھلانے والی تھی؟ کیا کوہارا اور اس کا ساتھی..... واش روم سے اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کے بندوبست میں مصروف تھے؟ چلو..... ایسا تو ایسا ہی سہی..... میں نے پُرسکون ذہن سے سوچا۔ لیکن وہ دو لاشوں کو کس طرح وہاں سے غائب کرنے والے تھے؟ یہ مجھے دیکھنا تھا۔

کوہارا کی طرف سے کسی شدید ہنگامے کی بھی توقع اپنی جگہ میرے ذہن میں سانپ کی طرح کلبلا رہی تھی۔

کم و بیش نصف گھنٹا بیت چلا اور..... پھر میں نے اُن دونوں کو وہاں سے برآمد ہوتے دیکھا۔ میں فوراً اپنا سر جھکا کر لیٹا ہوا بن گیا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے۔ میرے سر پر کسی نے انگلیوں سے ''ٹھونک'' بجایا۔

میں جاگا ہوا تو تھا ہی چونک کر آنکھ کھولی۔ وہ کوہارا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور چہرہ لال بھبوکا تھا۔

''میرے ساتھ آؤ.....''

''میں نہیں آسکتا۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔ مجھے اس کا یوں حکم دینے کا انداز نہایت ناگوار گزرا تھا۔ ''میں تمہارا زرخرید نہیں ہوں، جاؤ جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھو۔''

آواز میری نیچی تھی، انداز محتاط تھا۔ یہ ہم دونوں کی مجبوری تھی۔ ورنہ مسافر ہماری اس ''سرد جنگ'' کو شبے کی نگاہ سے دیکھ سکتے تھے۔

میری جوابی کارروائی پر وہ اندر سے بہت بُری طرح تلملا کر رہ گیا۔ وہ چند لمحے مجھے بڑی خوں خوار نظروں سے گھورتا رہا۔ ہم دونوں اس وقت طیارے میں ایک دوسرے کے خلاف کھلے بندوں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جو کرنا تھا، درپردہ ہوتا۔

دراصل..... ہم دونوں کی ''گوٹ'' اس وقت پھنسی ہوئی تھی۔ توازن برابر کا تھا لیکن باوصف اس کے میں سمجھ رہا تھا کہ میری گوٹ باہر نکلنے والی تھی اور کوہارا کی پھنس گئی تھی۔ وہ اب جمشید حمیدی کو زیادہ دیر تک یرغمال بنائے رکھنے کی پوزیشن سے خارج ہو چکا تھا۔ لیکن یہ بات جمشید کو کب معلوم تھی بھلا.....؟ وہ تو بے چارہ ابھی تک یہی سمجھ رہا ہوگا کہ اس کی بیٹی یاسمین خانم ہنوز اس کے خونخوار ساتھیوں کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ہے جس کے بارے میں کوہارا نے جمشید کو دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر اس نے تعاون نہ کیا تو نہایت خاموشی سے اس کی بیٹی کو موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔ لیکن..... اب صورتِ حال اور ہو گئی تھی۔

''ہم.....'' وہ اپنے حلق سے ایک غضبناک سی ہمکاری

خارج کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کی ''ہم'' میں مجھے ایک تہدیدی سی چھپی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے کوئی پروا نہیں کی۔

سر گھما کر میں نے یاسمین کی طرف دیکھا اور چونک پڑا۔ کوہارا کا ساتھی اسے اپنے ساتھ کہیں لے جانے پر بضد تھا جبکہ کوہارا بزنس کلاس کی جانب بڑھ چکا تھا۔

میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور یاسمین خانم کی سیٹ کی جانب لپکا۔ ہنگامے کی شروعات اگرچہ ابھی ایک خاموشی کے پردے میں تھی، تاہم کسی بھی وقت یہ پردہ چاک ہوسکتا تھا۔

''یہ کہیں نہیں جائے گی۔'' میں نے کوہارا کے ساتھی سے زہریلے مگر دبنگ لہجے میں کہا۔ وہ میری طرف دیکھ کر چونکا۔ ''اس کا بازو چھوڑ دو...... ورنہ میں تمہارا اور تمہارے باس کوہارا کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں، تم دونوں کے پاس آتشیں ہتھیار ہے۔''

وہ ہک دک رہ گیا اور یاسمین کا بازو چھوڑ کر یوں پیچھے ہٹ گیا جیسے کرنٹ لگا ہو اُسے۔ پھر اس نے بھی بزنس کلاس کا رخ کیا۔ میں یاسمین کے ساتھ والی خالی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

''اب تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے یاسمین کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اگلے چند منٹوں میں حالات میرے قابو میں آنے والے ہیں۔''

''لل...... لیکن، شہزی! میرے پاپا اس درندے کی قید میں ہیں۔ وہ طیش میں آکر انہیں کسی قسم کا جانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

یاسمین نے خدشہ ظاہر کیا۔ اس کی حالت اور کیفیات اب دھیرے دھیرے بحال ہونے لگی تھی۔

''اس خدشے پر میں نے غور کیا ہے۔'' میں نے سامنے ٹاپ فرسٹ کلاس کے ڈور کی طرف نظریں جمائے ہوئے اس سے کہا۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے کوہارا ایک بپھرے ہوئے درندے کی طرح داخل ہوا تھا۔

''کوہارا، اب پروفیسر صاحب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ بھی مت سمجھو کہ وہ کوہارا کی قید میں ہیں۔ ہاں! اس کی حراست میں ضرور ہیں، وہ بھی ایک حد تک، اس موذی نے تم دونوں باپ بیٹی کے گرد جو غیر مرئی حصار قائم کر رکھا تھا وہ اب ٹوٹ چکا ہے۔''

میری اس بات سے یاسمین کی کچھ تشفی ہوئی اور کچھ نہیں۔ تاہم وہ بولی۔ ''لیکن شہزی! کوہارا جیسے خونی آدمی سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ بہرحال ابھی تک پاپا کے سر پر مسلط ہے۔''

''اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا کہا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''لیکن میں نے اس طرح اس کے تحکمانہ انداز پر اس کے پیچھے غلاموں کی طرح جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اب اس کے پاس جانے کا سوچ رہا ہوں۔ تم ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر تمہیں اکیلا دیکھ کر اس کا ساتھی دوبارہ تمہیں ساتھ لے جانے پر مجبور کرے تو ہرگز اس کے ساتھ مت جانا، یہ دونوں اب تمہارے ساتھ کسی بھی قسم کی زبردستی کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے ہیں۔''

میں نے آخر میں اسے تاکید کرنا ضروری خیال کیا تھا۔

تب ہی اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا، میں نے یاسمین سے سوال کیا۔

''تمہارے سفری کاغذات تو تمہارے پاس ہی ہیں ناں......؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ کر اپنی بھویں سکیڑیں پھر اسی انداز میں بولا۔

''ہم! اس کا مطلب ہے، اس نے پوری طرح تمہیں یرغمال بنا رکھا ہے۔''

''شہزی، انہوں نے ان دونوں لاشوں کا کیا کیا ہوگا؟ میرا مطلب ہے اگر دونوں لاشیں ابھی تک وہیں پڑی ہیں تو پھر کسی وقت بھی کسی مسافر کی نظر میں آسکتی ہیں۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں...... ایک دم ہراس پھیل جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''تب پھر میرا خیال ہے، ابھی تم اس کے پاس مت جاؤ، یہاں کسی وقت بھی شور مچ سکتا ہے۔ ایسے میں تمہارا اس کے پاس ہونا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔''

اس کی بات میں وزن تھا، میں نے کہا۔ ''میں اسی لیے خاموش بیٹھا ہوں لیکن مجھے جلد یا بدیر کوہارا سے بات کرنی پڑے گی، وہ جتنا اپنی فطرت میں ایک درندہ صفت انسان ہے اتنا ہی عقل سے پیدل بھی، گھمنڈ میں آکر وہ اپنے راز میرے سامنے عیاں کرنے سے ذرا نہیں چوکتا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ... لاشوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک زوردار نسوانی چیخ نے طیارے کا خوابناک ماحول درہم برہم کر ڈالا۔ ہم دونوں ہی چونک پڑے تھے۔

☆☆☆

اس چیخ سے طیارے کا سکون تہس نہس ہو گیا تھا۔ اونگھتے اور سوئے ہوئے مسافر ہڑبڑا کر اٹھے۔ یاسمین اور میں

نے بھی چونک کر چیخ کی سمت دیکھا۔ لائٹیں آن ہونے لگیں۔

چیخ مارنے والی ایک درمیانی عمر کی لڑکی تھی۔ وہ غالباً واش روم گئی تھی اور اس نے لاشیں دیکھ لی ہوں گی۔ شاید کوہارا اور اس کا ساتھی لاشوں کو ٹھکانے نہیں لگا سکے تھے اور بھلا لگاتے بھی کیسے؟ مگر پھر یہ اتنی دیر تک اندر کیا کرتے رہے تھے؟

مسافر اس چیخ کا معما جاننے کے لیے اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھنے لگے۔ جہاز کا عملہ بھی حرکت میں آچکا تھا اور مسافروں سے التماس کر رہا تھا کہ وہ پُرسکون رہیں اور اپنی سیٹوں پر براجمان ہو جائیں۔ میں اور یاسمین بھی دکھاوے کے طور پر تھوڑا پریشان ہوئے مگر اپنی سیٹوں پر موجود رہے۔ دیکھنا تھا کہ اب ہوتا کیا ہے؟

ایک اسٹیورڈ کاک پٹ میں جا کے کیپٹن کو بلا لایا تھا، وہ اپنی وردی سے کو پائلٹ نظر آتا تھا۔ اس نے واش روم جا کر صورتِ حال، بہ الفاظ دیگر لاشوں کا جائزہ لیا اور دوبارہ نمودار ہو کر تیز تیز قدموں سے کاک پٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ شاید اپنے ساتھی ہواباز کو اس کی اطلاع دینے گیا تھا۔ دو ائر ہوسٹس بھی کاک پٹ کی طرف بڑھی تھیں۔

ٹوائلٹ میں دو لاشوں کی خبر پھیلتے ہی...... طیارے میں اچھا خاصا ہراس پھیل گیا تھا۔ کچھ جذباتی مسافروں نے طیارے کے عملے سے احتجاج کیا تھا کہ طیارے میں ایک سے زائد قاتل موجود ہیں اور وہ جہاز کو ہائی جیک بھی کر سکتے ہیں، لہٰذا جہاز کو فوراً کسی ائرپورٹ پر اتار کے پولیس تفتیش کی جائے۔ دیگر مسافر بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

جہاز کا عملہ بدستور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ تھوڑی دیر بعد پائلٹ نے بھی خود واش روم جا کر جائزہ لیا تھا اور پھر اس سلسلے میں فوری اقدامات کرنے کے لیے دوبارہ کاک پٹ کی طرف لپکا تھا۔

اسی وقت اسپیکر سے اعلان کیا گیا۔

اس اعلان کا لُبِ لباب یہی تھا کہ تمام مسافر جہاز کے عملے سے تعاون کریں اور اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائیں، موجودہ صورتِ حال کو فیس کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، نیز اس وقت ہم تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے تھے۔ پانچ گھنٹوں کا سفر بیت چکا تھا اب ڈھائی گھنٹے بعد ہم دبئی انٹرنیشنل ائرپورٹ پر لینڈ کریں گے۔ وہاں انٹرپول پولیس سے رابطہ کیا جارہا ہے۔ امید ہے حالات بہتر ہو جائیں گے، شکریہ۔

اس اعلان کا الٹا اثر ہوا۔ مسافروں میں بے چینی پھیل گئی۔ ایک ادھیڑ عمر کی دبنگ سی یورشین خاتون نے چیخ کر اس اعلان کو طفلِ تسلی قرار دیتے ہوئے اس بات کا شور مچایا کہ ان ڈھائی گھنٹوں میں وہ قاتل اس جہاز کو کسی کھلونے کی طرح ہائی جیک کر سکتے ہیں، لہٰذا...... اس نے مطالبہ کیا کہ طیارے کو فوراً کسی قریبی ملک کے ائرپورٹ پر ایمرجنسی لینڈنگ کر کے تحقیق کرائی جائے۔ ضرور ان نامعلوم قاتلوں کے پاس اسلحہ بھی ہوگا۔

اس کی بات غلط نہ تھی۔ یوں بھی طیارے کے تمام مسافروں کی سوئی ایک ہی خدشے پر اٹک کر رہ گئی تھی اور وہ تھی، "ہائی جیکنگ" نامعلوم قاتل پکڑے جانے کے خوف سے طیارے کے مسافروں کو یرغمال بنا کر فرار کی راہ اختیار کر سکتے تھے۔ اس پر عملے کے ایک سنیئر افسر نے اس عورت کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ ایسے الفاظ منہ سے مت نکالے جو اُن نامعلوم قاتل یا قاتلوں کو کسی قسم کی "شہہ" دیتے ہوں۔ اس کی بات کی اور مسافروں نے بھی تائید کی تھی مگر بہرحال طیارے میں بے چینی پھیل چکی تھی۔

مجھے خدشہ تھا کہ کہیں مسافروں کے دباؤ کی وجہ سے طیارے کو دبئی سے پہلے نہ کسی ملک میں اتار لیں۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس وقت ہم انڈیا یا پاکستان کی فضائی حدود سے گزر رہے تھے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین......!"

اچانک طیارے میں یہ اعلانیہ آواز ابھری۔ بے چین اور پریشان مسافروں کی بھنبھناہٹ یک دم تھم کر رہ گئی۔

اس آواز کو پہچان کر یکلخت جیسے میں سکتے میں آگیا۔ یہ سے جی کوہارا کی آواز تھی۔

"طیارے کا کنٹرول ہم نے سنبھال لیا ہے۔ آپ سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر آرام سے بیٹھ جائیں۔ عملے کے اراکین کو بھی میں یہی تلقین کرتا ہوں۔ ہمارے خلاف کسی قسم کی بھی غلط حرکت آپ سب کی سلامتی کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ سب ٹھیک رہے گا جب تک آپ کا تعاون رہے گا، میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔"

اس اعلان کے بعد ہی مسافروں کی دبی دبی چیخیں سنائی دیں۔ یاسمین نے سراسیمہ سے انداز میں فقط میرا بازو دھیرے سے پکڑ کر دبایا تھا جبکہ میں خود اس موذی مردود...... سے جی کوہارا کی آواز پہچانتے ہی اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کوہارا کے پاس شاید اپنے بچاؤ کا اور کوئی راستہ نہ رہا تھا۔ میں نے اس کا وہ خطرناک کھیل طیارے میں

ہی بگاڑ کر رکھ دیا تھا جو وہ خاموشی کے پردے میں کھیلنے کی کوشش کررہا تھا۔

اس یورشین خاتون کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا اور میرا بھی...... مجھے کوہارا کے خلاف پہلے ہی کوئی کارروائی کرلینی چاہیے تھی، لیکن ایسا میں نے دانستہ طور پر نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہی تھی کہ یوں میرے لیے بھی کئی خطرات اور پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی تھیں۔ مجھے بھی اسی کا ساتھی سمجھا جاتا۔ اب جو یہ ''پیچ'' کوہارا نے تیار کی تھی، اس پر میں کھیل سکتا تھا۔

کوہارا کاک پٹ میں جاچکا تھا اور...... ضرور اس نے پائلٹس کو گن پوائنٹ پر لے لیا تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی...... بھی اندر ہی کہیں موجود اسے کور دیے ہوئے ہوگا یا پھر ممکن تھا اسے کوہارا نے ہی اندر اپنے سوئٹ میں پروفیسر جمشید کے سر پر مسلط کررکھا ہو۔

مجھے کوہارا کے اس اقدام پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ محض اپنے ایک ساتھی کے بل بوتے پر اتنے بڑے طیارے کو کیسے ہائی جیک کرنے کی جرأت کرسکتا تھا؟

''دشش...... شہزی! اب کیا ہوگا؟ اس بدبخت نے وہی کیا جس کا مجھے بھی ڈر تھا۔'' یاسمین نے سرگوشی میں کہا۔

''ابھی خاموش رہو، میں دیکھتا ہوں کہ آگے کیا ہوتا ہے؟''

''مسٹر شہزی......!''

دفعتاً اس مردود کی دوبارہ اسپیکر پر آواز ابھری اور میرا دل یک دم اچھل کر حلق میں آن اٹکا اور اعصاب شل ہونے لگے۔

''تم اپنی سیٹ چھوڑ کر کاک پٹ میں پہنچو...... فوراً......'' کوہارا کی تحکمانہ آواز ابھری اور ڈرے سہمے مسافر حیران و پریشان ہوکے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے جبکہ میں دھڑکتے دل سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ میں اس خبیث کے حکم پر تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کا یوں مجھ سے شناسائی ظاہر کرنے کا مطلب یہی تھا کہ میں بھی اس کا ساتھی ہوں۔ یہ اس کی مجھے اپنے ساتھ پھنسانے کی سازش بھی ہوسکتی تھی۔

یاسمین نے دوبارہ مجھ سے گھبرا کے سرگوشی میں کہا تھا مگر میں نے اسے پھر خاموش رہنے کی سختی سے تاکید کرڈالی۔ میرا ذہن اس وقت موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیزی سے تانے بانے بُننے میں مصروف تھا۔ کوہارا اس وقت شکست خوردہ ہوچکا تھا۔ اس بری وحشی نے ایسے میں ایک خطرناک قدم اٹھالیا تھا۔

اسپیکر پر دوبارہ اس رذیل کی آواز ابھری۔

''شہزی! یہ مت سمجھنا کہ تم بچ جاؤ گے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے دو ساتھیوں کے قاتل تم ہی ہو۔ جن کی لاشیں واش روم سے ملی ہیں۔ میں پھر تمہیں وارن کرتا ہوں کہ اپنی سیٹ چھوڑ کر فوراً کاک پٹ میں پہنچو۔'' یہ اعلان کرتے ہوئے اس خبیث نے نہایت مکاری سے دیگر مسافروں کو بھی میرے خلاف اُکسانے کی خاطر، میرا پورا نام اور سیٹ نمبر بھی بتادیا۔

ڈرے سہمے مسافر ایک دم اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میری سیٹ کی طرف تکنے لگے۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا، میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ میں خود کو چور اور مجرم سمجھنے لگا۔ ایک خجالت کا سا شکار ہونے لگا تھا میں......

تب ہی مجھے اپنی سیٹ سے اٹھنا پڑا۔ چند مسافروں کے حلق سے دبی دبی آوازوں کی بھنبھناہٹ خارج ہوئی تھی۔ میں ابھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا، مسافر حیرت اور سراسیمہ سی نظروں سے میری جانب تکنے لگے۔ میں نے کوہارا کی اس چال کا توڑ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا اِدھر اُدھر مسافروں کی طرف گردن موڑ کر کہا۔

''یہ آدمی جو اسپیکر پر ہم سے مخاطب ہے ایک خطرناک کریمنل ہے۔ اس کا نام سے جی کوہارا ہے اور یہ ایک برمی باشندہ ہے۔ میں اس کا ساتھی نہیں بلکہ دشمن ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے یہ شخص ٹاپ فرسٹ کلاس کے سوئٹ نمبر تھری اے میں موجود تھا جو پروفیسر جمشید کے نام سے ریزروڈ ہے۔ جسے اس نے اپنے ایک مجرمانہ مقصد کے لیے یرغمال بنا رکھا ہے جبکہ اس کی بیٹی کو اس کے انہی دو کریمنل ساتھیوں نے یرغمال بنا رکھا تھا، جن کی لاشیں واش روم سے ملی ہیں۔ ان کے پاس خطرناک ہتھیار تھے۔ اب بھی اس کا ایک ساتھی کوہارا کے ساتھ موجود ہوگا۔ یہ مجھے محض بلیک میل کررہا ہے۔ آپ نے اس کا اندازِ تخاطب ملاحظہ کرلیا ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوں، میں اس خطرناک صورتِ حال پر اور اس کریمنل پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اتنی تقریر کرکے میں کاک پٹ کی جانب بڑھ گیا۔

فضائی میزبان خواتین، شیشے کے کیبن والی اپنی نشستوں تک محدود تھیں۔ میں کاک پٹ کا دروازہ دھیرے سے دھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔

سامنے ہی مجھے طیارے کی بڑی سی اسکرین دکھائی دی تھی جس کے پار فضائے بسیط کا تاریک آسمان میرے جیسے نئے نظارہ کرنے والے کے حواسوں پر ایک عجیب سی ہیبت طاری کررہا تھا۔ اندر دو پائلٹ اپنی سیٹوں پر محبوس ہوکر بیٹھے

ہوئے تھے۔ ان کے سامنے جہازی سائز کا پینل پھیلا ہوا تھا۔ اَن گنت ڈائل اور چھوٹی بڑی اسکرینز روشن تھیں۔

کوہارا اور اس کا ساتھی ہاتھوں میں گنز تھامے ان کے سر پر ملک الموت کی طرح مسلط تھے۔

پائلٹ دونوں امریکی نظر آرہے تھے۔ ان دونوں میں ایک اپنی وردی سے کیپٹن نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس، پچاس کے ہی لگ بھگ تھی جبکہ اس کا ساتھی پائلٹ نسبتاً جوان نظر آتا تھا۔ اس وقت وہ دونوں دباؤ کی کیفیات میں مبتلا دکھائی دیتے تھے۔ ان کی ٹانگیں نشستوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ ہاتھ البتہ آزاد رکھے گئے تھے۔ ظاہر ہے پھر وہ طیارے کو کنٹرول کرنے سے قاصر رہتے۔

میں نے کوہارا کی طرف جلتی سلگتی نظروں سے گھورا، جبکہ اس نے بھی مجھ پر اپنی اکلوتی آنکھ سے زہریلی نظر جما رکھی تھی۔ اس نے کاک پٹ کا ائرٹائٹ دروازہ لاک کر دیا اور زہرخند لہجے میں بولا۔

''تم نے میری نصیحت بھلا کر بڑی بھیانک غلطی کی ہے شہزی! اب اس کا خمیازہ تم سمیت جہاز کے سارے مسافروں کو بھگتنا پڑے گا۔'' اس نے مجھ سے ایک ایک لفظ چبا کر کہا تو میں بھی اس سے مرعوب ہوئے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''وہ تمہاری نصیحت نہیں بلکہ دھمکی تھی کیونکہ میں اس طیارے میں تمہاری موجودگی کے مجرمانہ مقصد سے آگاہ ہوچکا تھا۔ تم نے بیک وقت دو افراد کو یرغمال بنا رکھا تھا۔''

ہماری گفتگو وہ دونوں پائلٹ بھی غور سے سن رہے تھے۔ ان کے بشروں پر ہنوز پریشانی اور تشویش پائی جاتی تھی۔

''ہا..... ! اپنی یہ بکواس بند کرو.....'' کوہارا طیش میں آکر دہاڑا۔ ''اب جو میں تمہیں حکم دوں گا، اس کی تم نے بلاچوں وچرا... تعمیل کرنا ہوگی۔''

''میں تمہارے کسی مجرمانہ مقصد میں تعاون نہیں کر سکتا۔'' میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''لیکن..... یہ سب جو تم کر رہے ہو، وہ تمہارے لیے بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''اچھا..... کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں۔'' وہ دہاڑا۔ ''یہاں..... اس جگہ پر خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔'' اس نے گن کی نال کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایک چھوٹی سے اضافی فولڈنگ نشست تھی، جو کاک پٹ کے ایک کونے میں کو پائلٹ کی نشست کے ساتھ جڑی تھی۔

میں خاموشی سے وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا۔

وہ چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا۔ اس نے اپنی گن ایک طرف لٹکائی اور جیب سے رسی نکال کر میرے دونوں ہاتھ پینل کے ایک فولادی ہک کے ساتھ باندھنے لگا، اس دوران میں کوہارا کی خوفناک نظر میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ اس نے گن کا رخ میری جانب کر دیا تھا۔ اس کے تیور خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ وہ اس وقت غیظ اور وحشت میں کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میرے ہاتھ پاؤں رسن بستہ ہوگئے تو پھر کوہارا طیارے میں بڑا کشت وخون مچا ڈالے گا۔ کون اسے روکتا؟ لہٰذا میں بظاہر بےبسی کا انداز ظاہر کرتا رہا۔ پھر جب اس کے ساتھی نے رسی کو ایک ہی بل دینا چاہا تھا کہ میرے وجود میں بجلی بھر گئی۔

میں نے مثل پارہ حرکت کی اور میری ٹانگ اس کے سینے پر پڑی، وہ الٹا اور لڑکھڑا کر کوہارا سے جاٹکرایا۔ کوہارا کی گن کا رخ بدلا اور اسی سے بوکھلاہٹ یا بدحواسی میں اس نے ٹریگر دبا دیا۔ کاک پٹ کے محدود ماحول میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی جو طیارے کی دیوہیکل اسکرین پر پڑی۔ اس پر ایک جانب لکیروں کا جال سا بن گیا اور سوراخ بھی ہوگیا۔ جہاں سے تیز طوفانی ہواؤں جیسا عفریت اندر داخل ہوا اور طیارے کا بیلنس آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگا۔ ساتھ ہی کاک پٹ میں ائر پریشر الارم کی مخصوص بپ..... بپ..... ابھرنے لگی۔

طیارے میں موجود مسافر بھی ضرور پریشان اور ہراساں ہو گئے ہوں گے۔ دروازہ ائرٹائٹ تھا اسی لیے مسافروں کے شور شرابے کی آواز نہیں آرہی تھی، پھر ایک اور بپ کی آواز ابھری۔ کاک پٹ کے دروازے کی پیشانی پر لگا سرخ بلب جلنے بجھنے لگا۔ شاید کوئی باہر سے دروازے پر زور آزمائی کر رہا تھا۔

ادھر کوہارا نے سنبھلنے کی کوشش میں ایک ہاتھ سے سیٹ کا سہارا لیا تھا، لیکن میں نے اس پر ہیمر پنچ کا خطرناک داؤ آزماتے ہوئے اس کی کنپٹی پر ضرب لگائی، یہ میرا وہی داؤ تھا جسے میں ایسے نازک وقت میں استعمال کرتا تھا جب مجھے فوری طور پر مدِمقابل کو پچھاڑنا ہو۔

پھر یوں ہوا کہ جیسے سب کچھ، فوری نتائج جاننے کے لیے ہماری پھیلی ہوئی آنکھوں نے سلوموشن میں یہ منظر دیکھا۔ حتمی نتائج دینے والا یہ ہیمر پنچ..... سے جی کوہارا کی کنپٹی پر لگا، ایک پنچا چھوٹا۔ کوہارا کو جھٹکا لگا، وہ لڑکھڑایا، کاک

پٹ کی دیوار سے ٹکرایا، گن اس کے ہاتھ سے چھوٹی، وہ خود بھی گرا، اپنے اس ساتھی کے قریب جو میری ضرب کھا کے گرا تھا اور اب اپنی گن اچکنے کے لیے حرکت پذیر ہو چکا تھا...... ادھر کوہارا گرتے ہی ساکت ہو گیا تھا۔

اس کا ساتھی اپنی گن اٹھانے کے لیے کاک پٹ کے فرش پر کرولنگ کر رہا تھا اور تب تک وہ پہنچ بھی چکا تھا، میرا دھیان اس سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہٹا تھا کیونکہ کوہارا پر وار کرنے کے فوراً بعد ہی مجھے اس کا بھی ''بندوبست'' کرنا تھا۔

وہ گن ہاتھ میں لیتے ہی میرا نشانہ لینے کی کوشش میں تھا، لیکن کوہارا اس کے قریب ہی گرا تھا اور وہ گن اس کے بھاری بھرکم وجود کے نیچے دب سی گئی تھی۔ وہ اسے نکالنے کی تگ ودو میں تھا، میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹا۔ میرے ایک ہاتھ کا شکنجہ اس کی گردن پر کس گیا۔

وہ دونوں پائلٹ آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے، یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت ایک چونکا دینے والا عمل وقوع پذیر ہوا۔ کوہارا کا ساتھی بدستور فرش پر تھا اور اس کی گردن کو کسنے کے لیے مجھے جھکنا پڑا تھا، یوں میرا چہرہ زمین پر پڑے کوہارا کے رُوبرو تھا۔ دفعتاً ہی اس کے بے جان وجود میں حرکت ہوئی۔

اس نے دو تین بار اپنے سر کو جھٹکا دیا اور ہوش میں آنے لگا، اس کا ساتھی بھی تڑپا اور میری توجہ کوہارا پر مرکوز تھی۔ یوں وہ اپنی گردن میرے شکنجے سے چھڑا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا، میں نے کوہارا کے سر کی ٹکر مارنا چاہی۔ مگر پل کے پل اس نے حرکت کی اور اس کی ٹانگ میرے پیٹ پر لگی۔ میں پیچھے کو اچھل کر کو پائلٹ کی سیٹ سے ٹکرا کر گرا۔

کوہارا کسی ہولناک درندے کی طرح جیسے دوبارہ نیند سے بیدار ہوا تھا۔ وہ بدبخت میرا خطرناک ... داؤ سہہ گیا تھا، کیونکہ وہ گینڈے جیسی جسامت اور بھینسے کی سی طاقت رکھتا تھا۔

گنیں ان کے پاس ہی پڑی تھیں، جنہیں دونوں نے ہی بڑی چابک دستی سے اچک لیا تھا۔

''بس......شہزی! تمہارا کھیل ختم ہوا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھ پر گن تان لی۔ وہ اب بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے سر کو جھٹک رہا تھا، میرے مخصوص گھونسے کے ... زیر اثر وہ اب بھی تھا۔ اس کے ساتھی نے بھی اپنی گن کی نال کا رخ میری جانب کر رکھا تھا۔

میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے رہ گیا۔

☆☆☆

طیارے کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ دونوں پائلٹ بڑی مشکلوں سے آسمان کی بلندیوں میں تیرتے ڈولتے اس دیوہیکل آہنی پرندے کو سنبھالے ہوئے تھے۔

کوہارا نے مائک جھپٹا اور مسافروں سے ایک بار پھر مخاطب ہو کے انہیں دھمکیاں دیں کہ وہ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہیں، اگر کوئی اپنی سیٹ سے کھڑا ہوا ملا، اسے بلا دیر شوٹ کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد کاک پٹ کی پیشانی پر جلتا بجھتا بلب اور الارم بند ہو گیا۔

''کیپٹن! طیارے کی اس تڑخی ہوئی ونڈ شیلڈ کا کچھ ایمرجنسی بندوبست کرو...... اس کا تدارک کیسے ہوگا؟'' میں نے کیپٹن سے کہا۔

''اس کا فوری تدارک بے حد ضروری ہے۔'' کیپٹن نے ایک کڑوی سی نظر کوہارا پر ڈالتے ہوئے میری جانب دیکھ کر جواب دیا۔ ''اس کے لیے میری ٹانگوں کا آزاد ہونا ضروری ہے۔''

''کوہارا......! طیارے کی اس ایمرجنسی پر قابو پانا ضروری ہے۔ اس کی رسیاں کھول دو تاکہ یہ اپنا کام نمٹا سکے۔'' میں نے کوہارا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا بندوبست کر سکتے ہو تم؟ لیکن کوئی چالاکی نہیں ہو گی۔'' کوہارا نے کیپٹن پائلٹ کی طرف دیکھ کر تہدید کی۔

''طیارے کی اسکرین ہائی ایلومینیٹڈ میٹل کی بنی ہوئی ہے۔ یعنی ٹوٹنے کی صورت میں اس کی کرچیاں نہیں بکھرتیں، البتہ زیادہ پریشر سے اس میں سوراخ ہو جاتا ہے۔'' کیپٹن بتانے لگا۔ ''ایمرجنسی طور پر اس کا سدِ باب ''پین'' (pane) کی صورت میں کرنا پڑتا ہے۔ میرے پاس ایک سنگل گلاس اسٹیکر پیپر شیٹ موجود ہے۔ وہ اس سوراخ پر چسپاں ... کرنا ہوگی۔''

''جلدی کرو...... پھر۔'' کوہارا نے کہا اور ساتھ ہی اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کیپٹن کو ...... گن پوائنٹ پر لیتے ہوئے اس کے جکڑ بند کھول دیے۔ اس کے...... بعد کیپٹن نے ایک بٹن پش کیا۔ ایک خانہ شق ہوا اس کے اندر سے اس نے ایک چوڑا سا رول نکالا اور پھر ایک بڑا...... ٹکڑا کاٹ کر ونڈ شیلڈ پر چسپاں کر دیا۔

طوفانی ہوا کی سنسناہٹیں اور دباؤ، شور ایک دم تھم سا گیا۔

اپنا کام نمٹا کر جب وہ اپنی چیئر پر بیٹھا اور کوہارا کے ساتھی نے دوبارہ اس کی ٹانگیں سیٹ کے آہنی پایوں سے باندھ دیں تو وہ قدرے چلا کر بولا۔

''میں طیارے کو زیادہ دیر سنبھالنے سے قاصر ہوں، اسکرین ڈیمج ہو چکی ہے۔ فیول بھی ختم ہونے لگا ہے۔ اسے دبئی ائرپورٹ پر اتارنا ناگزیر ہو گیا ہے۔''

کوہارا نے غصے سے دانت پیس کر اپنی گن کا بٹ اس کی پیشانی پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے شدتِ تکلیف کے سبب چیخ نکل گئی۔ پیشانی پھٹی اور وہاں سے خون رسنے لگا۔

''اپنی بکواس بند کرو اور جو حکم دیا گیا وہی کرو جلدی.....'' کوہارا نے گرج کے کہا۔ اس وقت وہ ایک خطرناک وحشی درندے کے روپ میں نظر آ رہا تھا۔ جسے کسی کی تو کیا اپنی بھی پروا نہ ہو۔

پتا نہیں اس بدبخت نے کیپٹن کو کیا حکم دے رکھا تھا۔ کیپٹن سیٹ سے ڈھلک گیا اور کراہتے ہوئے دوبارہ سنبھلا۔ رومال نکال کر اپنی زخمی پیشانی پر رکھتے ہوئے زخم سہلانے لگا۔

''تم پاگل ہو گئے ہو..... کوہارا..... ! مت بھولو کہ اس طرح تمہاری اپنی جان بھی خطرے میں ہے۔ پائلٹ سب جانتا ہے کہ کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔'' میں نے تیز لہجے میں کوہارا سے کہا۔ وہ زہر خند ہنسی کے ساتھ بولا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس بڈھے کیپٹن کی چالاکی نہیں سمجھ رہا؟ یہ اب تک کوڈ ورڈز میں انٹرپول اور ائر ٹریفک کنٹرول والوں کو کمانڈو ایکشن کے لیے اشارہ دے چکا ہوگا۔ میں اس کی چالاکی میں نہیں آنے والا۔ میری جان جاتی ہے تو جائے، مگر میں اپنے ساتھ سارے مسافروں کو لے کر مروں گا، اس لیے جو میں کہہ رہا ہوں، وہی ہونا چاہیے، بس! اب تم سمجھاؤ اس بڈھے کو..... ورنہ اس نے دوبارہ فضول بکواس کی تو اس کا برا حشر کروں گا۔''

میں نے دیکھا کوہارا کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ جو وہ کہہ رہا تھا کر گزرنا بھی جانتا تھا۔ میرا ایک عرصے سے اس سے ٹاکرا رہ چکا تھا، ایسے وقت میں جب خود اس کی اپنی بھی جان پر بنی ہوئی ہو، وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر ڈوبتا تھا۔

''تم.....'' کوہارا نے مجھ سے یہ کہنے کے بعد اپنے بری ساتھی سے تحکمانہ کہا۔ ''باہر جاؤ اور سب کو اپنی اپنی جگہ محبوس رہنے کی تاکید کرو، جو نخرے کرے بلاضرورت سوال کرے اسے بے دریغ گولی سے اڑا دو.....''

''یس باس.....!'' وہ کہتے ہوئے پلٹنے لگا۔ کوہارا نے دوبارہ کہا۔

''سنو.....'' وہ رک گیا۔

''اس لڑکی یاسمین پر اور اس کے باپ پر بھی نظر رکھو۔ جب تک میں نہ بلاؤں اندر مت آنا اور محتاط رہنا، کسی رعایت سے کام مت لینا۔''

وہ ہرکارہ کاک پٹ کا دروازہ کھول کر محتاط انداز میں باہر نکل گیا۔

اب اندر میں اور کوہارا تھے۔ کوہارا نے مجھے اسی مذکورہ سیٹ پر اس دھمکی کے ساتھ بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر اس بار میں نے کوئی ..... غلط حرکت کی تو وہ اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ کر کے کاک پٹ کو تباہ کر دے گا۔ میں جانتا تھا کہ یہ اس کی دھمکی خالی خولی نہیں تھی۔ وہ اس وقت ایک ایسا شکست خوردہ اور جنونی ہو رہا تھا کہ ہر صورت آر یا پار کر دیتا۔

''کیپٹن! تم کیا گونگے بہرے ہو گئے ہو.....؟'' کوہارا دہاڑا۔

کیپٹن جرأت مند انسان تھا، بولا۔ ''دبئی کی فضائی حدود میں ہم داخل ہو چکے ہیں۔ جیسا تم چاہ رہے ہو، وہ اب ممکن نہیں رہا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر.....'' کوہارا سنسناتے لہجے میں بولا۔ ''ایسے ہی رہو۔ میں تو اپنے سر پہ کفن باندھ چکا ہوں۔ میرا عظیم دشمن بھی اِدھر ہی ہے۔ سب میرے ساتھ ہی مرو، سے جی کوہارا کے لیے ایسے سودے گھاٹے کے نہیں ہوتے۔'' یہ کہہ کر وہ جنونی انداز میں قہقہے لگانے لگا۔

''کیپٹن! جو یہ کہہ رہا ہے اس پر عمل کرو.....'' میں کیپٹن کی ہمت دھری پر چیخا۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔ تم ایک انسان کی خاطر کئی لوگوں کی جانیں داؤ پر نہیں لگا سکتے۔''

کیپٹن نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا ایک روایتی بلف کھیلنا چاہا تھا۔ جو ناکام گیا تھا۔ لہٰذا اس نے مائیک پر پہلے ''مے ڈے..... مے ڈے.....'' دہرایا اور پھر طیارے کی ہائی جیکنگ کا بتایا۔ اس کے بعد فوری طور پر جب اس نے ائر کنٹرول ٹریفک کو فیول کے سلسلے میں جو کہا، اسے سن کر میں بوکھلا سا گیا۔

کوہارا اس وقت واقعی جنونی ہو رہا تھا۔ ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر ایک خطرناک مذاق کرنا چاہتا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا؟

''کوہارا..... ! یہ تم نے کیسا حکم جاری کروایا ہے؟ کیا یہ ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسرا طیارہ جو فیول ٹینکر ہو اور وہ دورانِ پرواز ہمارے طیارے میں فیول منتقل کرے؟''

"ہاہا...... ہاہا......! سب ممکن ہے کوہارا کے آگے، تم دیکھتے جاؤ یہ سب کیسے ممکن ہوتا ہے میرے عظیم دشمن......!" کوہارا نے بدمست قہقہہ بلند کیا۔ پھر غرور سے بولا۔

"لیکن...... مجھے افسوس ہوا کہ میرا دشمن...... جسے میں عظیم سمجھتا تھا کہ وہ "اے۔اے۔آر" (A.A.R) کی ٹیکنک سے بھی آگاہ نہیں...... چچ...... چچ...... افسوس۔"

"جانتا ہوں میں اچھی طرح...... اس ٹیکنک کو 'ائر ٹو ائر ری فلنگ' (air-to-air refueling) کہا جاتا ہے۔" میں نے بھناتے ہوئے لہجے میں کہا اور کوہارا سمیت وہ دونوں پائلٹ حیرت سے منہ پھاڑے میری طرف تکتے رہ گئے۔

"لیکن یہ بے حد رسکی عمل ہوتا ہے اور اشد ضرورت کے پیشِ نظر ہی اس پر عمل کیا جاتا ہے۔"

"واؤ...... مجھے فخر ہوا تم پر میرے عظیم دشمن......! تم واقعی کوہارا کی دشمنی کے لائق ہو۔" کوہارا نے ایک اور بدمست قہقہہ حلق سے خارج کیا۔

کوہارا کا مقصد یہی تھا کہ کسی ائرپورٹ پر اترنے کے بجائے دورانِ پرواز ہی ایک دوسرے طیارے کے ذریعے فیول منتقل کیا جائے اور اسے مصر کے ہی ائرپورٹ پر لینڈ کیا جائے۔

کیپٹن کی مائیک پر بحث ہوتی رہی۔ وہ انسانی حقوق کے واسطے دیتے ہوئے پانچ سو سے زائد انسانوں کی زندگیوں کی بھیک مانگ رہا تھا۔ پھر وہ مختلف رابطے بھی کرتا رہا۔ اس میں لگ بھگ ایک گھنٹا بیت گیا۔ وہ وقفے وقفے سے یہ رابطے کیے جا رہا تھا۔

میں نے اس سے پہلے کبھی اپنے دل و دماغ میں اس قدر دہشتوں کی یلغار ہوتے نہیں محسوس کی تھی۔ میں بھی ایک عام سا ہی گوشت پوشت کا انسان تھا، ڈر، خوف اور جان کے داؤ پر لگنے کے روایتی خوف کے جذبات میرے اندر جنم لے سکتے تھے۔ موت سے میں نہیں ڈرتا تھا مگر یہ ایک حرام موت تھی۔

ایک پاگل جنونی انسان کی درندگی جس کا نشانہ صرف میں ہی نہیں بنتا بلکہ کئی سو معصوم اور بے گناہ مسافروں کی جانیں بھی داؤ پر لگی ہونے کا معاملہ تھا۔ ان میں معصوم بچے بھی تھے۔ مجھے اس خبیث کوہارا...... نے ایک عجیب سی دھمکی دے کر اپنی سیٹ تک محصور رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"عجیب" اس لیے کہ میں میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے بھی نہیں تھے مگر میں اس مردود کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے بھی قاصر تھا۔ تاہم یہ بھی درست تھا کہ میری ایسی "بے بسی" کی کیفیات عارضی تھیں، ہاں! جب تک طیارے میں ایندھن "ری فل" نہیں کر دیا جاتا۔

میں نے دیکھا، کیپٹن کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ وہ اپنی سی ایک گھنٹے سے زائد تگ و دو کے بعد ہمیں گویا یہ مژدۂ جانفزا سنا رہا تھا کہ ایک چھوٹا فاضل طیارہ انسانی ہمدردی کے طور پر پرواز کرنے والا ہے۔

میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ ایک بوجھ تھا دل و دماغ میں جو اترنے لگا۔ مجھے اب کوہارا کے خلاف کارروائی کرنے کا موقع مل سکتا تھا، مگر اس صورت میں جب طیارے کی خاطر خواہ ایندھن کی ضرورت پوری ہو جاتی۔ اس سے پہلے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس میں اس مسافر طیارے کی تباہی کا خدشہ شامل ہوتا۔

کوہارا کے بدہیئت ہونٹوں پر بھی شاطرانہ مسکراہٹ رقصاں ہو گئی تھی۔ اس کی چندی چندی سی اکلوتی برمی آنکھ میں فاتحانہ چمک عود کر آئی تھی۔

اسی وقت کاک پٹ کے دروازے پر بپ کی مخصوص آواز ابھری۔

"کھولو دروازہ......" کوہارا نے میری طرف دیکھ کر تحکمانہ انداز میں کہا اور گن کا رخ میری جانب کر لیا۔

میں اسے خوفناک نظروں سے گھورتا ہوا اٹھا اور لاک گرا کر دروازہ کھول دیا۔

اسی وقت میرے سینے پر خودکار رائفل کی نال آن لگی۔

یہ کوہارا کا وہی ساتھی تھا، جسے اس نے کاک پٹ سے باہر ہدایات دے کر مامور کیا تھا۔

اس نے احتیاط کے پیشِ نظر ہی ایسا کیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں چونک پڑا۔ اس کے ہمراہ یاسمین تھی۔ اس کے حسین چہرے پر فکر و تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہاں سکون پھیل گیا۔

ہرکارے نے اسے ٹھوکا دیا اور یاسمین کا پاؤں رپٹا، وہ اندر آتے آتے لڑکھڑائی تو میں نے اسے گرنے سے بچانے کی خاطر اپنے دونوں بازو پھیلائے۔ وہ ان میں سما گئی۔ اس کے ریشمی بال میرے چہرے پر پڑے، وہ میرے سینے سے لگ گئی اور یوں چمٹ گئی جیسے الگ نہ ہونا چاہتی ہو...... میں اُسے اسی طرح ہی خود سے لگائے چند قدم پیچھے کو پلٹا۔

"کمبلر! اسے کیوں لائے ہو یہاں......؟" کوہارا نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ تب تک میں نے یاسمین کو دھیرے سے خود سے الگ کر کے اسی

چیئر پر بٹھادیا جس پر تھوڑی دیر پہلے میں بیٹھا تھا۔

''باس! یہ زیادہ شور کررہی تھی۔'' گمبلر نامی ہرکارے نے جواب دیا۔ ''یہاں آنے کی ضد کررہی تھی۔''

''ہم...... اپنے یار شہزی سے دل لگا بیٹھی ہوگی......''

کوہارا نے خباثت بھرے لہجے میں اس کی اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... ٹھیک ہے تم جاؤ...... کسی نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کی؟''

''چند مسافر مہم جوئی دکھانے کی کوشش کررہے تھے۔'' گمبلر بتانے لگا۔ ''انہیں خاموش کرنے کے لیے ایک کو گولی مارنا پڑی۔ سب خوف سے ٹھنڈے پڑ گئے۔''

''گڈ......! کوئی رعایت مت کرنا۔ تمہارے پاس ہتھیار ہے، ذرا محتاط رہنا اور انہیں دھمکاتے بھی رہو کہ اندر تمہارے ساتھی نے جہاز کا کنٹرول سنبھال لیا ہے، اس کے پاس خطرناک اسلحہ ہی نہیں بلکہ تباہ کن بم بھی ہیں اور سب اطمینان رکھیں کہ بہت جلد کسی بھی ائرپورٹ پر لینڈ کرنے والا ہے۔''

کوہارا نے اسے نئی ہدایت دی۔ گمبلر واپس لوٹ گیا۔

ایک بے گناہ مسافر کی جان جانے کا مجھے بے حد دکھ ہوا اور کوہارا اور اس کے درندہ صفت ساتھی پر طیش بھی آیا۔

اسی وقت کوہارا نے مائیک لیا اور اس میں بولنے لگا۔

''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میں آپ سے ایک بار پھر مخاطب ہوں، مجھے افسوس ہوا ہے کہ ایک مسافر جان سے چلا گیا۔ لیکن اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ جو تعاون نہیں کرے گا اسے اسی طرح بیدردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اب آپ یہ بھی سن لیں اچھی طرح۔ طیارے میں فیول ختم ہوگیا ہے، ہم فوری طور پر کسی بھی ملک کے ائرپورٹ پر اترنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تاہم پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ایک طیارہ فیول لے کر فلائی کرچکا ہے۔ شکریہ۔''

یہ اعلان کرکے کوہارا نے مائیک پائلٹ کو تھمایا اور پھر کیپٹن سے بولا۔ ''رابطہ کرکے فوراً بتاؤ...... وہ فیول ٹینک فاضل طیارہ کہاں تک پہنچا ہے؟''

''قریب آچکا ہے۔ ریڈار میں نظر آرہا ہے۔'' کیپٹن نے روکھے سے لہجے میں جواب دیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوہارا کو کچا چبا جائے۔

''دیکھو کیپٹن!'' کوہارا نے اسے تہدید کرنے کے انداز میں کہا۔ ''فیول لانے والے طیارے کو میری طرف سے یہ وارننگ دے دینا کہ ایسا نہ ہو فیول ٹینک کی آڑ میں اس فاضل طیارے کے اندر کمانڈو موجود ہوں...... ورنہ میں تمہیں آخری حکم یہی دوں گا کہ اپنے جہاز کو اس سے ٹکرادو...... سمجھ گئے تم......؟''

کوہارا کی بات پر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی دوڑ گئی۔ یاسمین بھی متوحش نظر آنے لگی۔ دونوں پائلٹس کے چہرے بھی سُت کررہ گئے۔

کوہارا ہماری جانب متوجہ ہوا۔ وہ یاسمین کو بڑی گرسنہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے قریب آنے کا اشارہ کیا مگر یاسمین نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ہراساں نگاہوں سے اس کی طرف تکنے لگی۔

''اِدھر آؤ...... میرے پاس......'' غصیلے لہجے میں اس نے یاسمین کو مشتعل نظروں سے گھورتے ہوئے کہا اور اپنی رائفل کی نال کا رخ اس کی طرف کردیا۔

مجھے ڈر تھا کہیں یہ آسیبی جنونی درندہ یاسمین کو گولی نہ مار دے۔

میں نے یاسمین کے کان میں سرگوشی کی اور وہ ایک نگاہ حیرت و بے بسی میرے چہرے پر ڈالتی ہوئی کپکپاتی ٹانگوں سے اس کی جانب بڑھنے لگی۔

ابھی وہ اس کے ذرا ہی قریب پہنچی تھی کہ کوہارا نے ایک سنسناتی سی غراہٹ سے مشابہ آواز خارج کرکے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی جانب اس زور سے کھینچا کہ وہ اس کے گینڈے جیسے جثے سے جا لگی۔

''آہ...... ایک عرصہ ہوگیا، ایسی نرم گرم رفاقت کا مزہ چکھے ہوئے۔'' وہ کمینگی سے ہنکارا بھرتے ہوئے بولا۔ ''جی چاہتا ہے اسی وقت تمہیں اپنے سوئٹ میں لے جاؤں...... مگر وہاں تمہارے بڈھے باپ نے قبضہ جما رکھا ہے۔ چلو...... جب تک اِدھر ہی دل بہلائے لیتا ہوں......'' کہتے ہوئے اس نے یاسمین کے حسین اور ہراساں چہرے پر اپنا بھاری اور بدہیئت چہرہ جھکایا۔

''کوہارا......!'' میں نے گرجدار آواز میں اس رذیل کو پکارا۔ میری للکار پر اس کا بڑھتا ہوا چہرہ رکا اور اسی طرح جھکے جھکے انداز میں اس نے اپنی اکلوتی آنکھ ترچھی کرکے میری طرف دیکھا۔

''میں تمہیں یہ ذلالت نہیں کرنے دوں گا۔ تمہیں شرم نہیں آتی، ایک بے بس اور مجبور لڑکی کے ساتھ ایسی گندی حرکت کرتے ہوئے۔'' میں بپھر گیا اور ساتھ ہی جوشِ غیظ تلے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

یاسمین روتے ہوئے سسکیاں لینے لگی۔ کوہارا نے اپنی گن کی نال میری طرف کردی اور اس کی موٹی انگلی ٹریگر پر جم

گئی۔

''نن...... نہیں...... نہ...... خدا کے لیے اسے مت مارنا۔'' دفعتاً یاسمین اپنا خوف بھلا کر کوہارا کی منت سماجت کرنے لگی۔

''ہمم...... بڑا یارانہ ہے ایک دوسرے سے......'' کوہارا نے اسی طرح خباثت سے مسکرا کر کہا پھر یاسمین سے بولا۔ ''میرے ساتھ بھی حساب کتاب رکھ لے ناں...... پھر، ایرانی شہزادی!''

کہتے ہوئے وہ پھر اس پر جھکا، یاسمین نے غایت درجے کی نفرت تلے اس کے مکروہ چہرے پر تھوک دیا۔ کوہارا کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تاہم قہقہ...... قہقہہ...... کرتے ہوئے بولا۔ ''اس تھوک کو میں تیرے گل گلنار چہرے سے ہی صاف کروں گا شہزادی......!''

میرے اندر غبار سا بھرنے لگا۔ طیش اور مارے غیظ کے مٹھیاں کھول اور بھینچنے لگا۔ یاسمین ایک شریف اور پاکیزہ مسلم خاتون تھی، جبکہ کوہارا ایک برمی کافر شیطان اور کئی بے گناہ برمی مسلمانوں کا قاتل بھی تھا۔ اسی سبب میرے اندر اس کے لیے نفرت وغضب کا ایک جوار بھاٹا امنڈا اور میں خود کو نہیں روک سکا...... اس سے پہلے کہ میں حرکت میں آتا، اچانک کیپٹن کی آواز ابھری۔

''طیارہ آگیا ہے۔''

کوہارا...... چونکا۔ اس نے یاسمین کو اپنی شیطانی گرفت سے آزاد کردیا۔ وہ سسکتی ہوئی میری جانب لپکی اور میں نے بے اختیار اپنے دونوں بازو پھیلا کر اسے خود میں سما لیا۔

کیپٹن مائیک پر اس طیارے کو بریفنگ دینے میں مصروف تھا۔ ہم سب کی نظریں اب جہاز کی ونڈ شیلڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے فضائے بسیط کا عجیب اور ہیبت ناک نظارہ تھا۔ حدِ نگاہ پھیلے ہوئے آسمان پر ایک رخ پر تاریکی اور بہت دور سفید لکیر سی نظر آرہی تھی۔ اس لکیر سے متعلق میں نے کسی خدشے کے پیشِ نظر کیپٹن سے دریافت کرنا چاہا، مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا، جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ وہ اس وقت خاصا چڑچڑا ہورہا تھا۔ البتہ اس کے ساتھی کو پائلٹ نے مدھم سے لہجے میں مجھے بتایا تھا کہ جہاز کے پائلٹ کے لیے ایسے عجیب مناظر معمول کی بات ہے، یہ سفید لکیر پو پھٹتی شفق کی ہے۔

طیارے میں ایسے مناظر اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جہاں ایک جانب تاریکی تو دوسرے مقام پر سویرے کی جھلک نظر آرہی ہوتی ہے۔ یہ سب خطِ استوا کی کارستانی ہوتی ہے۔ یعنی جس مقام پر سورج غروب ہورہا ہوتا ہے اسی مقام کی دوسری جانب وہ طلوع بھی ہورہا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی وقت ہمیں طیارے کی اسکرین سے دائیں جانب کچھ جلتی بجھتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ یہ اسی فاضل طیارے کی تھیں جو ہمارے طیارے کے لیے فیول لوڈ کیے ہوئے تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے متوازی پرواز کرنے لگا۔ یہ مجھے بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے زمین پر میں کسی بس میں سوار ہوں اور میرے ساتھ ایک اور بس دوڑ رہی ہو۔ ہزاروں فٹ کی بلند فضا میں ایسا مظاہرہ میرے لیے حیرت سے زیادہ فکر وتشویش کا باعث تھا، کیونکہ جہازوں کے ائر روٹس ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر طے کیے جاتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ سڑک پہ برابر دوڑتی ٹریفک کی طرح کوئی دوسرا جہاز سامنے سے کراس کرتا نظر آجائے یا پیچھے سے آگے نکل جائے۔ لیکن یہاں میں یہ جو ہیبت ناک نظارہ دیکھ رہا تھا، وہ کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا تھا، کیا شک تھا کہ ایسا کسی اشد مجبوری کی بنا پر ہی ہوتا تھا۔ اس میں بھی دونوں جہازوں کے پائلٹس کا انتہائی تجربہ کار ہونا ضروری تھا، بالخصوص فاضل طیارے کے پائلٹ کو زیادہ ہی مشاق ہونا پڑتا تھا۔

آسمان پر اب دھیرے دھیرے سویرا اجاگر ہونے لگا تھا۔

فاضل طیارہ ایک مخصوص راہ متعین کرنے کے بعد اب ہمارے طیارے کے متوازی پرواز کررہا تھا۔ یقیناً یہ حیرت ناک اور عجیب منظر طیارے میں بیٹھے دیگر مسافر بھی کھڑکیوں سے دیکھ اور ہول رہے ہوں گے۔

دونوں پائلٹ اپنے کام میں مصروف ہوگئے تھے۔ یہ ایسا موقع تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں اور کوہارا ایک دوسرے سے بھی غافل ہوگئے تھے۔ کیونکہ یہ فیول بھرنے کا مرحلہ تھا۔ لڑائی کی صورت میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر یہ خطرناک پروگرام متاثر ہوتا اور تباہی یقینی ہوتی۔

اچانک میں نے فاضل طیارے سے ایک ایریل ٹائپ کی شے کو نمودار ہوتے اور فضا میں لہراتے دیکھا۔ اب ہمارا طیارہ ''ریسیور'' تھا۔ یہ ایریل ٹائپ شے...... جو فاضل طیارے سے نمودار ہوئی تھی ایریل ری فلنگ پروب اینڈ ڈروگ کنیکٹنگ سسٹم تھا۔ اس کا آخری سرا...... ریسیور طیارے کے فیول ٹینک کے ایک ایمرجنسی وال ہول سے جسے ہوز (hose) کہا جاتا تھا از خود اٹیچ ہو جاتا تھا، یوں ایک

طیارے سے دوسرے طیارے میں فیول بھرنے لگتا تھا۔ یہ ایک مخصوص میگنیٹک سسٹم کے تحت ریسیور طیارے کے وال سے اٹیچ ہو جاتا تھا۔ اس خطرناک ری فلنگ پروسس کو جلد نمٹایا جاتا تھا۔

یوں ری فلنگ پروسس شروع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

تاریک آسمان کی ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر یہ خطرناک عمل جاری تھا۔ دونوں آہنی پرندے ایک دوسرے کے متوازی محوِ پرواز کرتے ہوئے ایک عجیب اور ہولائے دینے والا منظر پیش کر رہے تھے۔ دونوں طرف کے طیاروں کی ذرا سی غلطی خوفناک تباہی کا سبب بن سکتی تھی۔

لیکن ابھی بیس منٹ ہی بیتے ہوں گے کہ اچانک عمر رسیدہ کیپٹن نے فاضل طیارے کے پائلٹ سے مائیک پر بدستور باتیں کرنے کے دوران کوہارا کی طرف گردن موڑ کر کہا۔

”فاضل طیارے کے ایریل کا پروب ہمارے فیول ٹینک کے ڈروگ سے صحیح طور پر اٹیچ نہیں ہوا ہے۔“

”تو پھر......؟“ کوہارا اس کی جانب گھور کر خونخوار لہجے میں غرایا۔

”فاضل طیارے سے...... دو عدد ایکسپرٹ ہمارے طیارے کے فیول ٹینک تک آنا چاہتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں......“ کوہارا دہاڑ کر بولا۔ کیپٹن کی بات پر میرے اندر ایک پرتشویش آمیز سی بے چینی نے یکلخت سر اٹھایا تھا۔

”میں ان کی چالاکی سمجھ رہا ہوں، یہ لوگ اس بہانے طیارے کے اندر داخل ہو کر ہمارے خلاف کمانڈو ایکشن کرنا چاہتے ہیں۔“ کوہارا نے کہا۔ اس کا ایسا سوچنا حالات کے عین مطابق ہی تھا۔

”تم غلط سوچ رہے ہو۔“ کیپٹن نے جھلا کر کہا۔ ”یہ کمانڈو نہیں، انجینئرز ہیں یوں بھی وہ ہمارے طیارے میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں بھلا؟“ کوہارا کچھ سوچتا ہوا بن گیا۔

”جلدی جواب دو مجھے، انہیں گرین سگنل دوں یا نہیں؟“

”دے دو......“ بالآخر کوہارا نے اجازت دے دی۔

میرے اندر شدید قسم کی دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔ آسمان کی بلندیوں میں نجانے اب کیسی خوفناک جنگ کی ابتدا ہونے والی تھی، اس کا تصور ہی میرے لیے جاں گسل تھا۔ میں خود بھی ایک کمانڈو تھا، ایسی صورتِ حالات میں کوہارا جیسے ہائی جیکرز سے کیسے نمٹا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہی کچھ تھا تو ایک بڑی مصیبت میری منتظر تھی۔

میں نے دیکھا، فاضل طیارے سے ایک اور رسی لہرائی جس کے سرے پر باسکٹ بندھی ہوئی تھی اور اس میں دو انسانوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔

ہم سب کی نظریں اس طرف سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ہٹی تھیں، اگرچہ اس دوران میرے پاس کوہارا پر حملہ کرنے کا ایک اچھا موقع تھا لیکن بات وہی تھی کہ ہم سب اس وقت نازک گھڑیوں سے گزر رہے تھے۔ یہ صرف میرا اور یاسمین کا معاملہ نہیں تھا بلکہ طیارے میں سوار پانچ سو سے زائد مسافروں کی زندگیاں داؤ پر لگی تھیں۔ پھر کوہارا جیسے خطرناک درندے پر اتنی جلدی قابو پانا آسان بھی نہ تھا، اس کے لیے وقت درکار ہوتا، جبکہ وہ خود اس وقت ”زندہ بہ دست مردہ“ کے مصداق شکست خوردگی کے عالم میں کوئی بھی خطرناک حرکت کر سکتا تھا۔ یوں میں نے کسی اور نسبتاً محفوظ موقع کے لیے...... خود کو اس ارادے سے باز رکھا تھا۔

باسکٹ لہراتی ہوئی اسی سمت جا رہی تھی جدھر ری فلنگ ایریل اٹیچ تھا۔ اسی وقت کوہارا نے مائیک پر اپنے ساتھی گمبلر کو بلایا۔ وہ کاک پٹ میں داخل ہوا تو کوہارا نے اسے تحکمانہ لہجے میں ساری صورتِ حال سے بریف کرتے ہوئے کہا۔

”طیارے کے دروازے پر کسی کو حرکت کرتا دیکھو تو بے دریغ فائر کر دینا۔ عملے سمیت کوئی بھی مسافر اپنی سیٹ نہیں چھوڑے گا۔“

”آپ بے فکر رہیں باس!“ گمبلر نے کہا۔ ”دو مسافروں کی ہلاکت نے طیارے میں خوف پھیلا دیا ہے لیکن باس! کامیابی اور منزل حاصل کرنے تک کاک پٹ کا قبضہ مت چھوڑنا۔ کیونکہ عملے اور مسافروں میں چند لوگوں کی نیت کو میں بھانپ رہا ہوں۔ شاید مجھے اکیلا پا کر وہ کسی قسم کی مہم جوئی کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔“

”میں ان کی اس کمزوری سے واقف ہوں اچھی طرح گمبلر......!“ کوہارا نے کہا۔ ”جب تک میں یہاں ہوں، ان کی سانسیں اٹکی رہیں گی، تم اپنی پوزیشن ایسی رکھنا کہ کوئی تم پر اچانک حملہ نہ کر پائے مگر تم بہ آسانی ان پر گولی چلا سکو۔“

”یس باس! میں نے خود کو کاک پٹ کے قریب ہی رکھا ہے۔ میری پشت پر پائلٹ روم کی دیوار ہے۔“

”گڈ......! سب پر کڑی نگاہ رکھو۔“

”او کے باس......!“ وہ چلا گیا تو...... کوہارا نے مائیک پر ایک بار پھر اعلان کرتے ہوئے مسافروں کو دھمکایا۔

''لیڈیز اینڈ جنٹلمین......! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہمارا مقصد طیارے کو ہائی جیک کرنا یا کسی کی جان کو خطرے میں ڈالنا نہیں ہے۔ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ ہماری منزلِ مقصود قریب ہے اور وہاں اترتے ہی ہم فرار ہو جائیں گے، پھر تم سب آزاد ہو۔ لیکن میرے ساتھی پر کسی نے دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت کی تو...... سب کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میرے پاس خودکار رائفل ہی نہیں بلکہ طاقتور بم بھی ہیں اور میں نے اس وقت طیارے کے دماغ یعنی کاک پٹ پر اپنا پورا قبضہ جما رکھا ہے۔ مجھے بہرحال دو مسافروں کی ہلاکت کا افسوس ہے۔ شکریہ۔''

کوہارا یہ ساری بکواس کرنے کے بعد میری طرف دیکھ کر تاؤ دلانے والے انداز میں ہنسی سے بولا۔ ''کیوں میرے عظیم دشمن! اب سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے ناں......؟''

''تمہارے آئندہ کے کیا ارادے ہیں؟'' میں نے اس کے جی جلانے والے انداز کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاہا...... ہاہا......! بہت خوف زدہ ہو رہے ہو مجھ سے......''

''تم خود اس وقت خوف سے بھیگی بلی بنے ہوئے ہو کوہارا......! میں جانتا ہوں یہ بات......'' جواب میں، میں نے بھی اسے تاؤ دلایا۔ مگر وہ بھی میری طرح اس اندازِ غنیم کو صرف نظر کرتے ہوئے مسکراتا رہا۔

''ایک اور مسئلہ ہو گیا ہے۔'' اچانک کیپٹن نے دوبارہ کہا۔ جیسا مذکور ہوا وہ مسلسل فاضل ٹینکر طیارے کے پائلٹ سے رابطے میں تھا۔ کوہارا سے بولا۔

''اب کیا ہو گیا بڈھے بگلے......!'' کوہارا جھلا کر بولا۔ یہ اس کے اندر کے چھپے ہوئے خوف کا ہی شاخسانہ تھا۔

''ان دونوں میں سے ایک انجینئر طیارے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔''

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ باہر سے کوئی اندر داخل نہیں ہو سکتا؟'' کوہارا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

''یہ میرا خیال تھا اور اب بھی میرا یہی خیال ہے۔'' ادھیڑ عمر پائلٹ نے جواب دیا۔ ''لیکن...... وہ لوگ ہی مجھے اس کا طریقہ بتائیں گے، کیونکہ ایسے حالات سے گزرنا ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا حصہ ہے۔''

مجھے کسی گڑبڑ کی بو آ رہی تھی۔ یہ واحد بات تھی جس سے میں کوہارا کے خدشات سے متفق تھا۔ تاہم میں خاموش رہا۔

''مجھ سے ان کی بات کراؤ......'' کوہارا نے غرا کر پائلٹ سے کہا تو اس نے دو ایک لفظ مائیک میں کہنے کے بعد ہیڈ فون سر سے اتار کر کوہارا کی طرف بڑھایا۔

کوہارا نے وہ اپنے سر پر چڑھایا اور اس سے منسلک مائیک میں غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم لوگ اگر کوئی چالا کی چلنا چاہتے ہو تو یاد رکھنا، ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں، لیکن اس کے نتیجے میں سب بھیانک انجام سے دوچار ہو جائیں گے۔ تمہارے دو انجینئرز اگر وہ واقعی کمانڈوز نہیں ہیں تو ان سے کہو باہر ہی سے خرابی دور کرنے کی کوشش کریں۔''

پائلٹ نے خود بھی گفتگو سننے کی خاطر اسپیکر وائیڈ کر رکھا تھا، لہٰذا دوسرے طیارے کے پائلٹ کی آواز ابھری۔

''ہم لوگ کمانڈوز نہیں ہیں اور نہ ہی اس کا ذرا سا بھی رسک لینے کا سوچ بھی سکتے ہیں۔ ریسیور طیارے کے ایمرجنسی فیول ٹینک کا والو کسی خرابی کے باعث صرف تیس فیصد فیول لے رہا ہے اور باقی ستر فیصد باہر ضائع ہو رہا ہے۔ ہمارا فقط ایک انجینئر طیارے میں داخل ہو کر یہ خرابی دور کر لے گا۔''

''تیس فیصد کی رفتار سے جس قدر فیول بھر سکتا ہے وہ بھر دو......'' کوہارا نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ ''ہماری منزل زیادہ دور نہیں، قاہرہ ائرپورٹ ہماری آخری منزل ہوگی۔''

''باوجود اس کے یہ ناممکن ہے۔'' فاضل طیارے کے پائلٹ نے کہا۔ ''صرف اتنی مقدار بھری جا سکی ہے کہ تمہارا طیارہ دورانِ پرواز ری فل ہوتا رہے مگر ہمارا فیول ختم ہو جائے گا۔ پھر نہ تمہارے پاس اور نہ ہمارے پاس اتنا وقت ہو گا کہ دوسرا طیارہ آسکے، تب تک تمہارا طیارہ...... زمین بوس ہو جائے گا۔''

کوہارا سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بڑی گمبھیر اور اعصاب شکن گھڑیاں تھیں۔ ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر پانچ سو جانوں کے ساتھ جیسے اس صدی کا ایک بھیانک مذاق ہو رہا تھا۔ مجھے اپنا سینہ جکڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اب کوپائلٹ ہی کے چہرے پر نہیں بلکہ ادھیڑ عمر...... کیپٹن کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اور یہ دونوں کوہارا کی طرف سراسیمہ سی ملتجیانہ نظروں سے تکنے لگے تھے۔

''سوچنے کا وقت گزر چکا ہے۔ جلدی جواب دو......''

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر کوہارا نے اجازت دے دی اور ہیڈ فون سر سے اتار کر پائلٹ کو تھما کر مجھ سے بولا۔ ''شہزی......! تمہیں میرا ایک حکم ماننا ہوگا۔''

''میں تمہارا کوئی حکم نہیں مانوں گا اور نہ ہی تمہارے

ایسے کسی جرم میں شریک بنوں گا، سمجھے تم......؟''

میں نے فوراً غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو اس کی اکلوتی آنکھ میں طیش کی لہر سی اُمڈی اور پھر وہ اسی لہجے میں غراتے ہوئے بولا۔

''نہیں شہزی! تمہاری ضد نہیں چلے گی۔ اس وقت تم سمیت طیارے کا ہر شخص میرا محکوم ہے۔ جو میرا حکم نہیں مانے گا میں اسے بلاتامل گولی ماردوں گا۔ تمہاری پروا بھی نہیں کروں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی گن کا رخ میری جانب کردیا۔ میرا تن بدن مارے غیظ اور طیش کے پھنکنے لگا۔ یاسمین مجھے گن پوائنٹ پر دیکھ کر ایک دم ہراساں ہوگئی اور اپنی نشست سے اٹھ کر میرے سینے سے اپنی پشت کے بل لگ کر کھڑی ہوگئی۔ میں یاسمین کے اس جذبۂ بے اختیاری پر کچھ حیران سا ہوا۔ اس کا مجھ سے چپکا ہوا نرم و نازک وجود خزاں رسیدہ پتے کے مانند کپکپاتا محسوس ہوا۔ یاسمین کا ڈرا سہما روپ میرے لیے نیا تھا۔ بے شک وہ بھی ایک عام سی انسان اور لڑکی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے اسے بہت جرأت مند اور ثابت قدم دیکھا تھا۔ یا پھر اس وقت حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ہر کوئی اپنے سائے سے بھی خوف زدہ تھا۔

''اس کی بات مان لو اینگری ینگ مین......!'' معاً اس ادھیڑ عمر پائلٹ نے مجھ سے کہا۔ ''اس پر خون سوار ہے، اپنی زندگی بھی داؤ پر لگائے ہوئے ہے اور ہماری بھی...... یہ کسی کی پروا نہیں کرے گا اس وقت......''

طیارے کے ایک ذمے دار کیپٹن کی بات پر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ ایسا بھی مجھ سے کہہ سکتا تھا؟ یا پھر شاید اسے واقعی میری جوانی پر ترس آگیا تھا۔

''کیا کرنا ہے مجھے......؟'' بالآخر میں نے رکھائی سے کہا۔ کوہارا کے بدہیئت ہونٹوں پہ ایک بار پھر تاؤ دلانے والی مکروہ مسکراہٹ ابھری۔

''باہر جا کر میرے ساتھی کی مدد کرو اور...... دیکھو...... اگر تم نے آنے والے آدمی کے ساتھ ذرا بھی کسی قسم کی ساز باز کرنے کی کوشش چاہی تو تمہاری باری بعد میں آئے گی، اس کی پہلے آجائے گی۔'' کہتے ہوئے اس نے یاسمین کی طرف اشارہ کیا۔

میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یاسمین نے خود مجھے پابہ زنجیر کرڈالا تھا۔ تاہم مجھے کوہارا کی اس بات پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ مجھ پر یعنی ''عظیم دشمن'' پر بھروسا کررہا تھا! کیوں؟ کیا اس میں اس کی کوئی چال تھی یا پھر اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا، ممکن تھا اپنی فطری رعونت کے سبب وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں اس کا ان حالات میں کچھ بھی بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، چہ جائیکہ...... یاسمین اس کی گرفت میں تھی۔

میں بادلِ ناخواستہ کاک پٹ کے دروازے...... کی طرف بڑھا۔

''ٹھہرو......!'' وہ یک دم بولا۔ مجھے اس کا تحکمانہ انداز بُری طرح کھل رہا تھا۔ میں رک کر اس کی جانب گھورنے لگا۔ وہ مائیک پر اپنے ساتھی گیملبر سے باتیں کرنے لگا پھر مجھے جانے کا اشارہ کردیا۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکلا، میرے سامنے نشستوں کی دہری تہری قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے ہر رنگ و نسل کے مسافر ایک دم مجھے یوں تکنے لگے جیسے میں ہائی جیکرز کا ساتھی ہوں۔

ان کی آنکھوں میں غصہ اور نفرت ہلکورے لے رہی تھی، خوف بھی تھا اور تشویش بھی۔ ایک دو نشستوں پر میں نے کچھ کو روتے سسکتے ہوئے بھی دیکھا، اس طرف خون پھیلا ہوا تھا، ایک سیٹ پر خون آلودہ لاش کو لٹکا کر بٹھادیا گیا تھا۔ تیسری رو کی پانچویں نشست پر بھی یہی کچھ دیکھنے میں آیا۔

گیملبر مجھے دیکھتے ہی ایک طرف کو ہوگیا تھا۔ اسے کوہارا کی طرف سے ہدایت مل گئی تھی۔ تاہم اس نے مجھ پر اپنی گن تان لی تھی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ یہ سب جاننے کے باوجود یہ لوگ مجھے بھی ظالم اور اس جرم میں برابر کا شریک سمجھ رہے تھے۔

میں نے عملے کے ایک آدمی کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ وردی پوش فلائٹ اٹینڈنٹ تھا۔ میری ہی عمر کا نوجوان لڑکا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''ری فلنگ کے سلسلے میں تھوڑی خرابی دور کرنی ہے، اس کے لیے فاضل طیارے سے ایک انجینئر آنا چاہتا ہے۔ اس کی محفوظ صورت کیا ہوسکتی ہے؟''

وہ فوراً پلٹا اور سامنے کے ایک گلاس کیبن سے اپنے چیف اٹینڈنٹ کو بلالیا۔ یہ ایک پکی عمر کا لمبا چوڑا امریکی تھا اور مجھے بڑی تیکھی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کی پروا کیے بغیر...... اسے یہی کچھ بتایا۔ اس نے بجائے مجھے جواب دینے یا کوئی حامی بھرنے کے الٹا دھمکانا شروع کردیا۔

''تم...... تم...... لوگ یہ سب اچھا نہیں کررہے ہو، یاد رکھو...... یہ امریکی طیارہ ہے اور......'' وہ غصے میں بہت بھرا ہوا

تھا، اسے اپنے امریکی ہونے کا زعم بھی بہت تھا۔

میں نے اس کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچ لی، میری اس جارحانہ حرکت پر کئی مسافروں کے منہ سے دبی دبی چیخیں خارج ہوگئیں۔ خوف کی کچھ ایسی ہی فضا پورے طیارے میں طاری تھی۔ میں چلّا کر اور اس سمیت دیگر لوگوں کو بھی سنانے کے لیے بولا۔

''تم سب لوگ کیا گونگے بہرے اور اندھے ہو......؟ دیکھ نہیں رہے ہو کہ یہ مجھے اور میری ساتھی لڑکی کو بھی یرغمال بنائے ہوئے ہیں۔''

''تم انہیں پہلے سے جانتے تھے، تمہیں طیارے میں سوار ہونے سے پہلے بتانا چاہیے تھا ان کے بارے میں......'' ایک خرانٹ قسم کے جوان مگر موٹے سے مسافر نے مجھے گھورتے ہوئے ذرا ہمت دکھائی تو میں نے چیف فلائٹ اٹینڈنٹ کی گردن چھوڑ کر اس سے خار کھائے لہجے میں کہا۔ وہ سامنے کی سیکنڈ رو میں براجمان تھا۔

''مجھے پتا ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا لیکن یہاں انہیں پہچانتے ہی میں نے ان کی سرکوبی کی ہے، اسی لیے ان کی طاقت اب تقسیم ہوچکی ہے۔ یہ کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے، صرف فرار چاہتے ہیں، اور میں بھی تمہیں یہی تلقین کروں گا کہ ان کے ساتھ تعاون کرو۔''

پھر میں چیف کی طرف متوجہ ہوا...... ''اور...... اب تم بھی...... وقت ضائع مت کرو۔'' میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

وہ فوراً حرکت میں آیا۔ تب ہی میں نے بہت سے مسافروں کی آنکھوں سے میرے لیے جھلکتا ہوا برہمی اور نفرت کا غبار کم ہوتے دیکھا۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں بھی کرنے لگے۔

بدبخت کوہارا نے اپنے ساتھ مجھے بھی گندہ کر ڈالا تھا۔ یہ خطرناک معاملہ میری امریکا یاترا کی مہم کو سبوتاژ کرسکتا تھا۔ کیونکہ اس سلسلے میں پہلے ہی امریکی افسران بہت ''کانشس'' تھے۔ بہرطور شکر تھا کہ یہ سارا کچھ سب کی نظروں کے سامنے ہورہا تھا اور اب تک میرے ہاتھ سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی، میری سچائی کی گواہی اندر کاک پٹ میں بیٹھے وہ دونوں پائلٹس بھی دے سکتے تھے۔

تاہم ابھی یہ سب بہت دور کی باتیں تھیں۔ معاملہ ابھی تک تاریکی اور اُلجھن کے پردے میں تھا کہ اب پردۂ ظلمت سے کیا ظہور میں آتا ہے؟

چیف فلائٹ اٹینڈنٹ اب کسی مائیک پر اندر کاک پٹ سے پل پل کی خبر لے رہا تھا۔ مجھے اندر یاسمین کی بھی فکر ستا رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت طیارے کو ایک جھٹکا لگا۔ کئی خوف زدہ چیخوں کے ساتھ دعائیہ کلمات ابھرے۔

''او...... گاڈ......! او...... گاڈ......!''

میں خود پریشان ہوگیا۔

''ی ی...... کیا ہو رہا ہے......؟ ہمیں بتایا جائے......''

کسی مسافر کی خوف سے کپکپاتی آواز ابھری۔ چند دیگر مسافر بھی اسی طرح چلّائے تھے۔

میری پیشانی پر بھی تشویش کی لکیریں گہری ہوگئیں۔ کیا ایسا ایندھن کی کمی کے باعث ہوا تھا۔

اسی وقت طیارے کو دوسرا جھٹکا لگا۔ مسافروں نے چیخیں مار کے رونا شروع کردیا۔

''کیپٹن سے دریافت کرو مسٹر ہوبرڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے چلّا کر چیف فلائٹ اٹینڈنٹ سے کہا۔ اس کا نام میں نے اس کی وردی پر بائیں جانب لگے ٹیگ پر پڑھ لیا تھا۔

''میں دروازہ کھولنے کی ہدایات لے رہا ہوں۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔ اس کا ابھی تک مجھ سے دل صاف نہیں ہوا تھا۔ اس کی اکھڑ مزاجی پر مجھے غصہ آگیا اور میں غصے سے دانت پیستا ہوا اس کی جانب بڑھا اور مائیک اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر کیپٹن سے طیارے کو جھٹکے لگنے کی وجہ دریافت کی۔

کیپٹن نے یہی بتایا کہ ایسا طیارے میں ایندھن کی کمی کے سبب ہو رہا ہے اور مزید یہ اب میں مائیک ...... فوراً ہوبرڈ کو تھما دوں۔

وہ اسے دورانِ پرواز طیارے کا دروازہ کھولنے کی کچھ ہدایات سمجھا رہا تھا۔ میں نے وہ ہوبرڈ کو تھما دیا۔

اسی وقت کوہارا کی اسپیکر میں آواز ابھری۔ وہ کم بخت مجھے مخاطب کرتے ہوئے برہمی سے بکواس کرنے لگا۔

''شہزی! بیچ میں مداخلت مت کرو اور جو تم سے کہا گیا ہے وہی کرو، ورنہ تمہاری ساتھی کی خیر نہیں ہوگی جو میرے قبضے میں ہے۔''

میں غصے سے بھنّا کر رہ گیا۔ کوہارا کی اس دھمکی پر دیگر لوگوں پر اثر پڑنے لگا کہ ان کی طرح میں بھی مجبور اور بےبس تھا، نیز یہ کہ مجھے استعمال کیا جارہا تھا۔

اس کے بعد ہوبرڈ نے کریو کیبن سے ایک اور شخص کو آواز دے کر ...... بلایا اس کے بعد ایک طرف کو دوڑا، مجھے چونکہ اس کے ساتھ رہنے کی کوہارا مردود نے ہدایت کر

رکھی تھی اسی لیے اس کے پیچھے میں بھی دوڑا۔
وہ ایمرجنسی ایگزٹ ڈور اوپن کرنا چاہتا تھا۔
ذرا ہی دیر بعد ہم ایک ایسے مختصر سے خلا میں آگئے جہاں وہ دروازہ نصب تھا۔ اس پر شیشے کی کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ میں نے وہاں ایریل نما رسی کے ساتھ بندھے شخص کو موجود دیکھا۔ اس نے چست لباس پہن رکھا تھا اور اس کی کمر پر کٹ بندھی نظر آتی تھی۔
''تمہارا کیا خیال ہے یہ کوئی کمانڈو ہوسکتا ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت ہوبرڈ سے کہا تو وہ طنزیہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر بولا۔
''ڈر گئے؟ ہو بھی سکتا ہے یہ کمانڈو ہو، میں تو خود دعا مانگ رہا ہوں کہ ایسا ہو۔''
مجھے اس غبی انسان کے جواب پر غصہ تو بے حد آیا تھا مگر میں ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ''اچھی بات ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ.....صرف ایک کمانڈو کیا کرسکتا ہے؟''
''ہائی جیکرز بھی دو تین ہی ہیں۔'' ہوبرڈ بولا۔
''ٹھیک، لیکن انہوں نے طیارے کے حساس اور نازک مقام پر اپنی گرفت مضبوط کر رکھی ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اس پوزیشن میں بھی ہیں کہ شکست کی صورت میں طیارے.....کو مسافروں سمیت تباہ کرنے میں ایک پل کی بھی دیر نہیں لگائیں گے۔''
میرے محتاط اور حقیقت پر مبنی تجزیے نے لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر بھی تشویش اور خوف کے سائے لہرا دیے تھے۔
''اگر ایسا ہوا تو تم کس کا ساتھ دوگے؟''
''ظاہر ہے کمانڈو کا.....'' میں نے کہا اور پھر ہوبرڈ نے آگے بڑھ کر دروازے کے چند لیورز کو اِدھر اُدھر گھمایا اور مجھے ایک طرف ہٹ جانے کو کہا۔ میں سامنے سے ہٹ کر ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ ایسے دورانِ پرواز طیارے کا ایمرجنسی دروازہ کھولنے کی ٹریننگ تھی۔
میں دھڑکتے دل کے ساتھ اسے اپنی کارروائی کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کریو اس کی مدد میں شامل تھا۔
''پاور'' کی تربیت کے دوران میں مجھے بھی ایسے کئی مراحل سے گزارا جاتا رہا تھا۔ جس میں پیراشوٹنگ سے لے کر ''فری فال اسکائی جمپنگ'' بھی شامل تھی۔
لیکن میرے دماغ میں یہی خدشہ بگولے کی طرح چکرانے لگا کہ ایسی صورت میں کیا ہم سب کی سلامتی داؤ پر لگ سکتی ہے؟ یا پھر لامحالہ مجھے بھی اس کمانڈو کی مدد میں شامل ہونا پڑتا؟ ایک خیال یہ بھی ابھرا کہ ایسا سرے سے نہ ہی ہوتو اچھا تھا، فیول کا مسئلہ حل ہوتے ہی میں خود اپنے طور پر اس مخدوش صورتِ حال سے نمٹنے کی کوشش کرتا۔
آخر میں ہوبرڈ نے ایک اسٹیئرنگ نما ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔
دروازہ کھلتے ہی چیختی چنگھاڑتی ہواؤں کا شور ایک زوردار ائر پریشر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔
میں نے دیکھا ہوبرڈ بڑی مہارت کے ساتھ اپنا کام نمٹانے میں مصروف رہا۔ وہ دروازہ پورا کھول کے ایک طرف کو ہٹ گیا تھا۔ تیز ہواؤں کے تھپیڑے اسے بری طرح ہلا رہے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے قریب نصب کسی آہنی راڈ کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ کریو بھی ہمت اور حوصلے سے کام لے رہا تھا۔ میں نے دیکھا، باہر تلملاتے سے مناظر دکھانے والے خلا میں وہ ''باسکٹ سوار'' شخص اپنے ایک ہاتھ سے کچھ اشارہ کررہا تھا۔ ساتھ ہی اپنے چہرے کے قریب نصب مائیک سے اپنے طیارے کے پائلٹ سے بھی مخاطب تھا۔
ہزاروں فٹ کی بلندی پر باسکٹ کبھی دروازے کے قریب آتی اور پھر دور ہو جاتی تھی۔ باسکٹ سوار ہر بار دروازے کے قریب ہونے پر کوئی عمل دہراتا تھا۔ وہ کوئی حلقہ دار رسی اندر اچھالنے کی کوشش میں تھا، دو تین بار کی کوشش کے بعد ہی وہ رسی، جس کے سرے پر آنکڑے جیسی کوئی شے بھی لہراتی نظر آتی تھی، بالآخر دروازے کے کسی فولادی رخنے سے اٹک گئی اور پھر اس کے بعد وہ شخص اسی رسی کی مدد سے باسکٹ سمیت اندر داخل ہوگیا۔
اس کے اندر داخل ہوتے ہی.....میں نے اپنی عقابی اور بھانپتی ہوئی نظریں اس کی حرکات وسکنات پر جما دیں۔ اس کے انداز واطوار سے مجھے غیر معمولی چابک دستی اور ایک مخصوص قسم کی محتاط روی کا شائبہ جھلکتا محسوس ہوا جو صرف ایک تربیت یافتہ کمانڈو کے انداز کا ہی ''خاصہ'' ہوتا ہے۔
وہ بڑے.... مشاق اور غیر معمولی پھرتی سے باسکٹ سے اچھل کر طیارے کے فرش پر اپنے قدم جما چکا تھا۔ کریو اور ہوبرڈ اسے سنبھالنے کو لپکے۔ نووارد ''ہواباز'' نے باسکٹ چھوڑ دی اور اس کے بعد دروازہ بند کرلیا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی چیختی دھاڑتی ہواؤں کا شور یکلخت تھم گیا۔ میں نے ہوبرڈ کو نووارد کے کان کے قریب ہوتے اور اسے کچھ کہتے پایا، یوں اس نے کچھ کہتے ہوئے میری جانب بھی آنکھوں سے اشارہ کیا تھا۔
میری چھٹی حس پھڑکی۔ اس شخص نے فوراً اپنی جیب سے ایک پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔ وہ میری طرح ہی خاصا

قد آور اور جسیم و جنگجو نظر آتا تھا۔ میں اس کی حرکت پر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''اس وقت طیارے کو اس کھلونے سے زیادہ ایندھن کی ضرورت ہے، مسٹر!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ تاہم میں محتاط بھی تھا۔ کہیں یہ مجھے ہی فوراً گولی کا نشانہ نہ بنالے۔ میرا ہی نہیں کو ہارا کا بھی یہ خدشہ درست نکلا تھا کہ ''ری فیلنگ'' کی آڑ میں کمانڈو ایکشن ہوسکتا تھا۔

''بکواس بند کرو اپنی...... ہاتھ اوپر اٹھالو......'' اس نے مجھ سے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ میں نے خاموشی اپنے ہاتھ اٹھالیے اور اس غبی چیف فلائٹ اٹینڈنٹ کی طرف دیکھا، اسی بے وقوف نے اسے میرے بارے میں غلط بتایا تھا۔ لہٰذا میں گھور کر بولا۔ ''تم اسے غلط راہ دکھا کر اس طیارے کی سلامتی کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔ اسے حقیقت کیوں نہیں بتاتے کہ میں ہائی جیکرز کا ساتھی نہیں ہوں اور...... تم، مسٹر کمانڈو......! کیا تم اتنے ہی گھاس چرے ہوئے ہو کہ مجھ نہتے آدمی کو دشمن سمجھ رہے ہو؟''

میری بات پر اس کمانڈو کی آنکھوں میں واضح طور پر اُلجھن سی تیر گئی اور وہ اسی نظروں سے ہوبرڈ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ کیا چکر ہے؟ صاف کیوں نہیں بتاتے کہ کون ہے یہ؟''

''میں بتاتا ہوں جناب اس کی حقیقت......'' نوجوان کریو نے کہا۔ اس نے اپنے آفیسر کی بھی پروا نہیں کی تھی .... اس وقت جان پر بنی ہوئی تھی اور ذرا سی غلط فہمی خطرناک دشمن کے حق میں سود مند ہوسکتی تھی .... کریو نے کمانڈو کو مختصراً الفاظ میں اصل حقیقت بتاڈالی۔

لیکن کمانڈو اتنی جلدی کب اعتبار کرنے والا تھا، اس نے... کریو کو حکم دیا کہ وہ اس کی پشت کے بیگ سے ہتھکڑی نکال کر میرے دونوں ہاتھ باندھ دے۔ جبکہ اس نے اپنے پستول کی نال کا رخ بدستور میری ہی سمت کررکھا تھا۔ مجھے سخت غصہ آنے لگا۔ کریو بھی تذبذب کا شکار ہوگیا۔

''تم پرے ہٹو...... میں نکالتا ہوں......'' ہوبرڈ دانت پیس کر بولا اور آگے بڑھا۔ ٹھیک اسی وقت طیارے کو ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ کافی جھک گیا، نتیجے میں ہم سب کا ہی توازن بگڑا اور...... ہم اِدھر اُدھر لڑکھڑا کر گرنے لگے۔ مگر میرے لیے طیارے کا یہ دوسرا جھٹکا غیر متوقع نہیں تھا، لہٰذا میں نے بہ سرعت اپنے حواسوں اور خود کو سنبھالا اور کمانڈو پر چیتے کی طرح جھپٹا۔ وہ جب تک سنبھلا میں اسی کا پستول اس پر تان چکا تھا۔

''اب بھی وقت ہے، سنبھل جاؤ...... اور میری بات کا یقین کرو، میں ان کا ساتھی نہیں ہوں بلکہ ایک عام مسافر ہوں، میری اپنی ساتھی ہائی جیکر سربراہ کے قبضے میں ہے۔'' میں نے اس کمانڈو سے درشت لہجے میں کہا۔

''پہلے طیارے کے فیول کا فوری بندوبست کرو اس کے بعد اس کے خلاف ایکشن کا سوچنا ہے، میرا وعدہ ہے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ لیکن طیارہ اس کشمکش میں تباہ ہوجائے گا۔ ایندھن ختم ہونے کے قریب ہے اسی لیے یہ بار بار جھٹکے کھا رہا ہے۔''

اس بار کمانڈو ہی نہیں وہ غبی ہوبرڈ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہی کچھ تیزی سے نمٹایا گیا۔ طیارہ لحہ بہ لحہ اب نیچے جارہا تھا۔ مسافروں کی خوف سے جانے کیا حالت ہو رہی ہو گی۔

کمانڈو کو اس قسم کی بھی تربیت تھی۔ اس نے فیول ٹینک والے گوشے میں جا کر جلدی جلدی اپنا کام نمٹایا اور اس کے والو کی خرابی درست کردی۔ فیول تیزی سے ٹینک میں بھرنے لگا۔ طیارے نے دو ایک اور ہلکے جھٹکے کھائے اور پھر اپنی درست رفتار میں آ گیا۔

''میں اپنے اور ساتھی بھی یہاں اتارنا چاہتا ہوں۔ یہ پستول مجھے دے دو۔'' کمانڈو نے مجھ سے تیز لہجے میں کہا۔

''ابھی یہ خطرناک غلطی بھول کر بھی مت کرنا مسٹر!'' میں نے اسے ٹوکا۔ ''پستول ابھی میرے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ ہائی جیکر سربراہ اس وقت کاک پٹ سے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کسی دوسرے آدمی کو اترتے دیکھ لے گا تو میری ساتھی سمیت وہ دو پائلٹس کو بھی گولی کا نشانہ بنادے گا، وہ بہت پاگل اور جنونی آدمی ہے اور اس سے زیادہ بے رحم بھی......''

مگر وہ دونوں اپنی جگہ سے ٹس سے مس تک نہیں ہوئے۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''ٹھیک ہے پھر تم دونوں اِدھر ہی بند رہو۔'' کہتے ہوئے میں اندرونی دروازے کی جانب الٹے پیروں پلٹا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں، کیا میں بھی......'' ایک دم نوجوان کریو نے مجھ سے کہا۔ اس کا نام بیث تھا۔

''آجاؤ تم......'' میں نے اسے اجازت دی، وہ اپنے افسر کے مقابلے میں زیادہ سمجھ دار معلوم ہوتا تھا۔

''ٹھہرو......!'' اچانک کمانڈو بولا۔ ''ہم بھی تمہارے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہیں۔''

''تمہیں اب تک صورت حالات کا ادراک ہوجانا

چاہیے تھا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر برہمی سے کہا۔ وہ دونوں شرمسار اور خجل سے نظر آرہے تھے۔

اس کے بعد ہم سب اندر آگئے لیکن مسافروں والے کیبن میں آتے ہی میں ایک دم چونک پڑا۔

☆☆☆

کمبلر کی جگہ..... مجھے سے.جی کوہارا..... گن ہاتھ میں لیے کھڑا دکھائی دیا تھا۔ اس نے شاید کمبلر کو کاک پٹ میں بھیج دیا تھا اور خود اس کی جگہ لے لی تھی۔ وہ بے حد مکار اور شاطر انسان تھا۔ ایسا اس نے یقیناً یہی دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ نازک مرحلہ (ایندھن بھرنے کا) دیکھے۔

میں نے کمانڈو سے چھینا ہوا پستول پہلے ہی اپنی پشت میں شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اُڑس لیا تھا۔

''کام نمٹالیا گیا شہزی.....؟'' کوہارا نے میری جانب گھور کر پوچھا۔

''ہاں!'' اس کا بار بار ... یوں مخاطب کرنا خجل کررہا تھا مجھے۔

''یہ وہی انجینئر ہے جو فاضل طیارے سے ایندھن کا مسئلہ حل کرنے آیا تھا؟'' کوہارا نے پوچھا۔

''ہاں.....'' میں نے پھر مختصراً جواب دیا۔

''تو پھر اس کا کام ختم.....'' کہتے ہوئے اس نے اپنی گن سے بے دریغ فائر جھونک دیا۔ انجینئر (کمانڈو) کے سینے سے خون کا فوارہ ابلا اور وہ سینہ پکڑے تیورا کر سیٹوں سے ٹکراتا ہوا فرش بوس ہوگیا۔ کئی مسافروں کی بیک وقت چیخیں بلند ہوئیں۔ خود میں لحہ بھر کو بت بنارہ گیا۔ ہوبرڈ اور بیٹ کے چہروں پہ خوف کی پرچھائیاں چسپاں ہوکر رہ گئیں۔

''معاف کرنا دوستو! میں کسی بیرونی آدمی کو یہاں زیادہ دیر ٹکنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ہمارا کام ہوگیا۔ اب آپ سب محفوظ ہو، مگر اس وقت تک جب تک کوئی میرے کام میں مداخلت نہیں کرے۔'' کوہارا کا بیان جاری تھا۔ اس کی بربریت کا کھلی آنکھوں سے مظاہرہ دیکھ کر مسافروں کو چپ سی لگ گئی تھی۔

''تم کچھ کرتے کیوں نہیں ہو۔'' ہوبرڈ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کوہارا نے مجھے آنے کا اشارہ کیا اور میں اپنے سینے میں کوہارا کے لیے غیظ و نفرت کے ہزاروں طوفان چھپائے آگے بڑھا۔

ڈرے سہمے بیٹھے مسافروں کی نشستوں کی درمیانی روپر چلتا ہوا میں کاک پٹ کے پاس پہنچا تو کوہارا نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں رک گیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس رذیل اور سفاک جنونی درندے کا خون پی جاؤں۔ تاہم..... مجھے ایک اطمینان تھا کہ کمانڈو کا پستول اب میرے پاس تھا جس کا کوہارا اور اس کے ساتھی کو علم بھی نہ تھا۔

کوہارا اندر گیا اور اس کا ساتھی کمبلر باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ میں چاہتا تو اس پر ہلا بول سکتا تھا، مگر اندر یاسمین اب کوہارا کے رحم و کرم پر تھی۔

کمبلر نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور میں کاک پٹ کے اندر داخل ہوگیا۔

فیول لینے کے بعد طیارہ جیسے اپنے اندر ایک خاموش طوفان چھپائے مطمئن انداز میں محو پرواز تھا۔

کوہارا نے یاسمین کو حسب سابق میرے حوالے کردیا، جس پر میں نے اندر ہی اندر گہری اور طمانیت بھری سانس لی تھی۔ میں اب کسی وقت بھی موقع تاک کر کوہارا کی قبر کھودنے والا تھا......

ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد حالات میرے حق میں ہونے لگے تھے۔ لیکن کاک پٹ جیسی نازک اور حساس .... جگہ پر کوہارا پر حملہ انتہائی سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔

''گریٹ.....''

کاک پٹ میں سے جی کوہارا کی فاتحانہ آواز ابھری...... وہ اپنی اس قدر کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ اس مردود کو اس قدر مطمئن و مسرور دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا، لیکن میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اس رذیل کو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

فیول..... کی ایمرجنسی بہ خیر و خوبی ٹل گئی تھی۔ یاسمین کو میں نے اپنی چیئر پر بٹھا دیا تھا۔ خود اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ان لمحات میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوہارا مجھ سے کچھ بے پروائی سی برتتے ہوئے ہے۔ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی، یا تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں اس پر دوبارہ حملہ کرنے کا رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، یا پھر وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے اپنی فطرت کے مطابق جس بربریت کا مظاہرہ کیا تھا، اس کی دھاک مسافروں سمیت مجھ پر بھی بیٹھ چکی تھی۔

''ہا.....! مسٹر کیپٹن! اب بولو.....! مصر تو پہنچ ہی جائیں گے ناں اب؟'' تھوڑی دیر بعد کوہارا نے کیپٹن سے جیسے حظ اٹھانے والے انداز میں پوچھا۔

''ہاں! اب ہم قاہرہ ائرپورٹ آرام سے اتر سکتے ہیں۔'' کیپٹن نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا۔

''قاہرہ ائرپورٹ نہیں کیپٹن......!'' اچانک کوہارا نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تت......تو پھر......؟'' کیپٹن پریشانی سے ہکلایا۔

''موبارغہ کے مضافات میں ایک کھلا میدان ہے۔ طیارے کو تمہیں وہیں اتارنا ہے۔'' کوہارا نے کہا۔

''کک...... کیا؟'' کیپٹن بُری طرح ہکلایا۔ ''بب...... بھلا وہاں اتنا بڑا طیارہ کس طرح لینڈ کرسکتا ہے؟ وہاں تو سوائے مٹی اور ریت کے میدان کے سوا کچھ نہیں......''

''جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرنا ہے تم کو بڈھے بگلے......! تمہیں تو دوران پرواز ایندھن بھرنا بھی ناممکن نظر آرہا تھا۔'' کوہارا نے اپنی گن کی نال اس کی گردن سے لگاتے ہوئے کہا۔

یہی وہ وقت تھا جب میرا دایاں ہاتھ دھیرے دھیرے اپنی پشت کی بیلٹ کی جانب سرکنے لگا۔ یاسمین ہی نہیں کوپائلٹ بھی میری اس حرکت کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ طیارہ اب کیوں ہمارے ساتھ پرواز کررہا ہے۔ اسے واپس لوٹ جانے حکم دو کیپٹن!'' کوہارا چیخا۔ اس کی کھاگ نظریں ونڈشیلڈ سے پرے ایک جانب اس فاضل طیارے کا جائزہ لینے لگیں۔

کیپٹن نے رابطہ قائم کیا اور پھر کوہارا سے بولا۔ ''وہ اپنے ساتھی کی واپسی کے منتظر ہیں۔''

''ان سے کہو دفعان ہوجائیں...... ان کا ساتھی مر چکا۔'' کوہارا سفاکی سے غرایا۔

''کک...... کیا......؟ تت...... تم نے اُسے مار ڈالا......؟''

''ہاں......! میں بیرونی آدمی پر بھروسا نہیں کرتا۔ کہو ان سے ہماری نظروں سے دفع ہوجائیں۔'' وہ دہاڑا۔ کیپٹن نے فوراً مائیک پر اس کے الفاظ دہرادیے۔ وہ پریشان بھی ہو گیا تھا۔ اس کے چند ثانیوں بعد ہی وہ طیارہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

اس میں یقیناً کمانڈوز سوار تھے، مگر کوہارا نے ان کا ''مشن'' ناکام بنا ڈالا تھا اور اب یہ پاگل جنونی کوہارا...... نجانے کون سے ایسے ویران مقام پر کیپٹن کو یہ دیوہیکل مسافر طیارہ اتارنے کے لیے دباؤ ڈالے ہوئے تھا۔ صورتِ حال پھر خطرناک ہونے لگی تھی۔

میں نے کسی خیال کے تحت کیپٹن سے پوچھا۔ ''اس وقت ہم کس پوزیشن پر کس ملک کی فضائی حدود سے گزر رہے ہیں؟''

اس وقت تک میرا ہاتھ رینگتے رینگتے پتلون کی بیلٹ تک پہنچ گیا تھا اور انگلیاں پستول کے دستے کو چھونے لگی تھیں، ایسے میں میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کوہارا جیسے جنونی عفریت کو مجھ پر ذرا بھی شبہ ہوجاتا تو وہ پاگلوں کی طرح اندھا دھند مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرسکتا تھا۔ میں اس وقت مکمل رسک لیے ہوئے تھا اور اس کے بنا کوئی چارہ بھی نہ تھا، کیونکہ وہ بدبخت اپنی ضد کا پکا تھا۔ اس نے طیارے کو ایک غیر محفوظ مقام پر اتروانے کا حکم صادر کردیا تھا جس میں جہاز کی تباہی کے پچاس فیصد سے زیادہ امکانات تھے اور یوں کئی سو مسافروں کی جانیں ہم سمیت داؤ پر لگ سکتی تھیں، نیز جانتا تھا میں کہ کوہارا کو اس کی مرضی سے کوئی بھی نہیں ہٹا سکتا تھا۔ ایسا وہ یقینی طور پر انٹرپول پولیس کے ہاتھوں گرفتاری اور اس کی کمانڈو ایکشن فورس سے بچنے کے لیے کررہا تھا...... گویا یہ مردود خبیث اپنی جان بچانے کی خاطر سب کی زندگیاں خطرے میں ڈال رہا تھا۔

یہی وہ وقت تک تھا جب...... میرا ہاتھ بالآخر پستول کے دستے پر اپنی گرفت جما چکا تھا اور پھر اس سے پہلے...... کہ میں اسے باہر کھینچ کر کوہارا کو بے بس کرتا...... اچانک کیپٹن کی جوابی گفتگو ابھری۔ وہ کوہارا کی بات کے جواب میں کہہ رہا تھا۔

''ری فیلنگ کی وجہ سے میں راستہ بھٹک رہا ہوں۔ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ بدستور ڈیش بورڈ پر جھکا ہوا تھا اور ساتھ ہی اپنے ساتھی پائلٹ کو بھی کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...... بڈھے بگلے......؟'' کوہارا نے غصے سے دہاڑ کر پوچھا۔

میری پیشانی پر ان گنت سلوٹیں ابھر آئیں۔ کیونکہ میں راستہ بھٹکنے کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔ میرا ہاتھ پستول پر لگا وہیں رک گیا تھا۔

''میں نے کہا ناں...... میں اپنے فضائی روٹ سے بھٹک گیا ہوں۔ ری فیلنگ کے پروسس کے دوران...... مجھے اپنے طیارے کی ڈائریکشن بدلنا پڑی تھی۔''

''مجھے یہ سبق مت پڑھاؤ......'' کوہارا گرجا۔ ''تم پائلٹ ہو اور تمہارے لیے یہ معمول کی بات ہے، مجھے چکر دینے کی کوشش چاہی تو یاد رکھنا تمہیں گولی مار کے تمہارے ساتھی پائلٹ کو تمہاری سیٹ پر بٹھادوں گا۔''

''تم نہیں جانتے کہ اپنے طے شدہ فضائی روٹ سے

ہٹ کر پرواز کرنا کس قدر خطرناک ہوسکتا ہے۔'' کیپٹن بولا۔
''مخالف سمت سے آنے والا کوئی بھی طیارہ دور سے نقطے کی صورت میں دکھائی دے گا اور ہمیں اپنے جہاز کا رخ بدلنے کا ... موقع ملے بغیر وہ ہم سے ٹکرا جائے گا۔''

کوہارا اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا۔ خود میں بھی ایک بار پھر اسی تشویش کا شکار ہوگیا۔

''تمہاری فائرنگ سے ونڈ شیلڈ کو ہی نہیں بلکہ پینل کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ کمپاس میں خرابی پیدا ہوگئی ہے۔'' کیپٹن کے ان الفاظ نے جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کردیا۔

''کسی قریبی ائر ٹریفک کنٹرولر سے رابطہ کرکے بھی تم اپنی ڈائریکشن درست کرسکتے ہو۔'' کوہارا نے مشورہ دیا۔

''بس...... سر......! ریڈار میں ایک اور نقطہ نظر آرہا ہے۔''

اچانک کو پائلٹ کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ میں نے دیکھا کیپٹن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ خود میں بھی پریشان ہوگیا تھا۔ یاسمین الگ ہراساں نظر آنے لگی تھی۔

کوہارا نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کیپٹن کی گردن پر اپنی گن کا بٹ رسید کردیا۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی اور اس کا اوپری دھڑ پینل پر گرا اور سر وہیں ٹک گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ پتا نہیں طیارے کی پرواز سے پہلے ہی ''اوپر'' پرواز کرگیا تھا یا پھر ابھی نیچے ہی طیارے میں تھا کہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ میں جو کافی دیر سے کوہارا سے کسی مصلحت کی بنا پر اپنے اندر کے ابال پر اب تک قابو پائے ہوئے تھا کوہارا کی اس جنونانہ بلکہ بے وقوفانہ حرکت پر جوار بھاٹے کی طرح پھٹ پڑا اور غایت درجے کی نفرت و غیظ تلے اپنے ہونٹ سکیڑ کے پستول نکال کر اس پر تان لیا۔

سے جی کوہارا کے سان گمان تو کیا اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ ہوسکا ہوگا کہ میرے پاس پستول جیسی کوئی شے بھی ہوسکتی ہے۔

''بس کوہارا......! اب بس......'' میں جوش غضب ناک تلے حلق تک پر زور لگا کر بپھری ہوئی آواز میں اس سے بولا۔

''اب تم نے ذرا بھی حرکت کی تو اسی وقت جان سے چلے جاؤ گے۔ جہاں تمہارا ہاتھ ہے، وہیں رہنا چاہیے اور گن بھی وہیں پھینک دو۔''

کوہارا کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر تندی کے آثار ابھرے۔ اس کی اکلوتی آنکھ پھٹ کر رہ گئی تھی اور وہاں مجھے سرخ آندھی کا بگولا چکراتا نظر آیا۔ اس کی آنکھ شعلے برسانے لگی۔

میں نے اس کے گن والے ہاتھ پر تاک کر گولی چلا دی۔ جس طرح یہ بات بات پر فوراً گولی چلا کر مدمقابل پر اپنی دھاک بٹھاتا تھا یہی کچھ میں اب اس کے ساتھ بھی کرنا چاہتا تھا۔ اسی سبب جب اس نے میرا حکم ماننے میں تامل کیا تو میں نے گولی چلادی۔

کوہارا کی کراہ سے مشابہ چیخ ابھری اور...... گولی نے اس کا گن بدست بازو چھید ڈالا۔

''او گاڈ......! خ خ...... خدا کے لیے اپنی لڑائی چھوڑ دو......ایک جہاز اسی روٹ پر آرہا ہے......''

کو پائلٹ حلق کے بل لرزتی آواز میں بولا۔ میرا دھیان بٹا، ادھر گن اس کے ہاتھ سے چھوٹی۔ وہ سخت جانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اٹھانے کے لیے فرش پر جھکا۔ میں یہی سمجھا وہ اپنی گن اچکنے کے لیے جھکا ہے۔ مجھے سوچ لینا چاہیے تھا کہ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا تھا کہ...... مجھے خود پر پستول تانے دیکھنے کے باوجود ایسی احمقانہ حرکت کرتا، اسی لیے میں نے پوری تسلی کے ساتھ اس کے دائیں پہلو کا نشانہ باندھا اور ٹھیک اسی وقت اس نے بلف کیا، جھکتے ہی وہ وحشیانہ غراہٹ سے جھکائی دینے کے دوران ہی گھوما۔ گولی چلی نشانہ خطا گیا، مگر کوہارا کا ہدف بے خطا نہ گیا، اپنے بھاری بھرکم وجود کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اس نے جھکے جھکے انداز میں لات چلا دی۔ نشانہ میں نہیں تھا، کو پائلٹ تھا۔ اس بے چارے کے سینے پر کوہارا کی اس زور سے ٹانگ پڑی کہ وہ حلق کے بل دل دہلا دینے والے انداز میں چیخا، چونکہ اس کی ٹانگیں کرسی سے بندھی ہوئی تھیں، مگر کوہارا جیسے گینڈے کی ٹانگ کی ضرب اس قدر زوردار اور طوفانی انداز کی تھی...... کہ کرسی فرش سے اکھڑ گئی، وہ کرسی سمیت جھٹکے سے اُچھلا اور مجھ سے ٹکرایا۔ میں لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے گیا اور دیوار سے جالگا۔

یاسمین دہشت زدہ انداز میں چلائی۔

''شش...... شہزی......! ووو...... وہ...... وہ دیکھو......''

اس نے ونڈ شیلڈ کی جانب اپنے ہاتھ کی انگلی کا اشارہ کیا۔

میری اور کوہارا کی بیک وقت پھٹی پھٹی آنکھیں طیارے کی ونڈ شیلڈ پر پڑیں۔

ہمارے طیارے کی ونڈ اسکرین کے پار جہاں تک ہماری نظر جاسکتی تھی ، دیکھا کہ... ایک اور مسافر بردار دیوقامت طیارہ ہمارے طیارے کی سمت طوفانی رفتار سے بڑھا چلا آرہا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی شخصیت میں استقامت اور دبدبہ نمایاں ہوتا ہے... بلکہ ان کی گفتار اور کردار کا لازمی جزو بن جاتا ہے... ایک ایسی پُربہار شخصیت کا ماجرا... وہ شاعر بنے پھر بزبانِ شاعر کلام سنانے کی ذمّے داری بھی نبھانا پڑی... بات یہیں تک نہ ٹھہری بلکہ بڑھتی ہی چلی گئی...

لبوں پر مسکان بکھیر دینے والے ایک کلاکار کی پُرلطف پتا

کلاکار

تمکین رضا



اُس دن اندازہ ہوا کہ بینک منیجر ہونے سے کہیں اہم کچھ اور بھی ہوا کرتا ہے۔ حالانکہ میرا رشتہ اسی بنیاد پر لگا تھا کہ میں ایک اچھے بینک میں منیجر تھا۔

روشنی ایک اچھی لڑکی تھی۔ وہ میرے ابو کے دوست کی بیٹی تھی۔ میں شروع ہی سے اسے پسند کرتا تھا پھر قسمت نے بھی ساتھ دیا اور میری اس سے منگنی ہوگئی۔ چھ مہینوں کے بعد ہماری شادی ہونے والی تھی۔

اس دوران میں ہم ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ میری یہ کہانی اس دن سے شروع ہوتی ہے جب میں نواز کے چکر میں آیا تھا۔ نواز بینک میں میرا ماتحت تھا۔

اس دن بینک میں کام کا رش بہت کم تھا۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھا کوئی اخبار دیکھ رہا تھا کہ اسٹاف کا ایک بندہ نواز کمرے میں داخل ہوا۔

”سر! آپ کو ایک چیز دکھانے آیا ہوں۔“ اس نے کہا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کر دیا۔

اس نے اپنا اسمارٹ فون میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ دیکھیں سر، مزہ آجائے گا۔''

میں نے فون لے کر دیکھنا شروع کر دیا۔ کوئی مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ایک مشہور شاعر زبردست نیشاپوری اپنا کلام سنا رہے تھے۔ لوگ اچھل اچھل کر داد دے رہے تھے۔

''کون ہیں یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''سر یہ زبردست نیشاپوری ہیں۔ زبردست شاعر۔ جس مشاعرے میں جاتے ہیں تہلکہ مچا دیتے ہیں۔''

''ہاں، وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ خاصا تہلکہ مچا ہوا ہے۔''

''لگتا ہے تمہیں شاعری سے بہت دلچسپی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت زیادہ سر۔'' اس نے بتایا۔ ''میرے ابا بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ آپ نے ان کا نام تو سنا ہو گا۔ گمنام سیتاپوری۔''

''نہیں، میں نے نہیں سنا۔''

''یہی تو ان سے غلطی ہو گئی۔ انہوں نے اپنا تخلص ہی گمنام رکھ لیا تھا۔ اسی لیے زندگی بھر گمنام ہی رہے۔ ورنہ وہ شاعر بہت اچھے تھے۔''

''ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔''

''ایک اور بات بتاؤں سر، اس دنیا میں دولت اقتدار اور عہدے وغیرہ کی اہمیت اپنی جگہ لیکن شہرت کی اہمیت کچھ اور ہوتی ہے۔ میں نے زبردست نیشاپوری کی مقبولیت اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ لوگ ان کے آگے بچھے جاتے ہیں۔ کون ہے جو ان سے ملنا نہیں چاہتا۔ لڑکیاں تو ان کی دیوانی ہیں۔''

''لڑکیاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یس سر لڑکیاں؟'' اس نے بتایا۔

''لیکن اس دور میں لڑکیوں کے پاس اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ شاعروں وغیرہ کے چکر میں پڑیں۔''

''یہی بات تو لوگ نہیں جانتے ہیں سر۔ لڑکیاں رومانی شاعری پر جان دیتی ہیں۔ اپنی ڈائری میں نوٹ کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کو میسج میں رومانی اشعار لکھ کر بھیجتی ہیں۔ مجھے تو زبردست نیشاپوری کی قسمت پر رشک آتا ہے۔''

اس وقت میں مسکرا دیا۔ ''نواز شاید تم یہ نہیں جانتے ہو گے کہ میں بھی شعر کہتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کیا؟'' وہ یہ سن کر اچھل پڑا۔ ''آپ بھی شعر کہتے ہیں؟''

''ہاں بھائی، اور وہ بھی رومانٹک۔ جس طرح کی شاعری تمہارے زبردست نیشاپوری کرتے ہیں۔''

''لیکن سر، آپ نے تو یہ راز بھی ظاہر نہیں کیا۔'' اس نے کہا۔

''اس لیے ظاہر نہیں کیا کہ بینک کی ملازمت ایک الگ چیز ہے اور شاعری ایک الگ فن ہے۔ لوگ کہتے . . کہ یہ لو۔ ہمارے بینک منیجر شاعری بھی کرتے ہیں۔''

''سر یہ تو بہت اعزاز کی بات ہے۔ آپ ذرا زبردست نیشاپوری صاحب کو تو دیکھیں۔ کیا زبردست پذیرائی ہوتی ہے ان کی۔ کون ان کو نہیں جانتا؟ سر پلیز اپنا کوئی شعر تو سنائیں۔''

''بھائی، اس وقت تو یاد نہیں ہے۔ کل میں اپنی ڈائری لیتا آؤں گا۔ اس میں لکھے ہوئے ہیں۔''

''ضرور لائیے گا سر، ارے واہ، میں ایک خوش قسمت انسان ثابت ہو گیا ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''دیکھیں نا سر، میں اپنے دوستوں اور خاندان والوں کو فخر سے بتا سکتا ہوں کہ میرے باس ایک شاعر بھی ہیں۔ میرے خاندان میں یہ بہت فخر کی بات ہوتی ہے۔''

وہ کم بخت تو یہ سب بول کر چلا گیا اور میں پھنس گیا کہ میں کیا کروں۔ میں نے یوں ہی اپنا بھرم رکھنے کے لیے یہ شاعری والی بات کر دی تھی۔ ورنہ میرا تو شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

گھر پر کسی شاعر کا ایک دیوان نہ جانے کب کا رکھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسی میں سے کچھ اس کو سنا دوں گا۔ وہ کون سا تحقیق کرنے لگے گا۔

اپنے کمرے میں بیٹھ کر میں نے وہ کتاب نکالی اور پڑھنے لگا۔ پھر اچانک ایک نیا خیال ذہن میں آ گیا کیوں نہ ایک مصرع اس دیوان سے اور ایک اپنی طرف سے لگا دوں۔

اتنا تو علم تھا کہ شعر کے دو مصرعے ہوتے ہیں۔ تب جا کر شعر بنتا ہے۔ بہر حال ایک مصرع نکلا۔ ''تمہاری بات میں جادو، تمہاری چال میں جادو۔'' میں نے اس پر اپنا مصرع لگا دیا۔ ''تم چلتی ہو تو زمانے کا عجب حال ہوتا ہے میرے دلبر۔'' اب وہ شعر کچھ یوں ہو گیا تھا۔ تمہاری بات میں جادو، تمہاری چال میں جادو۔ تم چلتی ہو تو زمانے کا عجب حال ہوتا ہے دلبر۔''

مجھے اس کی بھی سمجھ نہیں تھی کہ شعر وزن میں ہے یا نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک مکمل اور بہترین شعر تھا۔ میں نے دوسرے دن بینک جا کر اس کو یہ شعر سنا دیا۔ اس نے تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ ''واہ سر......واہ......کیا کہنے ہیں۔ یہ ایک شعر ہی غضب کا ہے۔ کیا کہنے ہیں۔ تم چلتی ہو تو زمانے کا عجب حال ہوتا ہے دلبر۔ واہ سر......دلبر کا کیا استعمال ہوا ہے۔ پوری اردو شاعری میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔''

اس کی اس قسم کی دل پھاڑ قسم کی تعریف کے بعد میں نے دوسرے یا تیسرے دن اسی قسم کا ایک شعر کہہ کر اسے سنا دیا جو کچھ یوں تھا۔ ''محبت زندگی ہے اور یہ کتنی پیاری ہے پھر اس پر میں نے اپنا مصرع لگا دیا۔ ''سمندر کنارے بیٹھ کر ڈوبتے سورج سے پوچھ لو۔ اب یہ مکمل شعر کچھ یوں ہو گیا تھا۔ ''محبت زندگی ہے اور یہ کتنی پیاری ہے۔ سمندر کنارے بیٹھ کر ڈوبتے سورج سے پوچھ لو۔''

شعر چاہے جیسا بھی ہوا ہو لیکن اس نے مجھے اس دور کا ایک اہم شاعر ڈکلیئر کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ برسوں کے بعد ایسے شعر سننے کو ملے ہیں۔

اس رات مجھے گھر واپس آ کر سنجیدگی سے سوچنا پڑ گیا۔

ویسے مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ میں نے اسے جو کچھ بھی سنایا ہے۔ وہ بکواس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن اگر کچھ سنجیدہ لوگوں کے درمیان اس قسم کے اشعار سنانے بیٹھ گیا تو میرا کتنا مذاق اڑایا جائے گا۔

اور ایک دن یہ خطرہ سر پر آ ہی گیا۔

اسی کم بخت نے مجھ سے کہا۔ ''سر اگلے ہفتے ہماری طرف ایک مشاعرہ ہو رہا ہے۔ آپ کو اس میں شرکت کرنی ہے۔''

''مشاعرہ؟'' میری تو جان ہی نکل گئی۔

''یس سر، ہماری برادری والوں کی ایک ایسوسی ایشن ہے جو ہر سال مشاعرہ کرواتی ہے۔ اس سال کے مشاعرے میں، میں نے آپ کا نام بھی شامل کر دیا ہے۔ میں نے آپ کی تعریفیں کی ہیں سر۔ میں نے ان کو بتا دیا ہے کہ ایک بینکار بھی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔''

یہ لیں۔ وہ کم بخت میری موت کا پورا بندوبست کر کے آ گیا تھا۔

''ارے نہیں بھائی، مجھے کہاں گھسیٹ رہے ہو۔ میں مشاعروں میں نہیں جاتا ہوں۔''

''لیکن اس مشاعرے میں تو جانا ہوگا سر۔'' اس نے کہا۔ ''یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔ میں سب سے کہہ آیا ہوں اور ویسے بھی ابھی دس دن ہیں۔ آپ کے لیے کیا ہے۔ آپ کو تو دس غزلیں کہہ سکتے ہیں۔ پلیز سر، انکار مت کیجیے گا۔''

بہت بری طرح الجھا دیا تھا اس نے۔ میں کہاں سے شعر کہتا۔ اس کو سنانے والے اشعار تو بہت تھے میرے پاس۔ لیکن وہاں تو باقاعدہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اس میں باقاعدہ شاعر حضرات آیا کرتے ہیں۔ دو منٹ میں میری ساری عزت کا ستیاناس ہو جاتا۔

میں کسی اور کی غزل چوری بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لوگوں کا مطالعہ بھی ہوا کرتا ہے۔ میری چوری پکڑی جاتی تو میرے ساتھ ساتھ وہ بھی بدنام ہو جاتا۔

اس نے مجھے زبردست نیشاپوری کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ مشاعروں میں ان کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ میں نے کسی سے ان کا پتا معلوم کیا اور ان کے گھر پہنچ گیا۔

مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا، وہ جلدی جلدی کرنا تھا۔ کیونکہ مشاعرہ سر پر تھا۔

ان کا مکان شہر کے ایک مضافاتی علاقے میں تھا۔ مکان کیا دو کمروں کا ایک کوارٹر تھا۔ دستک کے جواب میں وہی زبردست نیشاپوری صاحب بنیان اور پاجامہ میں باہر نکلے تھے۔

میں نے اس طرح پہچان لیا کہ میں ان کی وڈیو دیکھ چکا تھا۔

''جی میاں، کس سے ملنا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جناب، آپ ہی سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''دیکھو، اگر کسی ایسوسی ایشن کی طرف سے کسی مشاعرے کی دعوت دینے آئے ہو تو میں یہ بتا دوں کہ میں اس پورے مہینے بک ہوں۔ ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی مشاعرہ ہے۔''

''نہیں جناب، میں کوئی دعوت دینے نہیں آیا بلکہ آپ کی خدمات حاصل کرنی ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''سمجھ گیا۔'' وہ مسکرا دیے۔ ''شاگرد بننے آئے ہو؟ دیکھو، شاگرد بننے اور بنانے کے کچھ اصول ہوا کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ منہ اٹھا کر چلے آئے۔ پہلی بار مٹھائی لائی جاتی ہے۔ دوسری بار پگڑی کے ساتھ ساتھ کچھ نذرانہ بھی لایا جاتا ہے۔''

''قبلہ، مٹھائی تو میں لے آیا ہوں۔'' میں نے اپنی جیب سے دو ہزار نکال کر اُن کی طرف بڑھا دیے۔ ''یہ لیں جناب، اسے مٹھائی سمجھیں۔''

زبردست نیشاپوری ایک دم سے خوش ہو گئے۔

''سلامت رہو میاں، سلامت رہو۔ یہ بات ہوئی نا، آؤ اندر آ جاؤ۔ اطمینان سے باتیں ہوں گی۔''

وہ مجھے اندر لے آئے۔ خستہ سا کمرا تھا جس میں مختصر سا سامان تھا لیکن کتابیں بہت سی تھیں۔ ''بیٹھ جاؤ میاں۔ اتفاق سے اس وقت بیگم گھر پر نہیں ہیں اسی لیے خود چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

''زبردست صاحب، کوئی تکلف نہ کریں۔''

لیکن وہ نہیں مانے۔ مجھے کمرے میں بٹھا کر چلے گئے۔

کچھ دیر بعد وہ چائے بنا کر لے آئے تھے۔ وہ بھی میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ''ہاں میاں، اب بتاؤ کیا سلسلہ ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جناب، مجھے شاعری نہیں آتی۔'' میں نے بتایا۔

''تو اس میں کون سی بُرائی ہو گئی؟ شاعری تو کالو پان

والے کو بھی نہیں آتی۔" انہوں نے کہا۔
"لیکن فرق یہ ہے جناب کہ کالو پان والے کو مشارے میں نہیں بلایا جاتا، مجھے بلایا گیا ہے۔"
یہ سن کر زبردست نیشاپوری نے ہنسنا شروع کر دیا۔
"میں سمجھ گیا۔ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے۔ سمجھ گیا یعنی تمہیں مشاعرے میں جا کر کوئی غزل سنانی ہے؟"
"جی جناب اور میں غزل سے صرف اس حد تک واقف ہوں کہ میری ایک ٹیچر کا نام غزل ہوا کرتا تھا۔ مس غزل کہلاتی تھیں۔"
"اوہو ہو۔" اس بار وہ بہت دیر تک ہنستے رہے تھے۔
"دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو، کیا کرتے ہو؟"
"ایک بینک میں منیجر ہوں جناب۔"
"واہ۔" اس بار وہ مرعوب سے ہو گئے تھے۔ "چلو، بہت اچھا ہے۔ کبھی تمہاری ضرورت پڑسکتی ہے۔"
"کیوں نہیں جناب، حاضر ہوں۔" میں نے کہا۔
"چلو اب کام کی بات کر لیں۔ میں سمجھ گیا کہ تمہیں کسی مشاعرے میں شریک ہونا ہے اور تمہارے پاس کوئی غزل نہیں ہے۔"
"جی جناب، یہی بات ہے۔"
"کوئی بات نہیں۔ تم غزل مجھ سے لے جاؤ۔" انہوں نے کہا۔ "بلکہ ایسا کرو، ہر ہفتے ایک غزل لے جایا کرو۔ بس ہزار روپے دے دیا کرنا۔ میاں بہت سستا سودا ہے خود سوچو۔ تم شاعر کی حیثیت سے کتنے مشہور ہو جاؤ گے؟"
"ٹھیک ہے جناب۔" میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔
"مہینے میں چار غزلیں۔ یعنی چار ہزار روپے۔ ہے نا۔"
"ہاں بھائی اور رازداری کی شرط کے ساتھ۔ کسی کو بھی نہیں معلوم ہوگا کہ تم غزلیں مجھ سے لکھواتے ہو۔ اب بتاؤ، سستا سودا ہوا یا نہیں؟"
"بالکل ہو گیا۔"
"دیکھو میاں، یہ سودا بالکل ایمانداری کا ہوتا ہے۔ تم پرسوں آ کر اپنی دو غزلیں لے جانا اور ہاں، تم نے کوئی تخلص تو سوچا ہوگا؟"
"جی جناب، تیور۔ تیور ناظم آبادی۔"
"تیور؟ یہ کیسا تخلص ہے؟"
"بہت اچھا ہے جناب۔" میں نے کہا۔ "تیور تو تخلص ہو گیا اور ناظم آبادی اس لیے کہ میری رہائش ناظم آباد میں ہے۔"
"واہ، یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ اپنے شہر کو یاد رکھا جائے۔ اب مجھے دیکھو۔ میرے باپ دادا بھی نیشاپور گئے ہوں گے لیکن میں نے ابھی تک اس نام کو زندہ رکھا ہے۔ بہر حال تم پرسوں آ جانا۔"
میرا کام بن گیا تھا۔ میں بھی شاعر ہونے والا تھا۔ اب میں بھی مشاعروں میں اپنی دھاک بٹھا سکتا تھا۔ مجھے اب اس مشاعرے کی بھی پروا نہیں تھی جو دو تین دن کے بعد ہونے والا تھا۔

دو دن کے بعد میں زبردست نیشاپوری صاحب سے دو شاندار غزلیں لے کر آ گیا۔ اس وقت میں نے ان کی خدمت میں دو ہزار پیش کر دیے تھے۔ وہ بہت مشکور تھے۔ انہوں نے مجھے مشاعرے میں غزلیں پڑھنے کی پریکٹس بھی کروا دی۔
نواز کی برادری میں ہونے والے مشاعرے میں، میں نے وہ غزلیں سنا دیں جو زبردست صاحب نے دی تھیں۔ کیا غزلیں تھیں۔ یوں سمجھ لیں کہ مشاعرہ میرے ہی ہاتھ رہا تھا اور نواز کا یہ حال تھا جیسے میری پذیرائی دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سما رہا ہو۔
ایک مشاعرے کے بعد دوسرا مشاعرہ۔ پھر تیسرا۔ میرا یہ حال ہو گیا کہ میں ایک معتبر شاعر کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا۔
میری منگیتر روشنی میری ان کامیابیوں سے بہت خوش ہوا کرتی۔ وہ فون پر مبارک باد دیتی۔ "یار مجھے تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اتنے اچھے شاعر بھی ہو۔"
نواز دفتر میں اسٹاف کے دوسرے لوگوں سے کہا کرتا۔ "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ اپنے منیجر تیور ناظم آبادی بلا کے شاعر ہیں۔ واہ، واہ، کیا کلام ہوتا ہے اُن کا۔"
کسی نے پوچھا۔ "لیکن ہمیں پہلے تو پتا ہی نہیں چلا تھا۔"
"یہی تو بڑے لوگوں کا کمال ہوتا ہے وہ اپنا آپ ظاہر ہی نہیں کرتے۔ گم نام رہتے ہیں جس طرح میرے ابا تھے۔"
ایک دن اس نے ایک مشاعرے کا دعوت نامہ لا کر دیا تھا۔
"سر اس مشاعرے میں صدارت آپ کی ہوگی۔ چلیں گے نا سر؟"
"کیوں نہیں؟" میں خوش ہو کر بولا۔ "پہلی بار کسی مشاعرے کی صدارت ملنے والی تھی۔ یہ ایک اعزاز کی بات تھی۔ "ضرور چلوں گا۔"
"یہ ایک فی البدیہہ مشاعرہ ہوگا سر۔" اس نے بتایا۔
"یہ کیا ہوتا ہے؟"
"آپ تو جانتے ہی ہوں گے سر۔ اس میں ایک مصرعہ دے دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آدھ گھنٹے میں وہیں بیٹھ کر غزل لکھ لیں۔ سب کو کاغذ قلم بھی دے دیا جاتا ہے۔"
یہ سن کر میرے تو ہوش ہی ٹھکانے لگ گئے۔ میں ایسے مشاعرے میں کیسے شرکت کر سکتا تھا۔ میرے تو فرشتے بھی

ایک شعر نہیں کہہ سکتے تھے اور وہاں یہ حال تھا کہ پوری غزل کہنی تھی۔

''سر! مجھے امید ہے کہ اس مشاعرے میں بھی سب سے اچھی غزل آپ ہی کی ہوگی۔''

میں دل ہی دل میں اُسے گالیاں دے کر رہ گیا۔ کم بخت نے کہاں پھنسوایا تھا۔

مشاعرہ اگلے ہفتے تھا اور میرے پاس سوچنے کے لیے صرف تین دن رہ گئے تھے۔ سچویشن ایسی تھی کہ میں زبردست نیشاپوری کی خدمات بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس شرمندگی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا جس پر فوری طور پر عمل بھی کرنا تھا۔

ایک مشاعرے کی صدارت مل بھی رہی تھی تو وہ اتنا بے ڈھب مشاعرہ تھا۔

مجھے فوری طور پر غزل کہنی تھی اور یہ سب اسی وقت ہوسکتا ہے جب بندہ صحت مند ہو۔ اگر کوئی بیمار ہو جائے تو کسی مشاعرے میں کہاں جا سکتا ہے۔ لہٰذا میں بیمار پڑ گیا۔ وہ بھی دل کا مریض۔

ڈاکٹر اسلم بینک کے کلائنٹ تھے۔ وہ اپنا ایک اسپتال چلا رہے تھے۔

اتفاق سے وہ کسی کام سے بینک آئے۔ تو میں نے انہیں اپنے چیمبر میں بلا لیا۔ میں نے ان کے لیے کافی منگوا کر رکھ لی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب، آپ سے ایک ایسا بے ڈھنگا کام آپڑا ہے کہ اگر آپ نے ساتھ نہیں دیا تو میری عزت خاک ہو جائے گی۔''

''ارے، ایسا کیسا معاملہ ہے خدا خیر کرے، بتائیں مجھے۔''

''ڈاکٹر صاحب، دو تین دنوں کے لیے مجھے اپنے اسپتال میں ایڈمٹ کرلیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہ بھی دل کے شعبے میں۔''

''بھائی یہ کیوں؟ یہ تو بہت عجیب بات ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب، میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ آپ کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔''

''نہیں بھائی، مجھ پر یقین رکھیں۔ بات کیا ہے؟''

پھر میں نے خود کو احمق تصور کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ بہت دیر تک ہنستے رہے۔ ''بھائی یہ تو کمال کی کہانی ہے۔''

''بس اس وقت معاملہ عزت کا ہے۔'' میں نے کہا۔

ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

ان کی ہدایت کے مطابق مجھ پر اسی وقت دل کا مصنوعی دورہ پڑ گیا۔ بینک والوں نے فوری طور پر ایمبولینس منگوالی۔ وہ کم بخت نواز بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے اسپتال شفٹ کر دیا گیا۔

جہاں ایک ہفتے تک میرا مصنوعی علاج ہوتا رہا۔

بہت سے لوگ مجھے دیکھنے آتے رہے۔ ان میں رشتے دار اور دوست سب تھے۔ ایک دن میری منگیتر روشنی بھی گھر والوں کے ساتھ ملنے آگئی۔ اس کے والد بھی اس کے ساتھ تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد روشنی کے والد نے کہا۔ ''بیٹے میری روشنی کے لیے تم جیسا ہیرا رشتہ اور کہاں مل سکتا ہے لیکن بیٹے ہمیں مجبور سمجھ کر معاف کر دینا۔''

''میں نہیں سمجھا جناب۔''

''بیٹے میں اپنی پیاری اور چہیتی بیٹی کو دل کے کسی مریض کے حوالے نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کو روشنی نے بھی سمجھ لیا ہے۔ اسی لیے اس منگنی کو ختم سمجھو۔ خدا تم کو صحت دے۔''

''ارے بات تو سنیں۔'' میں بری طرح بوکھلا گیا۔

لیکن وہ کہاں سننے والے تھے۔ وہ سب میری صحت کی دعائیں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔

میرا یہ حال تھا کہ میں اپنے بال نوچ رہا تھا۔ نہ جانے کون سا منحوس لمحہ تھا جب میں نے شاعر ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور وہ نواز...... کو خدا غارت کرے۔ وہ بھی تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔

اس چکر میں میری منگنی بھی ختم ہوگئی تھی۔ پرابلم یہ تھی کہ میں کسی کو صحیح بات بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ میرا جو امیج بن گیا تھا۔ وہ برباد ہو کر رہ جاتا۔

میں ابھی سکتے ہی کے عالم میں تھا کہ وہی نواز پھولوں کا گلدستہ لے کر آ گیا۔ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ''مبارک ہو سر، بہت بہت مبارک۔''

''کس بات کی مبارک؟''

''سر! آپ کی علالت کی وجہ سے اس مشاعرے کو ملتوی کر دیا گیا ہے اور جب آپ صحت یاب ہو کر واپس لوٹیں گے تو وہ مشاعرہ ہوگا پہلے سے زیادہ اہتمام کے ساتھ۔ اور آپ ہی کی صدارت میں۔''

میں نے یہ سنا اور اسی وقت میرے سینے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔

اس بار مجھے واقعی دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔



قاتل و مقتول

رو بینہ رشید

ظلم... زیادتی... کی کوئی نہ کوئی انتہا ہوتی ہے... انتقام کی حدیں ہوتی ہیں... مگر سچ کی کوئی حد مقرر نہیں... وہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے... سمندر کی طرح دراز... خاموش اور گہرا... وہ بھی ایک انہونی کا شکار ہو چکا تھا... آس پاس وہ مناظر اور ثبوت تھے جو اسے مجرم گردانتے تھے... بچاؤ کا کوئی راستہ نہ تھا... وہ خاموش تھا... اور جھوٹ کی مضبوط اینٹوں کے درمیان ایستادہ تھا... تمام تر مایوسی... اور قانونی موشگافیوں کے باوجود وہ یقین کی طاقت پر جما تھا... اسے انتظار تھا کہ وہ جھوٹ... مکر و فریب کی ان مضبوط اینٹوں کو توڑ دے گا...

مجرموں کی ذاتی چپقلش کا فسانہ... ایک جرم کا شاخسانہ... سرورق کا تکملہ

چاروں طرف رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

آسمان پر دمکتا آدھا چاند کبھی بادلوں کی اوٹ میں چلا جاتا تو کبھی اس کی مدھم روشنی اردگرد کے ماحول کو روشن کر دیتی۔ یہ متوسط طبقے کی ایک صاف ستھری ...

تمام مکانات ون یونٹ بنگلوز کے انداز میں بنے ہوئے تھے۔ ہر گھر کے گیٹ کے ساتھ ایک چھوٹا سا باغیچہ سا بنا ہوا تھا جہاں درخت اور پودے لہرا رہے تھے۔

وہ دبے پاؤں گلی میں داخل ہوا تھا۔ اس کی نظریں

سڑک کے آخری کونے پر موجود مکان پر جمی ہوئی تھیں جس پر کیا گیا تازہ رنگ و روغن اسے باقی مکانات سے تھوڑا سا ممتاز کر رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اسی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دیکھنے میں وہ لمبی قد و قامت، اکہری جسامت اور اچھی شخصیت کا مالک نظر آرہا تھا۔ اس کے بال قدرے لمبے تھے جنہیں اس وقت اس نے پونی کی شکل میں ربر بینڈ میں جکڑ رکھا تھا۔ سیاہ رنگ کے لباس اور شوز میں وہ تاریک رات کا ایک حصہ ہی لگ رہا تھا۔ مکان کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں غصہ اور نفرت نیون سائن کے مانند جگمگا رہے تھے۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس گھر کو اس کے مکینوں سمیت لمحہ بھر میں صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالتا۔

''میں انہیں نہیں چھوڑوں گا، انہیں تباہ و برباد کر دوں گا۔'' اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے سوچا۔ ''انہیں تو اندازہ بھی نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

مکان کی دوسری جانب خالی جگہ میں کئی پودے اور درخت اگائے گئے تھے مگر اس کی توجہ ان کے درمیان موجود پرانے اور کافی بڑے نیم کے درخت پر مرکوز تھی۔ اس کی مضبوط شاخیں لمبے لمبے بازوؤں کے مانند گھر کی بالکونی تک پہنچی ہوئی تھیں۔ اس نے درخت کے پاس پہنچ کر اس کے تنے پر ہاتھ رکھا۔ یہ درخت اسے اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا تھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس سوچ کے ساتھ اس کے چہرے سے گزرتی چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ کسی بندر کے مانند تیز رفتاری سے درخت پر چڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

''زارا یہ فلم تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔'' اسحاق نے اپنی خوب صورت بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے جمائی لی۔ ''پتا نہیں یہ لوگ اتنی لمبی لمبی فلمیں کیوں بناتے ہیں اور آخر تم پورے گانے بھی دیکھتی ہو یار...... اس سے تو یہی بہتر تھا کہ ہم گپ شپ کر لیتے...... یا پھر سو جاتے۔''

''کمال ہے بھئی، اتنی اچھی فلم ہے...... اور وہ بھی عامر خان کی فلم...... تم اسے بیکار کہہ رہے ہو۔'' زارا نے گویا برا مانتے ہوئے کہا۔ وہ عامر خان کی ڈائی ہارٹ قسم کی مداح تھی اور اس وقت اسحاق نے براہِ راست اس کی فین شپ پر حملہ کر دیا تھا۔

''میں عامر خان کو تو کچھ نہیں کہہ رہا، تمہیں تو معلوم ہے کہ وہ مجھے بھی پسند ہے۔'' اسحاق نے پہلے حملے پر ہی ہتھیار ڈالتے ہوئے دفاعی انداز میں کہا۔ ''مگر آدھی رات کے بعد انسان کا دماغ ویسے بھی کچھ صحیح کام کرنا چھوڑ دیتا ہے...... یہ میں نہیں دنیائے ڈاکٹرز کہتے ہیں۔'' وہ بیوی کی آنکھیں نکالنے پر گڑبڑا کر بولا۔

''تمہیں معلوم ہے نا کہ رات میں ہمارا دماغ ایک کیمیکل خارج کرتا ہے جو دن بھر میں ہونے والی اعصابی ٹوٹ پھوٹ کو قدرتی انداز میں ٹھیک کرتا ہے۔ اگر ہم نہ سوئیں تو یہ کام نہیں ہو پاتا...... اور یہ بھی کہ یہ عمل رات دس بجے سے صبح چار بجے تک ہی ہوتا ہے اور یہ بھی کہ یہ کیمیکل ہمارے جسم کو نہ ملے تو صحت خراب ہو جاتی ہے، اعصاب جلد جواب دینے لگتے ہیں، بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں...... اور سب سے بڑھ کر جھریاں جلد آسکتی ہیں، رنگت بھی خراب ہو سکتی ہے اور تمہاری جیسی 26 سال کی حسینہ 62 سال کی بھی نظر آسکتی ہے تو تمہارے لیے ہی کہہ رہا ہوں میں......'' وہ کندھے اچکاتا ہوا بولا۔

''ارے بابا بس، اتنی لمبی تقریر......'' زارا نے اسے گھورا پھر ہنس دی۔ ''ٹھیک ہے میں باقی فلم کل دیکھ لوں گی...... اب خوش......؟''

''ہاں...... کیا بات ہے تمہاری...... اپنے مجازی خدا کا مشورہ ماننے کا شکریہ......'' وہ اس کے سامنے خم ہوتے ہوئے بولا۔

''او مسٹر مجازی خدا...... مہربانی فرما کر اب سونے چلیے...... ایسا نہ ہو کہ میرا ارادہ بدل جائے۔'' وہ اسے دھمکاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''خبردار...... چلو......'' وہ چھلانگ لگا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ''ویسے سونے سے قبل اگر تم ایک کپ چائے بنا لو تو یقین جانو کہ تمہاری عظمت ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش ہو جائے گی۔''

''چائے...... سونے سے پہلے کون پیتا ہے چائے؟''

''میں......'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''بڑے افسوس کی بات ہے ہماری شادی کو کل ملا کر گیارہ دن اور سترہ گھنٹے ہو چکے ہیں اب تک تو تمہیں یہ بات معلوم ہو جانی چاہیے تھی مگر آج کل کی یہ بیویاں انہیں شوہروں کا ذرا خیال نہیں ہوتا۔'' وہ سرد آہ بھر کر بولا۔

''اُف توبہ...... کتنے بڑے ڈرامے باز ہیں...... بنا دیتی ہوں چائے......'' زارا سر جھٹک کر بولی۔

''واہ واہ...... اسے کہتے ہیں کہ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر...... نہیں شاید یہ یہاں غلط ہو گیا ہے۔'' وہ سر

کھجاتے ہوئے بولا۔

''اسحاق میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ شاعری کی ٹانگ مت توڑا کریں۔'' زارا نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ بھی علامہ اقبال کے شعر......اور یہ شعر ویسے بھی بہت اچھا ہے گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر، ہوش وخرد شکار کر، قلب ونظر شکار کر......'' وہ اپنے لمبے گھنے بالوں کی چوٹی کو جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔

''اُف میں چائے بھول چکا ہوں۔'' اسحاق مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا مگر عین اسی وقت دھپ کی آواز نے ان دونوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ آواز کافی تیز تھی اور بہت قریب سے آئی تھی جیسے کوئی ان کے گھر میں کودا ہو، گھر میں ان کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اسحاق نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر زارا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود پچھلے دروازے کی طرف بڑھا۔

وہ متوحش نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

زارا اور اسحاق ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ اسحاق نے تو اسے پہلی ہی نظر میں پسند کرلیا تھا پھر جوں جوں وقت گزرا اور ان دونوں کی رسمی شناسائی عام دوستی تک پہنچی، وہ اس کی عادات اور اچھی فطرت پر فریفتہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے بعد سب کچھ بہت تیزی سے ہوگیا تھا۔ اسحاق زندگی کو پیچیدہ اور دشوار بنانے کا قائل نہیں تھا لہٰذا جیسے ہی اسے اس بات کا ادراک اور پھر یقین ہوا کہ زارا ہی وہ لڑکی ہے جس کے ساتھ وہ اپنی زندگی خوشی سے گزار سکتا ہے، اس نے سیدھے سبھاؤ دفتری انداز میں زارا سے اس کی مرضی پوچھ ڈالی۔ زارا نے بھی اسے اتنے ہی سیدھے سادے طریقے سے اپنے والدین سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اسحاق کے والدین تو کئی سال پہلے انتقال کرچکے تھے۔ اس کی ایک بڑی بہن تھی جو اپنے خاندان کے ہمراہ ملک سے باہر قیام پذیر تھی۔ اس نے اپنی آپی سے بات کی۔ انہوں نے آن لائن رشتہ پیش کیا جس کے بعد اسحاق اپنی ایک رشتے کی خالہ کو لے کر زارا کے گھر پہنچا۔ زارا کے والدین کو دونوں بہن بھائی بہت پسند آئے تھے پھر بھی رسمی دیکھ بھال اور انکوائری کے لیے وقت لیا گیا جس کے بعد ان کی جانب سے ہاں کردی گئی۔

اسحاق نے شادی میں اپنی ایک ہی شرط رکھی تھی کہ اسے زارا کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ اس کے پاس اپنا گھر موجود تھا جو اس نے اپنا آبائی گھر فروخت کرکے خریدا تھا۔ ایک سیکنڈ ہینڈ کار بھی تھی جس کی اقساط وہ تنخواہ سے ادا کررہا تھا۔ یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مطابق سات ماہ کے اندر وہ زارا اسکندر سے زارا اسحاق بن گئی۔ اس شادی سے وہ بہت خوش تھی مگر اس وقت ایک عجیب سے خوف نے کسی اینا کونڈے کے مانند اسے جکڑ لیا تھا۔ اگرچہ اس کا ذہن اس بات کو تسلیم نہیں کررہا تھا اور اسے اس کا وہم قرار دے رہا تھا مگر دل کسی انجانے خطرے کا سائرن بجا رہا تھا۔ اعصاب میں سرخ رنگ کی بتی جل بجھ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں شکیل احمد کی تصویر ابھر آئی تھی۔ شکیل اس کے محلے میں رہتا تھا۔ زارا نے تو خیر اسے کبھی غور سے دیکھا بھی نہیں تھا مگر وہ نہ جانے کب سے اسے اپنے دل ودماغ میں بسائے بیٹھا تھا۔ اسے تو اس بات کی خبر تب ہوئی جب اس کی منگنی کے لڈو محلے میں تقسیم ہوئے۔ اگلی صبح جب وہ دفتر جانے کے لیے نکلی تو شکیل اس کے راستے میں کھڑا تھا۔

''یہ منگنی توڑ دو زارا......'' وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ......دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟'' اس نے سختی سے کہا۔

''دماغ تو خراب ہونا ہی ہے، میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، برسوں تمہارا خواب دیکھا ہے، بس یہ چاہ رہا تھا کہ کسی قابل ہوجاؤں تو تم سے بات کروں گا مگر تم نے اتنی جلد منگنی رچالی۔''

''دیکھیے......اگر آپ نے ایسا کچھ سوچا بھی تھا تو اس میں میرا کیا قصور ہے، اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ میری منگنی ہوگئی ہے اور میں اس سے خوش ہوں۔'' وہ اس بار قدرے نرمی سے بولی۔ ''اب آپ میرے راستے سے ہٹ جائیں۔''

''مجھے تم کیا راستے سے ہٹاؤ گی......؟'' وہ غرایا۔

''اتنا آسان نہیں ہے اس طرح کسی کو دھوکا دینا......''

''میں نے کب دھوکا دیا ہے تمہیں؟ میری تو تم سے کبھی بات بھی نہیں ہوئی۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''تو اب تو ہوگئی ہے نا تم نے سن لیا نا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور تمہیں مجھ سے ہی شادی کرنا ہوگی۔''

''یہ کیا بکواس ہے......مجھے تم سے شادی نہیں کرنا۔'' اس بار وہ تیکھی غصے سے بولی۔ ''اور یہ کوئی مذاق بھی نہیں ہے۔ تم ہٹتے ہو میرے سامنے سے یا میں کسی کو بلاؤں؟''

''شادی تو تم کو مجھ سے ہی کرنا ہوگی ورنہ یہ جو تمہارا

خوب صورت چہرہ ہے نا اسے برباد کردوں گا میں...... پھر دیکھتا ہوں کون کرے گا تجھ سے منگنی...... یا پھر اس کا ٹینٹوا ہی دبادوں گا نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری......''

''تم......تم شاید پاگل ہو۔''

''میری بات یاد رکھنا...... تمہاری شادی صرف مجھ سے ہوگی...... جب میں نے کہہ دیا تو کہہ دیا......'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' وہ بولی۔

اس نے گھر آتے ہی یہ سارا واقعہ اپنے والدین کو بتا دیا تھا۔ اس کے والد تھوڑی دیر کے لیے چپ سے رہ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر باہر چلے گئے جب وہ واپس آئے تو قدرے مطمئن تھے۔

''کیا کیا اس نابکار کا......؟'' زارا کی والدہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''اس کے والد سے بات کر کے آیا ہوں بے چارے اچھے آدمی ہیں قسم کھائی ہے انہوں نے کہ اب ہمیں ذرا بھی زحمت نہیں ہوگی۔''

''چلو شکر ہے ورنہ آج کل تو یہ عجیب زبردستی چل پڑی ہے۔ اخباروں میں پڑھ پڑھ کر دل دہل جاتا ہے اور یہ ہمارے اپنے ساتھ ہی ہوگیا۔''

''بس اب بات ختم ہوگئی تم دونوں بھی اس بات کو یہیں ختم کردو...... سمجھ گئی نا۔'' وہ بولے۔

اس کے بعد اس نے شکیل کو دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔

اس وقت اس آواز اور اسحاق کے باہر جانے نے اس سارے واقعے کو اس کے ذہن میں ری وائنڈ سا کر دیا تھا۔

اگر یہ وہی ہوا تو......؟ اگر اس نے اسے یا اسحاق کو یا دونوں کو ہی کوئی نقصان پہنچا یا تو؟ اخباروں میں پڑھی اس قسم کی سیکڑوں خبریں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی تھیں۔ یوں بھی محلے میں شکیل کی شہرت ایک بدمعاش اور اوباش لڑکے کی سی ہی تھی۔ اس نے ایک لمحے کو دروازے کی جانب دیکھا، اسحاق اب تک واپس نہیں آیا تھا نہ ہی اب باہر سے کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے موبائل کی طرف دیکھا اور سوچے سمجھے بغیر پولیس ایمرجنسی کا نمبر دبا دیا۔

☆☆☆

وہ آسانی سے درخت پر چڑھ گیا تھا۔ ایک موٹی سی شاخ پر بیٹھنے کے بعد اس نے کندھے پر لٹکے سیاہ تھیلے سے چھوٹی سی دوربین نکال کر آنکھوں پر لگائی۔ بالکونی کے ساتھ بنے ہوئے کمرے کی روشنی جل رہی تھی مگر کوئی باہر نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر ذرا دیر بعد اس کے سامنے ایک مرد کا مسکراتا ہوا چہرہ آگیا۔ قدرے گوری رنگت، بھورے بال، بھوری آنکھوں سے سجا یہ ایک وجیہہ چہرہ تھا۔ اس نے ہاتھ کا رخ بدلا تو دیکھتا رہ گیا...... اب اس کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ وہی معصوم سا سنہرا چہرہ، چھوٹی سی خوب صورت ناک، نیلی آنکھیں، وہ دونوں باتیں کررہے تھے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کی گفتگو سننے سے قاصر تھا۔ یوں بھی ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر ہی وہ طیش کی آگ میں جھلس سا گیا تھا۔ عین اسی وقت اسے اپنی پنڈلی پر کچھ رینگتا ہوا محسوس ہوا پھر یک دم کسی نے ایک لمحے کے لیے پنڈلی میں آگ سی بھر دی، وہ بے اختیار پیر کھجانے کے لیے جھکا...... جس شاخ کو وہ بہت مضبوط سمجھ رہا تھا، وہ اس کے جھکنے کے ساتھ ہی عجیب طریقے سے لہرائی...... اس سے پہلے کہ وہ ٹوٹ جاتی اس نے اپنی تکلیف کو بھول کر دوسری شاخ کی طرف چھلانگ لگائی۔ اس پر وہ پہنچ تو گیا مگر اسے تھامنے میں لمحہ بھر کی تاخیر ہوگئی جس کے نتیجے میں وہ پھسلتا ہوا نیچے آگیا۔ چونکہ وہ گھر میں جھانکنے اور اندر اترنے کی نیت سے درخت پر کافی اندر کی طرف چلا گیا تھا اس لیے وہ پھسل کر گھر کے اندرونی حصے میں بنے چھوٹے سے لان کی گھاس پر گرا، چند لمحوں کے لیے اس کے اوسان خطا سے ہوگئے پھر وہ مشکل سے کھڑا ہوا۔ اس نے تیزی سے چاروں جانب نگاہیں گھمائیں۔ پتلی سی کوریڈور نما گلی میں کچھ آگے ایک لمبا اسٹول رکھا ہوا تھا جو غالباً صفائی یا رنگ وروغن والوں کے زیر استعمال رہا ہوگا۔ وہ لپک کر اس کی طرف بڑھا، اسے دیوار سے لگایا اور اس پر چڑھ کر دیوار سے دوسری جانب چھلانگ لگا دی۔ قسمت یہاں بھی اس کے خلاف ہی تھی۔ اس کا پیر زمین پر پڑے کسی پتھر پر لگ کر رپٹ گیا اور وہ ایک بار پھر زمین پر جا گرا مگر اس وقت اس کے پاس رکنے، اپنی چوٹوں کا جائزہ لینے کا موقع بالکل نہیں تھا۔ مکان میں کوریڈور کی لائٹ جل اٹھی تھی۔ وہ تیزی سے کھڑا ہوا اور دوڑتا ہوا گلی کے دوسرے کونے تک پہنچ گیا وہاں رک کر اس نے اپنی سانس درست کی اور مڑ کر اس مکان کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا۔

''کوئی بات نہیں، ایک دن اور سہی......کل کا معرکہ فیصلہ کن ہوگا۔'' اس نے گویا خود کو یقین دلایا اور تاریکی میں گم ہوگیا۔

☆☆☆

''کیا ہوا؟ سب خیر ہے نا.....؟'' اسحاق کو واپس آتا دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ''آپ کو اتنی دیر کیوں لگ گئی؟'' زارا دوڑ کر اس کے قریب پہنچی تھی۔

''باہر کچھ نہیں ہے۔'' اسحاق نے جواب دیا، اس کا چہرہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''مگر کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے، مجھے یقین ہے کہ یہاں کوئی آیا تھا۔''

''کیوں، ایسا کیوں لگا آپ کو.....؟'' زارا نے سہم کر پوچھا۔

''اندر کی طرف کسی کے پیروں کے نشان نظر آئے ہیں۔'' وہ بولا۔ اسی وقت باہر سے پولیس سائرن کی آواز آئی اور پھر ان کے گیٹ کی بیل کی آواز گونجی۔

''یہ کون ہے؟''

''پولیس.....'' زارا بے اختیار بولی۔

''پولیس کیسے آگئی.....؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ڈر گئی تھی.....آئی ایم سوری میں نے فون کر دیا تھا۔'' زارا کو اب اپنا یہ قدم حماقت لگ رہا تھا۔

''نہیں، تم نے ٹھیک کیا ہے۔'' اسحاق نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور باہر کا رخ کیا۔

دروازے پر ایک پولیس کار اس کی منتظر تھی۔ انہوں نے اپنا سائرن بند کر دیا تھا۔ کار میں موجود دونوں اے ایس آئی باہر اس کے گیٹ کے قریب کھڑے تھے۔

''آپ کے گھر سے کال آئی تھی۔'' انہوں نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''جی آفیسر.....ہمارے گھر میں کوئی کودا تھا اسی لیے میری وائف نے کال کی تھی۔''

''کودا تھا یعنی اب کوئی نہیں ہے؟'' وہ تھا پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''جی، وہ فرار ہو گیا ہے۔ آیئے میں آپ کو پچھلی گلی دکھاؤں.....مجھے شک ہے کہ چور وہاں کودا تھا۔''

''صرف شک ہے۔'' ایک اے ایس آئی بیزاری سے بڑبڑایا مگر دونوں اس کے ساتھ اندر آگئے تھے۔ کوریڈور اور پھر گھاس کے معائنے کے بعد انہوں نے سر ہلایا۔

''لگتا ہے کہ آپ کو شک ہی ہوا تھا۔''

''مگر یہ پیروں کے نشانات موجود ہیں۔''

''یہ کوئی ثبوت تو نہیں ہے یہ کسی کے بھی ہو سکتے ہیں۔''

''اور اس ٹہنی کو دیکھیے کیا ایسا نہیں لگتا کہ وہ اس سے کودا تھا.....؟'' اسحاق نے ان کی توجہ درخت کی مڑی ہوئی شاخ کی طرف کرائی۔

''ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی..... میرا خیال ہے کہ آپ ذرا زیادہ ڈر گئے ہیں ورنہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' دوسرے اے ایس آئی نے بات گویا ختم کر دی۔

اسحاق انہیں گھر کے باہر کے حصے میں بھی لے کر گیا وہاں انہیں ایک ٹوٹی ہوئی دوربین کے ٹکڑے بھی ملے تھے۔

''یہ دیکھیں آفیسر..... میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کل شام یہ یہاں نہیں تھی، میں نے خود پودوں کو پانی ڈالا تھا۔'' اسحاق نے دوربین کے ٹکڑوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے صاحب یہ ایک رہائشی علاقہ ہے یہ کسی بچے کی دوربین بھی ہو سکتی ہے پھر چور اس طرح بچوں والی دوربین استعمال نہیں کرتے، اگر آپ کی بات مان بھی لی جائے تو وہ واپس کیوں چلا گیا؟''

''شاید ہماری آوازوں سے ڈر کر۔'' اسحاق نے اس بار قدرے بدتمیزی سے جواب دیا۔

''جو چوری کرنے آتا ہے، وہ اس کے لیے تیار ہو کر آتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ نے کوئی آواز نہیں سنی، ضرور سنی ہوگی، وہ یقیناً کوئی بڑی بلی یا بلا ہوگا۔ وہی اس ٹہنی سے کودی ہوگی اس کی آواز پر آپ چونکے ہوں گے اور اس دوران وہ بھاگ گئی ہوگی۔'' دوسرے نے اس بار مکمل تصویر کشی کی۔

''یعنی آپ کے خیال میں یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے؟''

''بالکل بھی نہیں.....ہمارا تجربہ یہی بتا رہا ہے آپ کو خوف زدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے اگر پھر بھی کوئی مسئلہ محسوس ہو تو آپ کال کر لیجیے گا۔''

''بہتر ہے۔'' اسحاق نے نیم دلی سے کہا۔ وہ ان کے مفروضے سے بالکل مطمئن نہیں ہوا تھا مگر ظاہر ہے کہ اب اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ پولیس افسران کے جانے کے بعد اس نے گیٹ اور پھر اندرونی دروازوں کو احتیاط سے بند کیا۔ چند لمحے وہ لاؤنج میں کھڑا رہا۔ کھڑکی سے نظر آنے والے درخت کو بغور دیکھتا رہا پولیس کے آنے اور جانے کے باوجود گلی میں زندگی اسی طرح خوابیدہ رہی تھی حتیٰ کہ چوکیدار بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے کچھ سوچا پھر سر کو

جھٹکتے ہوئے بیڈروم کی جانب ہولیا۔

☆☆☆

ڈی ایس پی جبران احمد کو دفتر سے نکلنے میں آج پھر دیر ہوگئی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ ایک کیس میں الجھا ہوا تھا۔ آج اس کا کامیابی سے دی اینڈ ہوا تھا مگر وہ خاصا لیٹ ہوگیا تھا۔ اسے اپنے کام سے عشق تھا۔ کرمنالوجی میں اعلیٰ ڈگری کے بعد اسے امریکا میں بھی اچھی ملازمتیں مل رہی تھیں مگر اس نے واپس آکر پولیس فورس جوائن کرنے کو اولیت دی تھی۔ اس کی وجہ جہاں اس کا اپنا فیصلہ تھا وہیں اماں بھی تھیں، اس کے والد فوج میں میجر تھے اور اس کے بچپن میں ہی ایک جھڑپ میں شہید ہوچکے تھے۔ جوانی میں بیوگی کے باوجود اس کی والدہ نے دوسری شادی نہیں کی اور اپنی پوری زندگی اس کے لیے وقف کردی تھی۔ وہ ایک کالج میں پروفیسر تھیں اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتیں یا پھر جبران کی شادی کے منصوبے بناتیں، جبران مارشل آرٹ کا ماہر تھا، سراغ رسانی اس کا خاص شعبہ تھا۔ چار سال کے مختصر عرصے میں اس نے کئی مشکل کیسز کو کامیابی سے حل کیا تھا۔ مجرم اس سے کانپتے تھے مگر اس وقت وہ خود دل ہی دل میں کانپ رہا تھا۔ آج صبح ہی اس نے اماں سے جلد واپس آنے کا وعدہ کیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ ڈنر پر اس کی منتظر ہوں گی۔ ”جبران میاں آج کھانے سے پہلے خوب اچھی قسم کی ڈانٹ کا اسٹارٹر ضرور ملے گا تمہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

آج سڑک پر معمول کے مقابلے میں خاصا کم رش تھا۔ اس نے سکون کی سانس لی اور ایکسلریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھادیا۔ وہ کارساز سے مڑ کر تھوڑا آگے ہی گیا تھا کہ اسے سروس روڈ پر دو موٹرسائیکلیں آگے پیچھے جاتی نظر آئیں۔ پہلی موٹر سائیکل پر ایک نوعمر لڑکا سوار تھا جبکہ دوسری پر دو لڑکے بیٹھے تھے۔ ان کے سروں پر ہیلمٹ موجود تھا۔ اگرچہ پچھلی نشست پر بھی ہیلمٹ کی پابندی موجود ہے مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ جبران کی چھٹی حس گڑبڑ کا الارم بجارہی تھی۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر گاڑی کو ان کے پیچھے سروس روڈ پر موڑلیا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے پچھلی موٹر سائیکل نے پہلی کو سڑک کے کنارے پر روک لیا تھا۔ اس نے لڑکے کو جیب سے موبائل نکالتے اور ان دونوں سے بات کرتے دیکھا۔ اس دوران دوسری موٹر سائیکل پر سوار لڑکے کے ہاتھ میں ریوالور کی جھلک نے اسے بے چین کردیا۔ ”ڈیم اِٹ..... ان سے بحث مت کرو.....“ وہ بڑبڑایا اور گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ اِکا دُکا گاڑیاں ان کے پاس سے تیزی سے گزرتی جارہی تھیں اس لیے انہوں نے جبران کی کار کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ پہلی موٹر سائیکل سوار کا موبائل اب بھی اسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ غالباً ان کی منت سماجت کررہا تھا۔ جبران جانتا تھا کہ گھبرائے ہوئے سفاک چور چند ہزار کے موبائل کے لیے نوجوان کی جان لے سکتے ہیں اور اس کے پاس اب انہیں روکنے یا کوئی بات کرنے کا وقت نہیں بچا ہے۔ اسی لیے اس نے گاڑی کو آگے بڑھایا۔ عین اسی لمحے دوسری موٹر سائیکل پر سوار لڑکے نے ریوالور نکال لیا تھا۔ جبران نے گاڑی کے بونٹ کو ان کی موٹر سائیکل سے ٹکرا کر کار روک لی۔ موٹر سائیکل اس جھٹکے سے اچھل کر چند قدم آگے گئی اور پھر پھسل گئی۔ وہ دونوں سڑک کے کنارے پر گرے تھے اس اچانک افتاد سے پیچھے بیٹھے لڑکے کے ہاتھ سے ریوالور بھی چھوٹ کر سڑک پر جاگرا تھا۔ جبران اگلے ہی لمحے ان کے سر پر پہنچ گیا۔

”کیوں؟ موبائل چھینا جارہا تھا؟“ اس نے ان دونوں کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔

”تت تم..... کون ہو؟ بھاگو یہاں سے ورنہ.....“ ان میں سے ایک نے غرانے کی کوشش کی۔

جبران نے اس کی طرف دیکھا پھر اس کا گریبان چھوڑ کر اسی ہاتھ سے اس کے پیٹ میں زوردار گھونسا مارا۔ وہ اچھل کر گرا۔ دوسرا معافی تلافی پر اتر آیا تھا۔ جبران نے اس کے سر سے ہیلمٹ اتارا اور اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔ چند لمحوں میں وہ دونوں چت پٹا کر فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

”وہ ریوالور اس سے اٹھا کر یہاں لے آؤ“ اس نے ساکت کھڑے پہلی موٹر سائیکل سوار لڑکے کی طرف اپنا رومال پھینکتے ہوئے کہا۔

”مم..... میں..... میں اٹھاؤں.....؟“ وہ ہکلایا۔

”ہاں تم.....“ جبران بولا۔

پولیس کے وہاں پہنچنے اور ان ڈکیتوں کی گرفتاری تک وہ وہیں کھڑا رہا تھا۔ پہلی موٹر سائیکل والا لڑکا اس کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھک رہا تھا۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے مگر تمہیں ایک موبائل کے لیے اتنا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ یہ لوگ جنونی ہوتے ہیں اور گولی بھی ماردیا کرتے ہیں۔“

”جی سر، مجھے بھی ڈر لگ رہا تھا مگر.....“ وہ کچھ کہتے کہتے ہچکچایا۔

''کیا مگر...... ایک موبائل بھی جان کے برابر نہیں ہوتا۔''

''سر، اصل میں میرے گھر کے حالات کچھ خراب ہیں۔ اسی لیے میں نے موٹر سائیکل سواری کا کام شروع کیا ہے، امی کی چوڑیاں بیچ کر موٹر سائیکل اور یہ فون لینا پڑا ہے اگر یہ چلا جاتا تو میرا کام بند ہو جاتا......بس اسی لیے......''

اس نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔ جبران ایک لمحے کے لیے لاجواب رہ گیا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''شہزاد......'' اس نے جواب دیا۔

''شہزاد...... اللہ نے تمہاری حفاظت کی تم محنت کرتے رہو، وہ تمہاری ہر جگہ مدد کرے گا......شاباش......''

گھر واپسی تک اس کے ذہن میں وہ نوجوان گھوم رہا تھا۔

☆☆☆

گرمی صبح سے ہی مزاج پوچھے لے رہی تھی۔ محکمۂ موسمیات کی جانب سے گزشتہ روز ہیٹ ویو اور شہر میں شدید گرمی کے بارے میں اعلامیہ بھی جاری ہو چکا تھا۔ لوگ زیادہ تر گھروں اور دفتروں میں ٹھہرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ خصوصاً رہائشی علاقوں میں تو بہت ہی کم کوئی باہر نظر آ رہا تھا۔

وہ اس وقت اسحاق اور زارا کے گھر سے چند مکانات کے فاصلے پر اپنی چھوٹی سی کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں ان کے گھر کی طرف تھیں مگر ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ اس کے والد ایک دفتر میں اچھے عہدے پر تھے۔ کھاتے پیتے خاندان سے تعلق تھا یوں روپے پیسے کی فراوانی تھی۔ تین بیٹیوں کے بعد بیٹے کی پیدائش نے اسے بچپن سے خاندان بھر اور خصوصاً دادا، دادی کا لاڈلا بنا دیا تھا۔ اس کے بچپن کا ایک بڑا حصہ گاؤں میں دادا کے گھر میں گزرا تھا۔ جس نے اسے حکم دینے اور خود کو سب سے برتر سمجھنے کا عادی بنا دیا تھا۔ دادا کے انتقال کے بعد جب وہ شہر شفٹ ہوا تو ماں باپ کو اکلوتے بیٹے کی حرکتوں نے پریشان کر کے رکھ دیا۔ ہر روز اس کا کسی نہ کسی سے جھگڑا ہوتا۔ تعلیم کا شوق تھا نہیں، کاروبار کر رہا تھا مگر توجہ ندارد تھی۔ ایسے میں برے دوستوں کی سنگت نے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ محلے میں کوئی اس سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا پیٹھ پیچھے البتہ سب اسے رحمان کے گھر شیطان کے نام سے پکارا کرتے۔

انہی دنوں زارا کا خاندان اس محلے میں شفٹ ہوا اور شکیل سعید کو دمکتے چہرے والی یہ لڑکی پسند آ گئی۔ زارا کی منگنی کی خبر سن کر اس کو شدید غصہ آیا تھا۔ مسئلہ محبت سے زیادہ دادا گیری کا تھا۔ تب ہی اس نے اسے راستے میں روک کر اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ اس رات جب وہ گھر پہنچا تو اس کا سامان تیار تھا اور ابا جی کا بھی...... معلوم ہوا کہ وہ کسی ضروری کام سے گاؤں جا رہے ہیں۔ اسے ابا جی کے اس فوری وزٹ کے فیصلے پر حیرت بھی ہوئی تھی کیونکہ گاؤں کی تمام زمینیں اور جائداد دادا اس کے نام کر گئے تھے۔ ان کی ساری آمدن اس کو ہی ملا کرتی تھی۔ یوں ابا جی کا اس سب سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا پھر بھی وہ جانے کو تیار ہو گیا تھا مگر اسے جانا نصیب نہیں ہوا، دو دن پہلے چند دوستوں کی وجہ سے اس کا ایک بڑا جھگڑا ہو گیا تھا جہاں اس نے مقابل لڑکوں کو خوب پیٹا تھا۔ ان میں سے ایک کسی امیر آدمی کا بیٹا نکلا تھا اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اور وہ اسپتال میں خطرے کی حالت میں تھا۔ پولیس نے ان کی رپورٹ پر شکیل سعید کو گرفتار کر لیا تھا سات ماہ بعد جب وہ جیل سے باہر آیا تو زارا کی شادی ہو چکی تھی۔ اس سب کی خبر اس کے دوست اسے جیل میں پہلے ہی دے چکے تھے۔ اس دوران وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ اس کے باپ نے ابا جی سے اس کی شکایت کی تھی۔ اس کے دوستوں کا تو یہ بھی خیال تھا کہ اس گرفتاری اور سختی کے پیچھے بھی زارا کے باپ یا ہونے والے شوہر کا ہاتھ تھا۔ وہ اس کے لیے زارا پر تیزاب ڈالنے یا کچھ بھی کرنے کے لیے بھی تیار تھے مگر شکیل اپنی توہین، بے عزتی اور اس کے از خود فیصلے کے مطابق دھوکے کی سزا اسے خود دینا چاہتا تھا۔ اب یہ اس کی عزت کا معاملہ تھا اور اس قضیے کو نمٹائے بغیر وہ دوستوں کی محفل میں سر اٹھا کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے اس حوالے سے بہت سوچا تھا۔ وہ بدلہ اس طرح لینا چاہ رہا تھا کہ نہ صرف زارا کا خاتمہ ہو جائے بلکہ اس کے شوہر کی بھی زندگی برباد، آخر وہ بھی تو اس کی توہین کی وجہ بنا تھا۔ وہ یہ سب کچھ اس طرح کرنا چاہ رہا تھا کہ خود اس پر کوئی حرف بھی نہ آئے۔

''مزہ تو اسی میں تھا کہ وہ تباہ بھی ہو جائے اور کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے مسکرایا۔ اس کے لیے آج کا دن بہت اہم تھا اس کے ذہن میں آج کا سارا پلان موجود تھا۔ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے اور اب اسے اپنا کام شروع کرنا تھا۔ اس نے پسنجر سیٹ پر رکھے اپنے سیاہ تھیلے میں ہاتھ ڈال کر اندر موجود

لبے سے چاقو کو باہر نکالا۔ اس کی دھار پر احتیاط سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔

چاقو کو واپس اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے اس نے دوبارہ مکان کی طرف دیکھا اسی وقت گھر کے باہر ایک گاڑی رکی، اس میں سے اسحاق اترا اور گیٹ کھول کر اندر چلا گیا۔ اس نے گیٹ بند نہیں کیا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ واپس باہر جانے والا ہو۔ کھلا ہوا گیٹ شکیل کے لیے ایک سنہرا موقع تھا جسے وہ کھونا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ لپک کر گاڑی سے اترا، تھیلا اس نے کندھے پر لٹکا لیا تھا۔ چند لمحوں میں وہ گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ اسحاق کی گاڑی اسٹارٹ ہی تھی یعنی وہ واقعی فوری طور پر واپس جانے والا تھا شکیل ایک لمحہ ضائع کیے بغیر آگے بڑھا پورچ کے بعد اندرونی حصے میں داخل ہونے والا دروازہ اب اس کے سامنے تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کو ہچکچایا۔ اس بات کا خطرہ بہر حال موجود تھا کہ دروازہ کھولتے ہی ان میں سے کوئی اس کے سامنے ہو مگر اب یہ رسک اسے لینا ہی تھا۔ اس نے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ ایک نیم روشن کوریڈور نما جگہ میں کھلا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی زارا کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''بس...... دو منٹ میں ریڈی ہو رہی ہوں۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں ساتھ جارہے تھے۔ قسمت واقعی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے تیزی سے اردگرد دیکھا اور کوریڈور میں سب سے پہلے آنے والے دروازے میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی نیم اندھیرا سا تھا۔ جب اس کی آنکھیں اس ماحول میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ یہ گھر کا ڈرائنگ روم تھا۔

''جلدی کرو زارا! میں گاڑی اسٹارٹ چھوڑ کر آیا ہوں تا کہ میڈم کے لیے اے سی کی ٹھنڈک موجود رہے۔''

اسحاق کی آواز سن کر وہ چوکنا سا ہو گیا۔ اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ ان میں سے کوئی اب یہاں آتا مگر پھر بھی احتیاطی تدبیر کے طور پر وہ صوفے کی پشت پر جا چھپا تھا۔

''بس میں آ گئی جنابِ من......'' زارا کی آواز لہرائی۔

اس کے ہونٹ غصے سے بھنچ گئے۔

''چلو، ہاں تمہیں ایک بات بتانا بھول گیا۔ میں نے الارم سیٹ اپ کے لیے بات کر لی ہے وہ نہ صرف کل آ کر گھر میں الارم فٹ کر جائیں گے بلکہ کیمرے بھی لگا دیں گے۔''

''واؤ...... یہ بہت اچھا کیا آپ نے...... پولیس والوں نے تو ہماری بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔'' آوازیں اب قریب آتی جارہی تھیں۔

''ارے ہاں میں اورنج جوس کی بوتل کچن کاؤنٹر پر بھول گیا ہوں۔''

''اورنج جوس؟''

''ارے سرمد نے امپورٹ کیے ہیں بہت زبردست ہیں آج میں سونے سے پہلے چائے کے بجائے یہی پینے والا ہوں۔'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہے پھر میں اسے فریج میں رکھ کر آتی ہوں ورنہ پھر ٹھنڈا نہیں ہو پائے گا۔'' جواب میں وہ ہنسا تھا۔

اگلے پانچ منٹ میں وہ دونوں گھر سے نکل گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد بھی شکیل تھوڑی دیر وہیں چھپا رہا تھا۔ اسے اب جو بھی کرنا تھا، وہ آج ہی کرنا تھا۔ وہ الارم سیٹ اپ یا کیمرے میں نظر آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ چند لمحے بعد وہ باہر نکلا۔ دو بیڈ روم، ڈرائنگ روم، لاؤنج، کچن پر مشتمل گراؤنڈ فلور جدید انداز میں بنا ہوا تھا۔ لاؤنج سے اوپری منزل کی طرف سیڑھیاں جاتی تھیں مگر شاید وہ حصہ ان کے بہت زیادہ استعمال میں نہیں تھا۔ گھر کو بہت اچھی طرح سجایا گیا تھا۔

''تو...... یہ سب دیکھ کر اس سے شادی کی ہے اس نے......'' اس نے زہر آلود انداز میں سوچا۔ اس کی نظر لاؤنج کی دیوار پر لگے کی ہولڈر پر پڑی جس پر چابیوں کا ایک گچھا لٹکا ہوا تھا۔ اس نے اسے اٹھایا اور گھر میں داخلے کے اگلے پچھلے اندرونی دروازوں کے لاکس میں چابیاں لگانا شروع کیں۔ دو منٹ میں وہ دونوں لاکس کی چابیوں کو موم پر منتقل کر چکا تھا شاید ان کے پاس چابیوں کے دو سیٹ تھے تب ہی ایک سیٹ یہاں موجود رہ گیا تھا۔

اس کے بعد اس نے کچن کا رخ کیا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ باقی موقع اسے قسمت اور ان کی باتوں نے فراہم کر دیا تھا۔ فریج میں اورنج جوس کی ایک امپورٹڈ بوتل رکھی ہوئی تھی جس میں سے کسی نے ایک گھونٹ چکھا تھا۔ اس نے بوتل کھولی اور تھیلے میں موجود بے ہوشی کی دوا اس میں شامل کر کے اسے اچھی طرح ہلایا اور واپس فریج میں رکھ دیا۔ اب وہ کچن میں موجود چاقوؤں کے سیٹ کی طرف متوجہ ہوا وہاں مختلف سائز کے پیتل کے دستے والے تیز چمک دار چاقو موجود تھے، اس نے ان میں سے ایک

بڑے چاقو کا انتخاب کر کے اسے اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔

وہ دوبارہ لاؤنج سے گزرا تو اس کی نظر سائڈ ٹیبل پر پڑے والٹ اور موبائل پر پڑی۔ شاید اسحاق انہیں یہاں رکھ کر بھول گیا تھا اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یا تو وہ کہیں بہت قریب گئے تھے یا پھر بٹوا، موبائل، لینے واپس بھی آ سکتے تھے۔ اس نے بٹوا کھولا، دیگر چیزوں کے ساتھ کچھ نوٹ اس میں موجود تھے۔ دو کریڈٹ کارڈ بھی بٹوے میں لگے ہوئے تھے۔ شکیل نے سنہرے کریڈٹ کارڈ کو نکالا اور اپنے تھیلے میں ڈال لیا پھر کچھ سوچ کر اس نے اسحاق کے فون پر ایک میسج ٹائپ کیا۔ میسج مکمل ہونے کے بعد اس کے اپنے فون پر بپ کی آواز سنائی دی جسے سن کر مسکرایا تھا۔ اس کا کام فی الحال مکمل ہو چکا تھا۔

چاروں طرف نظریں گھماتا وہ باہر نکلا۔ دروازے کو اپنے پیچھے کھینچ کر بند کر کے وہاں سے نکلتے ہوئے وہ جدید تالوں کے خالق کا شکریہ ادا کرنا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر تھا۔

چاروں طرف سکوت اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ شکیل اپنی کار میں سویا ہوا تھا۔ ٹھیک دو بجے اس کے موبائل نے الارم بجایا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلے اس نے الارم بند کیا پھر گہری جمائی لی۔ پسنجر سیٹ پر رکھے اپنے تھیلے کی طرف دیکھا۔ ایک شیطانی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چمک اٹھی تھی۔ اس نے تھیلا اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور کار سے باہر نکل آیا۔ اس بار اس کی کار گلی کے کونے پر کھڑی تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اس کے گھر تک پہنچا۔ اندر داخل ہونے کے لیے نیم کا درخت اس کا مددگار بنا تھا۔ سکون سے بالکونی میں اتر کر وہ دبے قدموں سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ ہر طرف گہری خاموشی طاری تھی۔ دوپہر میں وہ گھر کا جائزہ تو پہلے ہی چکا تھا اس لیے اب وہ سیدھا ان کے بیڈ روم تک پہنچ گیا۔ دروازے کی ناب گھما کر اس نے پہلے درز بنا کر اندر کا جائزہ لیا۔ کمرے میں اسپلٹ کی ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی۔ اسحاق اس کی امید کے عین مطابق گہری بے ہوشی کی نیند میں تھا۔ زارا نے البتہ کروٹ لی تھی۔

وہ چند لمحے اپنی جگہ جما کھڑا رہا پھر وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا زارا کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ اس کی ناک پر آ گری تھی۔ شکیل نے اسے اس کے چہرے سے ہٹایا اسی لمحے زارا کی آنکھ کھل گئی۔ اسے جاگتے دیکھ کر شکیل نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہلکی روشنی میں شکیل کو اپنے سرہانے چاقو بدست دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ چیخنا چاہ رہی تھی مگر آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ اس نے نظریں گھما کر برابر میں بے خبر سوئے اسحاق کو دیکھا، وہ گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

”پپ پلیز میری بات سنو...... تم...... تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“ وہ بمشکل بول پائی۔ اس کی آواز کسی سرگوشی سے اب بھی بلند نہیں تھی۔

”وہی جو تجھ جیسی عورتوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔“ وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ ”تو کیا سمجھی تھی کہ میری بات کو جھٹلا کر اور مجھے اندر بند کروا کر تو خوش اور زندہ رہ سکے گی؟ کیا میں نے تجھے بتایا نہیں تھا کہ تجھے کیا کرنا ہے اور دوسری صورت میں کیا ہوگا......“ وہ غرایا۔

”مم میری بات سنو......“

”بات ختم ہو چکی ہے اب تو، تو جہنم میں جانے کو تیار ہو جا......“ وہ دانت پر دانت جما کر بولا۔

”اس سے تم کو کیا ملے گا تم پھر جیل چلے جاؤ گے۔“ وہ اسے باتوں میں لگا کر تکیے کے نیچے سے اسحاق کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

”میں نہیں...... تیرا یہ خصم جائے گا جیل میں...... پورا بندوبست کر لیا ہے میں نے اور تو جو اسے جگانے کی کوشش کر رہی ہے چالاک عورت...... تو لومڑی یہ جاگنے والا نہیں ہے۔“ وہ غرایا...... اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی زارا کا بازو ساکت ہو گیا۔

”بچ...... بچاؤ......“ بالآخر اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی مگر اسی وقت شکیل کے ہاتھ میں موجود خنجر اپنی تمام تر سفاکیت کے ساتھ اس کے پہلو میں اُتر گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف جم کر رہ گئی۔ اس نے ہلکی سی ہچکی لی۔ اسی دوران شکیل نے چاقو کو دوبارہ کھینچ کر ایک کے بعد ایک دو مزید وار کیے۔ زارا کی زندگی سے بھرپور چمکدار نگاہیں حیرت، خوف، تکلیف، دہشت اور اذیت کا سفر طے کرنے کے بعد چند لمحوں میں بے جان ہو گئی تھیں۔ وہ مر چکی تھی۔ اس کا بچاؤ کے لیے اٹھا ہوا بازو لٹک کر زمین پر آ ٹکا تھا۔ زخموں سے نکلنے والا خون بستر، تکیوں، چادر کو رنگین کر رہا تھا۔

شکیل چند لمحے نفرت سے اسے گھورتا رہا پھر اس نے گہری سانس لی، ایک لمحے کو، افسوس نے اس کے ذہن میں

جگہ بنائی پھر اس نے سر جھٹک دیا۔ زارا کی حلقوں سے امنڈی ہوئی آنکھیں...... اور بہتے ہوئے خون پر نظر جما کر اسے اچانک ایسا لگا جیسے اس کے پیٹ میں کچھ ہورہا ہو...... پھر شدید متلی سی محسوس ہوئی اس کا سر چکرا سا گیا تھا۔ خود کو سنبھالنے کے لیے وہ ایک لمحے کو نیچے بیٹھ گیا پھر بالآخر اسے تھوڑی سی متلی ہو ہی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ابھی اس کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس نے نفرت سے بے خبر سوئے اسحاق کو گھورا ایک منٹ کے لیے اس کا دل چاہا کہ اس کا بھی حساب صاف کر دیا جائے مگر وہ اسے موت سے زیادہ بڑی سزا دینا چاہتا تھا پھر زارا کی موت کا کوئی ذمے دار بھی تو سامنے ہونا چاہیے...... اس نے خود کو سمجھایا۔

اس کے دستانوں پر زارا کا خون موجود تھا اس لیے اس نے تھیلے سے دوسرے دستانے نکال کر پہنے پھر بیگ سے نیند کی گولیوں کی بوتل نکالی...... اسحاق کی طرف جا کر اس نے زمین پر کافی گولیاں بکھرانے کے بعد خالی بوتل بھی بیڈ کے پاس پھینک دی۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔ اس کی نظر بستر پر پڑے خون میں لتھڑے چاقو پر پڑی۔ اس نے آگے بڑھ کر چاقو اٹھایا اور اسحاق کا ہاتھ پکڑ کر چاقو پر اس کے نشانات ثبت کر دیے۔ زارا کا خون بستر، تکیے کو رنگین کر چکا تھا۔ شکیل نے اسحاق کو کروٹ دلا کر اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے لگائے پھر اس کے ہاتھوں کو خون بھرے بستر اور زارا کے زخم پر لگا کر خون میں لتھیڑ دیا۔ زارا کے لٹکتے بازو کو دیکھ کر اس کے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسحاق کے چہرے اور بازوؤں پر اس کے ناخنوں سے خراشیں سی بنا دیں۔ اس دوران وہ ہلکا سا کسمسایا تھا۔ اس کے بعد اس نے چاقو سے زارا کے بے جان بازو پر ایک زخم سا بنا دیا تاکہ پولیس کو یہ تاثر ملے کہ اس نے چاقو سے بچنے کے لیے مزاحمت کی تھی۔ اس کے بازو کو دوبارہ زمین پر ڈالتے ہوئے اس کی نظر اس کی انگلی میں چمکتی ہیرے کی انگوٹھی نے ایک لمحے کے لیے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی اس نے سوچا، پھر انگوٹھی کو انگلی سے نکال کر اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔ سائڈ ٹیبل پر...... رکھے لیمپ کو زمین پر ڈال دیا۔ کرسی الٹا دی ایک گلدان کو گرا کر توڑ دیا۔ کمرے میں اب مزاحمت کے آثار بن گئے تھے، وہ مسکرایا۔

''کلوروفارم۔'' اچانک اس کے ذہن میں ایک لفظ گونجا۔ اس نے تھیلے سے چھوٹی سی بوتل نکال کر اس کے چند قطرے ایک رومال میں لگا کر زارا کے ناک اور ہونٹوں کے پاس چھوا دیے۔ اب منظر مکمل تھا۔ اس نے اطمینان سے سوچا اور کمرے سے نکل کر کچن میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے فریج کھول کر اس نے جوس کی بوتل نکالی، اس میں تھوڑا سا جوس باقی تھا۔ اس نے بوتل میں موجود جوس کو سنک میں بہا کر بوتل کو ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے تھیلے سے ایک کاغذ نکالا جس پر خون کے نشانات والا ہاتھ لگا ہوا تھا۔ شکیل نے اسے فریج پر لگے میگنٹ سے اسے چپکا دیا۔

اس کے بعد اس نے تھیلے سے اسحاق کا سنہرا کریڈٹ کارڈ نکالا اور اسے دوبارہ اس کے بٹوے میں لگا دیا۔ اب اس کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

وہ اندرونی دروازے کے پاس جا کر رکا۔ تھیلے سے موبائل نکالا۔ ایک نمبر ملایا اور بولا۔ ''ایک رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ مکان کا نمبر اور پتا بتاتے ہوا بولا۔ ''یہاں کوئی بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے...... کسی کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں، آپ فوراً پہنچیں۔'' اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

دروازے کی ناب گھماتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا، اس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا، اطمینان سے اپنی گاڑی تک پہنچا...... اسے علاقے سے دور جانے میں چند لمحے لگے تھے۔

☆☆☆

اسحاق کی آنکھ اچانک کھلی تھی۔

کمرے میں گہری نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ صبح ہونے میں تین گھنٹے باقی تھے۔ اسحاق جاگ تو گیا تھا مگر اسے سب کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا جیسے اس نے عدسے والی عینک لگا رکھی ہو۔ اس نے الجھن میں پلکیں جھپکیں وہ خود کو عجیب سی کیفیت میں محسوس کر رہا تھا۔

اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کشتی میں ہو۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر ڈگمگا کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ کمرے میں عجیب سی جی متلانے والی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اسحاق نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ کنپٹیوں کو دباتے ہوئے اس نے پھر آہستگی سے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اس بار وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا سر اب بھی چکرا رہا تھا۔

وہ بمشکل چلتا ہوا دیوار کے پاس پہنچا۔ سوئچ بکس کی تلاش میں دیوار پر ہاتھ پھیرا بالآخر وہ بٹن دبانے میں کامیاب ہو گیا، روشنی نے ایک جھماکے کی طرح اس کی دیکھنے کی صلاحیت لمحے بھر کے لیے چھین سی لی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اب اس کی بصارت قدرے بحال ہوئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور بیڈ کی طرف مڑا۔ وہاں جو منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اس نے اسے دہشت زدہ کر دیا۔ اس نے لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کر لیں جیسے سامنے موجود منظر پر اسے یقین نہ آیا ہو۔ اسے یقین تھا کہ وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ بیڈ کی طرف دیکھا وہ بھیانک منظر اسی طرح موجود تھا۔ اس کے بیڈ کی سفید چادر اور تکیے خون سے لال تھے۔ زارا بستر پر مردہ پڑی تھی۔ اسحاق چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس کا ذہن طوفان کی زد میں آئے پتے کے مانند گھوم رہا تھا۔ اس کی بصارت دھندلاتی جا رہی تھی پھر وہ لہرایا اور زمین پر جا گرا۔

اس کی آنکھ کھلی تو ایک شخص اس پر جھکا ہوا تھا۔ اسحاق کا ذہن اب بھی نیم خوابیدہ سی حالت میں تھا مگر خوف سے وہ زمین پر ہی تیزی سے پیچھے کی جانب پھسلا۔ اب اس انجان شخص اور اس کے درمیان قدرے فاصلہ ہو گیا تھا۔ وہ کہنی کے بل اٹھا، آنکھیں بند کر کے چکراتی بصارت کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔

”یہ...... یہاں سب کیا ہو رہا ہے؟“ بالآخر وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔ اب اسے سب کچھ واضح نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں دو باوردی پولیس افسر موجود تھے، ان کے ساتھ ایک بغیر وردی والا شخص بھی تھا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ تم سیدھے کھڑے ہو جاؤ تا کہ تمہیں ہتھکڑی پہنائی جا سکے۔“ ان میں سے ایک بولا۔

اسحاق کی نگاہوں نے پولیس افسر سے کمرے کی دیوار تک کا سفر کیا جہاں خون لگا ہوا تھا پھر اس کی نظر بستر پر پڑی جہاں چادر وغیرہ خون سے تر تھے۔

”اوہ میرے خدا...... یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”زارا...... زارا کہاں ہے؟“

”ہم بھی یہی سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اسحاق صاحب......“ دوسرا پولیس افسر قدرے نرمی سے بولا۔

”یہ...... یہ سب کیسے ہوا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم کل جلدی لیٹ گئے تھے......“ اسحاق کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ سب کوئی خواب ہو اور چند لمحے بعد زارا اس کا کندھا ہلا کر اسے جگا دے۔

”دیکھیے اسحاق صاحب...... اس وقت آپ جو بھی کہیں سوچ سمجھ کر کہیں۔“ دوسرے پولیس افسر نے ہتھکڑی اس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

اسحاق نے بے یقینی سے اسے گھورا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، وہ رات ہنسی خوشی سویا تھا...... صبح اس کی زندگی برباد ہو چکی تھی اور اب یہ پولیس افسر اسے گرفتار کرنا چاہ رہا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر کچھ کہنا چاہا، تو اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر پڑیں جو زارا کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ وہ لرز کر رہ گیا۔

”آپ...... آپ کہیں مجھے تو اس کا ذمے دار نہیں سمجھ رہے؟“ وہ بالآخر چلایا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔“

اس کے چیخنے پر پہلے پولیس افسر نے پستول نکال لیا تھا۔ ”سیدھے کھڑے ہو جاؤ......“ وہ غرایا۔

اسحاق بمشکل کھڑا ہوا، اس کا سر ہنوز چکرا رہا تھا اور جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا، اس کے بعد وہ ہوش میں آنا بھی نہیں چاہ رہا تھا اس کے اٹھتے ہی دوسرے پولیس افسر نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر ہتھکڑی میں جکڑ دیے اور اسے لے کر باہر کی طرف چلے۔

آدھے گھنٹے میں ان کا گھر پولیس والوں سے بھر گیا تھا۔ فرانزک کی ٹیم شواہدات جمع کر رہی تھی۔ انہوں نے فریج پر موجود خون بھرے کاغذ سے کمرے کے بیرونی دروازے کے تالے تک ہر چیز کی چھان بین شروع کر دی تھی۔

دو پولیس افسران جو پہلے یہاں پہنچے تھے، وہ اسحاق کی نگرانی کر رہے تھے جو کہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا...... گزشتہ رات کی ایک ایک بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ساتھ ہی ساتھ مسلسل بڑبڑا بھی رہا تھا۔ اس کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔

کافی دیر بعد ایک قدرے عمر رسیدہ شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر جھریوں کا جال بچھا ہوا تھا اور اس کے کپڑے بھی سلوٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسحاق کے پاس آ بیٹھا۔

”میں انسپکٹر پرویز ہوں۔“ وہ بولا۔ ”ہم تمہیں اسٹیشن لے جا رہے ہیں جہاں تمہارا بیان لیا جائے گا۔“

اسحاق نے کچھ سوچے بغیر سر ہلا دیا۔

”اسحاق...... یہ سب کیا ہوا ہے؟“ ایک عورت کی چیختی آواز نے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی۔ وہ

ایک نوجوان اور خوب صورت عورت تھی۔ اس کے چہرے پر اس وقت گہری افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس کی نظر صوفے پر بیٹھے اسحاق پر پڑی اور وہ تیر کے مانند اس کی طرف لپکی۔

''اسحاق یہ سب کیا سن رہی ہوں میں؟ زارا کے ساتھ یہ کیا ہو گیا؟ تم بالکل فکر مت کرو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''یہ کون صاحبہ ہیں؟'' انسپکٹر پرویز کی آنکھوں میں شک ناچ رہا تھا۔

''یہ صائمہ ہیں۔ میری اور زارا کی بہترین دوست اور آفس کولیگ بھی......'' اسحاق بمشکل بولا۔ ''یہ قریب ہی رہتی ہیں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب ہو گیا ہے۔'' وہ بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ اس میں شکیل کا ہی ہاتھ ہے۔''

''ہمیں چلنا چاہیے۔'' انسپکٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ اسحاق کو کہاں لے جا رہے ہیں۔ آپ اس کی حالت دیکھ رہے ہیں، وہ اتنے بڑے صدمے کا شکار ہوا ہے۔'' وہ بولی۔

''ہمیں ان کا بیان ریکارڈ کرنا ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

''آپ کہیں اسحاق پر اس قتل کا شک تو نہیں کر رہے؟''

''ہمارا کام ہر ایک پر شک کرنا ہے، ہمیں آپ کا بیان بھی بعد میں درکار ہوگا۔'' وہ خشک لہجے میں بولا۔

''ضرور مگر اسحاق، زارا کو کبھی تکلیف نہیں پہنچا سکتا، یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔''

''ٹھیک ہے، فی الحال انہیں گرفتار بھی نہیں کیا جا رہا...... چلو بھائی...... اب ہمیں تھانے جانا ہوگا۔'' اس نے پولیس افسران کو اشارہ کیا اور وہ اسحاق کو لے کر باہر نکلتے چلے گئے۔

☆☆☆

اسے اس کمرے میں بیٹھے ایک گھنٹے کے قریب ہو گیا تھا۔ چوکور سے بنے کمرے میں ایک لمبی میز تھی جس کی ایک جانب اسے بٹھایا گیا تھا جبکہ دوسری طرف دو کرسیاں موجود تھیں۔ کمرے میں تیز بلب اور صرف ایک پنکھا موجود تھا جو گرمی کے خلاف ہاری ہوئی جنگ لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسحاق کے ذہن میں زارا کی شکل گھوم رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کی سمجھ میں اب تک کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے یاد تھا کہ رات اس کی زارا سے تھوڑی سی بحث ضرور ہوئی تھی مگر وہ تو کسی بھی بات پر ہو جاتی تھی جس کے بعد اس نے جوس پیا تھا، دونوں خوب ہنسے بھی تھے۔ وہ یقینی طور پر اس سے پہلے سو گیا تھا پھر اس کے بعد کیا ہوا اس بارے میں اس کا ذہن اس کی یادداشت بالکل خالی تھے......

''ہاں بھئی شہزادے......'' انسپکٹر پرویز کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''دو چار باتیں کر لیتے ہیں، یہ باتیں ریکارڈ ہوں گی کوشش کرنا کہ سچ بولو کیونکہ جھوٹ کا پردہ چاک کرنا ہمارا کام ہے مگر جھوٹوں کو پھر تکلیف بہت ہوتی ہے......''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا، میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کہوں کیا کیونکہ مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں نے...... میں نے زارا کو نہیں مارا، میں اسے کیسے مار سکتا ہوں، ابھی چند دن پہلے ہماری شادی ہوئی ہے اور ہم دونوں بہت خوش تھے...... میں بتا نہیں سکتا کہ مجھ پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک گئے جو اس کے گالوں سے گزرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر موجود خراش پر گر رہے تھے۔ اس نے چونک کر اپنے بازو پر دیکھا یہ پہلا موقع تھا جب اسے اپنے ہاتھوں اور چہرے پر موجود خراشوں کا اندازہ ہوا تھا۔

''یہ کیسے ہوا؟''

''کیا...... کیا یہ خراشیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، یہ کافی گہری ہیں جیسے کسی نے خود کو بچانے کے لیے مزاحمت کی ہو۔'' انسپکٹر پرویز نے کہا۔

انسپکٹر کے اس جملے پر اسحاق کے وجود میں غصے کی آگ سی بھڑک اٹھی مگر وہ خود اس بات پر الجھا ہوا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم......'' وہ ایک لمحے بعد بمشکل بولا۔ ''جب میں سویا تب یہ میرے جسم پر موجود نہیں تھے۔''

''اچھا...... کیا تمہیں اپنا بیان خود مضحکہ خیز نہیں لگ رہا؟'' وہ مسکرایا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ تم دونوں کے درمیان تعلقات کیسے تھے؟''

''بہت اچھے، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے انسپکٹر......'' تھے، بولتے ہوئے اسے اپنے گلے میں جلن سی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں اور آواز دونوں بھیگ گئے تھے۔

''کیا تم دونوں میں جھگڑا ہوتا تھا.....؟''

''ہاں..... اکثر بحث ہوتی تھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر.....مگر ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا تھا۔''

''مگر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ رات بھی تم دونوں لڑے تھے.....؟'' اس نے اسحاق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''ہاں بحث تو ہوئی تھی مگر بعد میں سب ٹھیک ہو گیا تھا۔ بحث بھی اس بات پر ہوئی تھی کہ ہمیں ایک روز پہلے بھی یہ لگا تھا کہ کوئی ہمارے گھر میں گھسا ہے..... میں نے پولیس کی مدد بھی حاصل کی تھی مگر انہوں نے اسے ہمارا وہم قرار دیا تھا، وہ کسی شکیل کا نام لے رہی تھی..... میں نے کہا کہ وہ مجھ پر اعتماد کرے..... میں واقعی غلط تھا.....'' وہ چپ ہو گیا۔

''اس کا قاتل نہ جانے کہاں پہنچ گیا ہوگا آپ میرے بیان کے بجائے اسے پکڑنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے.....؟''

وہ یک دم پھٹ پڑا۔

انسپکٹر پرویز جواب میں اسے جانچنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔

''شکیل سعید کا نام ہم نے سن لیا ہے پہلے بھی.....اور اس سے بھی جانچ پڑتال ہوگی مگر مسئلہ یہ ہے کہ تمہاری بیوی کو چاقو کے کئی وار کر کے مارا گیا ہے، وہ تمہارے بالکل برابر میں سو رہی تھی اور تمہیں خبر بھی نہیں ہوئی..... میں اس بات کو ہضم نہیں کر پا رہا ہوں۔''

''میں خود بھی نہیں سمجھ پا رہا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''میں اس قدر گہری نیند بھی نہیں سوتا.....شاید مجھے کچھ سنگھایا گیا ہو یا کوئی دوا دی گئی ہو۔''

''تمہارے بستر کے پاس سلیپنگ پلز ملی ہیں.....''

''میں اور زارا دونوں ہی کبھی نیند کی گولی نہیں لیتے تھے نہ ہمارے گھر میں یہ گولیاں تھیں..... وہ کہاں سے آئی ہیں، یہ بھی نہیں جانتا۔''

''ایک بات اور بھی ہے.....'' انسپکٹر ڈرامائی انداز میں بولا۔ اسحاق منتظر نظروں سے اسے تکتا رہا.....

''تمہیں معلوم ہے کہ جس چاقو سے تمہاری بیوی کو قتل کیا گیا ہے، وہ تمہارے کچن سے ہی لیا گیا تھا۔''

''اوہ.....'' اسحاق نے افسوس سے سر ہلایا۔

''یقیناً قاتل نے اسے ہمارے کچن سے اٹھایا ہوگا۔''

''دیکھو..... جو تصویر ہم دیکھ رہے ہیں، اس کے مطابق سب کچھ واضح ہے..... تمہاری بیوی کو تم سے ایک فٹ کے فاصلے پر قتل کر دیا جاتا ہے، وہ بھی چاقو کے وار کر کے اور تمہیں ذرا بھی خبر نہیں ہوتی، تمہارے چہرے پر خراشیں ہیں..... ہمارے لوگوں کو کوئی ایک تالا بھی ٹوٹا ہوا نہیں ملا۔ یعنی کوئی باہر سے اندر نہیں گھسا اور گھر میں صرف تم دونوں تھے.....اب تم بتاؤ اس سب سے کیا ثابت ہوتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اب تم حقیقت کا اعتراف کر لو۔''

اسحاق کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ ''تم.....تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں نے زارا کا قتل کیا..... میں نے؟ جو دنیا میں سب سے زیادہ محبت ہی اس سے کرتا تھا..... تمہیں مجھ پر شک کرنے کے بجائے اس کے قاتل کو ڈھونڈنا چاہیے..... ویسے بھی ثبوت سب واضح کر دیں گے۔''

''ہاں، یہ تم نے سچ کہا، تمام شواہد..... جمع کر لیے گئے ہیں ضروری ٹیسٹ ہو چکے ہیں تمہارا ڈی این اے ٹیسٹ بھی ابھی ہو جائے گا.....تمہارے اچھے ریکارڈ کی وجہ سے ہم ثبوت ملنے تک تمہیں گرفتار نہیں کر رہے مگر تم شہر سے باہر نہیں جا سکتے..... سمجھ رہے ہو نا تم..... ہماری نظریں تم پر ہی ہوں گی۔''

وہ یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا، اسحاق نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔

☆☆☆

''اچھا.....'' جبران نے انسپکٹر پرویز سے کیس کی تفصیلات سنتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

''تو اب تم اس کیس کے بارے میں کیا کہتے ہو.....؟''

''سر یہ اوپن اینڈ شٹ کیس ہے، تمام شواہد..... اور ثبوت اس کے شوہر کی طرف ہی اشارہ کر رہے ہیں، وہی اس کا قاتل ہے۔''

''انسپکٹر میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلے مضبوط ثبوت حاصل کرنے چاہئیں اس سے پہلے کسی پر مجرم ہونے کا ٹھپا لگانا غلط ہے۔'' جبران نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ درست کہہ رہے ہیں مگر اس بار میرا تجزیہ بالکل درست ہے۔'' وہ پرجوش انداز میں بولا۔ ''ہمیں آلۂ قتل مل گیا ہے اور اس پر اس کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ ہمیں فریج پر ایک خون آلود کاغذ بھی ملا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کر کے خودکشی کرنا چاہتا تھا اس کے لیے اس نے اپنے کریڈٹ کارڈ سے نیند کی گولیاں خریدی تھیں پھر اس نے اپنی بیوی کو بے ہوش کرنے کے لیے جو کلوروفارم استعمال کیا، وہ بھی کریڈٹ کارڈ سے خریدا گیا تھا۔''

''واہ، یہ واقعی زبردست کیس ہے...... ویسے تمہیں نہیں لگتا کہ سب کچھ ضرورت سے زیادہ پرفیکٹ ہے خیر اب مجھے یہ مت بتانا کہ تمہیں قتل کا مقصد بھی معلوم ہوگیا ہے۔''

''نہیں۔'' اس سوال پر انسپکٹر تھوڑا ہچکچایا۔ ''فی الحال ہم قتل کا مقصد نہیں جان پائے ہیں مگر تھوڑی تفتیش میں وہ ضرور سامنے آجائے گا۔''

''اور ظالم شوہر نے اعتراف تو کرہی لیا ہوگا؟''

''نہیں...... وہ اس بات پر مصر ہے کہ اس نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ واردات کے دوران وہ بے خبر سوتا رہا تھا۔''

''کمال ہے۔'' جبران ہنس پڑا۔ ''اتنے سارے شواہد کے بعد ایسا جواز...... یہ تو خود پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالنے والی بات ہے۔ کیا تم نے اسے کسٹڈی میں لے لیا ہے؟''

''نہیں سر، مجھے ابھی چند گواہوں سے بات کرنی ہے۔ کچھ ٹیسٹ ہوئے ہیں، ان کے نتائج کا انتظار ہے۔ اس کے بعد اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔''

''مقتولہ کے قریبی رشتے داروں میں کوئی موجود ہے؟ اس کا کیا کہنا ہے؟''

''اس کے ماں باپ کی حالت خاصی خراب ہے۔ انہوں نے اپنی جوان بیٹی کو کھویا ہے...... میری اس کے باپ سے سرسری گفتگو ہوئی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ اسحاق پر شک نہیں کررہے، ان کا شک اسی شکیل سعید پر ہے۔''

''اس شخص سے ملنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔'' جبران نے کہا۔

''جی ہاں اب میں اس کا بیان ہی لینے جارہا ہوں۔ اس کے متعلق جو حقائق سامنے آئے ہیں، ان کے مطابق وہ مشکوک کردار کا مالک ہے۔ پچھلے کئی ماہ جیل میں بھی رہ کر آیا ہے۔ جیل سے آنے کے بعد سے وہ اپنے ماں باپ سے الگ رہ رہا ہے......''

''ٹھیک ہے...... مجھے اس کیس کی پیش رفت سے آگاہ رکھنا......'' جبران بولا، یہ گویا میٹنگ ختم ہونے کا اشارہ تھا۔

☆☆☆

اسحاق دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے بستر پر بیٹھا تھا۔ زارا کے جانے کے بعد ان کا گھر جائے واردات ہونے کی وجہ سے فی الحال پولیس کسٹڈی میں تھا۔ زارا کے والدین اور صائمہ دونوں نے اسے اپنے گھر لے جانے کی بہت کوشش کی تھی مگر اسحاق نے اس کے بجائے ہوٹل میں جانے کو ترجیح دی تھی۔ یوں بھی وہ تنہا رہ کر سوچنا چاہتا تھا۔ اس کے اور زارا کے ساتھ یہ کیا ہوا تھا؟ وہ جتنا سوچتا، اتنا ہی الجھتا جارہا تھا۔ اس کے علم میں تھا کہ پولیس نہ صرف اس پر شک کررہی ہے بلکہ شاید اسے ہی قاتل گردان رہی ہے۔ یہ بات اس کے لیے کتنی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو لیکن جو کچھ نظر آرہا تھا اس کی بنیاد پر شاید ان کی جگہ وہ ہوتا تو وہ بھی یہی سوچتا۔ ''اسے خود کچھ کرنا ہوگا۔'' اس نے سوچا، اسے اس شخص کو ڈھونڈنا ہوگا اور کیفرِ کردار تک پہنچانا ہوگا......اس نے تہیہ کیا...... ''مگر کل کے بعد...... کل زارا کی تدفین تھی۔ اس کی زارا کی تدفین، اس کے ذہن نے دہرایا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگتی چلی گئیں۔

☆☆☆

شکیل سعید اس وقت تھانے میں موجود تھا۔ انسپکٹر پرویز نے اسے بیان کے لیے طلب کیا تھا۔

''تم جانتے ہونا کہ تمہارے محلے دار کی بیٹی زارا اسحاق کا قتل ہوگیا ہے؟'' اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں، میں نے اخبار میں پڑھا تھا، اس کے علاوہ سنا بھی ہے۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''تم زارا سے واقف تھے؟''

''جی ہاں، میں نے اسے دیکھا تھا، ایک دو بار بات بھی ہوئی تھی......اصل میں وہ...... مجھے پسند کرتی تھی......''

''وہ تمہیں پسند کرتی تھی یا تم نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے شادی کی تو تم اسے قتل کردو گے......'' انسپکٹر نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''وہ کہانی تو اس نے خود ہی گھڑی تھی......'' شکیل نے تیزی سے کہا۔ ''ویسے میں بھی تھوڑا بہک گیا تھا۔''

''تم ایک عورت پر الزام لگارہے ہو؟ کیا تم اسے ثابت کرسکتے ہو؟'' انسپکٹر کے چہرے پر غصے کے تاثرات نمایاں تھے۔

''خیر اس وقت کی بات کا تو کوئی ثبوت نہیں ہے مگر ابھی کا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اس نے اپنی موت والے دن مجھے ایک پیغام بھیجا تھا...... میں وہ آپ کو دکھا سکتا ہوں۔'' یہ کہہ

کر اس نے اپنا موبائل نکالا ایک میسج کھولا اور فون انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

''شکیل میں یہاں بالکل خوش نہیں ہوں۔ اسحاق بہت غصہ ور ہے کاش تم میری بات مان جاتے ...... اب بھی اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے اسے چھوڑ سکتی ہوں ...... ہمیشہ سے تمہاری زارا۔''

پرویز ایک لمحے پیغام کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''کیا یہ اس کے نمبر سے آیا ہے؟''

''شاید یا پھر اس کے شوہر کے نمبر سے ہوگا ...... مگر میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں پرانی باتیں بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اپنی زندگی کو صحیح طریقے سے گزارنے کا فیصلہ کر چکا ہوں، میں نے منگنی بھی کر لی ہے اور جلد ہی شادی کرنے والا ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''خوب ...... تمہاری منگیتر کیا کرتی ہے، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر کا انداز ایسا تھا جیسے اسے شکیل کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

''کک کیوں نہیں ......'' وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''مگر اسے یہاں بلانا تھوڑا غیر مناسب ہوگا۔''

''ٹھیک ہے مگر ہم تو ملنے جا سکتے ہیں نا چلو ......'' انسپکٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''مم ...... مگر مجھے اسے بتانا تو ہوگا ......'' شکیل نے فون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اب تک انسپکٹر کے ہاتھ میں تھا۔

''یہ فون اس وقت تمہیں واپس نہیں مل سکتا اس میں ایک اہم شہادت موجود ہے۔ امید ہے کہ تم ایک دو دن اس کے بغیر گزارا کر لو گے۔'' انسپکٹر نے سادگی سے پوچھا۔ شکیل کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیلتی چلی گئی۔

''چلو ...... مجھے تمہاری منگیتر کا بیان لینا ہے ویسے تم پرسوں رات کو کہاں تھے؟''

''پرسوں ...... میں اپنے گھر پر تھا۔'' شکیل نے جواب دیا۔ ''کیا آپ سمیرا سے شام میں نہیں مل سکتے ...... وہ اس وقت اپنے دفتر میں ہوگی۔''

''نہیں ...... دفتر میں ملاقات زیادہ بہتر ہے۔'' انسپکٹر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

سمیرا، شکیل کے مقابلے میں قدرے کم عمر کی دلکش لڑکی ثابت ہوئی۔

''جی ہماری کل ہی منگنی ہوئی ہے۔'' انسپکٹر کے سوالات کے جواب میں وہ بولی۔ ''میرا مطلب ہے کہ باضابطہ اعلان ابھی باقی ہے مگر شکیل نے مجھے انگوٹھی پہنا دی ہے'' اس نے سادگی سے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کی رنگ فنگر میں ہیرے کی خوب صورت انگوٹھی جگمگا رہی تھی جس کے گرد زرقون جڑے ہوئے تھے۔

''انگوٹھی تو بہت قیمتی اور خوب صورت لگ رہی ہے۔'' انسپکٹر نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی شکریہ ......'' وہ مسکرائی۔ ''ویسے شکیل کا اس زارا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟''

''ایسے کہ اگر وہ اس کے چکر میں ہوتا تو مجھ سے منگنی کیوں کرتا ...... پھر جیسا کہ وہ بتا رہا ہے کہ وہ تو اس کے لیے اپنی شادی بھی توڑنے پر تیار تھی۔ اگر شکیل کو اس سے تعلق رکھنا ہوتا تو وہ اسے جواب دیتا۔''

''ہمیں یہ سب دیکھنا ہوگا۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''شکیل تم ہماری اجازت کے بغیر شہر سے کہیں باہر نہیں جاؤ گے۔ میں دوبارہ تم سے جلد رابطہ کروں گا۔''

''کیا آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟''

''پولیس تو سب پر ہی شک کرتی ہے، یہ ہمارا کام ہوتا ہے ...... تمہیں کسی پر شک ہے؟''

''مجھے تو یقین ہے کہ یہ اس کے شوہر کا ہی کام ہے، وہ منٹ میں بھڑک اٹھنے والا آدمی ہے۔''

''تم اس سے ملے بغیر یہ رائے کیسے دے سکتے ہو؟'' انسپکٹر نے اسے گھورا۔

''مم میرا مطلب ہے کہ زارا کے اس پیغام سے تو یہی لگ رہا ہے ......'' انسپکٹر کی تیز نظروں اور انداز گفتگو نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ غصہ کسی لاوے کے مانند اس کے ذہن میں ابلنے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے ...... میں اب چلتا ہوں۔ تمہارا موبائل تمہیں دو دن میں مل جائے گا۔''

اس کے باہر نکلتے ہی شکیل نے درمیان میں پڑی میز کو لات ماری تھی۔ تیز آواز سے نہ صرف سمیرا اچھل پڑی تھی بلکہ پیون نے بھی اندر آ کر جھانکا تھا۔

''تم ...... تم یہ کیا کر رہے ہو؟'' سمیرا نے ناپسندیدگی سے اسے گھورا۔

''مجھے اس انسپکٹر کی گفتگو اچھی نہیں لگی۔'' وہ چڑ کر بولا۔ ''اور تم ...... تمہیں اس کو منگنی کی انگوٹھی دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ غرایا۔

''اس میں کیا حرج تھا؟'' سمیرا نے سہم کر پوچھا۔ اس

کے چہرے پر خوف اور ناپسندیدگی جھلک رہی تھی۔
''سوری......'' شکیل چند لمحوں بعد دھیرے سے بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ مجھے یک دم غصہ آجاتا ہے۔''
''ٹھیک ہے......'' وہ سرد لہجے میں بولی تھی۔ ''اب میرے خیال میں مجھے اپنی سیٹ پر جانا چاہیے۔'' پھر وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میٹنگ روم سے نکلتی چلی گئی۔ شکیل اسے کینہ توز نظروں سے گھورتا رہ گیا۔

☆☆☆

ان چار دنوں میں اسحاق بہت بدل گیا تھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے بن گئے تھے۔ شیو نے بڑھ کر ہلکی پھلکی داڑھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے جسم پر ملگجا بنا لباس تھا۔ زارا سے اس طرح جدائی نے اس سے جینے کی امنگ چھین لی تھی۔ اب اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔
''میں اس کے قاتل کو نہیں چھوڑوں گا۔'' اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ اسے اس کی ابتدا شکیل سے کرنی ہوگی۔ اس نے سوچا۔ دروازے پر دستک کی تیز آواز نے اسے چونکایا، وہ آہستگی سے کھڑا ہوا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے انسپکٹر پرویز کئی پولیس والوں کے ساتھ موجود تھا۔
''جی انسپکٹر صاحب......'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''اسحاق احمد تم کو اپنی بیوی زارا کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔'' پرویز بولا، اس کے الفاظ مکمل ہوتے ہی اس کے پیچھے کھڑے اے ایس آئی اور کانسٹیبل نے اندر داخل ہو کر اسحاق کو کندھوں سے تھام لیا۔ انہوں نے لمحہ بھر میں اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ اسحاق نے جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور تیزی سے گھوما ہی تھا کہ ہٹے کٹے کانسٹیبل کا زوردار گھونسا اس کے چودہ طبق روشن کر گیا۔
''انسان کا بچہ بن بھئی...... پولیس کے ساتھ جیکی چن بننے کی کوشش نہ کر، ورنہ تھانے پہنچنے سے پہلے ہی دماغ ٹھکانے پر آجائے گا تیرا......'' انہوں نے اسے گھسیٹ کر کھڑا کیا اور باہر لے آئے۔ اسے تیزی سے موبائل میں بٹھا دیا گیا تھا۔ تھانے پہنچ کر ان کے اترتے ہی دو تین رپورٹرز اپنے مائیک اور کیمرے لے کر ان کی طرف لپکے تھے۔
''کیا تم نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے؟''
''تم نے اسے کیوں مار ڈالا؟''
''کیا اس کے کسی اور سے تعلقات تھے؟ کیا تم نے اسے غیرت کے نام پر قتل کیا ہے؟'' ایک رپورٹر نے مائیک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
''ابھی کوئی بیان نہیں دیا جا سکتا صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ سارے ثبوت اسحاق احمد کے خلاف ہیں۔ اسے اسی لیے گرفتار کیا گیا ہے۔'' انسپکٹر پرویز رپورٹرز کے سامنے آتا ہوا بولا۔ اس دوران باقی پولیس والے اسحاق کو تھانے لے آئے تھے۔
اسحاق کی ذہنی کیفیت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ اسے لاک اپ کی طرف لے جایا ہی جا رہا تھا کہ وہ یکلخت زمین پر بیٹھ گیا...... بے عزتی اور تذلیل کے شدید احساس نے اس کی ساری طاقت گویا سلب کر لی تھی۔
''کھڑا ہو جا بے...... کیا زنانیوں کی طرح نخرے دکھا رہا ہے۔'' کانسٹیبل نے اسے ہلاتے ہوئے کہا۔
''بیوی کو قتل کرتے وقت تو بڑا اطرم خان بنا تھا......'' دوسرا بولا۔
''میں نے اسے نہیں مارا......'' وہ گویا پھٹ پڑا۔ ''میں نے زارا کو نہیں مارا...... میں اس کا قاتل نہیں ہوں۔'' وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔
''کیوں تماشا لگا رہا ہے؟'' دوسرے کانسٹیبل نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ وہ اسے مار رہے تھے مگر وہ اپنے ہوش میں نہیں تھا۔
''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' جبران احمد اس شور شرابے پر کمرے سے باہر نکل آیا۔
''یہ سر خواہ مخواہ شور ڈال رہا ہے۔'' کانسٹیبل سیلیوٹ مار کر مودبانہ انداز میں بولا۔
''یہ...... یہ کون ہے؟'' جبران نے پوچھا۔
''وہ جی جس نے اپنی بیوی کا خون کیا ہے دو دن پہلے......''
''میں نے زارا کو نہیں مارا...... خدا کے لیے میرا یقین کریں......'' اسحاق تڑپ کر بولا۔
''تو اندر چل......'' کانسٹیبل اس کی طرف لپکا۔
''اسے میرے کمرے میں لے آؤ۔'' جبران نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
چند لمحے بعد اسحاق اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اب بھی پورا لرز رہا تھا۔ جبران چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔
''تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''جی...... یس سر...... میں نے زارا کو قتل نہیں کیا...... یہ سچ ہے کہ میں اس وقت یہ ثابت نہیں کر سکتا مگر میں زارا کا قاتل نہیں ہوں۔'' وہ چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپتے ہوئے بولا۔

''تمہارے کیس میں بہت سارے سوالات موجود ہیں مسٹر اسحاق، اگر تم نے یہ قتل نہیں کیا تو پھر سارے ثبوت اس طرح تمہارے خلاف کیوں ہیں؟''

''میرے پاس اس کی کوئی توجیح موجود نہیں ہے کم از کم...... اس وقت نہیں ہے۔ کوشش کروں گا کہ اپنی بے گناہی ثابت کرسکوں۔''

''تم پڑھے لکھے انسان ہو، صورتِ حال کو خود بھی سمجھ سکتے ہو۔'' جبران بولا۔

''پھر آپ میری مدد کریں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ چند لمحوں کے لیے مجھے قاتل مانے بغیر اس کیس کی تفتیش کی جائے۔'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے...... میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں، تم پولیس سے تعاون کرو تا کہ تمہیں زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے، اگر مجھے تمہاری بے گناہی کا ایک ثبوت بھی مل گیا تو میں اس کیس کو خود دیکھوں گا۔'' جبران کو اس کے لہجے میں سچائی محسوس ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' اسحاق امید کی ڈور تھام کر بولا۔ اسے بھی یہ افسر سب سے الگ لگا تھا۔ ''میں وقت دینے پر آپ کا بہت مشکور ہوں۔''

اس کے کمرے سے جانے کے بعد بھی جبران چند لمحے کھڑا سوچتا رہا۔ اس کیس میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ تھی...... وہ گڑبڑ کیا تھی؟ اس نے اس کا پتا لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

تین گھنٹے بعد جبران، ڈاکٹر یاسمین علی کے دفتر میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر یاسمین اسی کی طرح ہی بیرونِ ملک سے کرمنالوجی اور فرانزک میں اسپیشلائزیشن کر کے آئی تھیں۔ ان کی آمد کے بعد سے ہی ڈپارٹمنٹ میں بہت بہتری آئی تھی۔

''آئی ایم سوری جبران، تمہیں انتظار کرنا پڑا، میں اصل میں ایک کیس کے فائنل کمنٹس کی تیاری کر رہی تھی۔''

''اِٹ از آل رائٹ یاسمین...... میں بھی اصل میں ایک کیس کے بارے میں تمہاری رائے جاننے آیا ہوں۔'' جبران مسکرایا۔

''کس کیس کے بارے میں؟''

''زارا اسحاق کے کیس کے بارے میں......''

''ہاں...... بہت خوب صورت اور جوان لڑکی تھی۔ مجھے اس کی موت سے اور اس طرح بے رحمانہ قتل سے بہت افسوس ہوا۔'' یاسمین نے کہا۔ ''نہ جانے انسان کس طرح اس قدر سنگ دل ہوسکتا ہے...... تم اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟ مجھے افسوس ہے کہ میری رائے اور تجزیے سے تمہیں کچھ مایوسی ہوگی......'' وہ آرام سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب؟ کیسی مایوسی؟''

''دیکھو نا پولیس نے اس حوالے سے اپنا ذہن تیار کر لیا ہوگا، میں جانتی ہوں کہ اس کے شوہر کو حراست میں لے لیا ہے مگر شواہد کے حوالے سے میرا تجزیہ کچھ اور ہی کہہ رہا ہے۔''

''کیا؟ میں تمہارا تجزیہ ہی جاننا چاہتا ہوں۔''

''دیکھو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کلوروفارم اس کے ہونٹوں اور منہ کی اندرونی جانب موجود ضرور تھا مگر اس کی مقدار بہت کم تھی یعنی اس مقدار سے کسی کو بے ہوش نہیں کیا جاسکتا۔''

''یعنی تمہارا مطلب ہے کہ زارا قتل کے وقت ہوش میں تھی؟''

''ایسا ہی لگتا ہے دوسرا مسئلہ اس کے ناخنوں میں پائے جانے والی کھال سے متعلق ہے۔ یہ سننے میں تھوڑا عجیب سا ضرور لگے گا مگر یوں لگ رہا ہے جیسے اسے مصنوعی طور پر لگایا گیا ہو۔''

''کیا مطلب ہے یاسمین؟''

''مطلب یہ کہ اگر کوئی مزاحمت کے دوران کسی کو نوچتا ہے تو کھال کی کھرچ اس کے ناخنوں کے اندر تک ہوتی ہے جبکہ اس کیس میں وہ صرف ناخن کے ابتدائی حصے میں لگی ہوئی ہے اس لیے میں اس حوالے سے مشکوک ہوں۔''

''اور ڈی این اے...... کیا کھال کی وہ کھرچ اسحاق کے ڈی ان اے سے میل کھا رہی ہے......؟''

''ہاں...... سمپل کے مطابق وہ اسی کی کھال کے ٹکڑے ہیں۔''

''یعنی یہاں کم از کم ہمارا کیس ثابت ہوتا ہے ورنہ تم نے تو انسپکٹر پرویز کے اوپن اینڈ شٹ کیس کی دھجیاں سی اڑا دی ہیں۔''

''ایک بات اور ہے......'' ڈاکٹر یاسمین نے کہا۔

''خودکشی والی بات بھی ثابت نہیں ہو رہی کیونکہ اس کے معدے میں دوا کی اتنی مقدار نہیں تھی جو خودکشی کے لیے کافی ہو۔''

''ہوسکتا ہے کہ اسے مقدار کا اندازہ ہی نہ ہو۔''

''ہوسکتا ہے......'' اس نے کہا۔ ''بہر حال اسے جس بے دردی سے قتل کیا گیا ہے، وہ افسوسناک ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کا قاتل جلد از جلد پکڑا جائے۔''

''میری کوشش بھی یہی ہے کہ آلۂ قتل پر ملنے والے نشانات اور دیگر ثبوتوں کے مطابق تو ہمارے پاس ریڈی میڈ قاتل بھی موجود ہے مگر میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ معاملہ اس قدر سیدھا اور صاف نہیں ہے۔''

''یہی میں بھی کہہ رہی تھی۔'' ڈاکٹر یاسمین مسکرائیں۔ ''اب جبران دی گریٹ نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے یعنی صرف منظر نہیں، پس منظر اور پیش منظر بھی کھنگالا جائے گا۔''

''آپ مطمئن رہیں میڈم......'' وہ جواباً سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور پھر ڈپارٹمنٹ سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

ہر گزرتا لمحہ اس کے اعصاب کو مزید بکھیرتا جا رہا تھا۔ ساری دنیا اس کے خلاف ہو چکی تھی اور خود اس کے پاس اپنے حق میں کوئی بھی مضبوط دلیل موجود نہیں تھی۔ ان چند دنوں میں اس کی پوری زندگی الٹ پلٹ گئی تھی اور اب وہ اس گندی سی کوٹھری میں تین مجرموں کے ساتھ بند تھا۔ شاید ان سے بڑے مجرم کے طور پر، کیونکہ اس پر 302 کا مقدمہ ثابت ہونے جا رہا تھا، اس نے جھرجھری سی لی۔

اس وقت ایک کانسٹیبل نے آ کر کوٹھری کا دروازہ کھولا...... وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں اسے دیکھ رہا تھا۔

''چلو تمہاری ملاقات آئی ہے۔'' وہ اسحاق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھ سے، مجھ سے کون ملنے آیا ہے؟'' وہ بے اختیار بولا۔

''خود چل کر دیکھ لو...... جلدی کرو۔'' وہ اکھڑ پن سے بولا۔

اسحاق اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچا وہاں صائمہ ایک اجنبی شخص کے ساتھ اس کی منتظر تھی۔

''اسحاق تم کیسے ہو؟'' وہ اسے دیکھتے ہی اس کی جانب لپکی۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے بے پناہ فکر جھلک رہی تھی۔ ''تمہیں گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے، تم بے گناہ ہو یہ میں جانتی ہوں، تم نے زارا کو قتل نہیں کیا ہے۔'' اتنی دیر میں پہلی بار کسی نے اس پر اعتماد کیا تھا۔ اسحاق کو ہلکے سے سکون کا احساس ہوا۔

''اور ہاں ان سے ملو...... یہ جمیل آفریدی ہیں۔ اچھے وکیل ہیں، میں انہیں یہاں لائی ہوں تاکہ تم ان کا وکالت نامہ دستخط کر دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اسحاق بولا۔ صائمہ کی آمد نے اسے کچھ ہمت دی تھی۔

''صائمہ، آپا کو کسی نے اس سب کی خبر نہیں دی ہوگی پلیز تم فی الحال انہیں کچھ مت بتانا، میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں پریشان ہوں اور ان کے پورے سسرال میں اس بات کا چرچا ہو۔'' وہ بولا۔

''تم فکر نہ کرو اسحاق، اس سے قبل ہی تم یہاں سے رہا ہو جاؤ گے۔'' صائمہ نے دوبارہ کہا۔

صائمہ اور وکیل کے جانے کے بعد وہ کوٹھری پہنچا ہی تھا کہ اسے دوبارہ طلب کر لیا گیا، اس بار اسے ڈی ایس پی جبران کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

''آپ کو میری بات پر یقین آیا؟'' اس نے اسے دیکھ کر امید بھرے انداز میں پوچھا۔

''اسحاق...... زارا کے ناخنوں میں پائے جانے والی کھال کی کھرچن تمہارے ڈی این اے سے مل گئی ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ تم دونوں میاں بیوی کے درمیان تعلقات بہت اچھے نہیں تھے اور یہ کہ تمہاری بیوی شکیل نامی کسی شخص کو پسند کرتی تھی۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' اسحاق بپھر گیا۔ ''آپ مجھے قاتل کہنا چاہیں تو کہہ لیں مگر زارا پر اس طرح کا الزام نہ لگائیں، وہ اس شکیل نامی غنڈے سے بہت ڈرتی تھی جس پر مجھے غصہ آتا تھا مگر وہ صرف مجھ سے پیار کرتی تھی۔''

''پھر اس نے اسے یہ پیغام کیوں بھیجا تھا کہ وہ اس کے لیے آپ کو چھوڑنے پر تیار ہے۔'' جبران نے سفاکی سے پوچھا۔

''کیا......؟'' اسحاق ایک لمحے کو ساکت سا ہو گیا۔

''میں یہ بات نہیں مان سکتا اس نے ایسا کوئی پیغام اسے بھی بھیجا ہو۔''

''مگر میرے پاس اس کا ثبوت ہے۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''ثبوت تو آپ کے پاس اس بات کے بھی ہیں اور بہت سارے ہیں کہ میں نے زارا کا قتل کیا ہے مگر میں نے

نہیں کیا..... اور یہ بات میرا اللہ جانتا ہے اسی طرح میں یقین سے کہہ رہا ہوں کہ زارا اس طرح کا پیغام نہیں بھیج سکتی نہ شکیل کو اور نہ کسی اور کو.....'' اسحاق نے طمانیت سے کہا۔

''تمہیں زارا پر بہت یقین ہے؟''

''ہاں، خود سے زیادہ..... پتا نہیں آپ کو اس بات پر یقین آئے یا نہ آئے مگر سچ کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے جو بالآخر چاروں جانب پھیل کر رہتی ہے، اسے چھپانا ممکن نہیں ہوتا۔ جھوٹ کی یہ عمارت جس نے بھی بنائی ہے، اس نے اس میں ہر اینٹ نہایت مہارت سے لگائی ہے، سچ کی تمام راہیں بند کر دی ہیں مگر حقیقت کبھی نہ کبھی سامنے آ ہی جائے گی۔'' اس نے تکلیف سے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

شکیل سعید نے آج کافی شاپنگ کی تھی۔ اس نے سمیرا کے لیے اس کے پسندیدہ رنگ کا جوڑا، میک اپ کا سامان، خوب صورت کڑے اور جھمکے بھی خریدے تھے۔ اس روز کے بعد سے اس کا موڈ شکیل کے ساتھ بگڑا ہوا تھا، وہ اس کی ناراضگی افورڈ نہیں کر سکتا تھا، اس کے والد خاصے امیر شخص تھے، ان کی کئی جائدادیں تھیں جن کے کرایوں سے وہ ایک پرتعیش زندگی گزار رہے تھے۔ سمیرا ان کی واحد اولاد تھی یعنی ان کی تمام دولت کی اکلوتی وارث تھی۔ وہ شکیل کو خاصا پسند کرتی تھی، اس سے شادی شکیل کے لیے فائدے کا سودا تھا۔ گزشتہ کئی ماہ میں وہ دادا کی زمین کا کچھ حصہ بیچ چکا تھا اور اس پر خاصا قرضہ بھی چڑھا ہوا تھا۔ سمیرا سے شادی اس کے لیے کامیابی کا ٹوکن تھا۔ ایک مرتبہ شادی ہو جاتی پھر وہ اسے دیکھ لیتا۔ شاپنگ سینٹر سے نکل کر وہ اپنی چھوٹی سی کار کی طرف بڑھا تھا کہ کسی نے اس کا کالر پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''تم..... تم قاتل ہو، تم نے میری دوست کو جان سے مار ڈالا..... میں اس بات سے واقف ہوں کہ وہ تم ہی ہو۔ تم سب کو بے وقوف بنا سکتے ہو مگر مجھے نہیں.....'' وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔

''تم پاگل ہو گیا؟'' اس نے جھٹکا دے کر اپنا کالر اس کے ہاتھوں سے چھڑوایا۔ ''ہو کون تم؟ کس قتل کی بات کر رہی ہو؟'' لوگ ان کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔

''میں صائمہ ہوں اور تم نے زارا کو قتل کیا ہے، وہ میری قریبی دوست تھی اور اس نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا بکواس ہے یہ..... دیکھو تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ پولیس نے اس کے قتل کے الزام میں اس کے شوہر کو گرفتار کیا ہے۔''

''یہ بات تم اور میں دونوں جانتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہے.....'' وہ غرائی۔

''مجھے تو یہ بات پولیس نے بتائی ہے اگر تمہیں اس حوالے سے کچھ بھی کہنا ہے تو پولیس اسٹیشن جا کر کہو..... ویسے تمہاری دوست اپنی شادی سے خوش نہیں تھی۔''

''یہ جھوٹ ہے۔ وہ بہت خوش تھی اور تم سے تو وہ سخت نفرت کرتی تھی۔''

''بہر حال تم کچھ بھی کہو، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب تم میرا راستہ چھوڑو۔'' وہ دماغ میں ابلتے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہوا پارکنگ کی طرف بڑھا۔

''تم جھوٹے ہو شکیل سعید..... بہت بڑے جھوٹے۔'' وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ ''میں اس معاملے کو اس طرح نہیں چھوڑوں گی ساری دنیا کو جلد ہی حقیقت کا علم ہو جائے گا..... تم دیکھ لینا۔'' وہ چلائی۔

شکیل کا صبر اب جواب دے چکا تھا۔ وہ اس کے ان جملوں کے ساتھ ہی تیر کی طرح مڑا۔ اس نے صائمہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گاڑی سے چپکایا۔ وہ اسے دھکا دینا چاہ رہی تھی مگر اس کی مضبوط گرفت میں کسی چڑیا کے مانند لرز کر رہ گئی۔

''بہت بکواس کر لی تو نے.....'' وہ اس کے کان کے بالکل قریب سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''اب تیرے حق میں بہتر یہی ہے کہ اپنا منہ بند رکھ اور اس معاملے سے دور رہ۔ ورنہ اپنی دوست کے مانند ایک روز تیری بھی کٹی پھٹی لاش برآمد ہوگی..... سمجھ گئی؟''

اس نے جملہ مکمل کر کے اسے فٹ پاتھ کی طرف دھکا دیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اگنیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھی تھی۔ سائڈ مرر سے اس کی نظر پیچھے کھڑی صائمہ پر پڑی، اس کے چہرے پر خوف، یا ڈر کے بجائے ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی..... وہ تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ آگے جا کر اس نے اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ مارے..... ''غصے پر قابو ضروری ہے۔'' وہ اپنے آپ سے بولا۔ اس نے غصے کے عالم میں صائمہ کے شک کو یقین دے دیا تھا اب اگر اس نے اس معاملے کو آگے بڑھایا تو..... اس نے پریشان ہو کر سوچا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ جگمگائی۔ ''وہ اسے بھی اس کی دوست

کے پاس روانہ کردے گا۔''

☆☆☆

اسحاق کو عدالتی ریمانڈ پر جیل شفٹ کر دیا گیا تھا اور اب وہ اسحاق کی جگہ قیدی نمبر 5031 تھا۔ جیل کے بارے میں پڑھنا، فلمیں دیکھنا ایک الگ بات تھی اور جیل میں قیدی کی حیثیت سے رہنا ایک بالکل مختلف تجربہ..... اسے یہاں آئے کئی روز ہو گئے تھے اور یہ چند دن سال کی زندگی پر بھاری تھے۔ اس کی انا، پسند ناپسند سب نہ جانے کہاں جا سوئی تھیں۔ اس کے وکیل نے یہاں اسے اس کی ضرورت کے مطابق رقم فراہم کر دی تھی جس کی وجہ سے وہ کسی حد تک سہولیات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ آگے کیا ہونے والا تھا، یہ وہ نہیں جانتا تھا اور حالات جس رخ پر جارہے تھے ان کو دیکھتے ہوئے وہ اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دل کو یقین تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ یقین دن میں کئی بار ٹوٹتا اور دوبارہ قائم ہوتا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے بستر پر بیٹھا زارا کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اسے بتایا گیا کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ ملاقاتی کمرے میں اس کی توقع کے مطابق صائمہ اس کی منتظر تھی۔ اس کے اور وکیل کے علاوہ اس سے کوئی بھی ملنے نہیں آیا تھا۔

''اسحاق تم کیسے ہو؟ خود کو سنبھالو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اسے دیکھ کر بہت محبت سے بولی۔

''ہاں امید تو ہے مجھے.....'' وہ نیم دلی سے مسکرایا۔

''تم کیسی ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

''نہیں صائمہ تمہارا شکر گزار ہوں میں..... ویسے اگلے ہفتے یہاں مزید پیسے دینا ہوں گے۔ تم میری چیک بک لے آنا دفتر سے، میں دستخط کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے اس وقت میں تمہیں ایک اہم بات بتانا چاہتی ہوں۔''

''کیسی اہم بات.....؟''

''ڈرتی ہوں کہ تم یہ بات برداشت نہ کر سکے تو.....''

وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

''میں اب سب برداشت کر سکتا ہوں۔'' اسحاق نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''دیکھو نا میں زارا کے جانے کے بعد اور اس ساری اذیت اور ذلت سہنے کے بعد بھی زندہ ہوں۔''

''ہمت کرو اسحاق.....'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تم مجھے وہ بات بتاؤ..... پلیز.....''

''وہ شکیل کے بارے میں ہے۔''

''شکیل..... کیا بات ہے؟''

''اس نے مجھے مارنے کی دھمکی دی ہے اور بتایا ہے کہ اس نے ہی زارا کو قتل کیا ہے۔'' وہ بالآخر بولی۔

''مجھے معلوم تھا.....'' اسحاق کرسی پر اس قدر آگے ہو کر بیٹھا تھا کہ کرسی اچانک الٹ گئی..... دروازے کے قریب کھڑا گارڈ یک دم الرٹ ہو گیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ اچانک گرنے سے اس کی ناک سے خون نکل آیا تھا۔ اس نے آستین سے خون صاف کیا۔ گارڈ چند لمحے اسے گھور کر دوبارہ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔

''پھر تم نے پولیس کو اس بارے میں بتایا؟'' اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''نہیں، وہ میری بات کا یقین نہیں کریں گے..... وہ سمجھیں گے کہ میں تمہیں بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہوں۔''

''یہ ہوا کب.....'' اس نے پوچھا۔ جواب میں صائمہ نے اسے پورا قصہ سنایا۔ درمیان میں اسحاق نے دو بار غصے سے ان کے درمیان موجود جالی پر ہاتھ مارا تھا۔

''صائمہ ہو سکے تو یہ بات کسی نہ کسی طرح ڈی ایس پی تک پہنچا دو۔ وہ مانے یا نہ مانے مگر اسے یہ ضرور بتا دینا.....'' وہ جالی کے قریب منہ لا کر بولا۔

صائمہ کے جواب دینے سے پہلے گارڈ نے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا دیوار پر بجایا۔ گویا ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اسحاق اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

وہ گہری نیند میں تھا۔ گھنٹی کی مسلسل آواز پر اس نے کسمسا کر بیڈ سائڈ سے فون اٹھایا اور کان سے لگایا۔

''کون بول رہا ہے؟''

''میں..... انسپکٹر پرویز.....'' دوسری جانب سے پرویز کی آواز سن کر جبران کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ کیا وقت ہوا ہے؟''

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اس وقت زحمت دی۔ اصل میں مجھے آپ سے اہم بات کرنی تھی۔ کیس میں

ایک نیا موڑ سامنے آ گیا ہے۔''
جبران اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، اس نے گہری سانس لی پھر بولا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''قالین پر موجود مٹی کے فرانزک تجزیے کے مطابق وہ اسحاق یا زارا میں سے کسی سے میچ نہیں ہو رہا ہے۔''

''یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس رات اس کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا بھی موجود تھا؟'' جبران بولا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اسحاق کا چہرہ گھوم گیا تھا۔

''پرویز میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک بار پھر جائے واردات کا جائزہ لینا چاہیے۔ تم صبح سات بجے اسحاق کے گھر پہنچ سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں سر!''

''بس تو پھر ہم وہیں ملتے ہیں۔'' اس نے اتنا کہہ کر کال کاٹ دی۔

جائے واردات کے دوبارہ مکمل معائنے کے بعد انہوں نے پڑوسیوں سے دوبارہ گفت و شنید کا فیصلہ کیا۔ اسحاق کا گھر گلی کے آخری کونے میں تھا۔ اس کے اردگرد کے تین گھر ان کے خصوصی ٹارگٹ تھے۔ پہلے دروازے پر دستک کے جواب میں ایک خاصی معمر خاتون باہر آئی تھیں۔ ان کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ جبران کا کارڈ دیکھنے اور اس کی بات سننے کے بعد انہوں نے گہری سانس لے کر جھرجھری سی لی۔

''بہت افسوسناک واقعہ ہے۔ اتنا اچھا جوڑا تھا، دونوں بہت خوش لگتے تھے۔ میں تو اسے بہت اچھا لڑکا سمجھتی تھی مگر آپ دوسروں کے بارے میں کبھی بھی کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ میں تو سوچ کر خوف زدہ ہو جاتی ہوں کہ میرے گھر کے برابر میں ایک قاتل رہ رہا تھا۔'' وہ کہتی چلی گئیں۔

''میڈم ہم اسی بارے میں تفتیش کر رہے ہیں۔ کیا آپ نے اس رات کوئی خاص چیز نوٹس کی تھی یا کوئی آواز سنی تھی؟''

جواب میں وہ مسکرائیں۔ ''بیٹا اصل میں، میں اپنے آلۂ سماعت کے بغیر کچھ بھی نہیں سن پاتی...... اس رات ہمارا ملازم بھی چھٹی پر تھا میں اور تمہارے انکل جلد ہی سونے لیٹ گئے تھے۔ جب سے ہمارا بیٹا بہو امریکا گئے ہیں یہاں صرف ہم دو ہی ہوتے ہیں۔''

اگلے دو گھروں سے بھی انہیں کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ گرمی کی وجہ سے وہ اپنے ائرکنڈیشنڈ کمروں میں بند تھے۔ اب صرف اسحاق کے سامنے والے دو گھر باقی تھے۔

جبران اور پرویز ان میں سے پہلے کی جانب بڑھے، یہ ایک دو منزلہ مکان تھا جس کی بالکونی سے اسحاق کے گھر کو دیکھا جا سکتا تھا۔ دروازہ ایک ملازم نے کھولا تھا۔ وہ ہی جبران کا کارڈ اندر لے گیا تھا اور واپسی پر اس نے انہیں اندر ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھایا تھا۔ یہ ایک متوسط طبقے کے گھر کا کمرا تھا جہاں سہولت کی ہر چیز موجود تھی۔ چند لمحوں بعد ایک ادھیڑ عمر خاتون ایک دس گیارہ سال کے لڑکے کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''معاف کیجیے گا میرے شوہر اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟''

''جی ہاں، آپ جانتی ہیں کہ آپ کے سامنے والے گھر میں قتل کی ایک واردات ہوئی ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس رات یا اس کے آگے پیچھے آپ نے یہاں کوئی عجیب بات دیکھی یا سنی ہو...... تو اس سے ہماری مدد ہو سکتی ہے۔''

''اس حوالے سے قتل والی صبح بھی پولیس نے ہم سے سوالات کیے تھے اور ہم نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہم نے کچھ نہیں سنا یا دیکھا۔'' وہ محتاط انداز میں بولی۔ اس کے انداز سے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ چاہتی ہو کہ وہ لوگ جلد سے جلد اس کے گھر سے چلے جائیں۔

''یاد کرنے کی کوشش کریں آپ کی ذرا سی مدد ہمارے لیے بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔'' اس بار پرویز نے کہا۔

''دیکھیے ہمیں جو معلوم تھا، ہم بتا چکے ہیں۔ اب ہمیں کیا معلوم کس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ اتنا وقت کس کے پاس ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک پر نظر رکھتا پھرے۔''

''آپ کی بات درست ہے۔'' جبران نے دھیرے سے کہا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ عورت کچھ چھپا رہی ہو۔

''ممی وہ ایک آدمی تھا نا جو اس درخت پر چڑھتا تھا......'' بچہ جو اب تک غور سے ان کی بات سن رہا تھا، اچانک بول پڑا۔

''صمد! تم خاموش رہو۔ سو بار کہا ہے کہ بڑوں کی باتوں میں دخل مت دیا کرو۔'' اس نے لڑکے کو گھر کا۔

''کون سا آدمی......؟'' جبران نے بچے کی طرف دلچسپی سے دیکھا۔

''اسے یوں ہی باتیں کرنے کی عادت ہے۔ کہانیاں

گھڑتا رہتا ہے۔'' وہ سخت لہجے میں بولی۔ ''اب میں آپ سے اجازت چاہوں گی۔''

''پلیز میڈم...... قانون سے تعاون خود آپ کی حفاظت کا ضامن ہے۔ اگر آپ آج دوسروں کے لیے سچ نہیں بولیں گے تو کل آپ کے ساتھ بھی کچھ ہوسکتا ہے، پلیز مجھ پر اعتماد کریں اور مجھے بچے سے بات کرنے دیں۔'' جبران نے سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے اپنے بچے کو پولیس کے چکروں میں نہیں ڈالنا......'' وہ تیزی سے بولی۔

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو ذرہ بھر تکلیف نہیں ہوگی نہ ہی آپ کے بیٹے پر کوئی حرف آئے گا۔'' جبران نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے چند لمحے بچے سے بات کر لینے دیں، ہوسکتا ہے کہ اس کے مشاہدے کی وجہ سے کسی بے گناہ کی جان بچ جائے۔''

اس بار خاتون خاموش رہ گئی تھی۔

''بیٹا! آپ کا کیا نام ہے؟'' جبران نے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''صمد......'' اس نے فوراً جواب دیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''تم نے درخت پر کسی کو دیکھا تھا؟''

''جی انکل......'' وہ ننھا سا سر ہلا کر بولا۔ ''میں نے کئی بار اسے دیکھا تھا امی کو بھی بتایا تھا۔''

''وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟''

''وہ ان کے گھر کے اندر جھانک رہا تھا۔''

''تم یہ یقین سے کہہ سکتے ہو؟'' پرویز نے پوچھا۔

''میں آپ کو دکھا سکتا ہوں۔'' وہ بولا اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ہینڈی کیم تھا۔

''میں نے اس کی تصویر بھی اتاری ہے، مجھے یہ ممی اور پاپا نے برتھ ڈے پر گفٹ کیا تھا۔'' وہ فخر سے بولا۔

کیمرے میں واردات کی رات سے ایک روز قبل کی تاریخ میں چند اسٹل تصاویر موجود تھیں اور ان سے پہلے کی تصاویر بھی موجود تھیں۔ ان تصویروں میں زارا اور اسحاق کے گھر کی بالکونی اور پچھلا حصہ نظر آرہا تھا۔ نیم کے درخت پر ایک شخص موجود تھا جس کے ہاتھ میں کیمرا یا دوربین تھی مگر اس شخص کی تصویر واضح نہیں تھی۔

''کیا اس سے آپ کی کچھ مدد ہوسکتی ہے؟'' صمد کی والدہ نے پوچھا۔

''جی ہاں بالکل ہوسکتی ہے، ہمیں یہ کیمرا درکار ہے، اس سے یہ تصاویر لے کر اسے دوبارہ آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔'' پرویز نے جواب دیا۔

''مگر آپ کو تو صرف یہ والی پکچرز چاہئیں ہیں نا......'' کیمرا لے جانے والی بات ننھے صمد کو کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔

''جی بیٹا......'' پرویز مسکرایا۔

''تو میں یہ آپ کے نمبر پر سینڈ کر دیتا ہوں نا......؟''

''بیٹا اسے ثبوت کے طور پر پیش کرنے کے لیے اس کیمرے کی بھی تصاویر درکار ہوں گی...... آپ کا کیمرا کل تک آپ کو مل جائے گا اور آپ کا انعام بھی۔'' جبران مسکرایا۔ اس بار اس کی ماں بھی مسکرائی تھی۔

''دیکھیے ہمیں بھی اپنی ذمے داری کا احساس ہے مگر میں اپنے بیٹے کو کسی معاملے میں ڈالنا نہیں چاہتی، آج کل کے حالات کا علم ہے آپ کو...... اس لیے پلیز اسے اس سب سے الگ رکھیے گا۔'' اس بار وہ قدرے لجاجت سے بولی تھی۔

''میں سمجھتا ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔'' جبران نے اسے تسلی دی اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔

''تو اسحاق سچ کہہ رہا تھا کہ کوئی اس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہی پرویز نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ یہ شکیل سعید ہی ہو...... میں نے جب اس کا بیان لیا تھا تب بھی مجھے اس کی کئی باتوں پر شک ہوا تھا۔ مٹی والی رپورٹ کے بعد یہ تصویر ایک بڑا ثبوت ہے۔''

''ہاں...... مگر فوٹو کافی دھندلا ہے۔'' جبران نے سر ہلایا۔ ''اس سے یہ اندازہ تو ہوتا ہے کہ کوئی وہاں موجود ہے مگر چہرہ بالکل واضح نہیں ہے۔''

''پھر بھی کچھ تو ملا ہے۔''

''ہاں اور ہم اس سے اس شکیل سعید پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔'' جبران نے کہا۔ اس کا ذہن تیزی سے شواہد کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک ایک خیال نے اسے روشنی دکھائی۔

''اس سارے کیس میں کریڈٹ کارڈ کے ذریعے خریدے گئے کلوروفارم وغیرہ ایک مضبوط ثبوت ہے، اگر ہم اس کیمسٹ سے بات کریں تو شاید کچھ اور اہم چیزیں سامنے آسکتی ہیں، تمہارے پاس اس کی رسید مل سکتی ہے۔''

''جی، وہ کریڈٹ کارڈ کے ذریعے نکلوائی گئی تھی۔'' پرویز بولا۔ چند لمحوں اور ایک فون کال کے بعد کیمسٹ کا پتا

ان کے پاس تھا۔
''کیا تم نے اس سے رابطہ کیا تھا؟'' جبران نے پوچھا۔
''نہیں...... ثبوت اتنا واضح تھا کہ چھان بین کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔'' پرویز نے ندامت سے کہا۔
''ہم وہیں چل رہے ہیں۔'' جبران نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
''ویسے کیا آپ کے خیال میں شکیل اتنا احمق ہوگا کہ وہ خود وہاں گیا ہو؟'' پرویز نے سوال کیا۔
''میرا خیال ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے۔'' جبران مسکرایا۔ اسے اب اس کیس میں مزہ آرہا تھا۔ ''اصل میں ہمارے پاس اسحاق کے خلاف اتنے مضبوط ثبوت موجود تھے۔ کریڈٹ کارڈ والے ثبوت کے بعد شکیل یا جو کوئی بھی ہے اسے یہ امید نہیں ہوگی کہ ہم کیمسٹ تک جا سکتے ہیں۔ کیا تمہارے پاس شکیل سعید کی کوئی تصویر ہے؟''
''ان دونوں کے...... میرا مطلب ہے کہ اسحاق اور شکیل کے فیس بک پیجز سے ان کی تصاویر نکالی ہیں میں نے۔'' پرویز نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔
''زبردست۔'' جبران نے انگوٹھا اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم دیکھتے ہیں کہ کیمسٹ ان میں سے کسی کو پہچانتا ہے کہ نہیں......'' ان ثبوتوں نے ان دونوں کو ذہنی طور پر انتہائی مستعد کر دیا تھا۔
کیمسٹ کی وہ دکان خاصی بڑی اور مصروف تھی۔ پرویز اپنا کارڈ دکھا کر شاپ کے مالک تک پہنچ گیا۔
''جی فرمائیے، میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' وہ ایک قدرے فربہ اندام شخص تھا۔
''ہمیں ایک کیس کے حوالے سے آپ سے بات کرنی ہے، کیا آپ روزانہ یہاں موجود ہوتے ہیں؟''
''بالکل یہ میرا کام ہے۔''
''کیا آپ کو گزشتہ ہفتے میں کسی کا آپ کی دکان سے کلوروفارم خریدنا یاد ہے؟''
''اصل میں کلوروفارم جیسی چیزیں بہت کم خریدی جاتی ہیں مگر ایک شخص آیا تھا۔''
''کیا آپ اس کو پہچان سکتے ہیں؟'' پرویز نے بے تابی سے پوچھا۔
''ارے میں اس کو جانتا ہوں، وہ اکثر یہاں سے دوا وغیرہ خریدتا رہا ہے۔'' دکاندار بولا۔
''کیا یہ وہی ہے؟'' پرویز نے شکیل سعید کی تصویر کھول کر موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
اس نے غور سے تصویر کو دیکھا اور بولا۔ ''ہاں یہی تو ہے، اس کا نام شکیل سعید ہے۔ وہ یہاں آیا تھا، مجھے تھوڑا مسئلہ یہ ہوا تھا کہ اس کے پاس کسی اور کا کریڈٹ کارڈ تھا، میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا بھی تھا۔ اس نے جواب میں کہا تھا کہ وہ اپنا کارڈ بھول آیا ہے اور ایک دوست کا کارڈ استعمال کر رہا ہے۔''
''اوکے......'' جبران نے کہا۔ ''ہمیں آپ کا باقاعدہ بیان درکار ہوگا، دوپہر تک ہمارے افسر آکر آپ کا بیان لے لیں گے۔''
''ٹھیک ہے سر......'' اس نے گردن ہلائی۔
''پرویز...... شکیل کے لیے وارنٹ تیار کرو۔ ہمیں آج دوپہر ہی اس کے گھر پر چھاپا مارنا ہے۔'' جبران تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھا۔ ''اس کا ڈی این اے سیمپل لینا ہوگا تاکہ مقتلی والے تجزیے سے ملایا جاسکے۔''
''ٹھیک ہے سر......'' پرویز بولا۔ ''میں ایک گھنٹے میں سارے انتظامات کر کے آپ کو بتاتا ہوں...... ایک بات اور ہے......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
''کیا؟''
''میں نے شکیل کی منگیتر کے ہاتھ میں ہیرے کی ایک خاصی مہنگی اور اچھی انگوٹھی دیکھی تھی جو اسے قتل کے اگلے روز ہی شکیل نے پہنائی تھی۔''
''تمہارا خیال ہے کہ وہ زارا کی انگوٹھی ہوسکتی ہے کیونکہ ہمیں لاش کے ہاتھ میں کوئی انگوٹھی نہیں ملی تھی؟''
''ہاں مجھے اسی بات کا شک ہے۔''
''ٹھیک ہے، اس کی منگیتر سے ملنا پڑے گا۔''

☆☆☆

شکیل سعید کی رات کچھ زیادہ اچھی نہیں گزری تھی۔ اس رات کے اچھا نہ گزرنے کی بنیادی وجوہات میں صائمہ کا نام سرفہرست تھا۔ گزشتہ شام اس سے ہونے والے ناکرے نے اس کا دماغ گھما دیا تھا۔ اسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ جب وہ اس کے ہاتھ آہی گئی تھی تو اس نے اس کا ٹینٹوا ہی کیوں نہیں دبا دیا پھر یہ پریشانی بھی ختم ہو جاتی کہ وہ کہیں بھی کچھ بھی نہ بکتی پھرے۔ دوسرا مسئلہ سمیرا تھی۔ تحفے وصولنے کے باوجود اس کا موڈ کچھ زیادہ بہتر نظر نہیں آرہا تھا۔ شکیل کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس روز پولیس افسر سے سوال جواب اور پھر اس کے غصے نے اسے شک میں مبتلا کر

دیا تھا۔ ''بھاڑ میں جائے۔'' اس نے تنگ آکر سوچا۔ ''زیادہ بک بک کرے گی تو پیچھا چھڑا لوں گا اس سے......''

وہ کسی کام سے دس بجے گھر سے نکل گیا تھا۔ دوپہر تک نیند کی طلب اسے دوبارہ گھر کی طرف لے گئی۔ جیل سے واپسی کے بعد ماں باپ سے اس کا خاصا بڑا جھگڑا ہوا تھا جس کے بعد سے اس نے ایک لگژری فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ فلیٹ بہت بڑا نہیں تھا مگر جدید انداز میں بنا ہوا تھا اور وہاں تمام سہولیات میسر تھیں۔ اس بلڈنگ میں بہت زیادہ فلیٹ بھی نہیں تھے۔ چونکہ اسے کچھ دیر بعد واپس جانا تھا۔ اس لیے اس نے گاڑی کو باہر ہی پارک کیا تھا۔ وہ ابھی کار سے اترا بھی نہیں تھا کہ اس نے دو پولیس کاروں کو عمارت میں داخل ہوتے دیکھا۔ اندر پہنچ کر وہ سب نیچے اُتر آئے تھے پھر ان میں سے دو گارڈ روم میں داخل ہوئے تھے۔ شکیل اپنی سیٹ میں دُبکا ہوا انہیں دیکھ رہا تھا۔ چونکہ باہر کئی گاڑیاں موجود تھیں اس لیے اس کی کار کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی تھی۔ اس کے بعد وہ سب لفٹ اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ شکیل کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے تھے...... یقیناً کوئی نہ کوئی گڑبڑ تھی اس وقت وہ اندر جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ کیوں آئے تھے؟ اوپر کیوں گئے تھے؟ وہ اس بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر اس وقت انتظار کرو اور دیکھو کی بہترین پالیسی تھی۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور کار عمارت میں داخل ہوئی۔ اس کی وجہ سے وہ گیٹ کے باہر ہی رک گئی تھی۔ اس سے جو شخص برآمد ہوا اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے شکیل ساکت سا رہ گیا۔ وہ وہی انسپکٹر تھا جس نے اسے بیان کے لیے تھانے بلایا تھا اور پھر اس کے ساتھ سمیرا کے دفتر تک گیا تھا۔ اس کی یہاں آمد کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ یہ چھاپا اس کے گھر پر ہی مارا گیا تھا مگر یہ ہوا کیسے......؟ اس نے دماغ پر زور ڈالا۔ اس نے تو کہیں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ سارے ثبوت اسحاق کے خلاف تھے۔ وہ جیل بھیجا جا چکا تھا پھر یک دم یہ کیا ہوا تھا......؟ اس نے ذہن پر زور ڈالا۔ انسپکٹر پرویز کسی سے فون پر گفتگو میں مصروف تھا۔ شکیل نے فیصلہ کیا کہ اس کے اوپر جاتے ہی وہ یہاں سے نکل جائے گا مگر جیسے ہی وہ فون بند کر کے اندر جانے کے لیے مڑا، اوپر سے چند پولیس والے نیچے اتر آئے تھے۔ وہ انسپکٹر کی جانب گیٹ کے پاس ہی آگئے تھے، ان کے ہاتھوں میں دو تھیلے تھے۔ اب وہ اتنے فاصلے پر تھے کہ شکیل ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔

''کیا وہ موجود ہے؟'' انسپکٹر نے ان کے قریب آتے ہی پوچھا۔

''نہیں وہ گھر پر نہیں ہے۔'' اے ایس آئی نے جواب دیا۔ ''سر! آپ کے حکم کے مطابق ہم نے پورے گھر کی تلاشی لی ہے۔ ہمیں کافی کچھ ملا ہے۔ بستر کے گدے کے نیچے سے یہ بہت ساری تصاویر ملی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کافی دنوں سے زارا اور اسحاق کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا لیپ ٹاپ بھی ہم نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے، ہمیں یقین ہے کہ ہمیں اس سے بہت اہم چیزیں ملیں گی۔'' وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

شکیل کے سر پر گویا کار کی چھت ٹوٹ کر آ گری تھی۔ اس کے تصور میں بھی یہ صورت حال نہیں تھی۔ لیپ ٹاپ پر کوئی پاس ورڈ بھی نہیں تھا یعنی ان کے لیے اس کے سارے منصوبوں کا پتا لگانا اب چند لمحوں کی بات تھی۔ وہ اس کی میل باکس میں موجود اس کے اس گمنام دوست کی میل تک بھی پہنچ سکتے تھے جس نے گزشتہ مہینے سے زارا اور اسحاق کے بارے میں اس کی بہت مدد کی تھی۔

''گڈ...... ٹھیک سے تلاشی لی ہے نا، کوئی چیز بچنی نہیں چاہیے۔'' انسپکٹر نے سختی سے پوچھا۔

''جی سر، ہمیں وہاں اس کے ایک جوڑی جوتے بھی ملے ہیں جن کے تلے پر خون کے چند دھبے بھی موجود ہیں۔''

''بہت خوب......'' پرویز مسکرایا۔ ''تم تمام ثبوتوں کے ساتھ دفتر پہنچو اور ان سب پر آج ہی کام شروع ہو جانا چاہیے اور تم اسلم......'' وہ دوسرے افسر کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم میرے ساتھ آؤ...... ہمیں ایک اور کام نمٹانا ہے۔''

''ٹھیک ہے سر...... کیا اسی کیس سے متعلق ہے؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

''اور کیا۔'' پرویز نے اسے گھورا۔ ''ہمیں اس میاں شکیل کی منگیتر کے دفتر جانا ہے۔''

''او کے سر۔''

''احسان! یہاں گارڈز اور دیگر افراد کو اچھی طرح یاد دہانی کرا دینا کہ شکیل کے آتے ہی پولیس کو مطلع کریں۔''

''جی سر۔''

انسپکٹر پرویز گاڑی کی جانب مڑا ہی تھا کہ یک دم ٹھٹک کر رہ گیا، اس کی نظر شکیل کی گاڑی پر جمی تھی۔

''میں نے اس کار میں شاید اسے دیکھا ہے۔'' وہ بولا۔ اس بار اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ شکیل کوشش کے باوجود سن نہیں پایا تھا۔

''مگر سر یہ تو خالی ہے۔'' اس کی سماعت سے ٹکرانے

والی دوسری آواز نے اسے چونکنا کر دیا تھا۔ اس نے احتیاط سے باہر جھانکا انسپکٹر کا رخ اس کی کار کی طرف ہی تھا۔ خطرہ کسی بھی لمحے اس کے سر پر پہنچ سکتا تھا۔ اب چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے اگنیشن میں لگی چابی کو گھمایا...... اچھل کر سیٹ پر بیٹھتے ہی گاڑی کو تیزی سے ریورس کیا اور آگے بڑھ گیا۔

''رکو...... میں فائر کر دوں گا۔'' انسپکٹر پرویز نے بھی بجلی کی سی تیزی سے ریوالور نکالا تھا مگر شکیل کی گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ دونوں تیزی سے اپنی کار میں بیٹھے۔ انہیں دور سڑک پر اس کی گاڑی جاتی نظر آ گئی تھی۔

''اس کا پیچھا کرو......'' پرویز چلاّیا پھر اس نے پولیس کو اس کی لوکیشن اور کار کے نمبر سے مطلع کیا...... شکیل کی گاڑی ٹریفک میں پھسلتی جا رہی تھی۔

''تم آج مجھ سے نہیں بچو گے......'' پرویز بڑبڑایا۔

''اسلم گاڑی تیز چلاؤ۔''

''جی سر......'' وہ ایکسلریٹر دباتے ہوئے بولا۔

شکیل جبڑے بھینچے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کا پورا کھیل بگڑ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں صائمہ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہو سکتا تھا یقیناً اسی نے جا کر پولیس والوں سے بات کی ہوگی، وہ اسے نہیں چھوڑے گا۔ اس نے اسٹیئرنگ پر مکا مارتے ہوئے سوچا۔

پولیس کار اس کے قریب آتی جا رہی تھی۔ اسے چند لمحوں میں ان سے پیچھا چھڑانا تھا ورنہ یقیناً پھر دوسری پولیس کاریں بھی اسے گھیرنے کے لیے پہنچ جاتیں۔ اس نے یکلخت یوٹرن لیا۔ اس بار اس کی گاڑی سڑک سے سروس لین پر اتر آئی تھی۔ وہ تیزی سے مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا دوبارہ سڑک پر آیا۔ پولیس کار اب بھی اس کے پیچھے تھی۔ اس کی کار اب ایک اسکول کے قریب سے گزر رہی تھی جہاں چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ لوگ بچوں کو لینے کے لیے آ رہے تھے۔ سڑک پر ایک کار گزرنے کی جگہ تھی۔ شکیل نے کار کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ اس دوران سامنے سے آنے والی کار سے اس کی گاڑی ٹچ ہوئی۔ اس نے خود کو بچانے کی کوشش کی اور کار کو سڑک کی دوسری جانب موڑا۔ عین اسی وقت ایک ادھیڑ عمر خاتون نے سڑک پر قدم رکھا۔ انہیں شاید اس وقت اس علاقے میں اس قدر تیز ڈرائیونگ کا گمان بھی نہیں تھا۔ شکیل کی گاڑی ان تک پہنچنے تک وہ سڑک کے وسط میں آ گئی تھیں۔ شکیل نے بھی انہیں آتا دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر چمکنے والی شیطانی مسکراہٹ کا مطلب یہ تھا کہ اس کے ذہن نے کوئی منصوبہ تراش لیا ہے۔ اس نے تیزی سے کار کو آگے بڑھایا، خاتون اچانک ایک کار کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر دہشت زدہ ہو کر ساکت سی ہو گئیں۔ لمحہ بھر میں شکیل کی کار کی ٹکر سے وہ اچھل کر سڑک پر گریں، ہر طرف ایک شور سا مچ گیا۔ شکیل نے ایکسلریٹر دبایا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے غائب ہو گیا۔ اس کے یقین کے عین مطابق پولیس کار خاتون کو اسپتال پہنچانے اور سڑک پر بھیڑ بھاڑ ہو جانے کی بنا پر اس کے پیچھے نہیں آ پائی تھی۔

☆☆☆

اسحاق اپنی کوٹھری میں بیٹھا دیوار کو تک رہا تھا۔ کوٹھریوں کے دروازوں پر ایک ردھم سے بجنے والے ڈنڈے کی آواز پر اس نے بیزاری سے منہ بنایا۔ یہ اس بات کا اعلان ہوتا تھا کہ قیدیوں کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہ وقت اس کے لیے سب سے مشکل ہوتا تھا۔ وہ وہاں ہونے والی اچھل پھاند، جھگڑوں سے گھبراتا تھا مگر قاعدے کے مطابق سب کو وہاں جانا پڑتا تھا۔ لہٰذا وہ بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ باہر پہنچ کر وہ اپنا کھانا لے کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر مجھو بھائی اور اس کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھو بھائی کو جیل کے اس حصے میں دادا سمجھا جاتا تھا۔ کمزوروں کو مارنا، پیٹنا، ہر ایک پر رعب جھاڑنا، کھانا اور چیزیں چھین لینا اس کا معمول تھا۔ اسحاق کا بھی وہ کئی بار مذاق اڑا چکا تھا مگر وہی اس سے کنی کترا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے تین ساتھی بھی ہوا کرتے تھے جو بدمعاشی میں اس سے کم نہیں تھے۔ آج بھی انہوں نے کسی کمزور قیدی کے سگریٹ چھین لیے تھے۔ وہ بار بار ان سے سگریٹ واپس کرنے کی التجا کر رہا تھا۔

''کیا پٹر پٹر کر کے دماغ خراب کر رہا ہے......'' مجھو بھائی نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ وہ کمزور سا شخص اس تھپڑ سے الٹ کر زمین پر جا گرا تھا۔ جب چند لمحوں تک وہ اٹھا نہیں تو سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ گارڈز بھی شور شرابا سن کر آ گئے تھے۔

تھوڑی دیر میں اسے ہوش آ گیا تھا مگر ڈپٹی وارڈن کے بار بار پوچھنے پر بھی اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ بے ہوش کیسے ہوا تھا۔ وارڈن نے وہاں موجود تمام لوگوں سے سوالات کیے تھے۔ کوئی بھی کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ سب سے آخر میں اسحاق کی طرف مڑا۔

''تم بھی تو یہیں تھے، پڑھے لکھے آدمی ہو...... اپنی ذمے داری جانتے ہو......'' اسحاق جواب میں بالکل

خاموش رہا تھا مگر غیر ارادی طور پر اس کی نظر مچھو بھائی کی طرف اٹھ گئی تھی۔

"تو یہ تم تھے......" ڈپٹی وارڈن نے مچھو بھائی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں پہلے بھی وارن کر چکا ہوں، آج کے واقعے کو میری آخری وارننگ سمجھنا۔" اس کے بعد کھانا انتہائی خاموشی سے کھایا گیا۔ اسحاق تو ایک نوالہ بھی نہیں کھا سکا تھا۔ مچھو بھائی کھانا ختم کر کے اسے جن کینہ توز نگاہوں سے گھورتے ہوئے اندر گیا تھا وہ اس کا خون خشک کرنے کے لیے کافی تھیں۔ وہ خود کو بار بار کوس رہا تھا کہ آخر اسے اس وقت مچھو کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

بہر حال اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ شام سے ذرا پہلے جب وہ احاطے میں بیٹھا ہوا تھا، یکلخت مچھو اور اس کے حواریوں نے اسے گھیر لیا۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی......؟" اس نے اسحاق کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کک، کچھ نہیں۔" وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم تو تجھے نرا شہری بابو سمجھے تھے پر تجھ میں تو بڑی ہمت ہے...... ہے کہ نا؟" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف چہرہ گھما کر تائید چاہی۔

"بہت ہے بھائی...... کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"ہاں...... یہ تو نے ٹھیک بولا...... تو ہمت تو ہے تجھ میں۔ پر تجھے اک بات بتاؤں یہ جو تیرے سامنے اتنے سارے بندے گھوم رہے ہیں نا ان میں سے کوئی یہ کام نہیں کرنے کا...... تو اب میں تیری اتنی ٹھکائی لگاؤں گا کہ تو بھی یہ سمجھ جائے گا کہ کب کہاں اور کیسے دیکھنا چاہیے۔" اس نے غرا کر کہا اور اسحاق کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا......

اسحاق اچھل کر نیچے گرا تھا۔ تھپڑ نے اس کے گال کی کھال پھاڑ دی تھی، چہرے سے خون ٹپکنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے مڑ کر مچھو کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا جس سے وہ ایک لمحے کو دہرا ہو گیا مگر یہ اس کا پہلا اور آخری وار ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد وہ چاروں اس پر پل پڑے تھے...... لمحے بھر میں وہ مٹی بھرے صحن میں پڑا تھا اس کے جسم پر چوٹیں ہی چوٹیں تھیں پھر کسی نے اس کے داہنے پہلو پر زوردار ٹھوکر رسید کی جس کے بعد وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

☆☆☆

"اس بار ہمارا پالا حقیقی معنوں میں سفاک اور بے حس قاتل سے پڑا ہے۔" پرویز بولا۔ "اب تک وہ منظر اور اس عورت کے چہرے کا خوف میری آنکھوں میں گھوم رہا ہے......"

"مگر یہ کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے سر۔" انسپکٹر اسلم نے کہا۔

"نہیں......" پرویز ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ "میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس نے جان بوجھ کر اسے ٹکر ماری تاکہ ہم سے چھٹکارا حاصل کر سکے اور وہ اس میں سو فیصد کامیاب بھی رہا۔"

"تم درست کہہ رہے ہو۔" جبران جو بہت دیر سے خاموش تھا بالآخر بولا۔ "ہمیں اب تیزی سے کام کرنا ہو گا...... پرویز میں نے اسحاق کے ریلیز آرڈر کے لیے بات کر لی ہے، تمہیں اسے جیل سے نکالنا ہو گا...... اسلم...... اس شکیل کی تصویر اور اس کے حوالے سے خبر میڈیا کے لیے جاری کروا دو...... ہم اس کے لیے زمین کو تنگ کر دیں گے...... اس بات کی پوری نگرانی کرو کہ وہ شہر سے باہر نہ جا پائے۔ ہاں پرویز تم نے اس لڑکی صائمہ کے بارے میں بتایا تھا نا کہ کل اسے شکیل نے دھمکی دی تھی، ہمیں اسے بھی تحفظ فراہم کرنا ہو گا...... تم نے یہ درست کہا ہے پرویز کوئی عام مجرم نہیں...... اس سے نمٹنے کے لیے ہمیں اس کے طریقۂ کار کو سمجھنا پڑے گا۔" جبران نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

وہ ایک قدرے ویران سڑک پر کھڑا تھا۔ اس کی گاڑی کا پیٹرول ختم ہو چکا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اب تک اس کی تلاش بڑے پیمانے پر شروع ہو چکی ہو گی اس لیے رات گئے تک کسی پناہ گاہ تک پہنچنا ضروری تھا۔ اس کے بعد وہ اس صائمہ کی بچی اور اسحاق سے نمٹنے کا پلان بنا سکتا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ ان دونوں کو بخشنے والا نہیں مگر پہلے اسے خود کو بچانا تھا۔ وہ کہاں جا سکتا تھا۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا۔ سمیرا یا اس کے دوستوں میں سے کوئی اس وقت اس کے کام نہیں آ سکتا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں بلب سا جل اٹھا۔ "محسن" اس خیال نے اسے تر و تازہ کر دیا تھا۔ وہ اس کا پرانا دوست تھا سیدھا سادہ اپنے کام سے کام رکھنے والا، وہ ایک چھوٹا ٹرک چلاتا تھا، شہر کے مضافات میں اس کا اپنا مکان تھا جہاں وہ تنہا رہتا تھا۔ یوں تو شکیل اور اس کی زندگی میں مماثلت تھی اور نہ ہی ان کی دلچسپیوں میں، مگر وہ کھانا بہت غضب کا بناتا تھا۔ شکیل مہینہ دو مہینے میں اس کے گھر کا چکر لگا لیا کرتا تھا۔ اس وقت اس کا گھر اس کی بہترین پناہ گاہ بن سکتا تھا۔ کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ دور بھاگ جانے کے بجائے وہاں چھپا بیٹھا ہو گا۔ اب مسئلہ

وہاں تک پہنچنا تھا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں وہ کار سے اترا اور ہر آتی جاتی گاڑی کو رکنے کا اشارہ دینے لگا کئی گاڑیوں کے بعد ایک چھوٹی سی کار اس کے اشارے پر رک ہی گئی۔ اس میں ایک ادھیڑ عمر شخص سوار تھا۔

''کیا تمہاری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔'' اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

''جی، ہاں......'' شکیل بولا۔ ''کیا آپ ایک لمحے کے لیے میری مدد کریں گے؟''

''کیوں نہیں، آپ کو جہاں جانا ہو وہاں میں آپ کو چھوڑ سکتا ہوں بشرطیکہ وہ میرے راستے میں ہو۔'' وہ اپنے مذاق پر خود ہی قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''آپ کی مہربانی ... اگر آپ پہلے تھوڑا سا دھکا لگوا دیں تو شاید یہ اسٹارٹ ہوجائے۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''اس میں کیا مشکل ہے۔'' وہ گاڑی سے اتر کر اس کی کار تک آگیا تھا۔ اس نے دھکا لگانے کے لیے گاڑی پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ شکیل نے جیک کی راڈ سے اس کے سر کا نشانہ لیا۔ وہ بغیر کوئی آواز نکالے سڑک پر ڈھے گیا۔ شکیل نے تیزی سے اسے گھسیٹ کر اپنی گاڑی میں ڈالا اور پھر گاڑی کو دھکا دے کر سڑک سے نیچے اتار دیا۔ اب اسے بہ آسانی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ شکیل نے اس سے نمٹ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ آدھے پونے گھنٹے میں وہ محسن کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح بہت خوش ہوا تھا۔

''تم ہاتھ منہ دھولو، میں کھانا نکالتا ہوں۔''

''کیا پکایا ہے آج تم نے یار......''

''تمہارے نصیب کا رزق تھا سو ہے بھی تمہاری پسند کا یعنی قرائی قیمہ۔'' وہ جیسے انکشاف کرتے ہوئے بولا۔

''واہ، پھر تو میں منہ ہاتھ دھو کر فوراً آتا ہوں۔'' اسے یاد آیا تھا کہ اس نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

مگر جب وہ واپس آیا تو کمرے کا نقشہ کچھ اور ہی ہو چکا تھا۔ محسن ٹی وی کے سامنے کھڑا تھا جہاں اس کی تصویر دکھائی جا رہی تھی...... شکیل چند لمحے کھڑا یہ سب دیکھتا رہا پھر اس نے آگے بڑھ کر ٹی وی بند کر دیا۔

''یہ سب ایک چال ہے محسن، دشمنوں کی چال۔'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے شکیل...... تو میرا دوست ہے مگر یار یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ تیرے ساتھ میں بھی کچھ کیے بغیر لپیٹ میں آجاؤں گا۔''

''مطلب کیا ہے تیرا؟'' شکیل نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ میں پولیس کو کچھ نہیں بتاؤں گا تیرے بارے میں...... تو ابھی یہاں سے کہیں اور چلا جا......'' اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شکیل جواب میں چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر محسن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''دیکھ یار! اگر تو نے یہ سب سن ہی لیا ہے تو تو یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ میرے پاس اس وقت کوئی جگہ نہیں ہے مگر اب اگر تو مصر ہے کہ ہم ساتھ نہیں رہ سکتے تو پھر ہم میں سے ایک کو تو یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔''

''یہ میرا گھر ہے شکیل......'' محسن نے تیز آواز میں کہنا شروع کیا ہی تھا کہ شکیل نے اس کی گردن اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لی۔ محسن نے مزاحمت کی خاصی کوشش کی مگر شکیل نے اس کی گردن ایک خاص انداز میں گھما دی۔ تڑخ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی وہ بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا تھا۔

''مجبوری تھی یار......'' شکیل نے ہاتھ جھٹک کر محسن کی لاش کو ایک الماری میں ٹھونسا اور پھر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ سامنے ٹیبل پر پڑے ریموٹ پر اس کی نظر پڑی تو اس نے ٹی وی آن کر دیا۔

خبروں میں اس کی تصویر دوبارہ دکھائی گئی تھی، اسے سفاک قاتل کا نام دیا جا رہا تھا جو اب تک دو قتل کر چکا تھا۔ یعنی اب تک گاڑی دریافت نہیں ہوئی ہے، اس نے سوچا...... خبر کے آخری جملوں نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔

''اسحاق جس پر پہلے اس کی بیوی زارا کے قتل کا الزام تھا کو فوری طور پر آزاد کیا جا رہا ہے۔''

''تمہیں یہ آزادی مہنگی پڑنے والی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ کھانے کے بعد اسے صائمہ اور اسحاق سے نمٹنے کا پلان بنانا تھا۔

☆☆☆

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بے گناہ ہے؟'' وارڈن نے انسپکٹر پرویز کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں، میں یہی عرض کر رہا ہوں۔ تفتیش سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ اسحاق نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا ہے۔ اصل قاتل ٹریس ہو چکا ہے۔ فی الحال وہ مفرور ہے مگر ہم جلد ہی اسے آپ تک پہنچا دیں گے۔ یہ اسحاق کے ریلیز آرڈر ہیں۔ ڈی ایس پی جبران نے ذاتی اثر و رسوخ

استعمال کر کے ان کی فوری رہائی کی کوشش کی ہے اور اب آپ سے تعاون کی امید ہے۔'' پرویز بولا۔
''اوکے میں اسے بلواتا ہوں، آپ خود اسے یہ خوش خبری سنا دیں۔'' اس نے موبائل اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔
''کیا......؟'' وہ چند لمحے بعد بولا۔''اب وہ کہاں اور کس حالت میں ہے؟''
دوسری طرف سے تفصیل سن کر اس نے فون بند کر دیا۔ پرویز اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
''اسحاق کا جیل میں کچھ غنڈوں سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ اسے کافی چوٹیں آئی ہیں، اچھی خبر یہ ہے کہ اس کی کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں ہے شاید ہمیں اسے اسپتال لے جانا پڑے۔'' انسپکٹر پرویز اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اگلا پورا دن اسی بھاگ دوڑ میں نکل گیا تھا۔ ہائی وے کے قریب سے شکیل کی کار دریافت کر لی گئی تھی۔ اس میں موجود شخص زندہ تھا مگر سر پر لگنے والی گہری چوٹ کی بنا پر ہنوز بے ہوش تھا خبروں میں اسی خبر کا چرچا تھا۔ میڈیا اور سوشل میڈیا پر پولیس کے لتے لیے جا رہے تھے اور اب تک قاتل کے گرفتار نہ ہونے کی وجہ سے اس کی کارکردگی پر سوال اٹھائے جا رہے تھے۔ دوسری جانب فرانزک سے مزید نتائج آ گئے تھے۔ صائمہ نے سمیرا کے پاس سے ملنے والی انگوٹھی کو بھی شناخت کر لیا تھا۔ اسحاق کو گزشتہ شام ہی اسپتال لے جایا گیا تھا۔ اگرچہ اسے کافی چوٹیں آئی تھیں مگر ان میں سے کوئی اندرونی یا گہری چوٹ نہیں تھی۔ اسے مرہم پٹی کے بعد آبزرویشن میں رکھنے کے لیے اسپتال میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور آج رات یا زیادہ سے زیادہ اگلی صبح تک اسے ڈسچارج کر دیا جانا تھا۔ جبران جب شام گئے اسپتال پہنچا تو وہ پہلے سے بہت بہتر اور چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ زارا کے قتل کا الزام ہٹ جانے نے اس پر جادو کی اثر کیا تھا۔
''تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' جبران نے اسحاق سے پوچھا۔
''بہت بہتر...... تھوڑی تکلیف ہے کیونکہ میں نے زندگی میں کل ملا کر اتنی مار نہیں کھائی تھی۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔''میں آپ کا اور انسپکٹر پرویز کا مشکور ہوں۔''
''نہیں...... یہ تو ہمارا کام ہے۔'' جبران نے ہاتھ ملایا۔ اتنی دیر میں انسپکٹر پرویز بھی اسپتال پہنچ گیا تھا۔
''سر شہر کی اچھی طرح سے ناکا بندی کر دی گئی ہے،

گاڑی سے برآمد ہونے والے شخص کی شناخت ہو گئی ہے، ہمارے اندازے کے مطابق وہ شکیل کو لفٹ دینے کے لیے رکا تھا۔ اس کے خاندان والوں کی فراہم کی گئی تفصیلات کی روشنی میں اس کی کار کی تلاش بھی شروع کر دی گئی ہے۔''
''گڈ...... صائمہ...... اس کی حفاظت کا کیا انتظام کیا گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''صائمہ کے گھر پر چار پولیس افسران متعین کر دیے گئے ہیں۔''
''مجھے یہ لگ رہا ہے کہ اس کا اگلا نشانہ صائمہ ہی ہو گی۔ وہ جس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے اس کے حساب سے آج کی رات اہم ہے، ویسے تو منطقی طور پر اسے جہاں وہ ہے وہاں چھپا رہنا چاہیے مگر میری چھٹی حس کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔'' جبران نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
''تو پھر آپ اس حوالے سے کیا چاہتے ہیں؟''
''میرا خیال ہے کہ ہمیں وہاں سیکیورٹی مزید سخت کرنی ہو گی۔''
''میں خود وہاں چلا جاتا ہوں۔'' پرویز نے کہا۔
''میں اس سے شکلاً بھی واقف ہوں۔''
''مگر تم بہت تھک گئے ہو گے۔''
''اب یہ تھکن شکیل کی گرفتاری سے ہی اُترے گی۔'' وہ مسکرایا۔
''ٹھیک ہے پھر تم وہاں چلے جاؤ...... میں یہاں اسپتال میں ہوں۔'' جبران نے سر ہلایا۔''اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہم آج کی رات اسے پکڑ لیں گے۔''

☆☆☆

''تم یہاں اس مکان میں اکیلی رہتی ہو؟'' پرویز نے چائے کا کپ صائمہ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس وقت اس کے گھر کے لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ صائمہ کا مکان زارا اور اسحاق کے گھر کے قریب ہی واقع تھا۔
''نہیں، ہم تین لڑکیاں مل کر رہتے ہیں۔ اصل میں میری دوسری دونوں کولیگز کزن ہیں، وہ بھی میری طرح دوسرے شہروں سے یہاں آئی ہیں۔ خاندان میں کسی شادی کی وجہ سے وہ دونوں گھر گئی ہوئی ہیں۔ ہمارے پاس ایک جز وقتی ملازمہ موجود ہے جو دن میں آتی ہے۔'' صائمہ نے تفصیل سے بتایا۔
''ٹھیک ہے......'' پرویز نے سر ہلایا، اس نے یہاں پہنچ کر سیکیورٹی کو ری شیفل (دوبارہ ترتیب) کیا تھا اب گھر کے بیرونی حصے میں دو پولیس والے موجود تھے جبکہ ایک اندرونی دروازے کے قریب تھا۔ اس نے خود اپنے لیے

لاؤنج میں جگہ بنائی تھی۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ یہاں آنے کی ہمت کرے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید...... اب تک جو کچھ سامنے آیا ہے اس کے مطابق وہ ایک جنونی قسم کا شخص ہے، اس کا بنایا ہوا سارا پلان خراب ہو گیا ہے اور وہ تمہیں اس کا ذمے دار سمجھ سکتا ہے پھر تم نے ہی بتایا تھا نا کہ اس نے تمہیں دھمکی بھی دی تھی۔''

''ہاں......'' وہ لرز کر بولی۔ ''تو پھر اب ہم کیا کریں گے؟''

''ہم اس کا انتظار کریں گے اگر آج وہ یہاں آیا تو بچ کر نہیں جا سکے گا میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا اس لیے اگر ممکن ہو تو تمہیں بھی اسی لاؤنج میں یا پھر اس سے ملحق کسی کمرے میں رہنا ہوگا جس کا دروازہ کھلا رکھا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' صائمہ بولی۔ ''آپ کے یہاں آنے سے مجھے بڑا اطمینان ملا ہے۔''

وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ خطرہ ان کے سر پر آچکا ہے۔

☆☆☆

شکیل اس وقت صائمہ کے گھر کے گیٹ سے ذرا فاصلے پر موجود تھا۔ اس کی نظریں گیٹ پر موجود پولیس والوں پر تھیں اور ذہن کوئی راستہ تلاش کر رہا تھا۔ اسے کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہونا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر شیطانی انداز میں مسکرایا...... گلی میں سڑک کے دونوں اطراف گاڑیاں پارک کی گئی تھیں۔ یہ اس کے لیے اچھی ڈھال تھیں، شکیل نے انہیں ہی اپنا ہتھیار بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس نے تمام گاڑیوں پر نظر ڈالی پھر ایک پرانی مہران پر اس کی نظر ٹھہر گئی اس کے لیے اس کے بونٹ کو کھولنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بونٹ کو کھول کر اس نے فیول پمپ سے پیٹرول کا پائپ ہلکا سا ڈھیلا کر دیا۔ پیٹرول کو رستا دیکھ کر اس نے پسندیدگی کے اظہار کے طور پر سر ہلایا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا پھر جیب سے ماچس نکال کر اسے جلایا اور جلتی ہوئی تیلی کو بونٹ میں اچھال کر تیزی سے ایک طرف ہو گیا۔ پیٹرول نے تیلی کی قربت پاتے ہی آگ پکڑ لی تھی۔ شعلے بلند ہوتے ہی شکیل نے آگ لگ گئی کا نعرہ بلند کیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق گیٹ پر موجود دونوں کانسٹیبل فطری طور پر گاڑیوں کی طرف لپکے تھے۔ شکیل کو اسی لمحے کا فائدہ اٹھانا تھا، اس کے گیٹ سے ہٹتے ہی وہ اندر داخل ہو گیا تھا۔

اسے اندرونی دروازے تک پہنچنے میں ایک منٹ لگا تھا، دروازہ کھولتے ہی اس کے سامنے گھر کا مین سوئچ کا باکس تھا۔ شکیل نے سوئچ آف کر دیا پورا مکان تاریکی میں نہا گیا تھا۔

''جمشید الرٹ رہو اور یہ باہر کیسا شور ہے۔'' پرویز کی آواز پر وہ دیوار کے ساتھ دبک گیا۔

''جی سر میں دیکھتا ہوں۔'' دوسری آواز اندرونی دروازے کے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جیسے ہی سوئچ بورڈ کے قریب آیا، شکیل پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔ سر پر پڑنے والے پیتل کے گلدان نے اسے آواز نکالے بغیر

زمین پر ڈھیر کر دیا تھا۔

''یہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' صائمہ کی سہمی ہوئی آواز سن کر شکیل سفاکی سے مسکرایا۔

''تم یہیں رہو، میں دیکھتا ہوں۔'' پرویز نے جواب دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے میں ٹارچ تھی۔ وہ محتاط قدم بڑھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ شکیل کے پاس وقت بہت کم تھا۔ باہر آگ بجھاتے ہوئے پولیس والے کسی بھی وقت اندر آسکتے تھے۔ اس نے پیتل کے اس گلدان سے پرویز کے پسٹل والے ہاتھ پر وار کیا۔ وار کے نتیجے میں پسٹل اس کے ہاتھ سے گر گیا مگر پرویز نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں موجود بھاری ٹارچ شکیل کے چہرے پر دے ماری تھی۔ ایک لمحے کو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالا اور جھک کر ریوالور اٹھانے کی کوشش کی۔ پرویز بھی اسی وقت جھکا تھا، ان دونوں کا ہاتھ ایک ساتھ ریوالور پر پڑا تھا۔ اب پسٹل کی شکل میں زندگی کی لیز حاصل کرنے کے لیے ان کے درمیان جنگ شروع ہو چکی تھی۔ شکیل نے اپنا گھٹنا پرویز کے پیٹ میں مارا تو وہ دہرا ہو کر نیچے گر پڑا تھا۔ یوں بھی وہ طاقت، جسامت اور عمر کسی بھی لحاظ سے شکیل کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ شکیل کے وار نے اس کے السر کی تکلیف کو جھنجوڑ دیا تھا۔ اس نے پھر بھی فوری طور پر کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اس کوشش نے زخمی شیر کے مانند غصے میں ڈوبے مگر خوفزدہ شکیل کو بپھرا دیا۔

''تم......'' اس نے چاند اور سڑک کی روشنی میں پرویز کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تم تو وہی ہو نا...... آج میں تم سے تمہارا آخری بیان لینا چاہتا ہوں۔'' وہ بولا اور پسٹل والا ہاتھ بڑھا کر گولی چلا دی۔ اس شخص نے اس کا بڑا نقصان کیا تھا۔ گولی انسپکٹر پرویز کے سر میں لگی تھی اور وہ لڑھک کر زمین پر الٹ گیا۔ شکیل نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ خوف سے لرزتی صائمہ اس کے سامنے تھی۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ بے ساختہ چیخی۔ شکیل لپک کر اس کے قریب پہنچا اور اس کے سر پر پسٹل رکھ دیا۔

''اگر منہ سے ذرا سی بھی آواز نکلی تو دوسری دنیا میں پہنچا دوں گا۔'' وہ غرایا۔

''پلیز...... پلیز مجھے چھوڑ دو۔'' وہ گھگھیائی۔

شکیل نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر کندھے سے لٹکے تھیلے میں سے ایک رومال نکالا اور اس کی ناک پر جما دیا، وہ لمحہ بھر میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے اٹھا کر وہ باہر نکلا۔ گیٹ کی دوسری سمت محسن کا ٹرک اس کا منتظر تھا۔ باہر لوگ گاڑیوں میں بھڑک اٹھنے والی آگ۔ بجھا رہے تھے۔ فائر بریگیڈ اب تک نہیں پہنچا تھا۔ کئی لوگ اپنی فیملیز کو وہاں سے دور کر رہے تھے۔ اس ہنگامے میں کسی کی توجہ شکیل پر نہیں پڑی تھی۔ اس نے بے ہوش صائمہ کو ٹرک میں ڈالا اگنیشن میں چابی گھمائی۔ وہ گلی سے باہر نکل رہا تھا۔ تب اس نے فائر بریگیڈ اور مزید پولیس کو اندر کی طرف آتے دیکھا مگر اب وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

☆☆☆

اسحاق کی نظریں جبران پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار فون پر نمبر ڈائل کر رہا تھا مگر ہر بار گھنٹیاں بج بج کر بند ہو رہی تھیں۔

''پرویز فون کیوں ریسیو نہیں کر رہا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''آپ پریشان نظر آرہے ہیں۔'' اسحاق نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ان کے فون کی گھنٹی بند ہو یا وہ مصروف ہوں۔''

''وہ ڈیوٹی پر ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔'' جبران نے اسٹیشن فون کر کے مزید نفری کو صائمہ کے گھر پہنچنے کا حکم دینے کے بعد کہا۔

''اوہ! اللہ اس کی حفاظت کرے۔'' اسحاق نے گھبرا کر کہا۔ اسی وقت اس کا فون بج اٹھا تھا۔ اسے اسپتال منتقل کرتے ہوئے وارڈن نے اس کا موبائل، والٹ وغیرہ پرویز کے سپرد کر دیا تھا۔ اس وقت کے بعد سے فون پہلی بار بجا تھا۔

''کس کی کال ہے؟'' جبران نے پوچھا۔

''کوئی پرائیویٹ نمبر ہے۔'' اسحاق نے جواب دیا۔

''کیا مجھے اسے ریسیو کرنا چاہیے؟''

''ہاں...... فون اٹھاؤ۔'' جبران نے کہا۔

اسحاق کے فون اٹھاتے اٹھاتے کافی گھنٹیاں بج چکی تھیں، اس نے آنسر کے بدلے بٹن کو اسکرول کیا اور فون کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف خاموشی تھی، بالآخر وہ بولا۔ ''ہیلو کون بول رہا ہے؟''

''اسحاق یہ میں ہوں شکیل۔'' دوسری جانب سے آنے والی آواز کو سن کر وہ ششدر رہ گیا۔

''تم...... تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے فون کرنے کی۔ اگر اس وقت تم میرے سامنے ہوتے......'' وہ طیش کے عالم

میں بولا۔

''اچھا تو تم یہ چاہتے ہو، میں نے تمہارے دل کی بات سن لی ہے۔ بہت جلد تم میرے سامنے ہو گے۔'' شکیل بولا۔

''تم بچو گے نہیں۔''

''میری فکر چھوڑو، کیا تم یہ جاننا نہیں چاہو گے کہ میں نے تمہیں فون کیا کیوں ہے؟''

''ہاں کیوں فون کیا ہے تم نے......'' اسحاق نے جبران کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اسے گفتگو جاری رکھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

''اصل میں میرے ساتھ کوئی ہے جو تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' وہ بولا اور اس کے ساتھ اس نے فون صائمہ کے چہرے سے لگا دیا تھا۔

''میں......صائمہ ہوں......پلیز میری مدد کرو۔'' اس کی آواز نے اسحاق کا دماغ ہی گھما دیا۔

''تم......تم چاہتے کیا ہو؟'' اس نے فون پر ہاتھ رکھا اور جبران کی طرف دیکھا جو اپنے فون پر تھانے سے رابطے میں تھا اور اسے گفتگو جاری رکھنے کا اشارہ بھی کر رہا تھا۔ شاید وہ اس کال کو ٹریس کروا رہا تھا۔

''میں تمہیں چاہتا ہوں، میرے دوست میں صائمہ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ اسے تمہارے حوالے کر دوں گا مگر اس کے لیے تمہیں میرے پاس تنہا آنا ہوگا۔''

''یعنی تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟''

''اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر ہمیں بات کرنی ہے اگر تم پولیس کو ساتھ لے کر آئے تو میں ایک لمحے میں اسے زارا کے پاس پہنچا دوں گا، تم سمجھ گئے نا۔''

''ہاں۔'' اسحاق نے کہا۔ ''مجھے کہاں آنا ہے؟''

''چند لمحوں میں پتا تمہارے پاس ہوں گا۔'' شکیل بولا اور اس نے لائن کاٹ دی۔ اگلے ہی لمحے اسحاق کے فون کی بیپ بجی تھی اس پر شہر کے مضافاتی علاقے کا پتا موجود تھا۔ وہ بستر سے کھڑا ہو گیا۔

''نہیں اسحاق تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پولیس اسے دیکھ لے گی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر وہ صائمہ کو مار ڈالے گا۔ اس سانپ سیڑھی کے کھیل کو اب ختم ہونا ہی پڑے گا۔'' اسحاق افسردگی سے بولا۔

''تم تنہا نہیں جاؤ گے، میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔'' جبران کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''مگر اس نے مجھے اکیلا آنے کو کہا ہے۔''

''میں تمہاری کار کی ڈکی میں جاؤں گا، وہ مجھے نہیں دیکھ پائے گا۔ اب وہ صرف تمہارا مقروض نہیں ہے۔'' جبران نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''صائمہ کو اغوا کرنے کے لیے اس نے پرویز کو قتل کر دیا ہے۔'' جبران ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اُف میرے خدا۔'' اسحاق بستر پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد وہ کھڑا ہوا اور دونوں آگے پیچھے اسپتال سے باہر نکلتے چلے گئے تھے۔ جبران نے اس دوران پولیس بیک اپ تیار کر لیا تھا۔ اسحاق، جبران کی سفید کار میں روانہ ہوا تھا۔ جبران ڈکی میں موجود تھا جسے لاک نہیں کیا گیا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے میں مطلوبہ پتے کے سامنے پہنچ گئے۔ مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسحاق لرزتے قدموں سے گاڑی سے باہر نکلا۔

''اسحاق گھبرانا مت میں فوراً اندر داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔'' اس کے کان میں لگے ہینڈ فری میں جبران کی آواز گونجی اسحاق نے سر ہلایا اور مکان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

جبران، اسحاق کے جانے کے دو لمحوں بعد ڈکی سے پھسلتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ تیزی سے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا، اندر بالکل خاموشی تھی۔ چند لمحے انتظار کے بعد اس نے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اسحاق سے اس کا ٹیلی فونک رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ اندرونی دروازہ گویا اس کے انتظار میں کھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھام کر اندر داخل ہوا۔ لاؤنج نما ایریا سے گزر کر اس نے پہلے کمرے کے دروازے کو دھکا دیا، کمرا بالکل خالی تھا، پھر اس نے دوسرے کمرے میں قدم رکھا، وہاں سے دوڑ کر وہ کچن میں آیا۔ کہیں بھی نہ تو شکیل موجود تھا اور نہ ہی اسحاق اور صائمہ۔ اس نے ایک بار پھر پورے مکان کا چکر لگایا۔ اس بار اسے کچن سے باہر راہداری اور پھر وہاں سے گندی گلی میں کھلنے والا چھوٹا دروازہ نظر آیا۔

وہ غالباً ان دونوں کو وہاں سے باہر نکال لے گیا تھا۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا اور چھوٹے دروازے سے دوڑ کر باہر نکل آیا۔ گلی بہت چھوٹی سی تھی۔ آخر وہ اس قدر خاموشی سے اتنی جلد ان دونوں کو وہاں سے کہاں اور کیسے لے گیا تھا۔ یہ سوال اس کے ذہن میں مسلسل گونج رہا تھا۔ اسے یہ

محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بس یہیں موجود تھا مگر کہاں اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ دوبارہ گھر میں واپس آیا۔ تھانے سے نفری منگوائی۔ اس کے بعد اسحاق کا نمبر ملایا مگر اب وہ رابطے میں نہیں تھا۔ اسحاق اور صائمہ کی جان خطرے میں تھی اور اس کے پاس آگے بڑھنے کے لیے کوئی کلیو موجود نہیں تھا۔ وہ گہری سوچ میں تھا جب ایک دبی دبی چیخ نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ آواز کہیں قریب سے ہی آئی تھی۔

☆☆☆

''مجھے معلوم تھا کہ تم جیسا شخص کوئی نہ کوئی مدد ضرور ساتھ لائے گا اس لیے میں نے تمہارے استقبال کی تیاری کرلی تھی۔'' شکیل سفاکی سے کہہ رہا تھا۔ وہ تینوں ایک چھوٹے سے تہ خانے میں تھے جو محسن کے گھر کے نیچے موجود تھا۔ محسن کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے اس نے اسے جس الماری میں ٹھونسا تھا، وہیں اسے تہ خانے کا سراغ ملا تھا اور اس کے بعد اس نے اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا، کچن اور پھر گندگی گلی والا دروازہ وہ صرف جبران کو بہکانے کے لیے کھول آیا تھا۔

صائمہ ایک طرف بندھی پڑی تھی جب کہ اسحاق کمرے کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کے سامنے شکیل موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں پرویز کا ریوالور تھا جس کی نال اسحاق کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

''تمہارا کیا خیال تھا، میں تمہیں ایک بات بتاؤں گا اور تم پولیس کو ساتھ لا کر ہیرو بن جاؤ گے؟''

''تم نے زارا کو مار ڈالا......'' اسحاق کسی اور ہی دنیا میں تھا۔

''ہاں اور اب تم دونوں کی باری ہے جس کے بعد یہ باب بند ہوجائے گا۔'' وہ مسکرایا۔

''نہیں......اس سے پہلے ایک اور کام ضروری ہے۔'' اسحاق بڑبڑایا۔

''وہ کیا؟''

''تیرا خاتمہ......'' اس نے کہا اور ایکدم اس پر چھلانگ لگائی۔ شکیل کا ریوالور والا ہاتھ سیدھا ہوتے دیکھ کر صائمہ کے ہونٹوں سے زوردار چیخ برآمد ہوئی تھی۔ اسحاق پورے زور میں شکیل کو اپنے ساتھ رگیدتا ہوا آگے لے گیا تھا۔ شکیل نے اس کے پیٹ اور کمر کے زخموں پر اپنا سر مارا تو وہ نیچے گر پڑا مگر اس سے پہلے کہ وہ ریوالور کو پھر اٹھا پاتا، اسحاق نے ریوالور کو لات مار کر دور دھکیل دیا اور شکیل کو گھٹنے سے پکڑ کر خود پر گرا لیا۔ شکیل نے مڑ کر اس کے چہرے پر ایک مکا رسید کیا جس سے اس کے چہرے پر موجود ٹانکے کھل گئے مگر اس نے پھر بھی گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔ شکیل نے اسے دھکا دیا اور جیب سے چاقو نکال لیا۔ اسحاق کو زمین پر گرا کر وہ اس کے سینے پر اپنا گھونسا مارنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اس سے قبل کہ اس کا چاقو اس کے جسم میں داخل ہو پاتا، تہ خانہ ایک دھماکے کی آواز سے گونج اٹھا۔ جبران کے ریوالور کی گولی شکیل کے سر میں اتر گئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے چاقو زمین پر گر گیا اور پھر وہ خود لڑھک کر الٹا ہو گیا تھا۔ اسحاق زمین پر پڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا، گیم واقعی اوور ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کیس ختم ہونے کئی روز ہو چکے تھے۔ جبران اس روز شکیل کا ان باکس چیک کر رہا تھا اسے وہاں کئی میلو نظر آگئیں جن میں کسی نامعلوم شخص کی طرف سے زارا اور اسحاق کے بارے میں معلومات بھیجی گئی تھیں۔ شکیل کی جوابی میلو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی اس شخص کو نہیں جانتا تھا۔ ان میلو میں کئی میں زارا اور اسحاق کی ہنستی مسکراتی تصویریں بھی شامل تھیں۔ واضح طور پر وہ میلو شکیل کے غصے کی آگ کو بھڑکا کر اسے اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش تھیں اور انہوں نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔ جبران الجھا ہوا تھا۔ آخر یہ کون ہوسکتا تھا۔ یہ جو بھی تھا زارا کے قتل میں وہ یقیناً برابر کا شریک تھا۔ اس معمے کو حل کیے بغیر یہ کیس بند نہیں ہوسکتا تھا۔ اس شام اس نے پھر اس بچے کی کھینچی گئی تصاویر کی کاپیاں نکالیں۔ ان تصویروں میں تین چار مواقع پر شکیل کو درخت پر چڑھے دیکھا جاسکتا تھا۔ اگرچہ یہ اس کا چہرہ واضح نہیں تھا مگر اب وہ جانتے تھے کہ وہ کون تھا۔ ایک تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے وہ چونک اٹھا۔ اس تصویر میں ایک گلابی رنگ کی چھوٹی سی نئی ماڈل کی کار نظر آرہی تھی۔ یہ کار اس نے دیکھی ہوئی تھی۔ جبران نے مختلف تصاویر نکالی۔ یہ الگ الگ دنوں کی تصویریں تھیں مگر توجہ دینے پر اسے ہر تصویر میں کہیں نہ کہیں وہ کار کھڑی نظر آرہی تھی۔ ایک تصویر میں اس کا نمبر بہت واضح تھا۔ اس نے نمبر کو کاغذ پر اتارا اور فون پر کسی کو اسے ٹریس کرنے کا حکم دیا۔

کچھ ہی دیر میں مطلوبہ معلومات اس تک پہنچ گئی تھیں۔ جو کچھ سامنے آیا تھا، اس نے جبران کو بھی حیرت زدہ کردیا تھا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق یہ نمبر صائمہ کی کار کا تھا۔ ہر بار صائمہ کی کار کا وہاں موجود ہونا سمجھ

میں آنے والی بات نہیں تھی۔ ایسا صرف اسی وقت ہوسکتا تھا جب اسے معلوم ہو کہ شکیل وہاں موجود ہے۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے فون اٹھایا۔ ایک نمبر ملایا اور بولا۔ ''میں اپنے گھر پر ہوں۔ مجھے کیس کے متعلق ایک بہت اہم بات معلوم ہوئی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ فوراً یہاں پہنچیں۔''

ایک گھنٹے بعد صائمہ اس کے سامنے موجود تھی۔

''خیر تو ہے جبران صاحب! آپ کا پیغام ملتے ہی میں آگئی۔ ایسا کیا معلوم ہوا ہے آپ کو؟''

وہ اسے چند لمحے دیکھتا رہا۔

''پلیز جبران صاحب بتایئے پھر مجھے اسحاق کے گھر جانا ہے۔''

''یہ ہی اصل معاملہ ہے صائمہ۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔

''کیا؟''

''اسحاق! تم غالباً اسحاق کو پسند کرتی تھیں۔ زارا درمیان میں آگئی۔''

''یہ کیا بکواس ہے۔'' صائمہ نے غصے سے پوچھا۔

''یہ بکواس نہیں، حقیقت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنی بیسٹ فرینڈ کے قتل میں ملوث ہو۔''

''میں اس بات پر یقین نہیں کرسکتی۔ میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔

''نہیں...... تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینے ہوں گے تم نے زارا کو قتل کرنے کے لیے شکیل کو اکسایا اور اسے ان کے بارے میں تمام معلومات فراہم کیں...... کیوں؟''

''یہ جھوٹ ہے۔''

''جھوٹ تم بول رہی ہو، ورنہ ہر اس رات جب وہ ان کی جاسوسی کررہا ہوتا تھا، تمہاری کار اس گلی میں کیا کررہی تھی؟'' وہ غرایا۔ اس نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے اس کے سامنے میز پر تمام تصاویر کو بکھیر دیا تھا۔ صائمہ پھٹی پھٹی نظروں سے تصاویر دیکھ رہی تھی۔

''تم شکیل جیسے سفاک قاتل کے ساتھ کام کررہی تھیں۔''

''نہیں۔'' وہ پھٹ پڑی۔ ''میں اس کے ساتھ کام نہیں کررہی تھی۔''

''مگر تم جانتی تھیں کہ وہ کیا کررہا ہے بلکہ صحیح معنوں میں اسے اکسانے والی تم ہی تھیں۔ بولو جواب دو۔''

''ہاں۔'' وہ چیخ پڑی۔

''تم جانتی تھیں نا کہ وہ اسے قتل کردے گا مگر تم نے اسے ہوشیار نہیں کیا۔''

''وہ اسی قابل تھی۔'' نفرت نے اس کا خوب صورت چہرہ قدرے مسخ کردیا تھا۔

''میں اسحاق سے پیار کرتی تھی پھر وہ آگئی اور اسحاق اس کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔ میں کیا کرتی۔''

''تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ شکیل، اسحاق کو بھی مار سکتا تھا؟''

''نہیں...... میں ایسا نہیں ہونے دیتی۔ شروع میں وہ اسحاق کو ہی مارنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اصل مجرم زارا ہے اور اسے مار کر وہ اسحاق کی زندگی بھی برباد کرسکتا ہے، مجھے یقین تھا کہ اسحاق اس سب سے بچ کر باہر نکل آتا، میں اس کی مدد کرتی جس کے بعد ہم دونوں شادی کرلیتے۔''

''مگر حاصل کیا ہوا؟ اسحاق تم سے کبھی شادی نہیں کرے گا۔'' وہ بولا۔

''کیوں نہیں کرے گا، تمہارے پاس ان سب باتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''شاید تم درست کہہ رہی ہو مگر تم یہ جانتی ہو نا کہ دماغ کا درست استعمال بہت کچھ ٹھیک کرسکتا ہے۔''

''ہاں مگر اس سے اس بات کا کیا تعلق ہے؟''

''تم اب باہر آسکتے ہو۔'' جبران بولا۔

کچن کا پردہ ہٹا تھا اور وہاں سے لنگڑاتا ہوا اسحاق برآمد ہوا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہورہا تھا۔ آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ صائمہ اسے دیکھ کر ساکت رہ گئی۔

''اسحاق...... یہ سب جھوٹ ہے، یہ مجھے پھنسانا چاہ رہے ہیں۔'' وہ لپک کر اس کی طرف بڑھی۔

''مجھ سے دور رہو صائمہ، میں نے سب سن لیا ہے۔ تم نے میری زارا کو مجھ سے دور کردیا۔ میرے لیے تم بھی اس شکیل کی طرح ایک قاتل ہو، میری محبت اور خوشیوں کی قاتل......'' وہ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

صائمہ اس کے پیچھے لپکی تھی مگر جبران کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''تم ایک مجرم ہو، پولیس یہاں پہنچنے والی ہے اب تمہیں عدالت میں اپنی صفائی دینا ہوگی۔''

وہ صرف اسے دیکھتی رہ گئی۔

خونی مسیحا

اسما قادری

تصویر کے دو رُخوں کے مانند ہر چیز مثبت منفی پہلو رکھتی ہے... انسانی ذہن... اس کی فطرت بھی ان دونوں پہلوئوں کی کشش سے خالی نہیں... جو لوگ اپنی سوچوں اور فطرت کے مثبت پہلو کو لے کے اعتدال اور احتیاط کے راستے پر چلتے ہیں... وہ ہمیشہ فائدے میں رہتے ہیں... بہ صورتِ دیگر نقصان اور تباہی ان کی منتظر رہتی ہے... منفی اور مثبت سوچوں کے حامل ذہنوں سے تعلق رکھتی ایک ہمدرد اور کرب آمیز کہانی... جہاں ٹوٹے دلوں اور پریشان حال لوگوں کی مسیحائی کرنے والے تھے تو دوسری طرف خونی مسیحا تھے جو اپنے گھنائونے اور شکاری جال کھولے بیٹھے تھے... سطر سطر میں دلچسپی اور لہو میں سنسنی پھیلا دینے والی کہانی کے اتار چڑھائو...

لڑکیوں کے سنگ گھومتی پھرتی اور بہت کچھ عیاں کرتی سرورق کہانی......

''اگر ونٹر وکیشنز کی طرح ہم آنے والے سمر وکیشنز میں بھی کیمپ لگائیں تو کیسا رہے گا؟'' بڑی دیر سے کولڈ ڈرنک کی بوتل پر نظریں جمائے بیٹھی عروج نے گپ شپ میں معروف اپنی باقی تینوں ساتھیوں کو دیکھتے ہوئے مشورہ طلب لہجے میں پوچھا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''لگتا ہے عروج بیگم کو کمانے کے مزے لگ گئے ہیں۔ ونٹر کیمپ لگا کر ہم نے اچھا خاصا پرافٹ کما لیا تھا نا۔'' سب سے پہلے مہ پارہ عرف پارو نے اس کی تجویز پر ردِعمل ظاہر کیا۔

''کمایا تو تھا لیکن جان بھی تو کتنی کھپانی پڑی تھی۔ میرا تو خیال ہے کہ کچھ مختلف کریں۔ کمانے کے لیے فی الحال ہمارے والدین موجود ہیں نا یار۔'' سعدیہ نے ناک سکیڑتے ہوئے آئیڈیے کی مخالفت کی۔

''رائٹ! تم نے ٹھیک کہا کہ کمانے کے لیے والدین موجود ہیں اور اللہ کے فضل و کرم سے ہم ان خوش قسمت لوگوں میں شامل ہیں جنہیں اپنی ضروریات و خواہشات پوری کرنے کے لیے کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا لیکن پھر بھی کچھ ایسا ہے جو ہمارے پیرنٹس ہمیں کما کر نہیں دے سکتے اور وہ ہمیں خود اپنے لیے کمانا پڑے گا۔''

''مثلاً؟'' عروج کے نہایت سنجیدگی سے بولنے پر تینوں نے ہی اسے غور سے دیکھا اور سعدیہ نے ایک لفظی استفسار کیا۔

''ثواب، دعائیں، نیک اعمال......'' عروج نے اسی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

''کماتے تو ہیں یار یہ سب بھی۔ نماز، روزے کے پابند ہیں۔ حسبِ توفیق صدقہ خیرات بھی دیتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کی دعائیں بھی ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔'' سعدیہ نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

''ٹھیک ہے ہم یہ سب کرتے ہیں لیکن میرے خیال



میں ہم جیسے مراعات یافتہ طبقے کے لوگوں کو اس سے بڑھ کر بھی کچھ کرنا چاہیے کیونکہ سنا ہے جس کے جتنے وسائل ہیں اس سے اسی حساب سے باز پرس ہوگی۔'' عروج نے جونکتہ بیان کیا اس پر وہ تینوں ہی سوچ میں پڑ گئیں۔ بات تو واقعی ایسی ہی کچھ تھی۔

''لیکن سمر کیمپ کا ثواب کمانے سے کیا تعلق؟ اس طرح کے کیمپس میں تو زیادہ تر اپر کلاس اور اپر مڈل کلاس کے بچے ہی ایڈمیشن لیتے ہیں اور ظاہر ہے وہ لوگ افورڈ کر سکتے ہیں۔'' پارو کے استفسار میں اعتراض نہیں بس الجھن تھی۔

''ہم اپنا کیمپ غریب بچوں کے لیے کسی ایسے علاقے میں لگائیں گے جہاں بچے ان سب باتوں سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ ہمارے اس کیمپ کا مقصد ہلکی پھلکی تفریح کے ساتھ بچوں کو بنیادی تعلیم سے آشنا کرنا ہوگا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں کتنے ہی گاؤں دیہات ایسے ہیں جہاں معصوم بچوں کو اسکول کی شکل... دیکھنا نصیب نہیں ہوتی یا اگر وہ سرکاری اسکولوں میں جاتے بھی ہیں تو انہیں سخت گیر اور متکبر ٹیچرز کے علاوہ حصولِ تعلیم کے لیے کچھ اور نہیں ملتا۔ ہمیں ایسے ہی بچوں کو زندگی کی تھوڑی سی خوشیاں اور رنگینیاں دکھانی ہیں۔'' عروج کا انداز جذباتی تھا۔ وہ تینوں ہی متاثر ہوئیں پھر سعدیہ بولی۔

''خیال تو نیک ہے لیکن میرے خیال میں اس پر عمل کے لیے کافی زیادہ وسائل درکار ہوں گے۔''

''ہمارے پاس ونٹر کیمپ سے ہونے والی انکم اور اپنی اپنی سیونگز ہیں۔ کچھ مدد ہم اپنے والدین اور جان پہچان کے لوگوں سے لے لیں گے تو کام چل جائے گا۔ ضروری تو نہیں ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر ہی کام کیا جائے۔ ہم میں سے ہر ایک اگر اپنی اپنی استطاعت کے مطابق کام کرنا شروع کر دے تب بھی ہمارے اردگرد بہت کچھ تبدیل ہو سکتا ہے۔'' عروج کے پاس گویا ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

''لگتا ہے تم نے حال ہی میں کسی درس میں شرکت کی ہے یا اصلاحِ معاشرہ کے کسی پروگرام میں۔'' روشی نے اسے گھورا۔

''نہیں یار! کبھی کبھی اپنے اندر سے بھی ایسے اچھے خیالات برآمد ہو جاتے ہیں اور پھر یہ اتنا بھی خالص نیکی کا پروگرام نہیں ہے۔ اس میں تھوڑا سا ایڈونچر اور تفریح بھی شامل ہے۔ ہم پہلی بار کسی چھوٹے سے گاؤں تک کا سفر کریں گے۔ وہاں کا لائف اسٹائل دیکھیں گے اور ان خوب صورتیوں کو تلاش کریں گے جن کا کہیں ذکر نہیں آتا لیکن میرے خیال میں ہل اسٹیشنز، برف زاروں، چراگاہوں وغیرہ کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی ان کا وجود ہوتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ نے اپنی کائنات کے کسی حصے کو خوب صورتی سے محروم رکھا ہوگا۔ کوتاہی ہم انسانوں کی ہوتی ہے جو اس کی بنائی اس خوب صورتی کو ڈھونڈ نہیں پاتے۔'' عروج نے جواب میں جو تقریر جھاڑی اس پر وہ تینوں ہی سر کھجا کر رہ گئیں اور دل میں سوچا کہ عروج بی بی مانیں نہ مانیں انہوں نے کسی درس میں شرکت ضرور کی ہے۔

☆☆☆

''اگر مستقبل میں کبھی مجھے وزیر ریلوے بننے کا موقع ملا تو میں سب سے پہلے ان پھٹیچر ٹرینوں کو آگ میں جھونکوں گی۔'' غیر آرام دہ نشست پر گرمی سے نڈھال بیٹھی سعدیہ نے بڑے عزم سے اعلان کیا۔

''ایسا کر کے تم کچھ نیا نہیں کرو گی بی بی! یہاں پہلے ہی ملکی وسائل کو آگ میں جھونکنے کا کام بڑی جانفشانی سے ہو رہا

ہے جس کو جس محکمے کی وزارت ملتی ہے وہ اس کا بیڑا غرق کرتا ہے اور اپنے فارن اکاؤنٹس میں مال ٹرانسفر کر کے چین کی بانسری بجاتا ہوا چل پڑتا ہے۔'' اس کے اعلان پر عروج نے بڑے فلسفیانہ انداز میں تبصرہ کیا لیکن سعدیہ کو غصہ آ گیا اور اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''میں تمہیں ان کرپٹ وزرا کی طرح نظر آتی ہوں کیا؟ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ان خستہ حال ٹرینوں کو ہٹا کر ان کی جگہ جدید اور آرام دہ ٹرینیں لے کر آؤں گی۔''

''یہ تو بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آنے والی بات ہے یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ ہماری قوم کا المیہ ہی یہ ہے کہ جن کے ہاتھ میں اختیار ہوتا ہے وہ کچھ کرتے نہیں ہیں اور جن کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا وہ بیٹھ کر خیالی پلاؤ پکانے اور ڈینگیں مارنے کا کام کرتے رہتے ہیں۔'' عروج پر اس کے گھورنے اور وضاحت دینے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور مزید تنقید کر ڈالی۔

''تم میرے پُرخلوص خیالات کو ڈینگیں مارنے کا نام دے رہی ہو؟'' صدمے سے سعدیہ کا غصہ مزید بڑھ گیا اور صاف محسوس ہوا کہ وہ لڑنے کے لیے پنجے تیز کر رہی ہے۔

''تم دونوں کس فضول بحث میں الجھ گئی ہو۔ یہ لو گنڈیریاں کھاؤ۔ بڑی رسیلی اور میٹھی ہیں۔'' روشی نے کھڑکی میں سے ایک پھیری والے سے خریدی گئی پلاسٹک کے لفافے میں موجود گنڈیریاں ان دونوں کی طرف بڑھاتے ہوئے جھگڑا ختم کرنے کی کوشش کی۔

''یہ گنڈیریاں...... یہ کھاؤں میں؟ تمہیں معلوم نہیں ہے کیا کہ یہ کتنی ان ہائی جینک ہیں۔'' سعدیہ ایک ڈاکٹر کی بیٹی تھی سو اسے ایسی باتوں کا ذرا زیادہ خیال رہتا تھا۔

''کہتے ہیں نا کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔ اب تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہوئے میں تمہارے لیے پزا اور کولڈ ڈرنک تو آرڈر نہیں کر سکتی۔ ویسے تو ان کا ہائی جینک ہونا بھی خاصا مشکوک ہی ہے۔'' روشی نے بے نیازی سے اسے جواب دیا اور ایک گنڈیری کو دانتوں کی مدد سے کاٹ کر مزے سے چبانے لگی۔ مہ پارہ پہلے ہی یہ کام کر رہی تھی۔ سعدیہ اور عروج نے بھی ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد لفافے میں سے ایک ایک گنڈیری اٹھا لی۔ وہ چاروں اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق سندھ کے ایک گاؤں کی طرف سفر کر رہی تھیں۔ شروع میں ان کے والدین کی طرف سے اس پروگرام کی مخالفت کی گئی تھی لیکن پھر ان کے خلوص کو دیکھتے ہوئے سب راضی ہو گئے اور ان کی خاصی مدد بھی کی۔ مہ پارہ اور عروج کے والد سہیل مرزا نے ہوم منسٹری میں اپنی جاب کا فائدہ اٹھا کر انہیں ایک چھوٹے سے گاؤں میں کیمپ لگانے کی اجازت بھی دلوا دی۔ انہوں نے اپنے والدین، عزیز و اقارب اور دوستوں کے تعاون سے اس کیمپ کے لیے خاطر خواہ تیاری بھی کر لی اور مقررہ وقت پر روانہ ہو گئیں۔

کیمپ کے لیے جمع کیا گیا سامان پہلے ہی ایک مال گاڑی سے روانہ کر دیا گیا تھا اور سہیل مرزا نے انتظام کر دیا تھا کہ مطلوبہ جگہ پہنچ کر بحفاظت رکھ دیا جائے۔ سامان کی تنصیب و ترتیب وہ چاروں وہاں پہنچ کر خود کرواتیں لیکن فی الحال تو تھرڈ کلاس میں سفر کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ یہ آئیڈیا روشی کا تھا کہ اگر غریبوں کے مسائل کو دل سے محسوس کرنا ہے تو ان کے درمیان رہ کر ان جیسی تکلیفوں کا تجربہ کیا جائے اور تجربے کا آغاز تھرڈ کلاس میں سفر سے کیا گیا تھا۔ ان چاروں کی خوش قسمتی تھی کہ تھرڈ کلاس میں سفر کے باوجود انہیں نشستیں میسر آ گئی تھیں اور اس رش کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا جس کا تہواروں وغیرہ کے موقع پر سفر کرنے والوں کو تجربہ ہوتا ہے۔ پھر بھی جو کچھ سہنا پڑ رہا تھا وہ ناز و نعم سے پلی ان لڑکیوں کے لیے تلخ تجربہ تھا۔ ٹرین کی سست رفتاری، گرمی کی شدت، بھانت بھانت کی خواتین، ان کے روتے بسورتے بچے، پسینے کی بدبو، سروں میں لگائے گئے کڑوے تیل اور لباس پر چھڑکے گئے سستے عطروں کی مہک...... سب کے سب ان کے لیے کڑے تجربات میں شامل تھے۔ سعدیہ اور عروج ان چیزوں کو ذرا زیادہ محسوس کر رہی تھیں لیکن ابتدائی ناگواری کے بعد مہ پارہ اور روشی نے تیزی سے خود کو اس ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ زنانہ ڈبے میں اپنے ساتھ موجود خواتین مسافروں سے ان کی گفت و شنید کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا اور ایک دو سے تو انہوں نے اتنی دوستی گانٹھ لی تھی کہ انہوں نے انہیں اپنے ساتھ کھانے میں بھی شریک کر لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا کھانا شیئر کر کے خوش ہوئی تھیں اور ان کے درمیان دوستی کا رشتہ مزید مضبوط ہونے لگا تھا۔ ان خواتین میں سے ایک عورت جو کہ اپنے تین بچوں کے ساتھ سفر کر رہی تھی اسی گاؤں کی رہائشی تھی جس گاؤں میں انہیں اپنا کیمپ لگانا تھا۔ زینت نام کی یہ عورت کراچی میں بغرضِ ملازمت مقیم اپنے بھائی کی شادی میں شرکت کر کے واپس اپنے گاؤں جا رہی تھی۔ بھائی نے اپنے ایک ساتھی مزدور کی بہن سے اپنی پسند سے شادی کی تھی اور زینت کو اپنی شہری بھابی زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔ وہ کئی تحفظات کا بھی شکار تھی... اسے ڈر تھا کہ اس کی شہری بھابی

اس کے بھائی کا گاؤں سے رشتہ ختم کردے گی۔ انہیں زینت کی سادہ سی گفتگو اور تفکرات سننے میں لطف آرہا تھا اور اس کے بچے بھی دوسری خواتین کے بچوں کے مقابلے میں خاصے معقول محسوس ہو رہے تھے۔ زینت کا سب سے بڑا بیٹا نو سال، اس سے چھوٹی بیٹی چھ سال اور سب سے چھوٹا بیٹا ڈھائی سال کا تھا۔ بچوں نے سستے مگر صاف ستھرے لباس پہن رکھے تھے۔ خود زینت بھی خوب صورت کڑھائی والا صاف ستھرا سوتی لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔ لباس پر موجود کڑھائی کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اس کے اپنے ہاتھوں کی مہارت تھی۔ ٹرین اسٹیشن پر رکتی تھی تو زینت کا شوہر بیوی بچوں کی خبر گیری کے لیے کھڑکی سے آکر جھانک لیتا تھا۔ وہ پکی رنگت کا، عمر میں زینت سے خاصا بڑا مرد تھا لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ حتی الامکان اپنے خاندان کا خیال رکھنے والا نرم مزاج آدمی ہے۔

طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ لوگ اپنی منزل پر پہنچے تو زینت اور اس کا شوہر اس وقت تک وہیں کھڑے رہے جب تک گاؤں میں ان کے قیام اور سہولیات کی فراہمی کے لیے ذمے دار شخص انہیں لینے نہیں آگیا۔ حامد نامی یہ شخص ڈی سی آفس کا ملازم تھا اور شکل سے ذرا ہونق محسوس ہوتا تھا۔ آتے کے ساتھ اس نے اپنے تاخیر سے پہنچنے کی معذرت کے ساتھ وضاحت کی کہ اس سے یہ قصور محض اس لیے سرزد ہوا کہ ٹرین خلافِ معمول وقت پر پہنچ گئی تھی۔ اس عجیب وغریب وضاحت پر وہ چاروں ہنس پڑیں اور زینت اور اس کے خاندان کو الوداع کہہ کر حامد کے ساتھ روانہ ہوگئیں۔

☆☆☆

سفر نے انہیں تھکا دیا تھا لیکن ایک رات کے آرام کے بعد اگلی صبح سے ہی وہ جوش اور ولولے کے ساتھ سمر کیمپ کی تیاریوں میں جُت گئی تھیں۔ انہیں گاؤں میں قائم واحد پرائمری اسکول کی عمارت کا ایک حصہ فراہم کر دیا گیا تھا۔ عمارت کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن بہرحال کام چلایا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی انہیں عمارت سے زیادہ کھلی جگہ کی ضرورت تھی جہاں بچوں کے لیے مختلف مشاغل اور تفریحات کا انتظام کیا جا سکے۔ ہوا بھر کر استعمال ہونے والے واٹر ٹب، جمپنگ کیسل، سی سا، فائبر سے تیار کردہ سلائڈز جیسی اشیا ان کے کیمپ کا حصہ تھیں۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال جیسے کھیلوں کا سامان بھی وہ اپنے ساتھ لائی تھیں۔ کتابوں اور اسٹیشنری کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا۔ حامد اپنے ساتھ کام کرنے والے کچھ لوگوں کو لے کر آیا تھا جنہوں نے حسبِ ہدایت ایک کھلی جگہ پر جھولوں وغیرہ کی تنصیب کا کام شروع کر دیا۔ وہ چاروں گاؤں کی چند نوجوان لڑکیوں کی مدد سے کلاس رومز کی تزئین و آرائش کرتی رہیں۔ حامد نے گاؤں کی مسجد سے اعلان کروا دیا تھا کہ جو لوگ سمر کیمپ میں اپنے بچوں کا داخلہ کروانا چاہتے ہیں وہ اسکول کی عمارت میں آجائیں۔ اعلان کے بعد داخلے کے لیے سب سے پہلے اپنے بچوں کو لانے والی عورت زینت تھی۔ زینت کے بعد چند اور عورتیں بھی آئیں۔ ان چاروں نے تفصیل سے ان عورتوں کو سمجھایا کہ کس طرح وہ ان کے بچوں کو مثبت تفریحات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ کھیل ہی کھیل میں کچھ سکھانا چاہتی ہیں اور وہ بھی بالکل مفت۔ ان عورتوں نے دوسری عورتوں کو جا کر بتایا تو مزید چند بچے داخلے کے لیے لائے گئے لیکن یہ زیادہ تر چھوٹی عمر کے بچے تھے۔ سات آٹھ سال سے اوپر کا کوئی بچہ ان کے کیمپ میں داخلے کے لیے نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ اس عمر سے اوپر کے زیادہ تر بچے اپنے والدین کے ساتھ کھیتوں اور باغوں میں کام کرتے ہیں یا پھر کوئی دوسری محنت مزدوری کر کے معاشی مسائل حل کرنے میں والدین کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف بہت تکلیف دہ تھا لیکن ان کے وسائل محدود تھے اور وہ ان مسائل کے حل کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھیں چنانچہ جن بچوں نے داخلہ لے لیا تھا ان ہی کی تعلیم و تربیت میں مگن ہوگئیں۔ ان بچوں کے لیے اس طرح کی تفریحات اور پڑھائی کا یہ طریقہ ایک انوکھی چیز تھی۔ وہ آنکھوں میں حیرت اور خوشی لیے پورے ذوق وشوق سے ہر چیز میں حصہ لیتے۔ وہ چاروں پہلے ہی ونٹر کیمپ کا تجربہ کر چکی تھیں اور وہاں بھی انہوں نے معصوم بچوں کی سنگت سے لطف حاصل کیا تھا لیکن یہاں ان بچوں کے ساتھ وہ الگ ہی خوشی محسوس کر رہی تھیں۔ مراعات یافتہ طبقے کے بچوں کے مقابلے میں ان بچوں کی خوشی زیادہ سچی اور خالص تھی۔ رف اینڈ ٹف لائف گزارنے والے ان بچوں کے لیے یہ سمر کیمپ کسی جادوئی دنیا کی حیثیت رکھتا تھا... وہ چاروں ان کے لیے وہ مہربان پریاں تھیں جو ہاتھ پکڑ کر انہیں اس جادوئی دنیا میں لے آئی تھیں۔ وہ صبح کیمپ آتے تو ان کے چہرے خوشی سے کھل رہے ہوتے اور واپس جاتے ہوئے وہ اداس نظر آنے لگتے۔ بچوں کی خوشی کے احساس نے ان کے اندر تکالیف اور مسائل سے نمٹنے کی انوکھی طاقت پیدا کر دی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اتنی شدید گرمی میں اے سی کے

بغیر صرف پنکھے چلا کر سو رہی تھیں اور یہ پنکھے بھی بار بار بند ہو جاتے تھے کہ بجلی کی آنکھ مچولی یہاں شہروں کے مقابلے میں اور بھی زیادہ جاری رہتی تھی۔ اسکول کا چوکیدار ان کے سامان کے ساتھ آیا ہوا جنریٹر چلا تو دیتا تھا لیکن نیند بہرحال خراب ہوتی تھی۔ تھوڑی نیند، سادہ غذا اور ڈھیر سارے کام کے باوجود وہ چاروں خوش تھیں کیونکہ ان کی ذات دوسروں کے لیے خوشی کا ساماں کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ ان کی گاؤں آمد کی ساتویں صبح تھی جب انہوں نے بہت سی آوازیں ایک ساتھ سنیں۔ لوگوں کے بولنے، گاڑیوں کے انجن اور سامان کو اِدھر سے اُدھر حرکت دینے کی آوازیں...... ان چاروں میں سے صرف مہ پارہ ہی صبح کے معمولات سے فارغ ہو کر تیار بیٹھی ہوئی تھی چنانچہ فوراً آوازوں کی طرف متوجہ ہوئی اور کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر دو بڑے لوڈنگ ٹرک کھڑے ...... تھے اور لوگ ٹرکوں سے سامان اتار رہے تھے۔ سامان گتے کے کارٹنز میں بند ہونے کی وجہ سے نظر تو نہیں آرہا تھا لیکن کارٹنز پر چھپی ہوئی کراس اور ہلال کی علامتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں طبی ساز و سامان لایا گیا ہے۔

''باہر کیا ہو رہا ہے یارو؟'' روشی نے دیوار میں نصب چھوٹے سے آئینے میں دیکھ کر اپنے بال سنوارتے ہوئے دریافت کیا۔

''لگتا ہے کوئی میڈیکل کیمپ لگایا جا رہا ہے۔ بہت ڈھیر سارا سامان آیا ہے۔'' اس نے فوراً اطلاع دی۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس گاؤں میں کوئی اسپتال نہیں ہے اور واحد ڈسپنسری بھی ایک کمپاؤنڈر صاحب نزلہ، زکام اور بخار کی عام دواؤں کے سہارے چلا رہے ہیں۔ غربت کی وجہ سے لوگ کہیں باہر جا کر بھی اپنا علاج نہیں کروا پاتے اور اپنی بیماریوں کو پالتے رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔'' مہ پارہ کا جواب سن کر روشی نے تبصرہ کیا۔

''ہاں یار غربت تو بہت ہے۔ کل زینت بچوں کو لینے آئی تھی تو میری اس سے بات ہوئی تھی۔ بے چاری فالسے کے ایک باغ میں کام کر کے آرہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہاں فالسوں کو ٹہنیوں سے الگ کر کے ٹوکروں میں بھرنے والی عورتوں کو بطور معاوضہ فالسے کے پیڑ کی وہ ٹہنی عطا کی جاتی ہے جس سے وہ فالسے چنتی ہیں۔ اس ٹہنی کو چھیل کاٹ کر عورتیں ان کی ٹوکریاں تیار کرتی ہیں اور پھر انہیں بیچ کر پیسے حاصل کرتی ہیں۔ ذرا سوچو کہ معمولی سی رقم کمانے کے لیے بھی بے چاریوں کو کتنے محنت طلب اور پیچیدہ طریقے پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں کوئی اپنے علاج معالجے پر توجہ دے بھی تو کیسے؟'' روشی آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی اور اب اس کی جگہ وہاں کھڑی ہونے والی عروج افسوس کے ساتھ انہیں بتا رہی تھی۔

''یہ ساری ہمارے حکمرانوں کی نااہلی ہے۔'' سعدیہ نے لگا بندھا تبصرہ کیا۔

''بات تو یہی ہے لیکن ان نااہلوں کو اپنے لیے منتخب کرنے والے بھی تو ہم ہی ہیں پھر ان کی نااہلی پر شکوہ کرنے کا کیا فائدہ۔''

''شکوہ نہ کریں تو اور کیا کریں؟'' سعدیہ خفا ہوئی۔

''اپنے حصے کی ذمے داریاں ادا کریں اور کیا کریں۔ چھوٹی چھوٹی ذمے داریاں ادا کرنے سے بھی بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں بچوں کی تعلیم اور تفریح کے لیے کیمپ لگا کر حسب طاقت ایک ذمے داری نبھا رہے ہیں اور یہ کچھ لوگ ہیں جو ہم سے بہت بڑے پیمانے پر یہاں صحت کے حوالے سے کام کرنے چلے آئے ہیں۔ سوچو اس سے کتنے لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ اسی طرح دیگر صاحب استطاعت لوگ بھی اگر اس طرح کے کارِ خیر میں ہاتھ ڈالنا شروع کر دیں یا باہمت نوجوان ڈونیشنز وغیرہ کی مدد سے کچھ کام کر دکھائیں تو ہمارے لوگوں کے حالات دھیرے دھیرے سنبھلنے لگیں گے۔'' مہ پارہ تھوڑی سی جذباتی ہوگئی۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن غربت، جہالت، دہشت گردی جیسے عناصر نے مل کر ہماری قوم کو جس ڈپریشن اور تنزلی میں مبتلا کر دیا ہے، بہت کم لوگوں کے لیے ہی یہ ممکن رہ گیا ہے کہ وہ مثبت انداز میں سوچیں اور عمل کر سکیں۔'' روشی کی بات میں بھی وزن تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اس تکلیف دہ موضوع پر مزید بات کی اور جلدی جلدی اپنے اپنے معمولات سے فارغ ہونے لگیں۔ جلد ہی بچوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ ان کے ساتھ ایسی مصروف ہوئیں کہ سہ پہر تک فرصت ہی نہیں مل سکی کہ میڈیکل کیمپ والوں کا جائزہ لے سکیں۔ کیمپ میں آیا کے فرائض انجام دینے والی عورت نے البتہ اس بات کی تصدیق کر دی کہ اسکول میں میڈیکل کیمپ لگایا جا رہا ہے اور وہ بھی بہت بڑے پیمانے پر۔ ڈاکٹرز اور پیرامیڈیکل اسٹاف کے پہنچنے کی اطلاع تھی اور یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ یہ ٹیم اپنے ساتھ ایک موبائل آپریشن تھیٹر بھی لائی ہے تاکہ کسی قسم کے آپریشن کے منتظر مریضوں کا

مسئلہ حل کیا جا سکے۔ یہ سن کر چاروں کو ہی خوشی ہوئی اور سوچا کہ فرصت ملنے پر میڈیکل کیمپ کا چکر لگائیں گی۔ سہ پہر کو بچوں کے واپس اپنے گھر چلے جانے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرتی تھیں اور پھر ان کے پاس اگلے دن کی پلاننگ کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ آج ہی چکر لگانے کا سوچ رہی تھیں۔ اتفاق سے آج زینت بچوں کو لینے آنے میں بہت لیٹ ہوگئی تھی اس لیے انہیں اس کے انتظار میں بیٹھنا پڑا تھا۔ گاؤں کے دیگر بچے خود ہی کیمپ آتے جاتے تھے لیکن زینت اس معاملے میں بہت حساس تھی اور بہت تاکید سے انہیں کہہ رکھا تھا کہ بچوں کو کبھی بھی اکیلے گھر نہ بھیجا جائے۔ اس کی ہدایت کے سبب انہوں نے بچوں کے اصرار کے باوجود انہیں گھر جانے کی اجازت نہیں دی اور زینت کا انتظار کرتی آپس میں ہلکی پھلکی گپ شپ کرتی رہیں۔ زینت آئی تو چال سے ہی نڈھال لگ رہی تھی۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا اور چھوٹے بچے کو اس نے یوں اپنی کمر پر لاد رکھا تھا جیسے کوئی بہت ہی بھاری بوجھ ہو۔

''کیا بات ہے زینت! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' اس کی حالت دیکھتے ہوئے عروج نے تشویش سے پوچھا۔ زینت نے فوراً اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور کمر پر لدے بچے کو نیچے فرش پر بٹھا کر خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اور پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ نیچے بیٹھ کر وہ اوڑھنی کے پلو سے چہرے کا پسینہ صاف کرنے لگی۔

''آج گرمی بھی تو بہت زیادہ ہے۔ بے چاری عورت گھنٹوں فالسے چننے کی مشقت کرتی رہی ہوگی اور اس کے بعد اتنی دور تیز دھوپ میں چل کر آئی ہے حالت تو خراب ہونی ہی تھی۔'' روشی نے ہمدردی سے سوچا اور فوراً ہی اس کے لیے گلاس میں ٹھنڈا جوس لے کر آگئی۔

''لو یہ جوس پی لو، طبیعت سنبھل جائے گی۔'' نرمی سے کہتے ہوئے اس نے گلاس زینت کے ہاتھ میں تھمایا۔ اس نے کانپتے لبوں سے دھیمی آواز میں شکریہ کہا اور گلاس لبوں سے لگالیا لیکن دو گھونٹ سے زیادہ نہ پی سکی اور چہرے پر موجود تکلیف کے تاثرات میں مزید اضافہ ہوگیا۔ گلاس ایک جانب رکھ کر اس نے ہلکی سی آہ بھرتے ہوئے اپنا پیٹ تھام لیا۔

''کیا بات ہے زینت، کیا پیٹ میں درد ہے؟'' عروج نے ایک بار پھر اس سے سوال کیا۔

''جی مس جی، آج صبح سے ہی درد ہو رہا ہے۔ کام بھی زیادہ نہیں کر سکی اور ادھر باغ میں ہی ایک پیڑ کے نیچے بیٹی رہی۔ سکینہ کے پاس پیٹ کے درد کا چورن تھا اس نے کھانے کے لیے مجھے دیا پھر بھی درد کم نہیں ہوا تو وہ مجھے دواخانے لے گئی۔ ادھر سے دوا لے کر آنے میں دیر لگ گئی پھر درد کی وجہ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا اس لیے بچوں کو لینے دیر سے پہنچی ہوں۔'' زینت نے بمشکل اپنا احوال سنایا۔

''تم کسی سے کہلوا دیتیں تو ہم بچوں کو کسی کے ساتھ گھر بھجوا دیتے۔ خوامخواہ اتنی تکلیف میں دھوپ میں جلتی ہوئی آئی ہو۔'' اس بار مہ پارہ بولی۔

''نہ نہ مس جی! بچوں کو تو ہر حال میں، میں ہی لینے آؤں گی۔ کتنی ہی دیر ہو جائے بچوں کو کسی اور کے ساتھ مت بھیجنا۔'' زینت جھٹ بول پڑی۔

''لیکن کیوں؟ گاؤں کی دوسری عورتیں تو اتنی احتیاط نہیں کرتیں پھر تم کیوں بچوں کے معاملے میں اتنا ڈرتی ہو؟'' سعدیہ کے تجسس کی رگ پھڑکی ساتھ ہی دل ہی دل میں اندازہ لگانے لگی کہ ہو نہ ہو کسی خاندانی دشمنی وغیرہ کا چکر ہوگا۔

''ڈرنا تو سب کو چاہیے جی پر حالات کی سختی نے ماؤں کو بے پروا بنا رکھا ہے۔ ادھر ہر عورت کے چھ چھ آٹھ آٹھ بچے ہیں۔ بے چاریاں گھر اور بچے بھی سنبھالتی ہیں اور ان کا پیٹ پالنے کے لیے سر کے سائیں کے ساتھ محنت بھی کرتی ہیں اس لیے اپنے بچوں کا ڈھنگ سے خیال رکھنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ میرا گھر والا سیانا بندہ ہے۔ اس نے مجھ پر زیادہ بچوں کا بوجھ نہیں ڈالا۔ وہ کہتا ہے کہ بس یہی بچے چنگی طرح پل جائیں تو خیر ہے۔'' وہ تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کے سوالوں کے جوابات دے رہی تھی۔

''تمہارے شوہر کی سوچ ٹھیک ہے پر تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم بچوں کے معاملے میں اتنا کیوں ڈرتی ہو اور تمہارے خیال میں باقی ماؤں کو بھی کیوں ڈرنا چاہیے؟'' ان کے لیے زینت کا رویہ واقعی حیرت انگیز تھا کیونکہ انہوں نے اتنے دنوں میں دیکھا تھا کہ گاؤں کا عمومی ماحول پُرسکون ہے اور بچے شہروں کے برعکس آزادانہ اِدھر سے اُدھر گھومتے پھرتے ہیں۔

''بات ہی کچھ ایسی ہے جی!'' زینت کے چہرے کا رنگ بدلا اور یوں لگا کہ وہ کچھ بتاتے ہوئے ہچکچا رہی ہو۔

''بتاؤ نا کیا بات ہے؟'' سعدیہ نے اصرار کیا۔

''سال پیچھے ادھر ہمارے گاؤں میں بڑی عجیب عجیب باتیں ہوئیں۔ تین چار چھوٹے بچے اغوا ہوگئے اور ان کی لاشیں اتنی بُری حالت میں ملیں کہ دیکھنے والوں کے دل

کانپ گئے، پھر پتا چلا کہ بڑے بچوں کے ساتھ بھی گڑبڑ ہورہی ہے۔ ان کو ڈرا دھمکا کر زبردستی ان کے ساتھ غلط حرکتیں کی جاتی ہیں اور ایسی حالت میں ان کی تصویریں اور ویڈیو بھی بنالی جاتی ہیں تاکہ وہ شرم کے مارے کسی کے سامنے زبان نہ کھولیں۔ پھر بھی ایک بچے نے زبان کھول دی اور ان دوسرے بچوں کے نام بھی بتا دیے جن کے ساتھ یہ سب ہورہا تھا۔ بہت شور مچا۔ پولیس میں پرچہ کٹا۔ بچوں نے جن لوگوں کے نام بتائے انہیں پکڑا بھی گیا لیکن پھر جانے وہ سب کدھر گئے۔ کہنے والے کہتے ہیں پولیس نے پیسے کھا کر ان بندوں کو چھوڑ دیا۔ ان میں سے کوئی دوبارہ ادھر نظر بھی نہیں آیا لیکن دل میں ڈر تو بیٹھ گیا ہے ناجی! میرا مرد کہتا ہے! اللہ نے ہمیں نے کرم کیا کہ ہمارے بچے محفوظ رہے پر اب ہمارا فرض بنتا ہے کہ بچوں کی پوری حفاظت کریں تاکہ کسی کو ان کے ساتھ ظلم کا موقع نہ ملے۔'' زینت بتانے پر آئی تو بتاتی چلی گئی۔ سن کر وہ چاروں افسردہ ہو گئیں۔ ایسے واقعات میڈیا پر بھی رپورٹ ہوتے رہتے تھے اور سن کر ہر بار دل کانپ جاتا تھا لیکن نجانے وہ کون درندے تھے جو معصوم پھولوں کو یوں روند ڈالتے تھے۔

''اب چلوں مس جی! پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔ آپ لوگوں کا شکریہ کہ آپ نے اتنی دیر میرے بچوں کا خیال رکھا۔'' ان لوگوں کو خاموش اور افسردہ پا کر زینت نے اجازت طلب کی اور چھوٹے کو گود میں اٹھا کر کیرم کھیلتے دونوں بڑے بچوں کو آواز دینے لگی۔

''ہاں ٹھیک ہے جاؤ اور دیکھو اگر طبیعت ٹھیک نہ ہو تو دوبارہ ڈسپنسری جانے کے بجائے یہاں آکر دکھالینا۔ یہاں اسکول میں شہر سے آنے والے ڈاکٹر کیمپ لگا رہے ہیں۔ تمہارا اچھا علاج ہو جائے گا۔'' مہ پارہ نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

''جی اچھا جی!'' زینت نے کہا اور بچوں کو ساتھ لیے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''یہ والا ڈاکٹر کتنا ینگ اور ہینڈسم ہے لگتا ہے، ہاؤس جاب کے بعد شاید سیدھا یہاں چلا آیا ہے۔'' شام کے وقت وہ چاروں فارغ تھیں۔ عروج اور مہ پارہ تو اس عورت سے ملنے چلی گئیں جسے انہوں نے اپنے کپڑے کڑھائی کے لیے دیے ہوئے تھے جبکہ روشی اور سعدیہ بچوں کے لیے بنائے گئے پلے ایریا میں جھولوں پر پینگیں لینے لگیں۔ ایک اونچی پینگ لیتے ہوئے سائبان تلے بیٹھے ڈاکٹر کے بارے میں روشی نے تبصرہ کیا۔

''ینگ ہے جب ہی تو سب سے زیادہ کام کی لگن بھی رکھتا ہے۔ میں دو دن سے دیکھ رہی ہوں کہ دوسرے ڈاکٹرز تین کے بعد مریضوں کو نہیں دیکھتے لیکن یہ مغرب تک بھی اپنی جگہ پر جما رہتا ہے۔ سب سے زیادہ مریض اسی کے پاس آرہے ہیں۔'' سعدیہ نے بھی اس کی تائید میں تبصرہ کیا پھر کچھ غور کرنے کے بعد اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''یہ تم ڈاکٹر کے ہینڈسم ہونے میں کس خوشی میں انٹرسٹ لے رہی ہو؟''

''اچھی چیز کو بندہ اچھا ہی کہتا ہے۔'' اس بار روشی نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

''چیز اور بندے میں فرق ہوتا ہے میڈم! ایک نوجوان لڑکی کسی نوجوان لڑکے کے بارے میں اس طرح کے کمنٹس دے تو یہ ذرا فکر کا مقام ہوتا ہے۔'' سعدیہ کا انداز کسی شکی اور کھوجی بڑھیا کا سا تھا۔

''زیادہ فضول بکواس مت کرو۔'' روشی نے اسے جھاڑا۔

''میں تو دوست ہونے کا حق ادا کررہی ہوں۔ خوامخواہ تم ادھر ادھر پھسل گئیں تو......'' سعدیہ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''پتا نہیں یار زینت کی طبیعت کیسی ہے؟ دو دن سے وہ اپنے بچوں کو لے کر نہیں آرہی ہے۔ جانے اس نے ہمارے مشورے پر عمل کر کے ڈاکٹر کو دکھایا بھی ہے یا نہیں۔'' سعدیہ کی ذہنی رو یکایک زینت کی طرف چلی گئی اور روشی سے چھیڑ چھاڑ چھوڑ کر اس کے بارے میں تشویش کا اظہار کرنے لگی۔

''میں نے ایک عورت سے اس کے بارے میں پوچھا تھا، وہ کہہ رہی تھی زینت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ چلو ایسا کرتے ہیں اسے دیکھنے چلتے ہیں۔ یوں بھی ہم فارغ ہی تو ہیں۔'' روشی اچھل کر جھولے سے نیچے اتر آئی۔ سعدیہ نے بھی اس کی پیروی کی پھر بولی۔

''ہم جائیں گے کیسے؟ زینت کا گھر تو ہمیں معلوم ہی نہیں ہے۔''

''نو پرابلم، نکلیں گے تو کوئی نہ کوئی بتا ہی دے گا۔'' روشی نے کہا تو وہ دونوں چل پڑیں۔ ابھی اسکول کے مین گیٹ کے قریب ہی پہنچی تھیں کہ حامد کی گاڑی آتی نظر آئی۔

''آپ کہاں جارہی ہیں لیڈیز؟'' انہیں دیکھ کر حامد نے گاڑی روک لی اور کھڑکی سے جھانک کر پوچھنے لگا۔

''بس یونہی ذرا گاؤں کی خواتین سے ملنے جانے کا پروگرام ہے۔'' سعدیہ نے جواب دیا۔

"میں ڈراپ کر دوں؟" حامد نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"نو تھینکس۔ ہم ذرا واک کے موڈ میں ہیں۔" سعدیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ایز یو وش۔ میں یہاں ٹیم کے انچارج صاحب سے ملنے آیا تھا کہ ان سے ان کے پرابلمز کے بارے میں پوچھ سکوں اگر آپ لوگوں کو کوئی کام ہے تو بتا سکتی ہیں مجھے آپ کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔"

"بہت بہت شکریہ حامد صاحب! آپ کے تعاون کی وجہ سے ہمیں یہاں بہت آسانی ہوگئی ہے۔ فی الحال تو سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ جب کوئی ضرورت ہوگی تو ہم آپ ہی سے کہیں گے۔" حامد کی پیشکش کے جواب میں روشی نے کہا اور پھر وہ دونوں اسے گڈ بائے کہتی ہوئی وہاں سے چل پڑیں۔

"دیکھنے میں ہونق لگتا ہے لیکن بندہ کام کا ہے۔" ذرا آگے نکل جانے پر سعدیہ نے حامد کے بارے میں اپنی رائے دی۔

"اسی لیے تو کہتے ہیں کہ کسی کی شکل پر نہیں جانا چاہیے۔" روشی نے بڑے مدبرانہ انداز میں تبصرہ کیا اور پھر وہ یونہی ہلکی پھلکی باتیں کرتی، پوچھتی پچھاتی زینت کے گھر جا پہنچیں۔ دروازہ زینت کے بڑے بیٹے نے کھولا اور دونوں کو سامنے پا کر کھل اٹھا۔

"اماں، اماں...... دیکھیں کون آیا ہے۔ میری مسیں آئی ہیں۔" اس نے سارے گھر میں شور مچا کر رکھ دیا۔ اس کی آواز پر پہلے اس سے چھوٹی بہن بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور بڑے جوش و ادب سے ان دونوں کو سلام کرتے ہوئے ان سے مصافحہ کیا۔ اسی دوران زینت بھی ان کے استقبال کے لیے باہر نکل آئی۔ اس نے بھی حتی الامکان ان دونوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کرنے کی کوشش کی لیکن دیکھنے میں وہ بہت نڈھال اور پریشان محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا زینت! طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تمہاری؟" انہیں کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے رنگین ٹکڑوں سے تیار کردہ رلی بچھی چارپائی پر بڑے احترام سے بٹھا دیا گیا تو روشی نے زینت سے دریافت کیا۔

"نہیں مس جی! طبیعت ہی تو ٹھیک نہیں ہے اسی لیے ان دونوں کو بھی آپ کے پاس لے کر نہیں آپا رہی ہوں۔ دونوں بڑے اداس ہو رہے تھے۔ ادھر آنے کے لیے پر میری ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ان کا ابا بھی صبح منہ اندھیرے کھیتوں پر جاتا ہے تو پھر دوپہر کے کھانے پر ہی شکل دکھاتا ہے۔ دو دن سے تو اسے کھانا بھی سکون سے کھانے کا وقت نہیں مل رہا ہے۔ الٹا سیدھا کھا کر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔ بچوں کو مجھے اپنی بہن کے گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ بس آپ دعا کریں جی کہ ساتھ خیریت کے یہ مشکل دن کٹ جائیں۔" زینت کا جواب طویل ہونے کے باوجود واضح نہیں تھا لیکن اس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ بڑی فکرمند ہے۔

"ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟ کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟" سعدیہ نے ہمدردی سے پوچھا۔

"پتے میں پتھری کا بتایا ہے جی۔ انہوں نے پیٹ کے اندر کا فوٹو لیا تھا اس سے پتا لگا ہے۔ کہتے ہیں آپریشن کر کے پتا نکالنا پڑے گا۔" وہ یقیناً الٹراساؤنڈ کا ذکر کر رہی تھی۔ آپریشن کا نام لیتے ہوئے اس کا چہرہ مزید زرد پڑ گیا تھا۔

"پتے کی پتھری کا تو یہی علاج ہے۔ تم گھبراؤ نہیں بڑا عام سا آپریشن ہوتا ہے اور تھوڑے دنوں میں ہی مریض بالکل صحت یاب ہو جاتا ہے۔" اس کی پریشانی کو سمجھتے ہوئے روشی نے نرمی سے اسے تسلی دی۔

"فکر تو ہوتی ہے باجی! آپریشن لفظ ہی بڑا خوفناک ہے۔ میں تو ان کے ابا سے کہہ رہی ہوں کہ تھوڑا عرصہ حکیم جی سے علاج کروا کر دیکھ لیتی ہوں، کیا خبر ایسے ہی پتھری نکل جائے لیکن وہ میرے پیچھے پڑا ہے کہ آپریشن کروالو۔"

"تمہارا شوہر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے زینت۔ فضول قسم کے علاج میں وقت ضائع کرنے کے بجائے میڈیکل ٹیم کی یہاں موجودگی کا فائدہ اٹھا کر فوراً آپریشن کروالو۔ تمہارے اس گاؤں میں ویسے ہی کوئی اسپتال نہیں ہے۔ یہ موقع ضائع کر دیا تو بعد میں رل کر رہ جاؤ گی۔" سعدیہ اسے سمجھانے لگی۔

"وہ بھی ایسی ہی باتیں کرتا ہے مگر پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" زینت تذبذب کا شکار تھی۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ شہروں میں تو الٹی سیدھی غذائیں کھا کھا کر لوگوں نے اپنا اتنا برا حال کر رکھا ہے کہ ہر پانچویں چھٹے بندے کو پتے کا آپریشن کروانا پڑتا ہے۔ لوگ ایک معمول کی طرح لیتے ہیں اس آپریشن کو۔" سعدیہ نے اسے سمجھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

"کیا شہر، کیا گاؤں مس جی! بیماریاں تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ بس ہم لوگوں کے پاس اسپتال اور دوسری جگہیں نہیں ہیں اس لیے ہمیں اپنی بیماری کی اصل وجہ... پتا نہیں چل پاتی

اور یونہی بغیر دوا علاج کے مرجاتے ہیں۔ اب آپ یہ ہی دیکھ لیں کہ ہمارے گاؤں میں اب تک چار چھ بندوں کو گردے کا مسئلہ نکل آیا ہے اور ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ اگر خراب گردہ نہ نکالا گیا تو پورے جسم میں زہر پھیل جائے گا۔'' وہ دونوں اس کے پاس بیٹھی گاؤں کے قصے سننے کے ساتھ ساتھ اسے آپریشن کے لیے آمادہ کرنے کی بھی کوشش کرتی رہیں۔

زینت نے بیمار ہونے کے باوجود اپنی استطاعت کے مطابق ان کی خوب خاطر مدارت کی۔ چھوٹے سے گھر میں جہاں ہر طرف زینت کے سلیقے اور سندھی ثقافت کے رنگ بکھرے ہوئے تھے، روایتی مہمان نوازی کے مزے لوٹتے ہوئے انہوں نے زندگی کے اس حسن کو محسوس کیا جو بقول عروج ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور جس سے صرف وہی محظوظ ہوتا ہے جس میں اسے کھوجنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔

☆☆☆

عروج کو زکام ہو گیا تھا۔ پہلے اس نے ساتھ لائی ہوئی دواؤں سے کام لینے کی کوشش کی لیکن جب طبیعت نہ سنبھلی تو مہ پارہ نے اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ کیمپ میں وہ شام کے وقت روشی کو ساتھ لے کر ڈاکٹر سے مشورے کے لیے جا پہنچی۔ خوب صورت و اسمارٹ ڈاکٹر جس کا نام انہیں طاہر معلوم ہوا تھا حسب معمول اس وقت بھی مریض دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک تقریباً چالیس سالہ شخص بیٹھا ہوا تھا جس کا ایکسرے دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''تمہارا ایک پھیپھڑا بالکل ناکارہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے باقی جسم میں بھی انفیکشن پھیلنے کا ڈر ہے۔ اگر تم خود کو بستر پر لگنے سے بچانا چاہتے ہو تو اس ناکارہ پھیپھڑے کو نکلوانا ہوگا۔ میں نے تمہارے ٹیسٹوں کی رپورٹیں بڑے ڈاکٹر صاحب کو دکھائی تھیں یہ ان کی ہی رائے ہے۔ اب تم فیصلہ کر لو کہ کیا چاہتے ہو۔ میں تو تم سے صرف اتنا ہی کہوں گا کہ بغیر رقم خرچ کیے، اتنے بڑے سرجن اور سہولیات کا دوبارہ میسر آنا بہت مشکل ہوگا۔ ہمارا موبائل آپریشن تھیٹر اور لیب ہر اس جدید سہولت سے آراستہ ہے جو کسی بڑے اسپتال کے علاوہ آپ کو کہیں اور نہیں مل سکے گی۔'' وہ دیکھنے میں جتنا خوب صورت تھا اس کا بات کرنے کا انداز بھی اتنا ہی دلکش تھا اور وہ نہایت نرمی اور خلوص سے اس شخص کو سمجھا رہا تھا۔

''پر ڈاکٹر صاحب پھیپھڑے تو سنا ہے کہ ان لوگوں کے خراب ہوتے ہیں جو تمباکو کھاتے پیتے ہیں یا شراب وغیرہ کے عادی ہوتے ہیں۔ میں نے تو کبھی ایسی کسی چیز کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔'' وہ آدمی بے حد افسردہ نظر آرہا تھا اور اسے اپنی بیماری کو قبول کرنے میں تامل تھا۔

''تم غلط نہیں کہہ رہے میرے بھائی لیکن کچھ دوسری وجوہات بھی ہوتی ہیں۔ تم کھیتوں میں کام کرتے ہو۔ دن بھر گرد وغبار اور پولن تمہارے پھیپھڑوں میں جاتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ فصلوں پر کیے جانے والے اسپرے ہیں جو انسانی صحت کے لیے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے بہت سے کسان ان مشکلوں کو برداشت کر جاتے ہیں۔ کچھ کو مرتے دم تک اپنی اصل بیماری کا پتا نہیں چل پاتا اور کچھ تمہاری طرح پیدائشی طور پر ذرا کمزور پھیپھڑوں کے مالک ہوتے ہیں جو برداشت نہیں کر پاتے۔ بہرحال تم پھر بھی خوش نصیب ہو کہ تمہارا ایک پھیپھڑا بالکل صحت مند اور طاقتور ہے اور تم اس کے سہارے ذرا سی احتیاط سے اب بھی اچھی زندگی گزار سکتے ہو۔'' طاہر کے انداز میں دوسرے بندے کو قائل کر لینے کی صلاحیت تھی، اس بات کو انہوں نے اس کے سامنے بیٹھے شخص کے چہرے پر موجود نیم رضامندی کے تاثرات کی وجہ سے پوری طرح محسوس کیا۔ وہ ڈاکٹر کی پشت کی طرف سے آئی تھیں اس لیے وہ ابھی تک انہیں دیکھ نہیں سکا تھا اور اس کی پوری توجہ مریض کی طرف مبذول تھی۔

''السلام علیکم ڈاکٹر صاحب!'' روشی کو مناسب معلوم نہ ہوا کہ وہ پشت پر کھڑی اس کی بے خبری میں ساری باتیں سنتی رہے۔ اس لیے بلند آواز میں سلام کیا اور عروج کا ہاتھ پکڑ کر سامنے آگئی۔

''وعلیکم السلام لیڈیز! کیسی ہیں آپ اور یہاں آنے کی فرصت کیسے نکال لی؟'' اس نے خوش گوار حیرت سے ان کا استقبال کیا اور باقاعدہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ تو ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہم سے زیادہ تو آپ مصروف رہتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم نے کبھی آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا کہ آپ جس نیکی کے کام میں مصروف ہیں اس میں خلل نہ پڑنے پائے۔'' روشی نے ذرا جھینپتے ہوئے وضاحت پیش کی۔

''نیکی کا کام تو آپ لوگ بھی کر رہی ہیں۔ مجھے حامد صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ آپ اسٹوڈنٹس ہیں اور اپنے ذاتی خرچے پر غریب بچوں کے لیے یہ سمر کیمپ لگا رکھا ہے۔ میں آپ کے اس جذبے کی دل سے قدر کرتا ہوں۔'' وہ بہت خوش دلی سے ان کی تعریف کر رہا تھا جس پر وہ دونوں ہی ذرا شرما سی گئی تھیں۔

''پلیز بیٹھیے۔ میں ان صاحب کو فارغ کر دوں پھر

آپ سے بات کرتا ہوں۔'' اس نے میز کے ساتھ رکھی دوسری کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر دوبارہ اپنے مریض کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''تم میری بات سمجھ گئے ہونا بھائی جاوید! پریشان نہ ہو اور علاج کے بارے میں غور کرو، غور بھی کیا کرنا ہے بس سب کچھ ہم پر چھوڑ دو۔ ہمارے قابل ڈاکٹرز سب سنبھال لیں گے۔'' اس کا تشفی دینے کا انداز بہت پُراپنائیت تھا۔ مریض اس کے پاس سے رخصت ہوا تو آپریشن کے لیے رضامند اور خاصا مطمئن نظر آرہا تھا۔

''بے چارے لوگ شعور اور وسائل کی کمی کی وجہ سے اپنی صحت کی طرف سے بالکل غافل ہیں۔ ہماری ٹیم نے ان چند دنوں میں بڑے سیریس کیس نمٹائے ہیں۔ ہمارے سرجنز کو ہمارے اندازے سے زیادہ آپریشن کرنے پڑ رہے ہیں۔ گردوں کے مریض خاص طور پر بہت زیادہ ہیں یہاں۔'' مریض کے جانے کے بعد وہ ان کی طرف متوجہ ہوا اور تبصرہ کرنے کے انداز میں بولا۔

''ہاں یہ بات تو ہم لوگوں نے بھی نوٹ کی ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق تقریباً پانچ چھ گردے کے آپریشن اب تک ہو چکے ہیں۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ ہم اس سلسلے میں ایک آگہی مہم کا آغاز کریں تاکہ لوگ اپنی صحت کا خیال رکھ سکیں۔'' روشی ناک پر ٹشو پیپر رکھے سڑسڑ کرتی عروج کے بجائے کسی اور مسئلے میں الجھ گئی۔

''سب سے بڑی وجہ تو پانی ہے۔ لوگ کنوئیں کا نمکین پانی اور ندی کا آلودگی سے پُرگدلا پانی پیتے ہیں جو گردوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ غذا میں بھی آئرن سے بھرپور پتے والی سبزیوں کا استعمال بہت زیادہ ہے جو گردے میں پتھری کا باعث بنتی ہے پھر یہاں کوئی مستند ڈاکٹر نہیں ہے جو مرض کو سمجھ سکے۔ اکثر درد ریفلیکٹری ہوتے ہیں، مطلب مریض جس جگہ درد محسوس کر رہا ہوتا ہے اصل میں مسئلہ وہاں نہیں ہوتا لیکن پین کلرز کھانے سے معاملہ دب جاتا ہے اور یوں لوگ برسوں مرض کو پالتے رہتے ہیں۔'' وہ روشی کے سوال کا جواب دے رہا تھا لیکن توجہ عروج کی طرف ہی تھی چنانچہ جب اس نے ایک اور چھینک ماری تو وہ بے ساختہ بولا۔

''پلیز آپ اس سیٹ پر آجائیں، میں آپ کا چیک اپ کرتا ہوں۔'' عروج نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ چیک اپ کے بعد اس نے نہ صرف نسخہ تجویز کیا بلکہ اپنے اسٹاک میں سے دوائیں بھی فراہم کر دیں۔ وہ دونوں وہاں سے لوٹیں تو خوش تھیں اور زبان پر ڈاکٹر طاہر کے لیے تعریفی کلمات تھے۔

☆☆☆

عروج کا زکام جلد ٹھیک ہوگیا تھا اور وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کیمپ کی ذمے داریاں پوری تندہی سے نمٹا رہی تھی۔ کیمپ میں زینت کے دونوں بچے دوبارہ آنے لگے تھے۔ زینت کے کیس کو پیچیدہ قرار دے کر میڈیکل کیمپ والوں نے اسے شہر بھجوا دیا تھا۔ اس کا خاوند اس کے ساتھ گیا تھا جبکہ بچے یہیں اپنی خالہ کے گھر رہ رہے تھے۔ خالہ کے اپنے پانچ بچے تھے۔ مزید تین بچوں کی ذمے داری نے اسے مزید مصروف کر دیا تھا چنانچہ اس نے بڑے دونوں بچوں کو ان کے سر کیمپ بھجوانا شروع کر دیا تھا۔ بچے اکیلے ہی آتے جاتے تھے۔ اس روز بھی وہ دونوں بہن بھائی ساتھ آئے تھے اور چھٹی کے وقت ساتھ ہی وہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ بچوں کے رخصت ہونے کے بعد ان چاروں نے حسبِ معمول تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر فریش ہوکر باہر پلے ایریا میں آبیٹھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تازہ تیار کردہ کیری کے شربت کے گلاس تھے جو کہ چوکیدار کی بیوی کی مہربانی تھی۔ بقول اس کے یہ شربت گرمی اور لو سے بچاؤ کا بہترین نسخہ تھا۔ اس وقت وہ شربت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں کہ انہوں نے زینت کی بہن کو افتاں و خیزاں وہاں آتے دیکھا۔

''سلام مس جی! میں پوچھنے آئی تھی کہ زینت کی دھی جنت تو ادھر نہیں آئی۔'' قریب آکر اس نے بے چینی سے سوال کیا۔

''نہیں وہ تو چھٹی کے وقت کاشف (بڑا بھائی) کے ساتھ چلی گئی تھی۔ کیا گھر نہیں پہنچی؟'' مہ پارہ نے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں پہنچی جی۔ میں کب سے اسے ڈھونڈ رہی ہوں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''اور کاشف......؟''

''وہ بدبخت تو آگیا ہے۔ یہاں سے واپس جاتے ہوئے جنت کو گھر جانے کا کہہ کر خود دوستوں کے ساتھ پتنگ اڑانے کھڑا ہوگیا تھا۔ پر جنت تو گھر آئی ہی نہیں۔ میں نے گاؤں کے ایک ایک گھر سے پتا کرلیا ہے۔'' اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ چاروں بھی بے حد تشویش میں مبتلا ہوگئیں۔ جنت چھوٹی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ اپنے دیکھے بھالے گاؤں میں خالہ کا گھر بھول کر کسی اور طرف جانکلتی۔

''تم نے پولیس میں جنت کے غائب ہونے کی رپورٹ کروائی؟'' سعدیہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''وہ کیوں جی......؟'' وہ حیران ہوئی۔

''بچی گھر نہیں پہنچی ہے اور گھنٹوں سے غائب ہے پھر بھی تم پوچھ رہی ہو کہ کیوں۔ خیر چھوڑو تم میں خود ہی کچھ کرتی ہوں۔'' اس سے سخت لہجے میں بولتی وہ اپنا موبائل نکالنے لگی۔ یہ گاؤں بھی پاکستان کے ان نمونوں میں سے تھا جہاں تعلیم اور علاج جیسی بنیادی سہولیات موجود نہیں تھیں لیکن مختلف کمپنیوں کے موبائل سگنلز بہ آسانی مل جاتے تھے۔

''السلام علیکم حامد صاحب! مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا۔ پلیز کسی قریبی تھانے میں جنت نامی ایک بچی کے غائب ہونے کی رپورٹ تو لکھوا دیں۔'' دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا پھر حامد کے پوچھنے پر تفصیلات بتانے لگی۔ زینت کی خالہ سمیت وہ تینوں بھی اس کی گفتگو توجہ سے سن رہی تھیں۔

''میرے خیال میں پولیس کو رپورٹ کرنے سے پہلے ہمیں تھوڑا سا اور انتظار کرنا چاہیے۔ آپ یہاں کے ماحول سے واقف نہیں ہیں۔ یہاں بچے گھر والوں کو بتائے بغیر گھنٹوں کسی کے گھر، کھیتوں یا باغات میں کھیلتے رہتے ہیں۔ آئی ہوپ کہ یہ بچی جنت بھی تھوڑی دیر میں گھر واپس آجائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتو آپ مجھ سے دوبارہ کونٹیکٹ کر لیجیے گا۔'' حامد نے اس مسئلے کو وہ توجہ نہیں دی جس کی وہ توقع کر رہی تھیں۔ لیکن اس کی مقامی آبادی کے رنگ ڈھنگ سے اچھی طرح واقفیت کی بنا پر یہ آس ضرور لگا لی کہ اس کا اندازہ درست ہوگا۔ اس آس کے سہارے سورج ڈھلنے تک بچی کو ڈھونڈا جاتا رہا لیکن اس کی کوئی خبر نہیں ملی کہ آسمان کھا گیا ہے یا زمین نگل گئی ہے۔ ایک بار پھر حامد سے رابطہ کر کے پولیس میں رپورٹ کی درخواست کی گئی۔ اس بار وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ گھنٹے بھر کے اندر پولیس حرکت میں آگئی۔ رات تک روایتی طریقوں سے تفتیش اور تلاش کا کام ہوتا رہا اور ناکامی کے بعد معاملہ اگلے دن پر ٹال دیا گیا۔ وہ چاروں اپنی جگہ اس بے حسی پر کڑھتی رہیں۔ ان سے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا گیا اور آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔

''کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ جنت کو کہاں ڈھونڈیں۔ بے چاری زینت اپنے بچوں کی اتنی حفاظت کرتی تھی۔ اسے پتا چلے گا کہ اس کی جنت کھو گئی ہے تو اس کا کیا حال ہوگا۔'' سعدیہ نے ٹشو سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ وہ چاروں ہی جنت کے لیے پریشان تھیں اور پریشانی میں روتی بھی رہی تھیں۔ بچی کے غیاب کا معاملہ موجودہ حالات میں کئی گنا زیادہ سنگین ہو چکا تھا۔ میڈیا کئی ایسے واقعات رپورٹ کر چکا تھا جس میں معصوم بچیوں کو اغوا کے بعد بے تحاشا تشدد اور زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیا گیا تھا۔ ایسے لرزہ خیز واقعات کے بارے میں خبریں سن کر ہر صاحب دل شخص تڑپ اٹھتا تھا اور وہ چاروں بھی اس وقت بری طرح تڑپ رہی تھیں کہ کسی طرح جنت کا پتا چل جائے لیکن کچھ کرنے سے قاصر تھیں۔ اپنی اس بے بسی پر جلتی کڑھتی، مقامی پولیس کی نااہلی پر غصے سے تبصرہ کرتی آخرکار رات گئے ایک ایک کر کے چاروں ہی نیند سے مغلوب ہو کر سو گئیں۔ رات کا جانے کونسا پہر تھا کہ سعدیہ کی آنکھ کھل گئی۔ نیند میں اسے لگا تھا کہ کسی بچے کی چیخ سنی تھی۔ آنکھ کھلنے پر وہ اپنی سماعت پر زور دیتے ہوئے کچھ اور بھی سننے کی کوشش کرنے لگی لیکن دوبارہ کوئی آواز سنائی نہیں دی تو دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن نیند اس کی آنکھوں سے روٹھ چکی تھی۔ بیزار ہو کر وہ بستر سے اٹھ گئی اور کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوگئی۔ کھڑکی سے نظر آتا سیاہ چادر کی طرح تنا آسمان ستاروں سے جگمگا رہا تھا لیکن چاند کی غیر موجودگی کی وجہ سے زمین پر زیادہ روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ سعدیہ کی نظریں ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی اسکول کی عمارت کے اس حصے کی طرف چلی گئیں جہاں میڈیکل ٹیم کا قیام تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے وہاں کچھ سائے متحرک نظر آئے۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنی رات کو کون ہے جو جاگ رہا ہے۔ یک دم ہی اس کے اندر وہ جاسوسہ جاگ گئی جو پرل گروپ کی ایک ممبر تھی اور جو چاہے بھی تو کسی پُراسرار نظر آنے والے معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانے سے باز نہیں رہ سکتی تھی۔ اپنی ساتھیوں میں سے کسی کو جگائے بغیر اس نے خاموشی سے جوتے پہنے اور باہر نکل گئی۔ گاؤں کی راتیں شہروں کی راتوں کے مقابلے میں زیادہ تاریک ہوتی ہیں لیکن وہ ڈرے یا گھبرائے بغیر آگے بڑھتی رہی۔ خود کو کسی کی نظروں میں آنے سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ چپک کر چل رہی تھی۔ آخرکار وہ چلتی ہوئی اس جگہ کے قریب پہنچ گئی جہاں وہ سائے موجود تھے۔ اب وہ حرکت نہیں کر رہے تھے لیکن موجود بہرحال تھے اور وہ ان کی مدھم آوازیں سن رہی تھی۔

''جو کچھ ہوا ہے مجھے بالکل پسند نہیں آیا حامد صاحب، جب اس علاقے میں ہماری ٹیم اپنا کام کر رہی تھی تو دوسری پارٹی کو یہاں سے کوئی سپلائی دینا درست نہیں تھا۔ اس طرح کامپلی کیشنز پیدا ہو جاتی ہیں۔'' کوئی شخص سرد آواز میں حامد

سے کہہ رہا تھا۔
''میں خود بھی محتاط آدمی ہوں ڈاکٹر! لیکن دوسری پارٹی کی ڈیمانڈ تھی اور وہ منہ مانگی پے منٹ دے رہی تھی اس لیے میں نے ان کی ڈیمانڈ پوری کروادی۔''
سعدیہ نے حامد کی شناسا آواز سنی اور اندھیرے کے باوجود قد کاٹھ کی بنیاد پر اندازہ لگالیا کہ ان تین سایوں میں سے حامد کون ہے۔
''پے منٹ تو ہم نے بھی آپ کو منہ مانگی ہی دی تھی۔'' قدرے عمر رسیدہ اور سرد آواز کا لہجہ ذرا تیز ہوا۔
''کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ جتنا آپ نے خرچ کیا ہے اس سے کئی گنا زیادہ کما کرلے جائیں گے۔'' حامد کے لہجے میں بھی ناخوشگواریت جھلکی۔
''جو ہوگیا اسے جانے دیں سر! مجھے امید ہے کہ اب ہماری یہاں موجودگی تک حامد صاحب محتاط رہیں گے۔'' تیسرے سائے نے ان دونوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کی۔
''میں اس شخص کو معاملے کی نزاکت کا احساس دلارہا ہوں طاہر! اغوا کی جانے والی بچی کی ماں ہمارا اسپیشل کیس ہے۔ زینت کی شکل میں ہم کتنی مشکل سے وہ ڈونر تلاش کر پائے ہیں جو ہمارے کسٹمر کے لیور ٹرانسپلانٹ کے لیے درکار تھا۔ یہاں لوگ سادہ اور کم علم ہیں اس لیے کسی نے ہم سے یہ سوال نہیں کیا کہ جب ہم اتنے بڑے بڑے آپریشنز یہاں کررہے ہیں تو زینت کا پتے کا معمولی آپریشن یہاں کیوں نہیں ہوسکتا۔ زینت کے شوہر کو تو طبی پیچیدگی میں الجھالیا تھا تم لوگوں نے لیکن میڈیا والے اتنی آسانی سے کچھ نہیں مانتے۔ وہ جنت کا کیس اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس کی اسپتال میں ایڈمٹ ماں کو بھی ہائی لائٹ کردیں گے جو کہ ہمارے کسٹمر کے لیے ایک ناپسندیدہ سچویشن ہوگی۔'' پہلا شخص ہنوز جھلایا ہوا تھا۔
سعدیہ کو اندازہ ہوگیا کہ وہ یہاں آنے والی جعلی میڈیکل ٹیم کا سربراہ شاکر ہے لیکن اس وقت اس کی شناخت سے زیادہ گفتگو اہم تھی جسے سن کر سعدیہ کے چھکے چھوٹ گئے تھے اور جو کچھ سمجھ آرہا تھا اسے سچ ماننے میں وہ خود ہی متامل تھی کہ نام نہاد مسیحاؤں کا بھیانک روپ قبول کرنا آسان نہیں ہوتا۔
''لیکن بات تو وہی ہے کہ اب آپس میں لڑنے جھگڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب ہمیں اس سچویشن کو ہینڈل کرنا ہوگا اور پہلے سے زیادہ محتاط طریقے سے کام کرنا ہوگا ورنہ واقعی میڈیا والے ہمارے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔'' طاہر نے اپنا مصالحتی کردار جاری رکھا۔
''پلیز طاہر! آپ مجھے جانے کی اجازت دیں اور میری امانت میرے حوالے کردیں۔ میں آپ دونوں سے زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار ہوں کیونکہ مجھے ایک نہیں دو ڈلیوریز دینی ہیں اور دوپہر تک اپنے دفتر میں بھی حاضر ہونا ہے۔'' حامد شاید جان بوجھ کر جھلاہٹ اور بیزاری کا مظاہرہ کررہا تھا۔
''تمہارا ذہنی دباؤ تمہارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ تم جیسے حریص لوگوں کی آنکھوں پر احتیاط کے وقت بھی لالچ کی پٹی بندھ جاتی ہے۔ تم نے تو یہ بھی نہیں سوچا کہ شہر سے آنے والی لڑکیوں نے یہاں سمر کیمپ لگا رکھا ہے اور تم جواب تک میڈیا کو اس علاقے سے دور رکھے ہوئے ہو وہ لڑکیاں اس کے برعکس عمل کرکے تمہارے لیے مشکل کھڑی کرسکتی ہیں۔'' معمر آدمی کی جھنجلاہٹ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس بار حامد کو غصہ آگیا اور طیش بھرے لہجے میں بولا۔
''جب اس آدمی کے اندر حوصلے کی اتنی کمی تھی تو اسے اپنی ٹیم میں شامل ہی کیوں کیا تم نے۔ اس جیسے سیکڑوں سرجن مل سکتے تھے ہمیں۔''
''اب آپ زیادتی کررہے ہیں حامد صاحب! سر شاکر بہت قابل آدمی ہیں جن کا کوئی نعم البدل مل ہی نہیں سکتا اور میں یہ بھی بتادوں کہ سر بزدل نہیں محتاط آدمی ہیں اور اسی احتیاط پسندی کی وجہ سے ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ بہرحال یہ لیجیے آپ اپنی امانت۔'' اس بار طاہر کا لہجہ بھی قدرے سخت تھا اور واضح ہوگیا تھا کہ مصالحانہ کردار ادا کرنے کے باوجود وہ اپنے سینئر کے ساتھ ہی ہے۔ ساری باتیں سنتی سعدیہ کی توجہ اس بار اس سلور باکس کی طرف گئی جو طاہر، حامد کے حوالے کررہا تھا۔ ہر طرف سے بند یہ باکس اسے شناسا سی چیز محسوس ہوئی اور پھر یکدم ہی ذہن میں جھماکا ہوا۔ ایک ڈاکٹر کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے وہ کچھ اہم باتوں سے واقف تھی۔ ایسا ہی ایک سلور باکس اس نے ایک بار اس اسپتال میں دیکھا تھا جہاں اس کے ڈیڈی کام کرتے تھے۔ اس کے استفسار پر انہوں نے بتایا تھا کہ اس باکس میں وہ گردہ آیا ہے جو مریضہ کے مڈل ایسٹ میں مقیم اس کے بھائی نے اس کی زندگی بچانے کے لیے ڈونیٹ کیا ہے۔ بھائی قبائلی دشمنی اور کچھ قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے خود پاکستان نہیں آسکتا تھا اور مریضہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ سفر کرسکے اس لیے دونوں بہن بھائیوں کے مختلف جگہوں پر رہتے ہوئے ساری طبی

کارروائیاں انجام دی گئیں اور آخر میں بھائی کا ڈونیٹ کیا ہوا گردہ بہن کے لیے سلور باکس میں محفوظ کر کے پاکستان بھیج دیا گیا۔ سعدیہ نے آرگن ہارٹیسی کے بارے میں بھی تھوڑا بہت سن رکھا تھا چنانچہ جو گفتگو سنی اور اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا اس کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ وہ ایک ایسے گروہ تک پہنچ گئی ہے جو بڑے دھڑلے سے اس بھیانک جرم میں ملوث ہے۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ حامد اب وہاں سے روانہ ہونے ہی والا ہے۔ حامد کی حیثیت کی وجہ سے اسے امید نہیں تھی کہ مقامی پولیس اس کے خلاف کوئی کارروائی کرے گی اور نہ ہی وہ اس کی منزل کے بارے میں جانتی تھی کہ وہاں اس کی گرفتاری کا انتظام کر سکے چنانچہ آناً فاناً اس نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دبے پاؤں پیچھے کی طرف گئی اور ٹراؤزر کی پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر اپنا موبائل نکالا۔ اب وہ اس موبائل پر ایک نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ ذرا سے توقف کے بعد اس کی کال ریسیو کر لی گئی۔

''میری نانی کی حالت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹرز ان کی زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں اور میرا جلد از جلد ان تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں۔'' دوسری طرف سے ہیلو سنتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا۔

''ریلیکس مس...... پلیز ایزی...... میں کچھ کرتا ہوں آپ کے لیے۔ صبح انشاء اللہ آپ کی روانگی کا انتظام ہو جائے گا۔'' دوسری طرف موجود شخص نے اسے تسلی دی۔

''صبح تک ویٹ نہیں کر سکتی میں۔ صبح تک تو میری اپنی جان نکل جائے گی۔ آپ نہیں جانتے میری نانی میرے لیے کیا ہیں۔ مجھے ابھی اور اسی وقت ان کے پاس جانا ہے۔ اگر آپ نے میری مدد نہیں کی تو میں پیدل ہی چل پڑوں گی اور اس کے بعد میرے ساتھ کچھ برا ہوا تو اس کے ذمے دار آپ ہوں گے۔'' وہ سخت جذباتی لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''پلیز کچھ الٹا سیدھا کرنے کا مت سوچیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کی فرینڈز کہاں ہیں؟'' اس کی دھمکی سن کر دوسری طرف موجود شخص جو کہ حامد تھا بوکھلا گیا۔

''وہ تینوں سو رہی ہیں۔ میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا اور جوتے پہن کر باہر آ گئی ہوں۔ آپ بتائیں کہ آپ کب تک مجھے لینے آ رہے ہیں؟ کیا میں اسکول کے گیٹ تک آ جاؤں؟'' وہ حامد کو زیادہ سوچنے کا موقع دیے بغیر تابڑ توڑ حملے کرتی جا رہی تھی۔

''اوکے، آپ آ جائیں۔ میں قریب ہی ہوں۔ آپ کو پک کر لوں گا۔'' آخر کار حامد نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور یہ بات تو وہ خود بھی جانتی تھی کہ حامد قریب ہی موجود ہے اس لیے فوراً گیٹ کی طرف رخ کیا۔ مہلت اتنی کم تھی کہ وہ فون کر کے اپنی سوئی ہوئی ساتھیوں کو حالات سے باخبر نہیں کر سکتی تھی اور اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔ گیٹ پر پہنچتے ہی حامد کی گاڑی بھی اسے نظر آ گئی۔ گاڑی وہ اسکول کے گیٹ کے اندر نہیں لایا تھا اور سعدیہ نے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ حامد اس کے آگے آگے تقریباً دوڑتا ہوا گیٹ تک پہنچا تھا۔ یقیناً وہ یہاں اپنی موجودگی کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

''آپ اپنے ساتھ کوئی سامان نہیں لائیں؟'' اسے خالی ہاتھ آتا دیکھ کر حامد نے اعتراض کیا۔

''سامان میرے پاس وہاں بہت ہے۔ ابھی میں اتنی ٹینشن میں ہوں کہ مجھے اپنی نانی کے پاس پہنچنے کے سوا کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔'' سعدیہ نے جان بوجھ کر خفا سے لہجے میں جواب دیا۔

''ویری اسٹرینج! میں نے آج کل کسی کو اپنے بزرگوں سے اتنا پیار کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے حامد نے حیرت کا اظہار کیا۔

''آپ تو شاید انسان کے انسان سے رشتے سے بھی واقف نہ ہوں تو کیا لوگ انسانوں سے محبت کرنا چھوڑ دیں۔'' سعدیہ کا لہجہ خود بخود کاٹ دار ہو گیا اور حامد کے کھولے ہوئے فرنٹ ڈور کو نظر انداز کر کے وہ پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر وہاں براجمان ہو گئی۔ حامد کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے بدلا لیکن کچھ کہے بغیر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور ذرا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد بولا۔

''فی الحال ہم بائی روڈ قریبی شہر تک جا رہے ہیں۔ وہاں سے ڈومیسٹک فلائٹ میں کراچی جانے کے لیے جگہ مل سکتی ہے۔ میری سیٹ پہلے سے بک ہے البتہ آپ کے لیے میں انتظام کر دوں گا۔''

''وہ تو آپ کو کرنا ہی ہوگا ورنہ میں آپ کی سیٹ پر قبضہ کر لوں گی۔'' سعدیہ نے اس سے اس کی کراچی روانگی کا مقصد دریافت کرنے کے بجائے دھونس جمائی۔

''آپ بے فکر رہیں۔ دونوں کے لیے سیٹ کا انتظام ہو جائے گا۔'' حامد نے ڈرائیونگ کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھتے ہوئے جواب دیا۔ اب وہ لوگ گاؤں کی حدود سے باہر نکل چکے تھے اور کچے راستوں سے ہٹ کر پختہ سڑک پر گاڑی نے رفتار پکڑ لی تھی۔ سعدیہ موبائل نکال کر اس پر تینوں

کے لیے میسج ٹائپ کرنے لگی۔ مختصراً ساری باتیں لکھنے کے بعد اس نے تینوں کو ہی میسج سینڈ کر دیا۔

''اتنے طویل ٹیکسٹ میسج سے بہتر ہے کہ بندہ کال کر لے۔'' حامد نے تبصرہ کیا۔

''میں کال کر کے کسی کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے منہ بنا کر جواب دیا لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ واقعی وہ تینوں گہری نیند سوتی رہ گئیں تو کیا ہوگا چنانچہ مہ پارہ کے نمبر پر بیل دی۔ پہلی گھنٹی پر ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

''تم کہاں غائب ہو گئی ہو۔ میری ابھی ابھی آنکھ کھلی ہے تو دیکھا تم بستر پر نہیں ہو۔'' مہ پارہ نے چھوٹتے ہی اس سے سوال جواب شروع کر دیے۔

''میں حامد صاحب کے ساتھ کراچی جا رہی ہوں۔ میری نانی کی حالت بہت سیریس ہے اس لیے میرا فوراً ان کے پاس پہنچنا بہت ضروری ہے۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں مہ پارہ کو جواب دیا۔

''ہیں...... کیا عالم بالا میں بھی لوگ بیمار ہوا کرتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق تو تمہاری نانی تمہاری پیدائش کے فوراً بعد ہی اس صدمے کے سبب دنیا سے گزر گئی تھیں کہ ایسی چھینی ناک والی نواسی کی نانی ہو کر دنیا کو کیا منہ دکھائیں گی۔''

''ہوسکتا ہے میں نانی کی وجہ سے پھنس جاؤں لیکن تم لوگ اپنا کام جاری رکھنا۔ میں نے ٹیکسٹ میسج میں بھی ساری تفصیل لکھ دی ہے لیکن حامد صاحب نے مشورہ دیا کہ فون کر دو تو فون کر رہی ہوں۔'' اس نے مہ پارہ کے مذاق پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

''نانی کی مزاج پرسی کے لیے عالم بالا جاؤ گی تو لازماً پھنس جاؤ گی۔ میں نے وہاں سے کبھی کسی کو واپس آتے نہیں دیکھا۔'' اس کے سنجیدہ لہجے کے باوجود مہ پارہ کا مذاق جاری تھا۔

''اوکے بائے۔ اس مسئلے کے حل کے بعد ملتے ہیں۔'' وہ جانتی تھی کہ مہ پارہ چاہے کتنے بھی مذاق کے موڈ میں تھی۔ اس معاملے کو یونہی نظرانداز نہیں کرے گی اور ممکنہ کارروائیاں شروع کر دی جائیں گی اس لیے اطمینان سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''فوراً ہی کال ریسیو کر لی آپ کی سہیلی نے۔ کیا اتنی رات گئے وہ جاگ رہی تھیں؟'' حامد نے اسے موبائل بند کرتے دیکھا تو سوال کیے بنا نہ رہ سکا۔

''اتنی رات کو چمگادڑیں، الو، عاشق اور چور جاگتے ہیں اور میرا یا میری فرینڈز کا ان میں سے کسی کیٹیگری میں شمار نہیں ہوتا۔'' اس نے رکھائی سے حامد کو جواب دیا اور پشت سے سر لگا کر یوں آنکھیں موند لیں جیسے اب وہ کوئی بات نہ کرنا چاہتی ہو۔ حامد نے بھی اس بات کو سمجھ لیا اور گاڑی میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ یہ خاموشی ہی تھی جس کے سبب پچھلی نشست پر آنکھیں بند کیے بیٹھی سعدیہ کو انجن کی آواز سے ہٹ کر بھی کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ پہلے اس نے ان آوازوں کو اپنا وہم جانا لیکن جب آوازیں تسلسل سے سنائی دیتی رہیں تو برداشت نہیں کر سکی اور حامد سے بولی۔

''آپ کی گاڑی کی ڈکی میں کیا رکھا ہے؟ ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی ڈکی کو بجا رہا ہے؟'' اس کا ذہن خودبخود اغوا شدہ بچی جنت کی طرف چلا گیا اور یہ سوچ کر پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی کہ جنت اسی گاڑی کی ڈکی میں موجود ہے۔

''ڈکی میں کچھ نہیں ہے۔ ڈکی کا ڈھکن ذرا ڈھیلا ہو گیا ہے اس لیے گاڑی چلتی ہے تو کھڑکھڑ کرتا ہے۔'' حامد کے چہرے کا رنگ ایک ثانیے کو بدلا لیکن پھر اس نے معقول بہانہ بنا لیا۔ سعدیہ کے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن اس کی توجہ مسلسل وقفے وقفے سے آنے والی آوازوں پر ہی مبذول تھی اور اسے ہرگز بھی حامد کی اس بات پر یقین نہیں تھا کہ ڈکی میں کچھ نہیں ہے۔ وہاں کوئی تھا جو اپنے ہاتھ یا پیر کی مدد سے ڈھکن کو بجاتا تھا اور پھر شاید تھک کر بجانا بند کر دیتا تھا۔

''آپ اپنی گاڑی کہاں چھوڑیں گے۔ ایسے خراب لاک والی گاڑی کو پارکنگ میں چھوڑ کر جانا تو مناسب نہیں ہو گا۔ پتا چلا پیچھے سے کسی نے ڈکی میں کوئی الٹی سیدھی شے رکھ دی تو آپ پھنس جائیں گے۔'' وہ تیزی سے اپنے لائحۂ عمل کے بارے میں سوچ رہی تھی اس لیے حامد کا پروگرام جاننا بھی ضروری سمجھا۔

''ڈونٹ وری، میں گاڑی پارکنگ میں نہیں چھوڑوں گا۔ ایک دوست سے فون پر بات ہو گئی ہے۔ وہ گاڑی اپنے ساتھ لے جائے گا اور اس کی سروس کروا دے گا۔ واپسی میں، میں اس سے گاڑی لے لوں گا۔'' حامد نے اسے جواب دیا تو اس نے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دی اور مہ پارہ کو ایک اور ٹیکسٹ میسج بھیجنے میں مصروف ہو گئی۔ اسی وقت حامد کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

''بس میں پہنچنے والا ہوں۔ تم نے دوسری سیٹ کا انتظام کر دیا یا نہیں؟'' وہ کال کرنے والے سے مخاطب تھا۔

''ہاں، ہاں، میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میرے ساتھ

ڈاکٹر ایس یوسف کی صاحب زادی سعدیہ ایس یوسف موجود ہوں گی۔ تم ان کے نام سے ٹکٹ تیار کروا لینا۔'' دوسری طرف سے شاید کوئی استفسار کیا گیا تھا جس کے جواب میں حامد نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں تصدیق کی۔ جواب میں دوسری طرف سے کچھ اور کہا جانے لگا جسے خاموشی سے سنتے ہوئے حامد کے ماتھے پر لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے بیک ویو مرر میں سعدیہ کی طرف دیکھا۔ وہ میسج ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔

''او کے، میں چیک کر لیتا ہوں۔'' اس نے کال کرنے والے سے کہا پھر موبائل ایک جانب رکھ کر سعدیہ سے مخاطب ہوا۔

''آپ گھر فون کر کے اپنی نانی کی خیریت لے لیں پھر پلین میں بیٹھنے کے بعد تو کال کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔''

''ج...... جی۔'' سعدیہ اس مشورے پر بڑبڑا سی گئی۔ گھر فون کیسے کر سکتی تھی کوئی سچ مچ تو نانی بیمار نہیں تھیں۔

''وہ ایکچو لی، میرے پاس بیلنس ختم ہو گیا ہے بعد میں ائرپورٹ پہنچ کر کال کر لوں گی۔'' اس نے بہانہ بنانے کی کوشش کی۔

''بیلنس کا کیا مسئلہ ہے آپ میرا موبائل استعمال کر لیں۔ پوسٹ پیڈ ہے۔ بلکہ میں خود ہی آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا نمبر میرے پاس سیو ہے۔'' کہہ کر اس نے سعدیہ کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور نمبر ڈائل کر ڈالا۔ تین چار گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کی گئی اور دوسری طرف سے ڈاکٹر ایس یوسف کی خمار آلود آواز سنائی دی۔ حامد نے اپنے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا جس کی وجہ سے آوازیں سعدیہ تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

''السلام علیکم سر! سوری آپ کی نیند خراب کی۔ اصل میں، میں سمجھ رہا تھا کہ اس وقت آپ اسپتال میں ہوں گے۔'' وہ نہایت مہذب لہجے میں ڈاکٹر صاحب سے مخاطب تھا لیکن سعدیہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ بیک ویو مرر سے اسے دیکھتی حامد کی آنکھوں میں اس کے لیے کاٹ سی ہے۔

''میں نائٹ شفٹ میں ڈیوٹی نہیں کیا کرتا مسٹر......''

''آئی نو سر لیکن میں نے سوچا کہ آپ کی خوش دامن صاحبہ کی حالت اتنی سیریس ہے تو آپ لازماً ان کے ساتھ اسپتال میں ہوں گے۔''

''کون ہیں آپ اور کیا فضول باتیں کر رہے ہیں۔ میری خوش دامن کو تو فوت ہوئے بھی برسوں گزر گئے ہیں۔'' ڈاکٹر یوسف کے لہجے میں بیک وقت حیرانی اور بیزاری کے رنگ جھلکے۔ سعدیہ سمجھ گئی تھی کہ بات کھل گئی ہے اس لیے کچھ اور نہ سوچا تو زور سے چیخی۔

''ڈیڈی بچائیں...... یہ حامد......'' اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی حامد نے لائن کاٹ کر موبائل آف کر دیا اور گاڑی کو زوردار بریکس لگائے۔ اچانک بریکس لگائے جانے کی وجہ سے سعدیہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور اس کا سر اگلی سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکرایا جب تک وہ سنبھل کر سیدھی ہوئی حامد پسٹل نکال کر اس کا رخ اس کی طرف کر چکا تھا۔

''اپنا موبائل مجھے دو۔'' غرا کر حکم دیتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ سعدیہ کے سامنے پھیلایا۔ گن پوائنٹ پر موجود شخص کے پاس انکار کی گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ سعدیہ نے بھی اس کا مطالبہ پورا کر دیا البتہ اس بات پر وہ دل ہی دل میں خود کو شاباش دے رہی تھی کہ اب تک کیا جانے والا ہر میسج وہ ساتھ ساتھ ڈیلیٹ کرتی رہی تھی۔ اس لیے حامد کو اس کا موبائل حاصل کر کے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق حامد نے اس سے موبائل لے کر پہلے آؤٹ باکس کھولا اور پھر اسے خالی پا کر جھنجلائے ہوئے انداز میں غرایا۔

''میرے پیچھے لگ کر تم نے اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنا خطرناک آدمی ہوں۔''

''معصوم بچوں کو اغوا کرنے اور علاج کے نام پر سادہ لوح لوگوں کے اعضا چوری کرنے والا جعلی ڈاکٹر خود کو آدمی کہے تو یہ انسانیت کی توہین ہوگی۔ تمہیں کہنا چاہیے تھا کہ تم نہایت خطرناک درندے ہو۔'' سعدیہ نے اس سے ڈرنے کے بجائے نفرت انگیز لہجے میں اسے جواب دیا۔

''یہ تو اچھی بات ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا۔ اب جب تم درندگی کا نشانہ بنو گی تو تمہیں زیادہ حیرت نہیں ہو گی۔'' اس وقت حامد بالکل بدلا ہوا شخص تھا اور یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو نہایت خوش اخلاقی اور مستعدی سے ان چاروں کی ہر بات پر عمل کرتا تھا اور جسے دیکھ کر وہ دل میں سوچا کرتی تھیں کہ ہمارے ہاں اب بھی ایسے لوگ ہیں جو ایمانداری اور فرض شناسی سے اپنی نوکری انجام دیتے ہیں۔

''میری قربانی سے اگر ایک درندہ اپنے انجام کو پہنچ گیا تو میں اسے گھاٹے کا سودا نہیں سمجھوں گی۔'' اس کے تیور سعدیہ کو لرزا رہے تھے لیکن اس نے اس پر اپنی کمزوری ظاہر نہ کی۔

''کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا میرا۔ میری بہت پہنچ

ہے۔'' وہ دیوانگی آمیز لہجے میں چلّایا اور موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ یہ وہ موبائل نہیں تھا جس پر اس نے ڈاکٹر یوسف سے بات کی تھی۔ وہ موبائل اب بھی آف پڑا ہوا تھا۔

''کہاں ہو تم لوگ۔ یہاں ...... آجاؤ۔ میں اسی جگہ ڈیلیوری دوں گا، ڈبل مال ہے۔'' اس نے اپنے مخاطب کو اپنی لوکیشن سے آگاہ کیا۔ ''دوسری ڈاکٹر کی لڑکی ہے۔ تم نے ٹھیک بتایا تھا کہ ڈاکٹر کی ساس بہت سال پہلے مر چکی ہے۔ یہ لڑکی جاسوسی کے شوق میں میرے پیچھے لگ کر آگئی ہے اور ظاہر ہے اب ہم اسے واپس جانے نہیں دے سکتے اس لیے اس کے بھی دام لگا دو۔'' گفتگو میں مصروف ہو کر اس کی توجہ سعدیہ پر سے ذرا سی ہٹ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ بدستور ڈرائیونگ سیٹ پر ہی بیٹھا ہوا تھا اور پیچھے کی طرف رخ کر کے سعدیہ کو نشانے پر رکھنے میں اسے تھوڑی سی مشکل پیش آرہی تھی۔ سعدیہ کو احساس ہو گیا کہ بچ نکلنے کے لیے اس کے پاس یہی موقع ہے۔ اس کے ساتھی آجاتے اور وہ ان کی گرفت میں چلی جاتی تو پھر کسی صورت نہیں بچ سکتی تھی۔ اس نے رسک لیا اور یک دم ہی دائیں طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر کود گئی۔ حامد نے اضطراری طور پر گولی چلا دی جو یقیناً پشت گاہ میں گھس گئی ہو گی۔ سڑک پر چھلانگ لگانے سے اسے تھوڑی سی خراشیں آئی تھیں لیکن اس نے توجہ نہیں دی اور زگ زیگ کے انداز میں بھاگتی سڑک سے اتر کر کچے کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ دو فائر مزید ہوئے۔ ایک گولی تو اس کے بائیں کان کے بالکل قریب سے گزری لیکن اس نے اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھال کر بھاگنا جاری رکھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس نے پیر میں سینڈل کے بجائے مضبوط جوتے پہن رکھے تھے اور اس کا لباس بھی گہرے رنگ کا تھا اس لیے بھاگنے میں آسانی کے ساتھ ساتھ اسے اندھیرے میں پناہ بھی مل رہی تھی۔ وہ اس وقت اس دہشت زدہ خرگوش کی طرح بھاگ رہی تھی جس کے پیچھے شکاری کتا لگا ہو۔ کتے کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ ایک شکار اس کی گاڑی کی ڈکی میں بھی موجود تھا اور اسے اس کی بھی حفاظت کرنی تھی اس لیے وہ تعاقب کرنے میں ذرا سے تذبذب کا شکار ہو گیا اور سعدیہ کو فاصلہ بڑھانے کی مہلت مل گئی۔ وہ جس راستے پر بھاگ رہی تھی وہ بالکل سپاٹ اور خالی نہیں تھا۔ وہاں ڈھیروں چھوٹے بڑے پتھر تھے اور خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ وہ کبھی پتھروں سے ٹھوکر کھاتی اور کبھی جھاڑیوں میں الجھ کر خود کو خراشیں لگوا بیٹھتی لیکن رک بہرحال نہیں رہی تھی کہ اسے اندازہ ہو گیا تھا حامد اس کے تعاقب میں ہے۔ حامد نے اسے پکڑنے کے جنون میں دو اندھی گولیاں مزید جھونک دی تھیں جو سعدیہ کے قریب بھی نہیں پہنچی تھیں لیکن اس کا خوف ضرور بڑھ گیا تھا۔ اس وقت حامد پر اسے ختم کر دینے کا جنون سوار ہو چکا تھا۔ بھاگتے ہوئے اسے امید کی کرن کی صورت ایک جگہ جلتی روشنی نظر آئی تو وہ اسی سمت دوڑ گئی۔ جیسے جیسے روشنی کے قریب ہوتی گئی منظر واضح ہوتا چلا گیا۔ وہ بغیر دروازے کا ایک جھونپڑا سا بنا ہوا تھا جس کی چھت کی بلی سے لال ٹین لٹکی ہوئی تھی اور اندر کچھ سائے نظر آرہے تھے۔ اس نے کچھ سوچا نہ سمجھا اور اندر گھس گئی۔

''کیرآ ہے۔ اے چھوری تو کیرآ ہے؟'' ان سایوں میں سے جو اب اسے انسانی خدوخال کے ساتھ واضح نظر آرہے تھے، ایک نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''میری مدد کرو ادا! وہ غنڈا میری جان لینے کے لیے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔'' سعدیہ نے اسے ہانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا ہی تھا کہ حامد کا چہرہ کسی بھوت کی طرح دروازے کے خلا میں دکھائی دیا۔ وہ بے ساختہ ہی خود سے سوال کرنے والے کے چوڑے وجود کے پیچھے چھپ گئی۔ قریب کھڑے ہونے کے باعث اسے بدبو کا بھبکا سا آیا اور خوف سے شل قوتِ شامہ نے پہلی بار کام کرتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ جس سے مدد کی طالب ہے وہ ایک شرابی ہے۔ وہاں ایک نہیں تین شرابی تھے جو اس ویرانے میں کچی شراب سے شغل کر رہے تھے۔ سعدیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ کنوئیں سے بچ کر کھائی میں چھلانگ لگا چکی تھی۔

☆☆☆

مہ پارہ نے سعدیہ سے بات ہونے کے بعد فوراً اس کا بھیجا ہوا میسج دیکھا اور بری طرح پریشان ہو گئی۔ معصوم بچوں کا اغوا اور آرگن پائیریسی (اعضا کی چوری) دونوں ہی نہایت بھیانک جرائم تھے اور یہاں دونوں جرائم بڑے دھڑلے سے انجام دیے جا رہے تھے۔ سعدیہ کے میسج سے واضح ہو گیا تھا کہ ان جرائم میں حامد کا بہت اہم کردار ہے اور تشویشناک بات یہ تھی کہ اس وقت سعدیہ، حامد کے ساتھ ہی سفر کر رہی تھی۔ ساتھ سفر کرنے کے لیے اس نے اپنی نانی کے بیمار ہونے کا بہانہ بنایا تھا جو پتا نہیں کس حد تک کامیاب رہتا۔ میسج پڑھتے ہی اس نے سب سے پہلے عروج اور روشی کو جگانے کا کام کیا۔

''یا اللہ کیا ہوا؟ یہ آج اتنی جلدی صبح کیسے ہو گئی؟'' روشی آنکھیں ملتے ہوئے بڑبڑائی۔

''ابھی صبح نہیں ہوئی ہے، میں نے ایک ایمرجنسی کی وجہ سے تم لوگوں کو جگایا ہے۔'' مہ پارہ نے تحمل سے اسے جواب دیا۔

''مائی گاڈ! پھر کوئی گڑبڑ، آخر ہمارا کوئی کام بغیر گڑبڑ کے انجام کو کیوں نہیں پہنچتا۔'' روشی سخت بدمزہ ہوئی۔

''اس مسئلے پر بعد میں غور کرلیں گے۔ پہلے تم دونوں اپنے اپنے موبائل پر آنے والا سعدیہ کا میسج پڑھ لو۔'' مہ پارہ نے ایک بار پھر تحمل کا مظاہرہ کیا۔

''ہیں سعدیہ کا میسج......لیکن وہ خود کہاں ہے؟'' روشی الجھی۔ اس بار مہ پارہ نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اسے گھورنے پر اکتفا کیا۔ روشی اس کے انداز پر بوکھلا کر جلدی سے موبائل اٹھا کر میسج پڑھنے لگی۔ عروج پہلے ہی یہ کام کر رہی تھی۔

''فوراً ڈیڈ کو فون کرو پارو! یہ بہت بڑا معاملہ ہے۔ ہم اکیلے اسے ہینڈل نہیں کرسکیں گے۔'' پورا پیغام پڑھنے کے بعد اس نے فوراً مہ پارہ کو مشورہ دیا۔

''میں یہی کرنے جا رہی ہوں لیکن ہمیں بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ میرے حساب سے مقامی پولیس بھی اس معاملے میں ملوث ہوگی۔ پولیس کی شمولیت کے بغیر اتنے بڑے بڑے جرائم نہیں ہوسکتے اس لیے مقامی پولیس کو اس معاملے سے الگ رکھنا ہوگا اور باہر سے مدد آنے تک خود معاملات ہینڈل کرنے ہوں گے۔'' مہ پارہ پرل کی غیر رسمی باس تھی اور اس کی وجہ اس کی قائدانہ صلاحیت تھی چنانچہ اب بھی اس نے غیر محسوس طور پر کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور ان دونوں کو سمجھانے لگی کہ انہیں کیا کرنا ہوگا۔ اس کی بات سمجھ کر وہ تیزی سے حرکت میں آگئیں جبکہ مہ پارہ نے اپنے والد سہیل مرزا کا نمبر ڈائل کیا۔

''پارو! اس وقت، خیریت تو ہے بیٹا!'' انہوں نے دوسری گھنٹی پر ہی کال ریسیو کرلی اور تشویش سے پوچھا۔ ان کی آواز کے ہلکے سے خمار سے ظاہر تھا کہ وہ نیند سے جاگے ہیں۔

''خیریت نہیں ہے ڈیڈ! ہم ایک بہت بڑے معاملے میں انوالو ہوگئے ہیں۔'' مہ پارہ نے انہیں جواب دیا اور پھر تفصیل سے ساری بات بتانے لگی۔

''اوہ مائی گاڈ! یہ تو واقعی بہت خطرناک معاملہ ہے۔ میں کچھ کرتا ہوں لیکن خیال رہے تم میں سے کوئی اس معاملے میں انوالو نہ ہو۔ یہ لوگ معمولی مجرم نہیں ہیں۔ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ تم لوگوں کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔'' سہیل مرزا نے پریشانی کے عالم میں اسے ہدایت دی۔

''آپ ہماری طرف سے بے فکر رہیں ڈیڈ۔'' اس نے انہیں تسلی دی اور پھر خود بھی اپنی ساتھیوں کی طرح تیار ہونے لگی۔ گہرے رنگ کے چست لباسوں کے ساتھ جوگرز پہن کر باہر نکلتے ہوئے انہوں نے اپنے پسٹل بھی ساتھ لے لیے تھے۔ یہ لائسنس یافتہ پسٹل خود حفاظتی کے نقطۂ نظر سے ان کے والدین نے انہیں دلائے تھے۔

''سعدیہ نے دوبارہ کوئی رابطہ کیا؟'' دبے قدموں آگے بڑھتے ہوئے روشی نے مہ پارہ سے سرگوشی میں دریافت کیا۔

''ہاں، ابھی کچھ دیر پہلے اس کا میسج آیا ہے، اس نے شک ظاہر کیا ہے کہ حامد کی گاڑی کی ڈکی میں جنت موجود ہے۔ اسے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی بار بار اندر سے ڈکی کو بجا رہا ہے لیکن حامد نے اس سے بہانہ بنایا ہے کہ ڈکی کا لاک خراب ہے جس کی وجہ سے مسئلہ ہو رہا ہے۔'' مہ پارہ نے بتایا۔

''اوہ مائی گاڈ! سعدیہ بہت ہائی رسک پر ہے۔ مجرم اپنے جرم کے ثبوت کے ساتھ موجود ہو تو زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔'' روشی نے تشویش کا اظہار کیا۔

''فی الحال ہم اس کے لیے دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اس لیے بہتر ہوگا کہ اپنے حصے کا کام اچھی طرح انجام دیں۔ ڈیڈ کے کچھ کرنے تک ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر کسی طرح حامد کو پتا چل گیا کہ سعدیہ نے اس سے غلط بیانی کی ہے تو وہ بال کی کھال نکال کر اصل بات سمجھ لے گا اور اس کی سب سے پہلی کوشش یہی ہوگی کہ اپنے ساتھیوں کو یہاں سے فرار کروا دے۔ ہمیں کسی کو یہاں سے نکلنے نہیں دینا ہے۔'' مہ پارہ بہت سنجیدہ تھی۔ روشی اور عروج بھی حالات کی نزاکت کو سمجھ رہی تھیں اس لیے چاہتے ہوئے بھی سعدیہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اسے فون نہیں کر سکیں۔ بار بار فون کرنے سے وہ ڈسٹرب بھی ہوسکتی تھی۔

''یاد ہے نا کہ تم میں سے کون لیفٹ اور کون رائٹ پر ہوگا۔'' چند قدم چلنے کے بعد اس نے سرگوشی میں ان دونوں سے پوچھا۔ انہیں اسکول کی عمارت کے جس حصے میں ٹھہرایا گیا تھا وہ چھوٹا اور باقی عمارت سے ذرا ہٹ کر تھا جبکہ میڈیکل ٹیم عمارت کے بڑے حصے میں جو تعمیر کے اعتبار سے زیادہ پرانا تھا ٹھہری ہوئی تھی اور وہ تینوں اس وقت بڑی عمارت کے قریب اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھیں۔ مہ پارہ کے سوال پر دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوکے! تم دونوں جاؤ۔ میں بیک پر رہوں گی۔

خیال رکھنا کہ ہمیں فی الحال صرف نگرانی کرنی ہے اور صرف اس صورت میں حرکت میں آنا ہے جب لگے کہ یہ لوگ فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' مہ پارہ نے ایک بار پھر ہدایات کو دہرایا تو وہ دونوں سر کو اثبات میں جنبش دیتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئیں۔ روشی عمارت کے دائیں پہلو تک پہنچی ہی تھی کہ اسے اپنی دائیں ٹانگ پر ہلکی سی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے چست ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وائبریشن پر لگے اپنے موبائل کو باہر نکالا۔ اسکرین پر سعدیہ کے والد ڈاکٹر ایس یوسف کی کال آنے کا اشارہ مل رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر کئی شکنیں ابھر آئیں۔ رات کے اس پہر ڈاکٹر یوسف کی کال آنے کو نیک شگون قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی اور بہت دھیمی آواز میں انہیں سلام کیا۔

''سعدیہ کہاں ہے روشی بیٹا! میں اس کے لیے بہت پریشان ہوں۔ ابھی ابھی میرے پاس ایک کال آئی تھی۔ کال کرنے والا عجیب سی باتیں کر رہا تھا پھر آخر میں سعدیہ کے چیخنے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی 'ڈیڈی بچائیں، یہ حامد' اور بس پھر لائن کٹ گئی۔ اس کال کے آنے کے بعد سے میں اس نمبر کے علاوہ سعدیہ کے نمبر پر بھی کئی بار ٹرائی کر چکا ہوں لیکن کوئی رسپانس نہیں مل رہا، دونوں نمبر پاورڈ آف ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب کے لہجے میں ایک باپ کی فطری پریشانی تھی۔

''اس وقت میں آپ سے زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتی انکل۔ آپ سعدیہ کے لیے دعا کریں اور سہیل انکل سے رابطہ کر لیں وہ آپ کو ساری تفصیل بتا دیں گے۔'' ڈاکٹر یوسف نے جو کچھ بتایا وہ بہت تشویشناک تھا لیکن وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ ان سے تفصیلی بات چیت کر پاتی چنانچہ مختصر بات کر کے سلسلہ منقطع کر دیا اور موبائل کو واپس ٹراؤزر کی جیب میں رکھنے لگی۔ اسی پل اسے اپنے قریب آہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے آواز کی سمت پلٹنا چاہا لیکن اپنی گردن پر لوہے کا ٹھنڈا لمس محسوس کر کے ٹھٹک گئی۔

''ہینڈز اَپ!'' اسے حکم دیا گیا جس پر اسے عمل کرنا پڑا۔ ہاتھ اٹھاتے ہی اس کے چہرے پر روشنی ڈالی گئی۔ روشی نے بے ساختہ آنکھوں کے آگے دائیں ہتھیلی پھیلاتے ہوئے روشنی سے بچنے کی کوشش کی۔ گہرے اندھیرے میں براہِ راست منہ پر ڈالی جانے والی روشنی نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔

''مس عثمان! آپ یہاں اس وقت کیا کر رہی ہیں؟'' سوال پوچھنے والی آواز میں حیرت تھی۔ اس بار روشی نے آواز کو شناخت کر لیا۔ وہ ہینڈسم و اسمارٹ طاہر تھا جو ایک ہاتھ میں پسٹل اور دوسرے میں ٹارچ لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو میں ذرا چہل قدمی کے لیے نکلی تھی۔'' اس نے بمشکل مسکراتے ہوئے بہانہ بنانے کی کوشش کی۔

''مائی گاڈ! میں سمجھا کہ شاید یہاں کوئی چور گھس آیا ہے۔ یونو کہ یہاں بہت قیمتی مشینیں، آلات، دوائیں اور دوسری اہم چیزیں موجود ہیں۔ گرمی بہت ہے کمرے میں جس کی وجہ سے کھڑکی کھولنے آیا تھا تو موبائل کی روشنی دیکھ کر چونک گیا اور دبے قدموں آپ تک پہنچ گیا۔'' وہ روشی کی گردن پر سے پسٹل کی نال ہٹا چکا تھا اور اسے بتا رہا تھا۔

''جی ایک دوست کی کال آ گئی تھی۔'' طاہر کا نارمل انداز دیکھ کر اسے حوصلہ ہوا اور مسکرا کر بتانے لگی۔

''عجیب ہیں آپ۔ رات کے آخری پہر چہل قدمی اور دوستوں سے ٹیلی فونک رابطے کرتی ہیں۔'' طاہر نے تبصرہ کیا۔

''اس میں عجیب کیا ہے۔ آج کل تو سب ہی یہی کرتے ہیں۔ آپ بھی تو اتنی رات کو جاگ رہے ہیں نا۔'' روشی نے حاضر جوابی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

''میری بات اور ہے۔ میرا پروفیشن ہی ایسا ہے۔ آج رات ہی ہم نے ایک پیشنٹ کے گردے کا آپریشن کیا ہے۔ وہ یہیں موجود ہے اور تکلیف میں ہے تو نرس کے ساتھ ساتھ میں بھی اسے لک آفٹر کر رہا تھا۔'' اس نے جواب دیا اور پھر بااخلاق لہجے میں بولا۔

''اگر آپ یہاں تک آ ہی گئی ہیں تو کیوں نا ایک ایک کپ چائے پی لی جائے، آئیں اندر آ جائیں۔ آپ مجھے ایک اچھا میزبان پائیں گی۔'' اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جس سے وہ اپنے مریضوں کو نوازتا تھا اور جس کی وجہ سے سب اس کے اسیر ہو جاتے تھے۔

''نہیں، اب میں چلوں گی۔ میری فرینڈز میں سے کسی کی آنکھ کھل گئی تو وہ میرے لیے پریشان ہو جائیں گی۔'' روشی نے اس کے ساتھ اندر جانے سے پہلو بچانے کی کوشش کی۔

''شاید آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے لیکن بے فکر رہیں۔ میرے ساتھ نرس ایملی بھی موجود ہے۔'' طاہر نے اس کے گریز کا سبب کچھ اور سمجھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ چلیں آپ اصرار کر رہے ہیں تو آپ کی چائے پی ہی لیتے ہیں۔'' روشی کو خیال آیا کہ

اندر نہ جانے کی صورت میں اسے یہاں سے ہٹنا پڑے گا چنانچہ اپنی رضامندی دے دی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید اندر جا کر کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔

''ایملی، ذرا اچھی سی چائے تو تیار کر دو۔ میرے ساتھ ایک مہمان ہے۔'' اندر پہنچ کر طاہر نے جس لڑکی کو مخاطب کیا حلیے سے وہ نرس کے بجائے کچھ اور ہی لگ رہی تھی۔ نیم عریاں لباس، بھڑکیلا میک اپ اور اس کی ادائیں مل کر اسے جو ثابت کر رہے تھے اس کا ایک ثبوت روشنی میں آنے پر اسے طاہر کی سفید ٹی شرٹ پر نظر آ گیا۔ کندھے کے قریب دو سرخ ہونٹ چھپے ہوئے تھے اور ایملی کے ہونٹوں پر سرخ ہی لپ اسٹک لگی ہوئی تھی۔ طاہر نے اس کی نظروں کا زاویہ محسوس کر لیا اور قدرے جھینپا ہوا نظر آنے لگا لیکن زبان سے کوئی وضاحت نہیں کی اور عام سے انداز میں اس سے اس کی فیملی بیک گراؤنڈ اور سمر کیمپ وغیرہ سے متعلق چھوٹے چھوٹے سوالات کرنے لگا۔ روشی بور سی اس کے سوالوں کا جواب دیتی ہوئی ادھر ادھر نظریں گھماتی رہی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ عام سا کمرا تھا جیسا کہ کسی ڈاکٹر کے زیر استعمال کمرا ہو سکتا ہے۔ ذرا سی دیر میں ایملی چائے تیار کر کے لے آئی۔ ابھی ان میں سے کسی نے چائے کو منہ نہیں لگایا تھا کہ کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور عمر رسیدہ شاکر اندر داخل ہوا۔

''بہت گڑبڑ ہو گئی ہے طاہر! ہمیں فوری پیک اپ کرنا ہوگا۔ حامد مارا گیا ہے اور پولیس کی ایک گشتی ٹیم نے اس کی گاڑی سے جنت اور وہ باکس بازیاب کر لیا ہے جس میں وہ کڈنی لے کر جا رہا تھا۔'' شاکر نے روشی کی وہاں موجودگی کو فوری طور پر محسوس نہیں کیا تھا اور پریشانی کے عالم میں بولتا چلا گیا تھا۔ جب اس کی نظر روشی پر پڑی تو شپٹا گیا۔

''یہ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے؟'' اس کے لہجے میں بیک وقت خوف اور جھلاہٹ کا تاثر تھا۔

''جو بھی کر رہی ہے اب واپس نہیں جا سکے گی۔'' طاہر کا خوب صورت چہرہ یک دم بھیانک نظر آنے لگا اور اس نے ایک بار پھر اپنا پسٹل نکال کر اس کا رخ روشی کی طرف کر دیا۔

''مجھے افسوس ہے خوب صورت لڑکی لیکن انجانے میں تم نے جو سن لیا ہے اس کے بعد تمہارے زندہ رہنے کی گنجائش نہیں بنتی۔'' اس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ بھی سفاک ہو چلی تھی۔ روشی لمحہ بہ لمحہ ٹریگر پر بڑھتے طاہر کی انگلی کے دباؤ کو دیکھ رہی تھی۔ بالآخر گولی چلی اور روشی کے حلق سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی۔

☆☆☆

شراب کی ناگوار بو سعدیہ کے دماغ میں گھسی جا رہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ پر جمے رہنے پر مجبور تھی کہ فی الحال اس شرابی کے چوڑے چکلے وجود کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی پسٹل لہراتے حامد کو دروازے پر کھڑا دیکھ سکتی تھی۔ وہ جھونپڑے میں موجود تینوں مردوں کو للکارتے ہوئے اپنے راستے سے ہٹ جانے ورنہ دوسری صورت میں گولی مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ پہلے تو وہ تینوں یوں گم صم کھڑے رہے جیسے اس کی بات سننے اور سمجھنے سے قاصر ہوں لیکن جیسے ہی حامد نے ایک قدم اندر رکھا، سعدیہ کے آگے چٹان کی طرح کھڑا مرد دہاڑا۔

''ادھر ہی رک جا...... کتے کی نسل۔ اس چھوری نے ہمیں ادا بولا ہے اور ہمارے ہوتے کوئی ہماری بھین (بہن) کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے میں تیرا ہی پتا صاف کر دیتا ہوں۔'' گالی سن کر حامد کا طیش کچھ اور بھی بڑھ گیا اور اس نے گولی چلا دی۔ سعدیہ نے اپنے آگے کھڑے شخص کے بازو سے خون نکلتے دیکھا اور اس کی دردناک چیخ سن کر بے ساختہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے یقین تھا کہ ابھی مزید گولیاں چلیں گی لیکن گولی چلنے کے بجائے ٹرچ کی آواز سنائی دی تو احساس ہوا کہ حامد کے پسٹل میں آخری گولی ہی باقی رہ گئی تھی اور اب وہ مزید گولیاں نہیں چلا سکتا۔ اس بات کو ان شرابیوں نے بھی سمجھ لیا اور وہ کسی بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح حامد کی طرف لپکے۔ حامد نے پلٹ کر بھاگ نکلنا چاہا لیکن اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ وہیں فرش پر گر گیا۔ شرابیوں کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ وہ اس پر پل پڑے۔ یہاں تک کہ زخمی بازو والا بھی اس کار خیر میں حصہ لینے سے باز نہیں رہا اور اپنے زخمی بازو کو دوسرے ہاتھ سے دبا کر خون روکنے کی کوشش کرتے ہوئے دونوں پیروں سے بے تکلفانہ حامد کے ضربیں لگانے لگا۔ ایک تو شراب کا اثر دوسرے حامد کی گولی چلانے کی جسارت نے ان تینوں کے اندر جنون بھر دیا تھا اور وہ جسم کے کسی بھی حصے کی تخصیص کیے بغیر اسے بے تحاشا پیٹ رہے تھے۔ حامد کے حلق سے کسی ذبح ہونے والے جانور کی طرح چیخیں بلند ہو رہی تھیں لیکن ان تینوں کو پروا نہیں تھی۔ اول اول سعدیہ نے کوشش کی کہ انہیں روک سکے لیکن جنون میں وہ اس کی آواز بھی نہیں سن رہے تھے۔ ان کے جنونی انداز نے اسے اتنا خوف زدہ کیا کہ وہ مزید وہاں ٹھہرنے کی ہمت نہیں کر سکی اور چپکے سے باہر نکل گئی۔ اندر وہ تینوں درندوں کی سی آوازیں نکالتے ہوئے اب بھی حامد کو پیٹ رہے تھے۔ حامد کی

دردناک چیخیں آہستہ آہستہ مدھم پڑتی جارہی تھیں۔ درندہ آج خود درندوں کے ہاتھ چڑھ گیا تھا۔ سعدیہ میں یارا نہیں تھا کہ وہاں کھڑی رہ کر ان کی آوازیں سنتی۔ وہ سمت کا تعین کیے بغیر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ بھاگتے بھاگتے اس کی آنکھوں سے چکاچوند کردینے والی روشنی ٹکرائی پھر اس کے کانوں نے جانی پہچانی آواز سنی۔ وہ پولیس موبائل کے سائرن کی آواز تھی۔ وہ اپنی جگہ رک گئی اور موبائل کو روکنے کے لیے ہاتھ ہلانے لگی حالانکہ وہ پہلے ہی رک چکی تھی۔

"کون ہو تم لڑکی اور یہاں کیا کررہی ہو؟" موبائل سے ایک ایس ایچ او اپنے سپاہیوں کے ساتھ اترا اور اس سے بارعب لہجے میں دریافت کیا۔

"ادھر ایک گاڑی کھڑی ہوگی، اس کی ڈکی میں ایک اغوا شدہ بچی موجود ہے اور وہاں اس طرف کچھ لوگ ایک آدمی کو مار رہے ہیں۔ پہلے آپ انہیں دیکھیں پھر میں آپ کو سب بتاتی ہوں۔" سعدیہ نے اپنے حواس بحال رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے جواب دیا اور خود سڑک پر ہی بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ ایس ایچ او سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے اس کی بات سمجھ لی اور فوراً ہی اپنے آدمیوں کو حرکت میں لے آیا۔ ساتھ ہی اس نے وائرلیس پر پیغام بھیج کر مزید نفری بھی طلب کرلی۔ اس کے اقدامات کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ پولیس کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد جب وہ وہاں سے روانہ ہوئے تو ایک ایمبولینس میں نیم بے ہوش جنت اور نیم جان حامد بھی موجود تھے۔ حامد کا بھرکس نکل گیا تھا اور وہ سانس بھی مشکل سے لے رہا تھا۔ پولیس والوں کی آپس کی گفتگو سے سعدیہ کو پتا چلا کہ جن لوگوں کے ہاتھوں حامد اس حال کو پہنچا تھا وہ کوئی عام لوگ نہیں بلکہ ڈاکو تھے اور وہ مشہور دہاڑیل ڈکیت کے گروہ کے افراد تھے لیکن وہ پولیس کی آمد کے ساتھ ہی فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ایس ایچ او کی زبانی اسے یہ بھی پتا چلا کہ وہ لوگ اپنے معمول کے گشت پر تھے جب فائرنگ کی آواز کی وجہ سے اس طرف متوجہ ہوئے۔ سعدیہ نے حامد کی گاڑی میں موجود سلور باکس کی اہمیت سے ایس ایچ او کو آگاہ کرکے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ کسی قابل ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق اس باکس اور اس میں موجود انسانی گردے کی حفاظت کا بندوبست کردے۔ اس رات کا باقی ماندہ حصہ، اس چھوٹے شہر کے ایک تھانے میں بہت مصروف گزرا تھا۔ سعدیہ کو بھی اپنا طویل بیان قلم بند کروانے اور اپنے پیاروں تک اپنی خیریت کی اطلاع پہنچانے کے لیے کافی انتظار کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

روشی نے گولی کی آواز سن کر چیخنے کے بعد غور کیا تو احساس ہوا کہ گولی اسے نہیں بلکہ طاہر کو لگی ہے اور وہ ہولے ہولے کراہتا ہوا اپنے بازو سے بہتے خون کو دیکھ رہا ہے۔ طاہر کا پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نجانے کہاں جا گرا تھا اور شاکر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس سارے منظر کو دیکھتے ہوئے بالکل سفید پڑ چکا تھا۔ روشی نے اپنا پسٹل نکالنے میں کوتاہی نہیں کی اور اسے شاکر اور طاہر پر تان لیا۔

"گڈ، تم ان لوگوں کو دیکھو، میں اور عروج باقیوں سے نمٹتے ہیں۔" روشن دان سے جھانکتی مہ پارہ نے اسے ہدایت کی اور خود وہاں سے ہٹ گئی۔ اس نے روشی کو طاہر کے ساتھ اندر جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور کسی ممکنہ گڑبڑ کا سوچ کر خود بھی ان کے پیچھے اندر گھس گئی تھی۔ اس کی اس احتیاط نے ہی روشی کی جان بچائی تھی۔ لیکن اب عمارت کے اندر سے آنے والی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ فائرنگ کی آواز نے سوتے ہوؤں کو اٹھا دیا ہے۔ یہ اس عارضی اور نام نہاد اسپتال کے اسٹاف کے لوگ تھے جن کی بڑی تعداد لازماً شریکِ جرم تھی اور انہیں مدد آنے تک کنٹرول میں رکھنا لازمی تھا۔ مہ پارہ نے اس کا سادہ حل نکالا اور عمارت کے دروازے باہر سے بند کردیے۔ اسکول کے چوکیدار کو بھی اس نے سمجھا دیا تھا کہ اندر بہت گڑبڑ ہے اور اوپر سے ذمے داران کے آنے تک انہیں کسی کو یہاں سے نکلنے نہیں دینا ہے۔ چوکیدار اور عروج کے ساتھ مل کر اس نے باہر مورچا بندی کرلی تھی اور کسی کا ان کی نظروں میں آئے بغیر وہاں سے نکل بھاگنا آسان نہیں تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے والد سہیل مرزا سے بھی رابطے میں تھی اور انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کرتی جارہی تھی۔ یہ سہیل مرزا کے اثر و رسوخ کا ہی نتیجہ تھا کہ مقامی پولیس کو بھی حکم مل گیا کہ وہ اسکول کی عمارت کو گھیرے میں لے لیں لیکن مزید کوئی کارروائی نہ کریں۔ کارروائی کے لیے انہیں اس اسپیشل ٹیم کی آمد کا انتظار کرنا تھا جو بہت جلد وہاں پہنچنے والی تھی۔

ادھر اندر موجود روشی کو بھی چیلنجز کا سامنا تھا۔ بازو پر گولی کھا کر کچھ دیر کے لیے صدمے میں چلا جانے والا طاہر یکلخت زور سے دہاڑا اور میز پر پڑا ایک بھاری پیپر ویٹ اس کی طرف اچھال دیا۔ روشی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئی اور دروازہ کھول کر اندر کی صورتِ حال جاننے کے لیے جھانکتی ایملی کا سر بھاری پیپر ویٹ کی زد میں آیا۔ وہ چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہوگئی۔ اپنی منظورِ نظر کے اس حال پر طاہر تھوڑا سا ٹھٹکا پھر طیش میں چائے کی ٹرے اٹھا کر روشی کی طرف پھینکی۔ اس

کا دایاں بازو جس سے وہ کام لینے کا عادی تھا زخمی تھا اور بائیں بازو کی کارکردگی اچھی ثابت نہیں ہو رہی تھی پھر بھی روشی نے اسے مزید رعایت دینا مناسب نہیں سمجھا اور ایک فائر اس کے پیروں کی طرف جھونک دیا۔ فائر بیکار نہیں گیا اور طاہر کی بائیں ٹانگ زخمی ہوگئی۔ روشی نے پھرتی سے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کیا تاکہ کسی بیرونی مداخلت کار کا سامنا نہ کرنا پڑے اور پھر ایک طائرانہ نگاہ طاہر اور شاکر پر ڈالی۔ طاہر اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکا تھا اور زمین پر گرا بری طرح کراہ رہا تھا جبکہ شاکر ابھی تک پھٹی پھٹی نظروں سے یوں سارے منظر کو دیکھ رہا تھا جیسے خود اس منظر کا حصہ ہونے کے بجائے کسی ہارر فلم کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جانے والا بچہ ہو۔

''ادھر، اس دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ اور دونوں ہاتھ سر سے اوپر کھڑے کرلو۔'' روشی نے تیز لہجے میں اسے حکم دیا۔ بولتے ہوئے اس کا تنفس معمول سے تیز تھا اور دل گویا کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ کسی انسان پر چاہے وہ طاہر جیسا درندہ صفت انسان ہی تھا، گولی چلانا اس کے لیے معمولی بات نہیں تھی۔ ایک غیر معمولی کام کر گزرنے کے بعد اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات پیدا ہوگئی تھی کہ پہلے سے خوف زدہ شاکر نے بھی اس سے خوف محسوس کیا اور بلا چوں و چرا اس کے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ وہ جس دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوا تھا اس کے ساتھ ہی ایک کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑے شاکر کی نظریں پھسل کر اس کرسی کے نیچے چلی گئیں اور وہاں اسے طاہر کا پسٹل پڑا نظر آ گیا۔ اس نے چہرے کو ذرا سا ترچھا کر کے روشی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی توجہ بٹی ہوئی تھی۔ وہ بیک وقت اسے اور طاہر کو نظروں میں رکھنے کے علاوہ ان آوازوں کی طرف بھی متوجہ تھی جو باہر سے آ رہی تھیں۔ وہ اسٹاف کے کچھ لوگ تھے جو دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے اور طاہر کو آوازیں دے رہے تھے۔ ان آوازوں کے پس منظر میں شاکر ایک اور آواز سن رہا تھا۔ پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز...... مطلب واضح تھا۔ کھیل ختم ہو چکا تھا اور اگر کسی طرح وہ اس لڑکی کو قابو میں کر بھی لیتا تو اس کے پاس فرار کی گنجائش نہیں تھی لیکن نہیں...... گنجائش ہمیشہ ہوتی ہے۔ اسے بھی ایک راستہ نظر آ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس راستے پر ضرور چلے گا۔ اپنی دانست میں وہ ایک قابل اور نامور سرجن تھا۔ اس کی جعلی سندوں کا راز اس کے سینے میں دفن تھا۔ اس نے کہیں اپنا رجسٹریشن نہیں کرایا تھا اس لیے کوئی چھان بین نہیں ہوئی نہ کسی نے اس کے پیشے کو چیلنج کیا۔ بس لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اسے ان سارے لوگوں کے سامنے سر جھکا کر پیش ہونا پڑے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہ لمحہ کبھی بھی اپنی زندگی میں نہیں آنے دے گا۔ فیصلہ کرتے ہی وہ یک دم نیچے بیٹھا اور کرسی کے نیچے ہاتھ ڈال کر طاہر کا پسٹل نکال لیا۔

''اے...... اے...... کیا کر رہے ہو تم۔ خبردار کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گی۔'' روشی وحشت کے عالم میں چیخی لیکن ڈاکٹر شاکر نے اس کی دھمکی کی پروا نہیں کی اور گولی چلا دی۔ گولی اس نے اپنی کنپٹی پر پسٹل رکھ کر چلائی تھی۔ روشی نے اس کی کھوپڑی میں بننے والے سوراخ، اس سے بہتے خون اور مغز کے ملغوبے کو دیکھا اور ایک ابکائی سی لے کر نیچے بیٹھ گئی۔ اگر طاہر اس دوران بازو اور ٹانگ سے ہونے والے خون کے بے تحاشا اخراج کی وجہ سے بے ہوش نہ ہو چکا ہوتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اب اس کے فائدہ اٹھانے کی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ فائدے کے نام پر اس نے اور اس کے دیگر ساتھیوں نے جو ظلم کمایا تھا آج اس کے حساب کا دن آ پہنچا تھا۔

☆☆☆

حامد بہت بُری حالت میں اسپتال پہنچا تھا۔ ڈاکٹرز نے اس کے ابتدائی معائنے کے دوران ہی اس کی طرف سے مایوسی ظاہر کر دی تھی اور بتایا تھا کہ اسے اتنی بری طرح مارا پیٹا گیا ہے کہ اندرونی اعضا کو بھی شدید نقصان پہنچا ہے۔ حامد کے منہ اور ناک سے مسلسل خون بہہ رہا تھا پھر بھی اس چھوٹے شہر کے چھوٹے اسپتال کے ڈاکٹرز نے اپنے فرض کی ادائیگی تندہی سے شروع کر دی اور اس کی زندگی بچنے کی امید بہت کم ہونے کے باوجود اپنی سی کوششیں کرنے لگے۔ ان کی ان کوششوں کا نتیجہ اس صورت نکلا کہ حامد اس لائق ہو گیا کہ پولیس کو اپنا نزاعی بیان ریکارڈ کروا سکے۔ اس بیان میں اس نے اعتراف کیا کہ اس کے ایک ایسے گینگ سے روابط تھے جو بچوں کے اغوا، ان کے ساتھ زیادتی اور قابلِ اعتراض ویڈیوز بلیک نیٹ پر براڈ کاسٹ کرنے کے سنگین جرائم کے علاوہ انسانی اعضا کی چوری اور ناجائز تجارت کے دھندے بڑے پیمانے پر چلاتا تھا۔ حامد کو اس گینگ اور کرتا دھرتاؤں کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور اس کے بیان کے مطابق وہ خود ہی اس سے رابطہ کر کے احکامات جاری کرتے تھے۔ احکامات کی بجا آوری پر اس کے فارن اکاؤنٹس میں خودکار طریقے سے بھاری رقم منتقل ہو جاتی تھی۔ حامد کو ان کے سہولت کار کا کردار ادا کرنا ہوتا تھا باقی انتظامات خود ان

کے اپنے ہوتے تھے۔ حامد نے مقامی تھانے کے ایس ایچ او کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اس لیے علاقے سے اتنے بچوں کے اغوا کے باوجود معاملہ اوپر تک نہیں جا سکا تھا اور جب یہ اندیشہ ہوا تھا کہ بات بڑھ سکتی ہے تو سلسلے کو کچھ عرصے کے لیے روک دیا گیا تھا۔ جنت کا اغوا آخری بچے کے اغوا کے طویل عرصے بعد کیا گیا تھا اور یہ وہ وقت تھا جب جعلی ڈاکٹر کی ٹیم اس کے علاقے میں اپنا کام کر رہی تھی۔۔۔۔ شاکر بھی اسی کی طرح ایک مہرہ تھا جو دولت کی ڈگڈگی پر ناچتا اپنے پیشے کی عزت اور وقار کو داؤ پر لگا چکا تھا۔ اس نے۔۔۔۔ طاہر سمیت اپنی پوری ٹیم خود تشکیل دی تھی اور انسانیت کی خدمت کے نام پر چندے اور فنڈز جمع کر کے گینگ کے لیے خدمات انجام دیتا رہتا تھا۔ حامد کی حیثیت اب بھی سہولت کار کی تھی اور وہ دھوکے سے حاصل کیے گئے انسانی اعضا کو طے شدہ مقام پر پہنچانے کا ذمے دار تھا۔ اس کے مطابق اغوا شدہ بچوں اور اعضا دونوں کی حوالگی کے سلسلے میں اسے کوئی ایک جگہ یا شخص مقرر نہیں تھا اور ہر بار اسے نئی ہدایات بھیجی جاتی تھیں۔ کوشش کی گئی تھی کہ حامد سے اس کے علاوہ بھی کوئی بات معلوم کی جا سکے اور کوئی ایسا کلیو حاصل کیا جا سکے جو اصل مجرموں تک پہنچنے میں معاون ہو لیکن وہ مزید کچھ نہیں بتا سکا تھا اور اس پر دوبارہ بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ اس بے ہوشی کا اختتام اس کی موت پر ہوا تھا اور موت کے ساتھ ہی اس کے وہ سارے فارن اکاؤنٹس بے مقصد ہو گئے تھے جنہیں اس نے انسانیت کا خون کر کے بھرا تھا۔ اس کا تو کوئی والی وارث بھی نہیں تھا جو اس دولت سے دنیاوی ہی سہی فائدہ اٹھا سکتا۔ دولت کے ڈھیر کی صورت اس نے خود اپنی قبر کو سانپ بچھوؤں سے بھرنے کا انتظام کر لیا تھا۔ اس کا معاون ایس ایچ او ہوا کا رخ بدلتے دیکھ کر پہلے ہی مرحلے پر فرار ہو گیا تھا اور ہنوز اس کی گرفتاری عمل میں نہیں لائی جا سکی تھی۔

۔۔۔۔ شاکر کی خودکشی کے بعد اس کے عملے سے بھی کچھ معلوم نہیں کیا جا سکا تھا۔ وہ سب۔۔۔۔ شاکر کے بھرتی کردہ تھے اور ڈاکٹر ان کی ''خدمات'' کے عوض خود انہیں بھاری معاوضے ادا کرتا تھا۔ کیسے؟ اس بات سے انہیں کبھی سروکار نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر طاہر جو ڈاکٹر شاکر کا دستِ راست سمجھا جاتا تھا اور اپنی خوب صورت شخصیت اور میٹھی زبان کی بدولت سب سے زیادہ مریض پھانستا تھا، وہ بھی کچھ بتانے سے قاصر رہا تھا۔ ایک حساس ادارہ خود اس کیس کو دیکھ رہا تھا۔ حامد، شاکر، طاہر اور دیگر ملزمان کے لیپ ٹاپس، موبائلز اور دوسری اہم اشیا تحویل میں لے لی گئی تھیں اور اس کیس میں سردھڑ کی بازی لگانے والی پرل گروپ کی ارکان کو حسبِ معمول دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا گیا تھا جس کے باعث وہ سرسر بہتی ندی سی لڑکیاں یعنی پرل گروپ کی ارکان غصے سے بل کھا کر رہ گئی تھیں کہ آوازِ احتجاج بلند کرنے کے اختیارات ان کے مختار والدین نے ان سے چھین لیے تھے۔

☆☆☆

انہوں نے اندر داخل ہوتی زینت کو دیکھا۔ حسبِ معمول اس کا چھوٹا بیٹا اس کی گود میں تھا اور جنت اور بڑا بیٹا دائیں بائیں چل رہے تھے۔ یہ وہ خاندان تھا جو دو بڑے حادثات سے بال بال بچ نکلا تھا۔ معصوم جنت اغوا ہونے کے بعد بھی اپنے کنبے میں صحیح سلامت واپس آ گئی تھی اور زینت کسی دولت مند کے ناکارہ جگر کی جگہ اپنے جگر کی پیوندکاری کی بھینٹ دینے سے بچ گئی تھی۔ زینت کو واپس لانے والوں نے یقیناً بہت سے کھوج لگائے ہوں گے لیکن ان چاروں کو صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ جگر کی پیوندکاری سے کسی شیخ کی بیوی کو گزرنا تھا اور اس مقصد کے لیے انڈیا کے ایک ماہر سرجن کو ہائر کر کے پاکستان لایا گیا تھا۔ زینت بچ گئی تھی لیکن پورا سچ سامنے نہیں لایا جا سکا تھا کہ سچ پر مصلحتوں، تعلقات اور مجبوریوں کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ سچ کے سامنے نہ لائے جانے پر نالاں تھیں، انہیں ان لوگوں کے لیے بھی شدید دکھ تھا جن کے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکی تھی اور وہ دھوکے سے اپنے قیمتی اعضا سے محروم کیے جانے کے بعد ساری زندگی طبی پیچیدگیوں سے گزرنے والے تھے لیکن دل میں یہ تھوڑا سا اطمینان تھا کہ اپنی بساط بھر انہوں نے کچھ نہ کچھ کردار تو ادا کیا ہی ہے۔ نارِ ابراہیم کو بجھانے میں حصہ لینے والی اس چڑیا جیسا کردار جو اپنی چونچ میں پانی کا ایک قطرہ لا کر اس ہیبت ناک آگ پر ڈالتی تھی جس کا بجھنا سوائے رضائے الٰہی کے کسی کے بس کی بات نہیں تھی لیکن چڑیا کو اطمینان تھا کہ وہ۔۔۔ بساط بھر اپنے حصے کا کام کر رہی ہے۔ انہوں نے بھی یہی کردار ادا کیا تھا اور آج اپنے سمر کیمپ کے آخری دن دیگر بچوں کے ساتھ جنت کو پا کر بہت خوش تھیں۔ ان کے اندر کسی بین الاقوامی گینگ سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی لیکن یہ بھی کیا کم تھا کہ انہوں نے جنت کو بچا لیا تھا۔ جو جنت کو بچانے کی سعی کرتے ہیں جنہم کے عذاب سے بچنے کا راستہ بھی ان ہی کو ملتا ہے۔ شرط صرف حق کو پہچان لینے اور اس پر چلنے کی کوشش کی ہوتی ہے۔